نسخۂ فیض اللہ، کلکتہ : 1843ء

باغ و بہار

میر امّن دِلّی والے

مُرتّب: ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

باغ و بہار

(نسخۂ فیض اللہ، کلکتہ: 1843ء)

مُرتّب:

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

دوست پبلی کیشنز

اسلام آباد۔ لاہور۔ کراچی

ضابطہ

ISBN: 978-969-496-517-8

کتاب : باغ و بہار
مُرتّب : ڈاکٹر مرزا حامد بیگ
موسم اشاعت : 2017ء
سرورق/تزئین : حنیف رامے
مطبع : ورڈ میٹ، اسلام آباد

دوست پبلی کیشنز
پلاٹ 110، سٹریٹ 15، I-9/2، اسلام آباد
فون: 051-4102784-85
E-mail: dostpub@nayatel.pk

تنبیہ الغافلین

قاضی عبدالودود

کے

نام

مُندرجات

اظہارِ تشکّر	ڈاکٹر مرزا حامد بیگ	07
مُقدّمہ	ڈاکٹر مرزا حامد بیگ	09
میر امّن دلّی والے: احوال و آثار		10
پس نوشت: رشید حسن خاں سے معاملہ		44
باغ و بہار		61
باغ و بہار کا ماخذ: ''قصۂ چہار درویش'' فارسی از مرزا ربیع الجب		75
باغ و بہار کی اسلوبیاتی ساخت		88
تحقیقِ متن : چند معروضات		96
ہمارا مآخذی نسخہ: نسخۂ فیض اللہ، کلکتہ: ۱۸۴۳ء		98

-ooo-

باغ و بہار : مقدّمہ	جان بارتھوک گلکرسٹ	122
میر امّن دِلّی والے : مونوگراف	ڈاکٹر مرزا حامد بیگ	123
نقل عرضی کی	میر امّن دِلّی والے	129

-ooo-

دیباچہ : ''باغ و بہار''	میر امّن دِلّی والے	131

شُروع قصے کا 136
سَیر پہلے درویش کی 142
سَیر دُوسرے درویش کی 169
سَیر تیسرے درویش کی 241
چوتھے درویش کی سَیر 254
خاتمہ کتاب میں 272

-ooo-

حواشی : بابت مُقابلہ متون 274
فرہنگِ باغ و بہار 310

-ooo-

ضمیمہ جات

تصویر : ریورنڈ ڈیوڈ براؤن، پرووسٹ فورٹ ولیم کالج، کلکتہ 421
تصویر : پروفیسر جان بارتھوِک گلکرسٹ، صدر شُعبہ ہندوستانی 422
عکس : سرورق "باغ و بہار" (بہ زبان اردو) اشاعتِ اوّل : ۱۸۰۴ء 423
عکس : سرورق "باغ و بہار" (بہ زبانِ انگریزی) اشاعتِ اوّل: ۱۸۰۴ء 424
عکس : انتساب "باغ و بہار" (بہ زبانِ انگریزی) اشاعت اوّل :۱۸۰۴ء 425
عکس : سرورق نُسخہ ءفیض اللہ، کلکتہ طبع چہارم :۱۸۴۳ء 426
عکس : آغاز نسخہ ءفیض اللہ : ۱۸۴۳ء مع مُہر فورٹ ولیم کالج، کلکتہ 427
عکس : مُہر و اندراج کُتب خانہ فورٹ ولیم کالج، کلکتہ۔ 428

اظہارِ تشکر

حنیف رامے (2006ء۔1931ء) عالمی شہرت کے حامل مصوّر اور خطاط۔ فنِ مصوّری میں استاد اللہ بخش اور خطاطی میں محمد حسین شاہ کے نمایاں شاگرد۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے اعلیٰ تعلیم یافتہ، لیکن فنونِ لطیفہ کے کسی ادارے سے سند یافتہ نہ تھے۔ اِس کے باوجود مصوّری اور خطاطی میں صاحبِ طرز ہوئے۔ مسلسل مشق سے اُنھوں نے لائین، فارم اور رنگ کا ایک انوکھا تال میل پیدا کرلیا تھا، جو عالمی سطح پر اُن کی پہچان بنا۔

حنیف رامے کا لائین ورک اور رنگ الگ سے پہچانے جاتے ہیں۔ نفاست اور طہارت کا ایک انوکھا احساس اُن کے فن پاروں سے پُھوٹ پُھوٹ پڑتا ہے۔

'سویرا'، لاہور اور 'نصرت' لاہور کے ایڈیٹر رہے۔ اُنھوں نے اپنے دورِ ادارت میں مشہور ترقی پسند لٹریری آرگن 'سویرا' کو ادب اور آرٹ کا مُرقع بنا دیا۔ 'نصرت' لاہور میں شائع ہونے والے اُن کے مضامین ڈاکٹر غلام جیلانی برق اور غلام احمد پرویز کی اجتہادی فکر کی Extention تھے۔

اُنھوں نے بہ طور پبلشر 'البیان' لاہور جیسا شاندار اشاعتی ادارہ قائم کیا، جس سے چُنیدہ کتب ہی شائع ہوئیں۔ اُن کا انگلش میں تحریر کردہ ناول : "Again"، Xlibris Corporation, USA نے 2000ء میں شائع کیا۔

حنیف رامے، پاکستان پیپلز پارٹی کے اساسی رُکن تھے۔ پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت میں سینٹ کے رکن، سپیکر قومی اسمبلی، وزیرِ اعلیٰ پنجاب اور کچھ مدت کے لیے قائم مقام وزیرِ اعظم پاکستان رہے۔

2005ء میں رامے صاحب نے میری خاطر 'باغ و بہار' کی تزئین کا کام کیا۔ میں سپاس گزار ہوں۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

مُقدّمہ

معروف محقق رشید حسن خاں، وسط ۱۹۸۷ء تک ''باغ و بہار'' کی تدوین کا کام مکمل کر چکے تھے۔ دسمبر ۱۹۸۷ میں ''نقوش ایوارڈ'' کی تقریب میں شرکت کی غرض سے لاہور آئے۔ اپنی مُرتب کردہ ''باغ و بہار'' محمد طفیل صاحب کے حوالے کرنے سے قبل ''نقوش'' لاہور بابت: دسمبر ۱۹۸۷ء میں شائع شدہ میرا مقالہ ''میر امّن دِلّی والے'' اُن کی نظر سے گزرا تو اُنھوں نے ''باغ و بہار'' کی اشاعت مؤخر کر دی۔ بعد ازآں ''کتاب نما''، دہلی میں جب بہ طورِ نمونہ، اُن کی مرتّب کردہ ''باغ و بہار'' کے چند صفحات شائع ہوئے تو ''کتاب نما'' دہلی بابت: ستمبر ۱۹۹۰ء میں ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے تدوینِ متن، بالخصوص اِملا اور تلفظ کے معاملات سے متعلق اُن کی تحقیق پر اِختلافی نوٹ لِکھا۔ رشید حسن خاں نے فاروقی صاحب کی تو ایک نہ سُنی، البتہ مجھے ردّ کرنے کو ''باغ و بہار'' کے مقدمہ پر نظرِ ثانی کا کام کرتے رہے۔ ردِّ تحقیق کا کام دِقّت طلب تھا اور اُنھیں ''باغ و بہار'' کی اشاعت جَلد منظور تھی، لہٰذا اِنتہائی عُجلت (''نشاطِ کار'') میں اُنھوں نے میرے مقالہ کو ردّ کرنے میں تحقیق کے بنیادی اصُولوں کی دھجیاں بکھیر دیں۔

میں تا دیر منتظر رہا کہ شاید کوئی مُحقق، مُتنازعہ معاملات پر رائے زنی کرے؛ لیکن تا حال ایسا ہُوا نہیں۔ لے دے کر یہ دیکھنے کو ملا کہ طبعِ مُتخلّل کے طور پر ڈاکٹر گیان چند نے اپنی کتاب ''تحقیق کا فن'' مطبوعہ: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبعِ اوّل: ۱۹۹۴ء کے صفحہ ۱۹۳ تا ۱۹۴ میں میر امّن کے اصل نام، بعد ازاِستعفیٰ حیدر آباد، دکن میں ملازمت اور اولاد کے باب میں میرے ایسے قیاسات کو بھی غلط ٹھہرایا، جنھیں داخلی اور خارجی شہادتوں کی مضبوط بنیادیں مُیسّر تھیں۔ لیکن یہ سوچ کر کہ تفصیل میں کون جائے، اُنھوں نے رشید حسن خاں کے لکھے پر صاد کیا اور اِس سہل انگاری نے اُن کی تحقیقی بصیرت کو بھی داؤ پر لگا دیا۔

مجھے ردّ کیے جانے کا افسوس نہیں۔ نہ تحقیق کے معاملات وراثت کے جھگڑے ہیں، جنھیں دیوانی عدالتوں میں نپٹا کر اُٹھنا ضروری ہے۔ یہ تو ایک سعیٔ نامشکور ہے، جس کے ساتھ مُحقق کا معاملہ تا دیر رہتا ہے۔ مجھے پُورا یقین ہے کہ ڈاکٹر گیان چند نے میرا مقالہ نہیں پڑھا اور محض وہی اقتباسات دیکھے، جنھیں رشید حسن خاں نے توڑ مروڑ کر حسبِ ضرورت ردّ کرنے کو چُنا۔ یوں رشید حسن خاں کے نظرِ ثانی شدہ مقدمہ بابت: ۲۸ جولائی ۱۹۹۱ء مشمولہ

''باغ و بہار'' مطبوعہ نقوش، لاہور طبع اوّل ۱۹۹۲ء کی اشاعت اور مجھے رڈ کرنے کے ضمن میں ڈاکٹر گیان چند کی تائیدِ مزید کے بعد یہ ضروری ہوگیا کہ محققین کے سامنے یہ مُقدمہ از سرِ نو رکھا جائے۔ پھر یہ خیال کر کے، کہ اِس کام کے ساتھ کیوں نا ''باغ و بہار'' کا ایک مُستند متن بھی نذرِ قارئین کر دیا جائے؛ میں نے ''باغ و بہار'' کا نُسخہء فیض اللہ، مُرتبہ: فاضِل مَولویان، فورٹ ولیم کالج، کلکتہ (نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن) مطبوعہ: کلکتہ: ایل مینڈیس، کمرشل ایڈورٹائزرز پریس: طبع چہارم: ۱۸۴۳ء (جس پر فورٹ ولیم کالج کی بیضوی مہر ثبت ہے) کو چُنا۔ یہ نُسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (اورینٹل سیکشن) میں کلاس نمبر ش ۔۳۳ ۔۴۳۳ء ۸۹۱۔ بُک نمبر ۶۸۸ الف کے تحت ''ذخیرۂ حافظ محمود شیرانی'' میں موجود ہے اور اُس کی ایک کاپی میرے ذاتی ذخیرۂ کُتب میں محفوظ۔

اب یہ مُقدمہ بطور نالشِ استقرارِ حق، مع ''باغ و بہار، ''نسخۂ فیض اللہ'' (۱۸۴۳ء) پیش خدمت ہے۔

O

میر امّن دِلّی والے: احوال و آثار

میں نے اپنے مقالہ ''میر امّن دِلّی والے'' مطبوعہ ''نقوش'' لاہور بابت: دسمبر ۱۹۸۷ء میں حد درجہ انکسار کے ساتھ عرض کیا تھا کہ: ڈاکٹر جان بارتھوک گلکرسٹ (پ: ۱۷۵۹ء م: ۹ جنوری ۱۸۴۱ء) کی تصنیفی و تالیفی خدمات کے علاوہ ایک اہم کارنامہ گوشۂ گمنامی میں سسکتے ہوئے میر امّن دِلّی والے جیسے نابغہء روزگار ہندوستانی مصنف و مترجم کو منظرِ عام پر لانا ہے۔ جس کا شکریہ نہایت درجہ عاجزی کے ساتھ ''چار درویش'' المعروف ''باغ و بہار'' کے دیباچے میں ادا کر دیا گیا ہے، لیکن یہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ ہی ہیں جنھوں نے فورٹ ولیم کالج کے انتخابی مجموعہ: "HINDEE MANUAL" OR "CASKET OF INDIA" (مطبوعہ: اپریل، ۱۸۰۲ء) اور ''باغ و بہار'' (مطبوعہ: ۱۸۰۴ء) کے اوّلین ایڈیشن کے سرورق پر مُصنف / مُترجم کے اصل نام کی بجائے صرف ''میر امّن'' طبع کروانے کی غلطی کر کے میر امان علی امّن دِلّی والے کے جُملہ احوال و آثار اور آیندہ تصنیفی کارناموں کو یکسر اندھیروں میں دھکیل دیا۔[1] اِس کی نوعیت اجمالاً یُوں ہے:

۱۔ میر امّن کے اصل نام کا معاملہ مدّت مدید تک کھٹائی میں پڑا رہا۔

۲۔ سنہ پیدائش کا تعین مدّت تک دشوار رہا۔

۳۔ میر امّن کی تصنیفی و تالیفی زندگی فورٹ ولیم کالج، کلکتہ تک محدود ہو کر رہ گئی۔

۴ سنہ ۱۸۰۶ء کو اُن کا سالِ وفات تصوّر کر لیا گیا۔

۵ میر امّن کے نامور بیٹے، ریختی گو شاعر میر یار علی جان صاحب کے حوالے سے بھی میر امّن کے حالاتِ زندگی کی پڑتال ممکن نہ ہو سکی، اور یوں میر امّن کے احوال و آثار کو وقت کی دبیز تہ نے کُلی طور پر ڈھانپ دیا۔

میر امّن نے اپنے وقت کے دستور کے مطابق اپنا تخلص ہی برتا اور ''چار درویش'' المعروف ''باغ و بہار'' اور ''گنجِ خوبی'' کے دیباچوں میں اپنا نام ''میر امّن دِلّی والے'' درج کیا۔

i۔ ''پہلے اپنا احوال یہ عاصی گنہگار، میر امّن دلّی والا بیان کرتا ہے''۔ (دیباچہ: ''باغ و بہار'' سے اقتباس)

ii۔ ''خداوندِ نعمت، صاحبِ خلق و مُروّت، جان گلکرسٹ صاحب نے کہ زبان اردو کے قدرداں اور فلک زادوں کے فیض رساں ہیں، اس بعید الوطن میر امّن دلّی والے کو لطف و عنایت سے فرمایا کہ ''اخلاقِ محسنی'' جو فارسی کتاب ہے اس کو اپنی زبان میں ترجمہ کرو''۔ (دیباچہ: ''اخلاقِ محسنی'' سے اقتباس)

جب کہ بہت پہلے میر امّن کے اصل نام کے باب میں مولوی سیّد محمد (مصنف ''ارباب نثر اردو'') اور مولانا حامد حسن قادری (مصنف ''داستانِ تاریخ نثر اردو'') نے میر امّن کا اصل نام میر امان اور تخلص بالترتیب ''لطف'' اور ''امّن'' بتایا تھا، یقیناً ٹھوس ثبوت ہوگا اُن کے پاس۔ یہ دونوں نام ایسے نہیں کہ اُن کے کہے کو آسانی سے جُھٹلایا جا سکے، لیکن پروفیسر ممتاز حسین نے ان دونوں کی اِس تحقیق کو مان کر نہیں دیا (۲) اور نہ دیگر محققین نے نام سے متعلق اس انکشاف کو کوئی اہمیت دی۔

''چار درویش'' المعروف ''باغ و بہار'' اور ''گنجِ خوبی'' (ترجمہ: اخلاقِ محسنی) کے بعد کے کارنامے میر امّن کو ''میر امان علی امّن دِلّی والے'' ثابت کرتے ہیں۔ مُلاحظہ ہو ''ستۂ شمسیہ'' تکمیل: ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۶-۳۷ء مطبوعہ: ۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۴۰ء کے دیباچہ از نواب محمد فخر الدین خاں المخاطب بہ شمس الامراء حیدر آباد، دکن سے اقتباس:

''بندہ نیازمند درگاہ ایزدی کا محمد فخر الدین خاں المخاطب بہ شمس الامراء اس طور پر گزارش رکھتا ہے کہ اکثر اوقات کتابیں چھوٹی بڑی علوم فلاسفہ کی جو زبانِ فرنگ میں مرقوم ہیں، بسبب میلانِ طبیعت کے کہ بہت اس طرف شوق رکھتا تھا، میری سماعت میں آئیں۔ اِس جہت سے چند مسائل و نکے از بر تھے اور اگرچہ بعضے علوم فلاسفہ زبان عرب و عجم میں بھی مشہور ہیں، چنانچہ علم جر ثقیل اور علم انظار وغیرہ مگر اس قدر نہیں ہیں کہ جیسا اب اہلِ فرنگ نے ان کو دلائل اور براہین سے بدرجہ کمال اثبات کیا ہے بلکہ بعضے علوم اہلِ فرنگ میں ایسے رواج پائے ہیں کہ اُن کا نام بھی یہاں کے

لوگوں نے نہیں سُنا۔ چنانچہ علم آب اور ہوا برقک اور مقناطیس اور کیمسٹری وغیرہ۔ اِس واسطے مدت سے ارادہ تھا کہ مُبتدیوں کے فائدے کے لیے کوئی کتاب مختصر جامع چند علوم کی زبان فرنگ سے ایسی ترجمہ کی جاوے کہ فرصتِ قلیل میں اس کی معلومات سے طالبوں کو کچھ کچھ فائدہ میسر ہوئے...... چنانچہ ان دنوں میں حسب مُدعا چند رسالے مختصر علوم فلاسفہ کے بطریق سوال و جواب کے لکھے ہوئے ریوری رنٹ چالس صاحب کے انگریزی زبان میں جو ۱۸۱۸ء میں بیچ شہر لنڈن کے چھاپے گئے تھے، بہم پہنچے۔ ان میں سے رسالہ علم جرثقیل، علم ہیئت اور علم آب اور علم ہوا اور علم انظار کہ اس کے آخر میں مقناطیس کا رسالہ بھی شریک تھا اور علم برقک کا کہ ہر ایک ان میں سے بدرجہء اوسط نہ بہت کم نہ بہت زیادہ لکھا ہُوا تھا اور ہر چند ترجمہ ان علوم کا ایک زبان میں قلمروِ اہل فرنگ میں رواج پایا ہے مگر نظر کرتے فائدے ساکنانِ بلدہ فرخندہ بنیاد حیدر آباد کے...... میں میر امان علی دہلوی اور غلام محی الدین حیدر آبادی اور مسٹر جونس اور موسیٰ تندوسی کو، جو ملازمانِ سرکار ہیں۔ حکم کرنے میں آیا کہ اِن علوم مذکور کو زبان انگریزی سے اردو زبان میں ہمارے روبرو ترجمہ کریں۔ چنانچہ بفضلِ حق سبحانہ تعالیٰ کے یہ چھ رسالے ترجمہ ہوئے مگر بعضے اسماء انگریزی اصطلاح کے جو زبان عربی اور فارسی میں نہ میسر ہوئے، اُن کو اس زبانِ اصلی پر بحال رکھنے میں آیا اور یہ چھ رسالے جو ترجمہ کئے گئے چھ علم پر مشتمل ہیں۔ اِس واسطے نام اُن کا ''ستۂ شمسیہ'' رکھا گیا۔ مناسب جان کے علم مقناطیس کو علمِ انظار کی جلد سے علٰحدہ کر کے آخر میں جلد برقک کے شریک کیا گیا اور مادۂ تاریخ اس رسالے کا گزرانا ہوا حافظ مولوی شمس الدین فیض کا یہ ہے۔ تالیف نواب شمس الامراءؒ ۱۲۵۳ھ (بہ مطابق ۳۷۔۱۸۳۶ء)

۱۔ یُوں وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مولوی سید محمد اور مولانا حامد حسن قادری نے میر امّن کے اصل نام کے تعین کے سلسلے میں شمس الامراء حیدر آباد دکن کے دارالترجمہ سے مُنسلک اسی میر امان علی دہلوی کے کام کو دیکھنے اور پرکھنے کے بعد میر امّن کا نام میر امان علی لکھا ہوگا۔ نیز ان کے پاس تحریری سطح پر کافی داخلی شہادتیں ہوں گی، اسی لیے وثوق اور قطعیت کے ساتھ اُنھوں نے میر امّن کا اصل نام میر امان علی لکھا اور کسی قسم کے حوالے کی ضرورت کو محسوس نہ کیا۔

۲۔ زمانی اعتبار سے بھی میر امان علی، میر امّن ہی ہو سکتے ہیں، نیز امّن مکمل نام نہیں، تخلص معلوم ہوتا ہے اور یہ تخلص میر امان علی کا ہی موزوں تر ہے۔

۳۔ میر امّن، فورٹ ولیم کالج میں مُنشی تھے اور یہاں انگریزی سے اردو ترجمہ پر نظرِ ثانی کا کام کیا۔

۴۔ نواب فخر الدین خاں کے مُقدمہ میں میر امان علی دہلوی کا نام ''بیاضِ متین'' کے مُرتب، مشہور شاعر اور ماہر

لسانیات غلام محی الدین متین حیدرآبادی، انگریز عالم مسٹر جونس اور فرانسیسی زبان کے ماہر لسانیات موسیو تنڈرس سے پہلے لیا گیا ہے۔ قیاس غالب ہے کہ حیدرآباد دکن کے ان تین بہت بڑے مترجمین سے پہلے میر امان علی دہلوی کا نام رکھنے میں ان کی فورٹ ولیم کالج والی شہرت کو دخل رہا ہوگا۔

اس ضمن میں دیگر حوالے موقع محل کی مناسبت کے ساتھ آ گے آئیں گے۔ مثال کے طور پر یہ سوال خاصا اہم ہے کہ ۴۔ جون ۱۸۰۶ء میں فورٹ ولیم کالج کونسل نے شعبہ ہندوستانی کے ڈورین (DORIAN) یعنی سیکنڈ منشی میر امّن کو ان کی اپنی خواہش کے مطابق چار ماہ کی تنخواہ مبلغ ۳۲۰ روپے مع جون ۱۸۰۶ء کی پوری تنخواہ ادا کر کے کالج سے الگ کر دیا تھا[۳] تو میر امّن گئے کہاں؟ اور دوسری اہم بات یہ کہ میر امّن کو اُن کی خواہش کے مطابق کالج سے الگ کیا گیا۔ علاحدگی کا سبب بڑھاپا یا ان کی طویل علالت نہیں۔ گمان غالب ہے کہ میر امّن نے کالج کے بگڑتے ہوئے حالات کے پیش نظر بروقت حیدرآباد دکن کا رُخ کیا ہو، جہاں شمس الأمراء نے دارالترجمہ قائم کرنا تھا۔ کیا یہ شہادتیں ناکافی ہیں کہ میر امّن دلی والے کا پورا نام ''میر امان علی امن دلی والا'' تھا؟

میر امّن کے لطفؔ تخلص سے متعلق ڈاکٹر وحید قریشی کی تحقیق پر اضافہ ممکن نہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی: ''باغ و بہار ایک تجزیہ''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور (۱۹۶۸ء) میں لکھتے ہیں:

''وہ معمولی شُدبُد کے شاعر تھے۔ اُنھیں خود بھی اپنی اس شاعرانہ حیثیت کا احساس ہے۔ ''گنج خوبی'' کے دیباچے میں اپنی شاعری کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

نہ شاعر ہوں میں اور نہ شاعر کا بھائی
فقط میں نے کی اپنی طبع آزمائی

جس شخص کی شاعرانہ استعداد کا یہ عالم ہو، اُس کا تذکروں میں ذکر معلوم۔ بعض مُتاخر کتب میں ان کے دو تخلص بیان کیے گیے ہیں، امّنؔ اور لطفؔ۔ لُطف تخلص کا اِستدلال ''باغ و بہار'' کے اس شعر سے کیا گیا ہے:

تُو کونین میں لُطف پر لُطف رکھ
خدایا بہ حق رسولِ کبار

لیکن شعر میں کوئی قرینہ نہیں کہ میر امّن کا تخلص ''لطفؔ'' قرار دیا جائے۔ مرزا علی لطفؔ، مئولف ''تذکرۂ گلشن ہند'' شاعر تھے اور لطفؔ تخلص کرتے تھے۔ گارسیں دتاسی نے اُن کے صاحبِ دیوان ہونے کا ذکر بھی کیا ہے۔ اگرچہ فورٹ ولیم کالج کے باقاعدہ ملازم تو نہ تھے لیکن اُن کے تفصیلی کام کی اشاعت فورٹ ولیم کالج ہی سے ہوئی۔ یہ

کلکتے ہی میں مقیم تھے۔ میر امّن نے ''گنج خوبی'' کے دیباچے میں ان کے دو شعر دیے ہیں :

''مرہٹے جب عالمگیر بادشاہ کے بعد عالمگیر ہوکر ہندوستان میں چھائے۔ حضور (انگریز) کی فوج ظفر موج کے سامنے مرہٹے اور کانی سے پھٹ کر تتری بتری ہو گئے...... اور عین مقابلے کے وقت کا یہ قطعہ لطف کا ہے :

پلٹن اور توپیں جب سنمکھ ہوئیں
مرہٹے مصیبت (کذا) کے مارے مڑ گئے
فیر سنتے ہی ففرو ہو چلے
چھوٹی جب بندوق کوّے اُڑ گئے

قیاس یہ ہے کہ امّن نے باغ و بہار میں بھی اُسی ''لُطف'' کا شعر دیا ہے اور لُطف، میر امّن کا اپنا تخلص نہیں تھا۔'' (4)

''باغ و بہار'' کے خاتمہ کتاب میں مرزا علی لطفؔ کے بارہ اشعار شامل ہیں۔ اِن غزلیہ اشعار کا مطلع ''باغ و بہار'' کے سالِ تصنیف سے متعلق ہے۔ اشعار مُلاحظہ ہوں :

مُرتّب ہُوا جب یہ باغ و بہار
تھے سنہ بارہ سو سترہ در شُمار
کرو سَیراب اِس کی تم رات دن
کہ ہے نام و تاریخ باغ و بہار
خزاں کا نہیں اِس میں آسیب کچھ
ہمیشہ ترو تازہ ہے یہ بہار
مرے خُون دل سے یہ سیراب ہے
اور لختِ جگر کے ہیں سب برگ و بار
مُجھے بھول جاویں گے سب بعدِ مرگ
رہے گا مگر یہ سخن یادگار
اِسے جو پڑھے یاد مُجھ کو کرے
یہی قاریوں سے مرا ہے قرار
خطا گر کہیں ہو تو رکھیو مُعاف

کہ پھولوں میں پوشیدہ رہتا ہے خار
ہے انساں مُرکّب زسہو و خطا
یہ چُوکے گا ہر چند ہو ہوشیار
میں اِس کے سوا چاہتا کچھ نہیں
یہی ہے دُعا میری اے رکردگار
تری یاد میں ، مَیں رہوں دم بہ دم
کٹے اِس طرح میرا لیل و نہار
نہ پُرسش کی سختی ہو مجھ پہ کبھو
نہ شب گور کی اور نہ روزِ شُمار
تُو کونین میں لُطفؔ پہ لُطف رکھ
خُدایا بہ حقِ رسولِ کبار

اِن اشعار میں مرزا علی لطفؔ نے میر امّن کے جذبات کی عکاسی کی ہے اور یہ طریقہ اُس دور میں مُروّج تھا۔ مثلاً شمس الامراحیدرآباد دکن کی بیشتر کتب کا مادۂ تاریخ حافظ مولوی میر شمس الدّین محمد فیضؔ کا نکالا ہُوا ہے جبکہ کچھ کتب میں اس طرف اشارہ کر دیا گیا ہے اور کچھ میں نہیں۔

''باغ و بہار'' کے خاتمہ کتاب میں مرزا علی لُطفؔ کے اشعار کی شمولیت کا ایک سبب یہ بھی رہا ہوگا کہ لُطفؔ، ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے بہت قریب تھے اور گلکرسٹ کی ہی فرمائش پر اُنھوں نے علی ابراہیم خاں کے تذکرہ شعرائے ہند ''گلزارِ ابراہیم'' (سال تصنیف ۱۱۹۸ھ مطابق ۱۷۸۴ء) کا فارسی سے اردو ترجمہ کیا اور تذکرہ ''گلشن ہند'' نام رکھا۔ لُطفؔ نے یہ ترجمہ ۱۸۰۱ء میں مکمل کیا تھا۔ (۵) یاد رہے کہ ۱۸۰۱ء ہی میں ''باغ و بہار'' کا اوّلین مسودہ تیار ہُوا۔ مرزا علی لُطفؔ ''تذکرہ گلشنِ ہند'' کے دیباچے میں رقم طراز ہیں :

''_____ علی ابراہیم خاں مرحوم نے ایک تذکرہ شعرائے ہند کا عبارتِ فارسی میں لکھا اور نام گلزارِ ابراہیم رکھا ہے۔ ۱۱۹۸ ہجری اور ۱۷۸۴ عیسوی میں وہ تذکرہ تمام ہُوا۔ مشہور یوں ہے کہ بارہ برس میں سرانجام ہوا، رفتہ رفتہ جب سر حلقۂ بزمِ نکتہ دانی رونق افزائے محفلِ معانی، سُخن کی جان اور سُخن دانوں کے قدر دان، صاحب والا مناقب مسٹر گلکرسٹ صاحب کی نظرِ مبارک سے گزرا از بسکہ شاعروں کا احوال اُس میں مُجمل لکھا تھا، ایک مُدّت سے صاحب عالی حوصلہ کو خیال اس بات کا تھا کہ اگر بیان اس کا مفصّل زبان ریختہ میں کیا جائے تو خُوب ہو اور ہر

ایک شاعر کی پوری پوری غزل اپنا جلوہ دکھائے تو نہایت طبع کو مرغوب ہو ـــــ"۔(۶)

میر امّن نے فورٹ ولیم کالج، کلکتہ میں مُلازمت اختیار کرنے تک کے مختصر حالاتِ زندگی "باغ و بہار" اور "گنجِ خوبی" کے دیباچہ جات میں بیان کیے ہیں۔

میر امّن کی سنہ پیدائش سے متعلق پبلک پروسیڈنگز کا ہوم ڈپارٹمنٹ مسلیننس امپیریل ریکارڈ ایسٹ انڈیا کمپنی بابت فورٹ ولیم کالج کلکتہ، نیشنل آرکائیوز (نئی دہلی) کچھ رہنمائی نہیں کرتا(۷) لیکن اگر میر امّن کو میر امان علی دہلوی ملازم سرکار شمس الامراء حیدرآباد دکن مان لیا جاتا ہے تو میر امّن کی طبعی عُمر سے متعلق بہت سے اُلجھیڑے رفع ہو جاتے ہیں۔ "ستۂ شمسیہ" کا دیباچہ (۱۲۵۳ھ/۳۷۔۱۸۳۶ء) میر امّن کو تادیر حیات ثابت کرتا ہے۔

یاد رہے کہ "باغ و بہار" (نومبر ۱۹۵۸ء) مُرتب کرتے ہوئے پروفیسر ممتاز حسین اور ان کی تقلید میں ڈاکٹر ممتاز منگلوری نے لکھا تھا کہ میر امّن کی پیدائش بعہد محمد شاہ (وفات: ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ء) میں ہوئی اور ۱۸۰۶ء میں وفات پا گئے۔ اِس قیاس کی بنیاد "آبِ حیات" از محمد حسین آزاد اور میر امّن کی خود نوشت مختصر حالاتِ زندگی (دیباچہ جات: "باغ و بہار" و "گنجِ خوبی") ہے۔

محمد حسین آزاد کا بیان مُستند تحقیق سے متعلق اپنی وقعت کھو چکا۔ اب آیئے "باغ و بہار" اور "گنجِ خوبی" کے دیباچہ جات کی طرف۔ بقول میر امّن، اُن کا خاندان نصیر الدین ہمایوں کے عہد سے لے کر شاہ عالم ثانی کے عہدِ حکومت تک منصب دار قدیمی اور خانہ زادِ مُوروثی میں شمار کیا جاتا تھا اور ان کے خاندان کا یہ لقب مُغل شاہی دفتر میں درج تھا۔ اس خاندانی افتخار کے اظہار کے بعد میر امّن لکھتے ہیں :

"جب ایسے گھر کی کہ سارے گھر اُس گھر کے سبب آباد تھے، یہ نوبت پہنچی کہ ظاہر ہے عیاں راچہ بیاں۔"

(مغلیہ حکومت کے بے اختیار ہو جانے، شہنشاہِ ہند عالمگیر ثانی کے قتل (۱۷۵۹ء) اور سورج مل جاٹ کے ۱۷۵۳ء میں دہلی پر حملے(۸) کی طرف اشارہ۔)

"تب سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کیا۔"

(سورج مل جاٹ (وفات: ۲۵ دسمبر ۱۷۶۳ء) کا دہلی پر دوسرا کامیاب حملہ ۱۷۶۱ء اور میر امّن کی خاندانی

جاگیر کی ضبطی کی طرف واضح اشارہ (۹)۔ بقول میر محمد تقی میرؔ ''سورج مل جاٹ نے ۱۲جون ۱۷۶۱ء میں اکبرآباد پر قبضہ کیا لیکن اس سے کچھ دن پہلے اس کا اکبرآباد کے اکثر محلات پر قبضہ مکمل ہو چکا تھا۔'' یقیناً سورج مل جاٹ نے جاگیروں کی ضبطی کا کام اس کے بعد ہی کیا ہوگا۔ اِس کی گواہی خود میر امّن کے بیان سے ملتی ہے۔)

''اور احمد شاہ دُرّانی نے گھر بار تاراج کیا۔''

(''ذکرِ میر'' میں بھی احمد شاہ کو ''ابدالی'' نہیں ''دُرّانی'' لکھا گیا ہے۔ یہاں ابدالی کے دہلی پر پہلے کامیاب حملے (۱۷۵۷ء) کی طرف اشارہ ہے۔) میر امّن دیباچے کے آخر میں رقم طراز ہیں :

''جب احمد شاہ ابدالی کابل سے آیا اور شہر کو لُٹوایا، شاہ عالم پُورب کی طرف تھے (شاہ عالم ۱۴۔مئی ۱۷۵۸ء میں دِلّی چھوڑ کر پُورب کی طرف نکل گئے تھے) کوئی وارث اور مالک ملک کا نہ تھا، شہر بے سِر ہو گیا۔ سچ ہے بادشاہت کے اقبال سے شہر کی رونق تھی ایک بارگی تباہی پڑی۔''

(عالم گیر ثانی کے قتل (۱۷۵۹ء) کے بعد شاہ جہاں ثانی ۳۰۔نومبر ۱۷۵۹ء تا ۱۰۔اکتوبر ۱۷۶۰ء تک حکمران رہا، لیکن اس کے بعد شاہ عالم ثانی کی ۱۷۷۲ء میں دِلّی واپسی تک تخت تقریباً بارہ برس تک خالی رہا) اس دوران میں بقول میر امّن: ''رئیس وہاں کے ؛ میں کہیں، تم کہیں ہو کر جہاں جس کے سینگ سمائے وہاں نکل گئے۔''

(اس ضمن میں ڈاکٹر وحید قریشی کا تجزیہ درست معلوم ہوتا ہے کہ میر امّن نے دِلّی کے اُمراء و رؤساء کے ترکِ وطن کرنے کی بات کی ہے۔ اسے میر امّن کی جلاوطنی خیال نہیں کرنا چاہیے۔ میر امّن کی تحریر سے داخلی شہادت کو دیکھتے ہوئے ان کی جلاوطنی کا زمانہ جاگیر کی ضبطی کے بعد کا بنتا ہے۔)

''ایسی ایسی تباہی کھا کر''

(لفظ ''ایسی'' کے دو بار استعمال کے حوالے سے ابدالی کے پہلے (۱۷۵۷ء) اور دوسرے حملے (۱۷۶۰ء) کی طرف اشارہ۔)

''وے شہر سے کہ وطن اور جَنم بُھوم میرا ہے اور آنول نال وہیں گڑا ہے، جلاوطن ہُوا اور ایسا جہاز کہ جس کا ناخدا بادشاہ تھا، غارت ہُوا۔''

(میں نے لکھا تھا: یہاں ''جہاز غارت'' ہونے سے مراد میر امّن کے گھرانے کی بربادی ہے، جو ''منصب دار قدیمی'' اور ''خانہ زاد موروثی'' شمار کیا جاتا تھا۔ میر امّن نے سورج مل جاٹ کے دوسرے حملے (۱۷۶۱ء) اور جاگیر کی ضبطی کا ذکر پہلے کیا اور ابدالی کے دہلی پر پہلے (۱۷۵۷ء) اور دوسرے حملے (۱۷۶۱ء) کا ذکر بعد میں کیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ میر امّن کی دہلی سے جلاوطنی سورج مل جاٹ کے دہلی پر کامیاب حملے (۱۷۶۱ء) کے بعد ہوئی۔ فرض کیا سُورج

مل جاٹ (وفات ۲۵ دسمبر ۱۷۶۳ء) کے بیٹے جواہر سنگھ نے دہلی پر قبضے (۶۵۔۱۷۶۴ء) کے بعد دہلی کے جاگیرداروں کو ان کی جاگیروں سے محروم کیا تو وہی زمانہ میر امّن کی دہلی سے جلاوطنی کا بنتا ہے۔ اب اگر میر امّن ۱۷۶۳ء میں بھی جلاوطن ہوئے تو قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت ان کی عمر تیرہ، چودہ برس رہی ہوگی۔ یُوں ۱۷۵۰ء کے لگ بھگ میر امّن پیدا ہوئے ہوں گے۔)

''میں بے کسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔''

(میں نے لکھا تھا کہ لفظ ''بے کسی'' اور گھرانے کے غارت ہونے کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ میر امّن کم عمری میں دہلی سے جلاوطن ہوئے، یعنی ۱۷۶۳ء میں تیرہ، چودہ برس کی عمر میں دہلی کو چھوڑا تو یہ داخلی شہادت ہمارے اس بیان کو بھی تقویت بخشتی ہے کہ میر امّن ''سنۂ شمسیہ'' (تکمیل: ۳۷۔۱۸۳۶ء) کے دیباچے کے مطابق ۳۷۔۱۸۳۶ء تک حیات تھے اور چھیاسی ستاسی برس عمر پانا حیرت کا باعث نہیں ہونا چاہیے۔)

''ڈوبتے کو تنکے کا آسرا بہت ہے۔ کتنے برس بلدۂ عظیم آباد میں دَم لیا۔ کچھ بنی کچھ بگڑی، آخر وہاں سے پاؤں اکھڑے، روزگار نے موافقت نہ کی۔ عیال واطفال کو چھوڑ کر تنِ تنہا کشتی پر سوار ہو، اشرف البلاد کلکتے میں آب ودانے کے زور سے آ پہنچا۔''

میں نے لکھا تھا: (ڈوبتے کو تنکے کا آسرا، کے محاورے اور صیغہ واحد متکلم پر غور کریں تو صاف پتا چلتا ہے کہ میر امّن کم عمری میں دہلی سے تنہا نکل بھاگے، عظیم آباد میں جوان ہوئے، شادی کی (جسے تنکے کا آسرا قرار دیتے ہیں) ورنہ دہلی سے نکلنے کے بیان میں عیال واطفال کا ذکر ضرور کرتے۔ یہ داخلی شہادت بھی ہمارے اُس بیان کو تقویت بخشتی ہے، جس میں ہم نے میر امّن کو ۳۷۔۱۸۳۶ء تک حیات ثابت کیا ہے۔)

''چندے بے کاری میں گُزری۔ اِتفاقاً نواب دلاور جنگ نے بُلوا کر اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کی اتالیقی کے واسطے مُقرر کیا۔ قریب دو سال کے وہاں رہنا ہوا، لیکن نباہ اپنا نہ دیکھا۔''

(وسط ۱۷۹۸ء تا ۴ مئی ۱۸۰۱ء کا زمانہ مراد ہے، اور اگر ''چندے بے کاری میں گزری'' کا خیال کریں تو قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ۱۷۹۸ء کی ابتداء میں کلکتے آئے۔)

''تب مُنشی میر بہادر علی جی کے وسیلے سے، حضور تک جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہٗ کے رسائی ہُوئی۔ بارے طالع کی مدد سے ایسے جواں مرد کا دامن ہاتھ لگا ہے، چاہیئے کہ دِن کچھ بھلے آویں، نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر، پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہوں اور گھر میں دس آدمی، چھوٹے بڑے پرورش پا کر دُعا اُس قدردان کو کرتے ہیں۔ خُدا قبول کرے۔'' (۲۴ نومبر ۱۸۰۰ء میں ''سرٹیفکیٹ مُنشی'' ہو جانے کا اشارہ)

پروفیسر ممتاز حسین نے درج بالا پیراگراف میں سے ''ایسے جواں مرد کا دامن ہاتھ لگا'' اور ''گھر میں دس آدمی، چھوٹے بڑے'' والے بیانات کو خاتمہ کتاب کے درج ذیل اشعار کے ساتھ مِلا کر پڑھا :

یہی ہے دعا میری اے کردگار — میں اِس کے سِوا چاہتا نہیں کچھ

کٹے اِس طرح میرا لیل و نہار — تری یاد میں میں رہوں دَم بدم

نہ شب گور کی اور نہ روزِ شُمار — نہ پُرسش کی سختی ہو مجھ پر کبھی

تُو کونین میں لُطف پر لُطف رکھ

خدایا ! بحق رسولِ کبار

بحوالہ: دیباچہ ''گنجِ خوبی''، میر امّن کا کثیر العیال ہونا نیز بحوالہ دیباچہ: ''باغ و بہار''، ''گھر میں دس چھوٹے بڑے آدمیوں کی پرورش پانے'' والے بیانات کو اِن اشعار کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے پروفیسر ممتاز حسین صاحب نے میر امّن کو گور میں پاؤں ڈالے بڈھا کھوسٹ ثابت کر دیا(۱۰)۔ جب کہ حقیقت اِس کے بالکل برعکس ہے۔

۱۔ میر امّن نے ڈاکٹر گلکرسٹ (پ:۱۷۵۹ء۔م:۱۸۴۱ء) کو ''جَواں مرد'' اُس کے کم سِن ہونے کے حوالے سے نہیں، بلکہ باہمت ہونے کے حوالے سے کہا ہے۔

۲۔ گھر میں دس چھوٹے بڑے آدمیوں کا یہ مطلب قطعاً نہیں لیا جاسکتا کہ میر امّن محض کثیر العیال تھے، اِس لیے یقیناً بہت بوڑھے رہے ہوں گے۔ ''بڑے'' سے مُراد میر امّن کے والدین بھی ہو سکتے ہیں اور اگر میر امّن اور اُن کی بیگم کو بھی ''بڑوں'' میں شمار کریں تو بھی بچوں کی تعداد چھے بنتی ہے۔

عظیم آباد کے قیام کے دوران لُٹی ہوئی دلّی سے گھر کے بقیہ افراد کا مِلنا بعید از قیاس نہیں۔ یُوں چھوٹے چھے افراد میں میر امّن کے بھائی بہن بھی شمار ہو گیے۔ ۱۸۰۲ء (''باغ و بہار'' کے دیباچے کی سنہ تصنیف) تک میر امّن کی عمر باون برس کے لگ بھگ رہی ہوگی، اِس لیے والدین کا حیات ہونا بھی بعید از قیاس نہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ پروفیسر ممتاز حسین صاحب نے اِن اشعار کو میر امّن کی شاعری قیاس کیا، جو درست نہیں۔ یہ اشعار مرزا علی لطف مؤلف ''تذکرہ گلشن ہند'' کے ہیں۔

اِس اقتباس کا سب سے اہم ٹکڑا درج ذیل ہے :

''ایک ٹکڑا اُٹھا کر، پانوں پھیلا کر سو رہتا ہوں اور گھر میں دس آدمی، چھوٹے بڑے، پرورش پا کر دعا اس قدردان کو کرتے ہیں۔''

چارلس ڈوئیلے اور کپتان ٹامس ولیمز کی کتاب "دی یورپیین ان انڈیا" (مطبوعہ ۱۸۱۳ء لندن) میں فورٹ ولیم کالج کے مُنشیوں کے شب و روز کا بیان اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ میر امّن فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے ہوسٹل میں مقیم تھے، جہاں اہل خانہ کو ساتھ رکھنا ممکن نہ تھا۔ اسی طرح کلکتے کے بیان میں "چندے بے روزگاری میں گزری" اور محمد کاظم خاں کی اتالیقی کے باب میں "نباہ اپنا نہ دیکھا" کی بے یقینی کی صورتِ احوال یہ ثابت کرتی ہے کہ میر امّن کے بقیہ گھر والے عظیم آباد یا کسی اور علاقے میں مقیم ہوں گے۔ بہت ممکن ہے لکھنؤ یا لکھنؤ کے مغرب میں ستر اسّی میل کے فاصلے پر واقعہ فرخ آباد صدر مقام فتح گڑھ میں۔ ۱۸۵۶ء سے قبل فرخ آباد، ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیرِ اثر علاقے میں شامل نہیں تھا۔

"باغ و بہار" کے دیباچہ کے سرسری مطالعہ سے ہی میر امّن کا شیعہ ہونا ثابت ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو :

> "جسم پاک مصطفیٰ، اللہ کا ایک نور ہے۔ اس لیے پر چھائیں اُس قد کی نہ تھی، مشہور ہے۔
> حوصلہ میرا کہاں اِتنا جو نعت اس کی کہوں، پر سخن گویوں کا یہ بھی قاعدہ دستور ہے اور اس کی آل پر صلوٰۃ و سلام، جو ہیں بارہ امام، حمد حق اور نعت احمد کو بیان کر انصرام اب میں آغاز اس کو کرتا ہوں، جو ہے منظور کام یا اُنھی واسطے اپنے نبی کی آل کے کہ یہ مکرّر گُفت گو بقول طبع خاص و عام۔" ("باغ و بہار")

۱۷۔ اگست ۱۸۰۰ء کے سرکاری اشتہار بابت فورٹ ولیم کالج کے مطابق مندرجہ ذیل اشخاص درج ذیل مختلف عہدوں پر مقرر کیے گیے۔

(۱)	ریورنڈ ڈیوڈ براؤن (۱۱)	پرووسٹ
(۲)	ریورنڈ کلاڈیس بکھانن	وائس پرووسٹ (۱۲)
		(یہ قدیم یونانی، لاطینی اور انگریزی کلاسیکی ادب کے پروفیسر تھے۔)
(۳)	لیفٹیننٹ جان بیلی	پروفیسر عربی زبان و شرح محمدیؐ
(۴)	لیفٹیننٹ کرنل ولیم کرک پیٹرک	پروفیسر فارسی زبان و ادب
(۵)	فرانسس گلیڈون	پروفیسر فارسی زبان و ادب
(۶)	این۔ بی۔ ایڈ مانسٹن	پروفیسر فارسی زبان و ادب
(۷)	ڈاکٹر جان بارتھوک گلکرسٹ	پروفیسر ہندوستانی/اردو زبان و ادب
(۸)	جان ہیری بارلو	پروفیسر گورنر جنرل کے پاس کیے ہوئے قاعدے قوانین کے مترجم و مُرتب۔

کالج کے انتظامات اور قواعد وضوابط کی تشکیل کے لیے ۱۳۔ستمبر ۱۸۰۰ء کے اشتہار میں کالج کونسل کے مندرجہ ذیل ممبران کے نام شائع کیے گئے :

(۱) ریورنڈ ڈیوڈ براؤن (پرووسٹ)

(۲) ریورنڈ کلاڈیس بکھانن (وائس پرووسٹ)

(۳) پروفیسر جان ہیری بارلو

(۴) پروفیسر این۔بی۔ایڈ مانسٹن

(۵) پروفیسر لیفٹینٹ کرنل ولیم کرک پیٹرک

(۶) روتھ مین (سیکرٹری کالج کونسل)

فورٹ ولیم کالج کے دیگر اساتذہ کے نام درج ذیل ہیں :

(۷)	پادری ولیم کیری	بنگلہ اور سنسکرت زبان وادب
(۸)	جیمز ڈونڈی ایل۔ایل۔ڈی	علم الحساب
(۹)	ڈوپلے سی	جدید زبانیں
(۱۰)	لمسڈن	اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ فارسی
(۱۱)	روتھ مین	شعبہ انتظامیہ / کالج کونسل کے سیکرٹری
(۱۲)	ہارنگٹن	علمِ قانون اور آئین

ایشیاٹک اینول رجسٹر ۱۸۰۱ لندن (۱۸۰۲ء) صفحہ ۳۱۔۳۲ کے مطابق ۲۹۔اپریل ۱۸۰۱ء تک فورٹ ولیم کالج کا انتظامی اور تدریسی عملہ مندرجہ بالا ناموں تک محدود تھا۔ ۲۹۔اپریل ۱۸۰۱ء کی میٹنگ میں کالج کونسل نے فارسی، عربی، ہندوستانی / اردو اور بنگلہ شعبوں میں ایک ایک چیف مُنشی، ایک ایک سیکنڈ منشی اور طلباء کی تعداد کو مدِنظر رکھتے ہوئے ضرورت کے مطابق منشی بھرتی کرنے کا فیصلہ کیا، لیکن چیف منشی اور سیکنڈ منشی سمیت ان کی تعداد پچاس سے زیادہ نہ ہو۔ [۱۳] یوں شعبہ فارسی، ہندوستانی / اردو، بنگلہ اور عربی کے لیے ایک ایک چیف منشی اور ایک ایک سیکنڈ منشی بھری کرنے کا فیصلہ ہوا۔ منشیوں کی تعداد شعبہ فارسی میں ۲۰، ہندوستانی / اردو میں ۱۲، بنگلہ میں ۶ اور عربی میں ۴ تجویز کی گئی۔ چیف مُنشی دو سو روپے ماہوار، سیکنڈ منشی سو روپے ماہوار اور منشی چالیس روپے ماہوار پر بھرتی کیے جاتے تھے۔

۴۔ مئی ۱۸۰۱ء کی میٹنگ میں ہندوستانی/اردو زبان و ادب کے مندرجہ ذیل اساتذہ کا تقرر عمل میں آیا اور چیف منشی کا عہدہ خالی رکھا گیا :

میر بہادر علی حسینی نارنولی (سیکنڈ منشی) تاری چرن متر (سیکنڈ منشی) مرتضیٰ خاں (منشی) غلام اکبر (منشی) نصر اللہ (منشی) میر امّن (منشی) غلام اشرف (منشی) ہلال الدین (منشی) محمد صادق (منشی) رحمت اللہ خاں (منشی) غلام غوث (منشی) کندن لال (منشی) کاشی راج (منشی) میر حیدر بخش حیدری (منشی)۔ سات جولائی ۱۸۰۱ء کو قطب علی، بطور فارسی کاتب اور پنڈت سُندر ناگری رسم الخط کے کاتب مقرر کیے گئے۔ اِس شعبے کے سربراہ ڈاکٹر جان بارتھوک گلکرسٹ کا تقرر بطور پروفیسر ۱۷۔ اگست ۱۸۰۰ء میں ہوا تھا۔[۱۴] ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے پرائیویٹ ''سرٹیفکیٹ منشی'' رہنے کے بعد میر امّن کا تقرر (جیسا کہ ان کے اپنے بیان دیباچہ ''باغ و بہار'' سے معلوم ہے) میر بہادر علی حسینی نارنولی کے توسط سے ۴۔ مئی ۱۸۰۱ء کو بطور منشی بہ مشاہرہ ۴۰ روپے ماہانہ عمل میں آیا۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ملازمت پر باقاعدہ حاضری کے لیے کچھ وقت ضرور دیا گیا ہوگا۔

اتوار کا دن یومِ تعطیل تھا۔ صرف اتوار کو چھوڑ کر چیف اور سیکنڈ منشیوں کو چھٹیوں میں بھی صبح ۱۰ بجے سے ایک بجے تک کالج میں حاضر رہنا پڑتا تھا، تاکہ طلبہ جب چاہیں اُن سے مدد لے سکیں۔ اُن کی چھٹی صرف پرووسٹ منظور کر سکتا تھا۔ چیف مُنشی کی عدم موجودگی میں تمام منشی اور کاتب سیکنڈ منشیوں کے ماتحت تھے۔

مُنشیوں سے متعلق چارلس ڈوئیلے اور کیپٹن ٹامس ولیمز لکھتے ہیں :

''مُنشی صرف مسلمان ہی ہوتے ہیں، یہ بات درست نہیں۔ ہندو منشی بھی ہوتے ہیں، لیکن بہت کم۔ ان کا کام نہ تو مستقل ہے اور نہ ہی کسی فرقے یا اس کی کسی ذات تک ہی محدود ہے۔ منشی لوگ اس بات کے لیے کوشاں رہتے ہیں کہ اُن کے لڑکے پڑھانے کے قابل بن جائیں، لیکن اس میدان میں انہیں بہت سے ایسے دولت مند اشخاص سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے جو اپنے لڑکوں کو اچھی تعلیمی سہولیات فراہم کر سکتے ہیں۔ اس میں خرچ یقیناً زیادہ اُٹھتا ہے لیکن انہیں محنت بہت کم کرنی پڑتی ہے۔

مُنشیوں کا علم عام طور پر محدود ہوتا ہے۔ قرآن کے لمبے لمبے اقتباسات سُنانے اور فارسی کی وہ چند کتابیں جو بھارت میں ملتی ہیں، اُن کا معمولی علم اُن کے حصّے میں آیا ہے۔ زیادہ تر بڑے آدمیوں کی زندگیوں سے متعلق یا حافظ کی غزلوں سے شناسائی کے علاوہ خوشخط ہونا، علاقائی جھگڑوں سے واقفیت اور قلمی مخطوطات کا علم، جن کا متن انگریزی کی نہ پڑھی جا سکنے والی کتب کی طرح مشکل ہوتا ہے، اور اِس علم کو دوسروں تک منتقل کرنے کے لیے ہر وقت

تیار رہنا ۔۔۔۔۔ بس یہی کچھ مشرق میں عالم کہلائے جانے کے لیے کافی ہے۔ گہری واقفیت کی طرف وہ نہ صرف دھیان ہی نہیں دیتے بلکہ اُس سے نفرت کرتے ہیں۔

مُنشی ہر روز ناشتے کے بعد سے دوپہر کے کھانے تک پڑھاتا ہے اور کبھی کبھار شام کو بھی۔ اُس کی تنخواہ اس کے آقا کے عہدے یا آقا کی ہمت پر منحصر ہے۔ دس روپے سے لے کر چالیس یا پینتالیس روپے ماہانہ تک پاتا ہے۔ وہ سب نوکروں کا افسر سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے نوکر اس کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ بہت سے (بڑے عہدوں سے) متعلق طلباء اسے جُوتے سمیت اپنے کمرے میں آجانے دیتے ہیں، جبکہ کوئی دوسرا نوکر جوتا پہنے ہوئے کمرے میں آجائے تو قابلِ نفرت خیال کیا جاتا ہے اور اُسے سخت سزا دی جاتی ہے۔

سرکاری شعبوں میں جو سیکڑوں مُنشی کام کرتے ہیں، وہ عموماً بہت کم تنخواہ پاتے ہیں۔ اسی لحاظ سے وہ اپنی پوشاک کی طرف سے بے خبر رہتے ہیں۔ وہ نہ تو کوئی عزت دار اشخاص ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کی علمیت کا درجہ بلند ہوتا ہے۔ کسی سمجھ دار شخص کی باتوں سے واقفیت رکھنا (دیسی لوگوں میں خاص طور پر بڑے لوگوں میں القابات کے استعمال سے متعلق حوصلہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ کسی طویل تحریر کا $\frac{1}{10}$ حصّہ تو ان کے القابات کی نذر ہو جاتا ہے) اور تیز پڑھنے کے ساتھ ساتھ سُرعت کے ساتھ لکھنا اُن کی خوبیاں سمجھی جاتی ہیں۔

زبانوں کا مطالعہ کرنے والے دوستوں کے مُنشی کے پاس ایک لڑکا نوکر رہتا ہے جو گھر آنے جانے کے وقت اس کے لکھنے کا سامان پکڑے رہنے کے ساتھ ساتھ اپنے آقا کے اوپر چھتری تانے رہتا ہے۔ ان میں سے بہت سے لڑکے اپنے آقاؤں کی محنت اور مہربانی سے ٹوٹی پھوٹی فارسی جان جاتے ہیں اور وقت آنے پر دفتروں میں نوکری حاصل کرنے کے لیے کافی پڑھنا لکھنا سیکھ لیتے ہیں۔ اُن میں سے کچھ تو بڑے آرام کی اور اونچی جگہوں پر پہنچ جاتے سُنے گئے ہیں۔" (۱۵)

قلمی آثار (مطبوعہ کتب) :

میر امّن نے فورٹ ولیم کالج کی ملازمت کے دوران دو کتابیں (آزاد ترجمہ) تیار کیں :

۱۔ "باغ و بہار" (قصّہ "چار درویش" پر ۱۸۰۲ء میں نظرِ ثانی کے حوالے سے تاریخی نام "باغ و بہار" رکھا اور سنہ تالیف ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء بتایا۔ طبع اوّل : ہندوستانی پریس، کلکتہ : ۱۸۰۴ء ("باغ و بہار" اشاعتِ اوّل دائیں ہاتھ کے سرورق پر سنہ اشاعت : ۱۸۰۳ء درج ہے)

۲۔ ''گنجِ خُوبی'' (مُلا حُسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف ''اَخلاقِ مُحسنی'' کا چالیس ابواب میں آزاد ترجمہ) طبع اوّل؛ ۱۹۔ اگست ۱۸۰۳ء سے قبل۔ ''اَخلاقِ مُحسنی'' کے ترجمے سے متعلق خود میر امّن ''گنجِ خُوبی'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

''لیکن فقط فارسی کے ہُو بہو معنی کہنے میں کچھ لطفِ روزمرہ نہ دیکھا، اِس لیے اُس کا مطلب لے کر اپنے محاورے میں سارا احوال بیان کیا۔''

عام طور پر یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ ''گنجِ خوبی'' فورٹ ولیم کالج سے شائع نہ ہو پائی (۱۶) جبکہ عتیق صدیقی نے ثابت کیا ہے کہ ''گنجِ خوبی'' کی اشاعت کی تکمیل فورٹ ولیم کالج کی طرف سے ۱۹۔ اگست ۱۸۰۳ء تک ہو چکی تھی۔ (۱۷)

اب ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ میر امّن کی اِس کتاب کا نہ صرف پہلا ایڈیشن بلکہ دوسرا ایڈیشن بھی فورٹ ولیم کالج، کلکتہ سے ہی طبع ہُوا۔ پروسیڈنگز آف دی کالج آف فورٹ ولیم، جلد ایک، امپیرئل ریکارڈ ڈیپارٹمنٹ، نئی دہلی (بھارت) کے مطابق میر امّن کا ''اخلاقِ محسنی'' سے ترجمہ ناگری لپی میں ''گنجِ خوبی'' کے نام سے جان گلکرسٹ نے پریس کے حوالے کر دیا تھا، جسے ۶۰۰ چوپیجی صفحات پر شائع ہونا تھا اور اس پر لاگت کا اندازہ ۴۰۰ روپے بتایا گیا تھا۔ (۱۸) ''گنجِ خوبی'' کا ایک ایڈیشن مطبع محمدی، کلکتہ سے ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۶ء (صفحات ۳۶۸) نیز ایک ایڈیشن ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں مطبع محبوب بمبئی سے شائع ہُوا۔

کالج کونسل کی کارروائیوں اور ''ہندی مینول'' (THE HINDEE MANUAL OR CASKET OF INDIA) مرتبہ: گلکرسٹ، مطبوعہ: فورٹ ولیم کالج ہندوستانی پریس، کلکتہ: ۱۸۰۲ء کے مطابق ''باغ و بہار'' کا پہلا نام ''چار درویش'' ہے اور پہلی بار ہندوستانی پریس، کلکتہ سے طبع شدہ ''ہندی مینول'' میں شامل ''باغ و بہار'' کے ۱۰۲ صفحات اسی نام سے شائع ہوئے تھے۔ نظرِ ثانی (۱۸۰۲ء) کے بعد میر امّن نے سالِ تصنیف ۱۸۰۲ء (جسے نظرِ ثانی کا سال کہنا مناسب ہوگا) کی مناسبت سے ''باغ و بہار'' کا نام دیا۔

یاد رہے کہ میر امّن نے ''باغ و بہار'' کا اوّلین مسودہ ''چار درویش'' کے نام سے ۱۸۰۱ء میں تیار کر لیا تھا۔ ۱۲۔ جنوری ۱۸۰۲ء کو ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے زیرِ طبع کتابوں کی اشاعت کا تخمینہ کالج کونسل کے سامنے پیش کیا تھا جس کے مطابق (۱۲۔ جنوری ۱۸۰۲ء کی تاریخ میں) ''چار درویش'' کے فارسی رسم الخط میں ۵۸ صفحات ہرکارہ پریس کلکتہ سے چھپ چکے تھے۔

اس رپورٹ سے پتا چلتا ہے کہ "چار درویش" کے چھوٹے چوتھائی کے ۴۳۲ صفحات پر مشتمل پانچ سو نسخوں پر تخمینہ اخراجات ۸۸۰۰ روپے تھا۔ ڈاکٹر گلکرسٹ نے توقع ظاہر کی تھی کہ یہ کتاب اگست ۱۸۰۲ء میں شائع ہو جائے گی۔ نیز ۱۲۔ جنوری ۱۸۰۲ء کی اس رپورٹ سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ہرکارہ پریس، کلکتہ کو چھے ماہ پہلے پرنٹ آرڈر دیا گیا تھا۔ [۱۹] یوں وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ میر امّن نے "چار درویش" ترجمہ کرنے کا کام اوائل ۱۸۰۱ء میں شروع کر کے جولائی ۱۸۰۱ء تک اوّلین مسودہ تیار کر لیا تھا۔ انڈیا آفس کے مخطوطات کی فہرست بھی یہی ثابت کرتی ہے کہ "چار درویش" ۱۸۰۱ء میں ترجمہ / تالیف ہو چکی تھی۔

ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی کتابوں سے متعلق تخمینہ رپورٹ کے جواب میں یکم فروری ۱۸۰۲ء میں کالج کونسل کی طرف سے گلکرسٹ کے نام لکھی گئی چٹھی [۲۰] میں مندرجہ ذیل کتب کا حوالہ ملتا ہے :

(۱) "بیتیسی سنگھاسن" (زیرِ طبع) ہرکارہ پریس، کلکتہ، ۳۶ مطبوعہ صفحات

(۲) "شکنتلا ناٹک" (زیرِ طبع) کلکتہ گزٹ پریس، ۲۴ مطبوعہ صفحات

(۳) "اخلاقِ ہندی"، (زیرِ طبع) ٹیلی گراف پریس، کلکتہ، چھپائی کا آغاز

(۴) "چار درویش"، (زیرِ طبع) ہرکارہ پریس، کلکتہ، ۵۸ مطبوعہ صفحات

(۵) "مثنوی میر حسن"، (زیرِ طبع) کلکتہ گزٹ پریس، ۳۶ مطبوعہ صفحات

(۶) "گلستان"، (زیرِ طبع) سپرو پریس، کلکتہ، چھپائی کا آغاز

(۷) "توتا کہانی"، (زیرِ طبع) ٹیلی گراف پریس، کلکتہ، چھپائی کا آغاز

(۸) "ہندوستانی پرنسپلز"، (زیرِ طبع) مارننگ پوسٹ پریس، کلکتہ، ۴۰ مطبوعہ صفحات

حکم دیا گیا تھا کہ محوّلہ بالا زیرِ طبع کتب کے جتنے اجزاء چھپ چکے ہیں، ان میں سے "مرثیۂ مسکین" کے انتخاب کے ساتھ طلباء کے لیے ضروری حصّوں کو یکجا کر کے کُل ۵۰۰ صفحات کی صرف ایک کتاب تیار کروائی جائے اور اِس کام پر دس ہزار روپے سے زیادہ خرچ نہ اٹھے۔ واضح رہے کہ اس منظور شدہ رقم میں "مرثیۂ مسکین" کی اشاعت کا خرچ بھی شامل تھا۔ چنانچہ یہ انتخابی مجموعہ "ہندی مینول" (THE HINDEE MANUAL OR CASKET OF INDIA) کے نام سے ۱۸۰۲ء میں شائع ہوا۔ اِس مجموعے میں میر امّن کی "چار درویش" کے ۱۰۲ صفحات شامل تھے۔ چار درویش" کے اِن ۱۰۲ صفحات کی طباعت پر ایک ہزار تین سو سینتیس روپے خرچ ہوئے۔ ۱۹۔ فروری ۱۸۰۲ء کو کالج کونسل کی منظوری کے بعد ۱۲۔ اپریل ۱۸۰۲ء کو یہ رقم ہرکارہ پریس کو ادا کر دی گئی۔ [۲۱]

یکم فروری ۱۸۰۲ء میں جب زیرِ طبع کتب کی اشاعت روک دی گئی تو میر امن نے ''چار درویش'' کے مسودے پر نظرِ ثانی کر کے بقول میر امّن: ''چار درویش کے قصّے کو ہزار جدوکد سے اردوئے معلا کی زبان میں باغ و بہار بنایا۔''

''باغ و بہار'' کے اعداد اور خود میر امّن کے بیان کے مطابق اس کا سنہ تالیف ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء ہے۔ اپنی دوسری تالیف ''گنج خوبی'' کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں کہ :

''سنہ ایک ہزار دوسو سترہ ہجری مطابق اٹھارہ سو دو عیسوی کے باغ و بہار کو تمام کر کے اس کو لکھنا شروع کیا''۔

یاد رہے کہ نظرِ ثانی کا کام جون ۱۸۰۲ء میں تمام ہوا۔ ''باغ و بہار'' فارسی قصہ ''چار درویش'' کا آزاد ترجمہ ہے لیکن فارسی زبان سے براہِ راست نہیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ حافظ محمود شیرانی کو ''چار درویش'' کا ایک فارسی نسخہ مصنفہ حکیم محمد علی المخاطب بہ معصوم علی خاں ۱۱۴۶ھ مطابق ۱۷۳۳ء کا ملا تو اُنھوں نے اسے حکیم محمد علی کی تصنیف سمجھ کر چار درویش کا مصنفِ اوّل قرار دے دیا۔ (۲۲) جبکہ محمد علی مُصنف نہیں، محض راوی تھے۔

میر امّن کی ''چار درویش'' یا ''باغ و بہار'' کی بنیاد محمد حسین عطا خاں تحسین کی ''نوطرزِ مرصّع'' ہے۔ (۲۳)

اگر میر امّن نے اسے امیر خسرو سے منسوب کیا تو اِس میں اُن کی جدّتِ طبع یا دروغ گوئی کو دخل نہ تھا بلکہ اُنھوں نے محض ایک مقبول عام روایت کو نقل کیا۔ اب تک فارسی کے جس قدر نسخے ملے ہیں اُن کا اسلوب امیر خسرو کے اسلوب سے نہیں ملتا اور نہ ہی تاریخ کی کوئی کتاب اس بات کا حوالہ دیتی ہے کہ اِس نام کا کوئی قصہ امیر خسرو نے تصنیف کیا۔ یہ ایک مقبولِ عام روایت تھی کہ ''قصہ چار درویش'' امیر خسرو نے اپنے پیرو مُرشد نظام الدین اولیاء کی تیمارداری میں کہا۔

۲۰۔ اگست ۱۸۰۴ء تک چوتھا چوتھائی کی صورت میں ''باغ و بہار'' تقریباً چھپ چکی تھی۔ کالج ریکارڈ کے مطابق یکم اگست ۱۸۰۷ء کو ''باغ و بہار'' کی ۵۰ جلدیں فی جلد ۲۰ روپے کے حساب سے خرید کر حکومت نے بمبئی کی حکومت کو بھجوائیں۔ ۱۶۔ فروری ۱۸۱۳ء کے فیصلے کے مطابق ''باغ و بہار'' کے نئے ایڈیشن کے لیے کالج کونسل نے مالی امداد دینا منظور کیا۔ اس طرح باغ و بہار کے ۱۹۔ مارچ ۱۸۱۳ء کی سو جلدوں والے ایڈیشن کے لیے ایک ہزار سات سو سولہ روپے دیئے گیے اور کپتان روبک نے ''باغ و بہار'' کے اِس ایڈیشن کی درستگی کے لیے مزید رقم کا مطالبہ کیا۔

کالج کونسل نے ۲۔ نومبر ۱۸۰۱ء کو ایک تجویز منظور کی تھی، جس میں کہا گیا تھا کہ : ''دیسی زبانوں میں ادبی کتابوں کی تصنیف و تالیف کی ہمت افزائی کے خیال سے متبحر دیسی لوگوں کو انعامات دیئے جائیں گے''۔ کالج کونسل

کے نام میر امّن کی لکھی ہوئی حسبِ ذیل عرضی، ''باغ و بہار'' کی بیشتر اشاعتوں میں شامل کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو :

''میر امّن دِلّی والے

بقلم خود

عرضی

جو

مدرسے کے مختار کار صاحبوں کے حضور میں دی گئی

صاحبانِ والا شان، نجیبوں کے قدردانوں کو خدا سلامت رکھے ! اِس بے وطن نے حُکم اشتہار کا سُن کر چار درویشوں کے قِصّے کو ہزار جدّ و کد سے اُردوئے مُعلا کی زبان میں باغ و بہار بنایا۔ فضلِ الٰہی سے سب صاحبوں کے سَیر کرنے کے باعث سرسبز ہُوا۔ اب اُمیدوار ہوں کہ اِس کا پھل مجھے بھی ملے تو میرا غنچہء دل مانندِ گُل کے کھلے۔ بقول حکیم فردوسی کے کہ ''شاہ نامے'' میں کہا ہے :

بسے رنج بُردم دریں سال سی
عجم زندہ کردم بہ ایں پارسی

سو اُردو کی آراستہ کر زباں
کیا میں نے بنگالا ہندوستاں

خداوند آپ قدردان ہیں، حاجت عرض کرنے کی نہیں۔ الٰہی تارا اقبال کا چمکتا رہے۔''(۲۴)

واضح رہے کہ انعام کے حصول کے لیے یہ وہ عرضی ہے جو میر امّن نے ''چار درویش'' پر نظرِ ثانی کا کام ختم کرنے کے بعد ۱۴ جون ۱۸۰۲ء کو ''باغ و بہار'' کے مسودے کے ہمراہ ڈاکٹر گلکرسٹ کے ذریعے کالج کونسل کو بھجوائی۔

اِس عرضی کے جواب میں ۱۴۔ جون ۱۸۰۲ء کے اجلاس میں کالج کونسل نے میر امّن کو ۵۰۰ روپے انعام دینا منظور کرتے ہوئے لکھا :

''فاضل دیسی میر امّن، جو کالج سے وابستہ ہیں، ان کو چار درویش کے ہندوستانی ترجمے کے لیے، جسے ہندوستانی پروفیسر نے آج ہی پیش کیا ہے، پانچ سو روپے بہ طور انعام دیئے جائیں گے''۔(۲۵)

اِس تحریر کی داخلی شہادت سے پتا چلتا ہے کہ میر امّن کو یہ انعام ''باغ و بہار'' کے مسودے پر دیا گیا نہ کہ مطبوعہ کتاب پر۔ اگر ڈاکٹر گلکرسٹ مطبوعہ کتاب پیش کرتے تو کتاب کا حوالہ موجود ہوتا، نیز یہ کہ اس دَور میں ''باغ

وبہار'' کی ضخامت کی کتاب تقریباً ایک سال میں چھپ کر تیار ہوتی تھی۔(۲۶)

میر امّن کو''باغ وبہار'' کے مسودے پر انعام ملا تو فورٹ ولیم کالج کے دو سیکنڈ منشیوں اور نئے بھرتی کیے گئے چار منشیوں نے بھی ڈاکٹر گلکرسٹ کے توسط سے اپنے مسودات کالج کونسل کو بھجوائے۔ اِس کا ثبوت ڈاکٹر گلکرسٹ کی وہ چٹھی ہے جو ۱۹۔ اگست ۱۸۰۳ء کو کالج کونسل کے نام لکھی گئی۔(۲۷)

ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے مسودات پر تاری چرن متر، مولوی امانت اللہ، سدل مصر پنڈت، للّو لال جی کوی اور مرزا کاظم علی جواں کے ناموں کی سفارش کی تھی جبکہ میر بہادر علی حسینی کے لیے لکھا تھا کہ اگر انھیں انعام نہ دیا جائے تو کم از کم ان کی تنخواہ ۸۰ روپے ماہوار سے ۱۰۰ روپے ماہانہ کر دی جائے۔ دوسرے لفظوں میں ڈاکٹر گلکرسٹ نے ۱۹۔ اگست ۱۸۰۳ء میں میر بہادر علی حُسینی نارنولی کو چیف مُنشی بنانے کی سفارش کی تھی۔(۲۸)

ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی اِس چٹھی کے جواب میں کالج کونسل نے لکھا کہ :

''کونسل کا یہ ارادہ کبھی نہیں تھا کہ جو دیسی علماء کالج سے مقررہ تنخواہ پاتے ہیں انھیں بھی انعام دیا جائے یا غیر مکمل یا مذکورہ کتب کے لیے پہلے سے ہی انعام کا اعلان کر دیا جائے۔ کونسل محنتی اور قابل اشخاص کو جنھیں کالج سے اچھی تنخواہ نہ مل رہی ہو، کبھی کبھی خاص مواقع پر انعام دینے کے لیے تیار ہے۔''(۲۹)

اس چٹھی کی آخری سطر میں واضح طور پر میر امّن کی حوصلہ افزائی کا حوالہ موجود ہے۔

۱۶۔ ستمبر ۱۸۰۵ء میں (ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے مُستعفی ہونے کے بعد) ہندوستانی شعبے کے نئے صدر شعبہ پروفیسر کپتان جیمز مَوئٹ تھے۔ ۳۰۔ ستمبر ۱۸۰۵ء کی کالج کونسل کی میٹنگ میں پروفیسر کپتان جیمز مَوئٹ نے ہندوستانی شعبے کے منشیوں کی جو تفصیل لکھ کر پیش کی تھی اس میں میر امّن کو ڈورِن (DORIAN) ظاہر کیا گیا تھا اور ان کی تنخواہ ۸۰ روپے ماہانہ بتائی گئی تھی۔(۳۰) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۳۰۔ ستمبر ۱۸۰۵ء تک میر امّن مُنشی کے عہدے سے ترقی پا کر ڈورِن (DORIAN) یا سیکنڈ مُنشی ہو گئے تھے۔

رسالہ ''ہماری زبان'' میں فورٹ ولیم کالج کونسل کے ریکارڈ کا حوالہ دے کر لکھا گیا ہے کہ :

''۴ جون ۱۸۰۶ء کو فورٹ ولیم کے ہندوستانی شعبہ کے پروفیسر کی شکایت پر کہ میر امّن نے ایک طالب علم کو پڑھانے سے انکار کیا ہے، کالج کونسل کے سامنے پیش کیے گئے۔ الزام کو تسلیم کرتے ہوئے پیرانہ سالی اور جسمانی معذوری کا اُنھوں نے عذر پیش کیا۔ ان کا بیان سننے کے بعد کالج کونسل اس نتیجے پر پہنچی کہ میر امّن کالج کی خدمات سے سبکدوش ہونے کے

خواہش مند معلوم ہوتے ہیں، طے پایا کہ اس مہینے کی تنخواہ کے علاوہ اور چار مہینوں کی تنخواہ دے کر کالج کی خدمات سے ان کو سبک دوش کیا جائے۔" (فورٹ ولیم کالج کی کاروائیاں جلد دوم ۱۰۶) (۳۱)

اس تاریخ کے بعد اُن کا نام کالج کونسل کی کارروائیوں میں نہیں ملتا اور نہ کسی نے بتایا کہ وہ کالج سے نکلنے کے بعد کہاں گئے اور کب تک زندہ رہے۔

۴۔ جون ۱۸۰۶ء کی میٹنگ میں کالج کونسل نے میر امّن کو اُن کی خواہش کے مطابق چار ماہ کی تنخواہ مبلغ ۳۲۰ روپے مع جون ۱۸۰۶ء کی پوری تنخواہ ۸۰ روپے ادا کر کے کالج کی ملازمت سے الگ کر دیا (۳۲)

اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ "تذکرہ ہمیشہ بہار" از نصر اللہ قمر خورجوی اور "مواقیت الفواتح" از مولوی مجتبیٰ علی خاں کے دو تذکرے جو ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء یا ۱۸۰۳ء میں میر امّن کی وفات بتاتے ہیں، درست نہیں۔ پھر یہ بات بھی تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ ۴ جون ۱۸۰۶ء میں میر امّن محض ۵۶ برس کی عمر میں درس دینے کے قابل نہ رہے تھے۔ فورٹ ولیم کالج سے میر امّن اور ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے مُستعفی ہونے کا انداز ملتا جلتا ہے۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی کالج کونسل سے نہ بنی اور میر امّن کو نئے صدر شعبہ پروفیسر کپتان جیمز مَوئٹ سے نباہ مشکل نظر آیا۔

میر امّن جو "باغ و بہار" کے ترجمے پر ۵۰۰ رُوپے نقد انعام پانے والے اولین منشی تھے، نیز ان کی "باغ و بہار" فورٹ ولیم کالج کی بہترین کتاب کا اعزاز حاصل کر چکی تھی، اگر اس پر بھی میر امّن بطور سیکنڈ منشی ۸۰ روپے ماہانہ پر کام کرتے رہے تو اس میں ان کی اعلیٰ ظرفی اور ایک حد تک مجبوری اور مُفلسی کو دخل تھا۔ اب نئے صدر شعبہ نے جب ان کے ساتھ عام مُنشیوں والا برتاوٴ روا رکھا تو اُن کا بددل ہونا یقینی تھا۔ پھر یہ وہ دور ہے جب لکھنو اور حیدر آباد دکن کے روٴساء نے نجی رصد گاہیں قائم کرنا شروع کر دی تھیں اور ان کے دار التراجم میں اعلیٰ درجے کے مترجمین کی کھپت ممکن تھی۔ پھر اس بات کو بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ۲۱۔ مئی ۱۸۰۶ء میں ہیلی بری (برطانیہ) کے مقام پر فورٹ ولیم کالج طرز کے ایک ادارے کے قیام کا فیصلہ ہو چکا تھا اور فورٹ ولیم کالج کا مستقبل تاریک تھا۔

ایسے میں اگر میر امّن نے جان بُوجھ کر پیرانہ سالی اور جسمانی معذوری کا عذر پیش کیا تو بعید از قیاس نہیں۔ خود ڈاکٹر گلکرسٹ جیسے نمایاں پروفیسر کو بھی فورٹ ولیم کالج کی ملازمت چھوڑنے کے لیے جسمانی معذوری کا بہانہ تراشنا پڑا۔

مُلازمت سے مُستعفی ہونے سے متعلق میر امّن کا فیصلہ بر وقت تھا، اِس لیے بھی کہ صرف چھے ماہ بعد

جنوری ۱۸۰۷ء میں فورٹ ولیم کالج کے اخراجات گھٹانے کا حکومتی فیصلہ سامنے آیا تو کالج کے عملے میں تخفیف کر دی گئی اور متعدد منشی جبری طور پر ریٹائر کر دیے گئے۔

۶۔ جون ۱۸۰۶ء کے بعد فورٹ ولیم کالج کا ریکارڈ میر امّن سے متعلق ہماری راہنمائی نہیں کرتا۔ اب لازم ہے کہ میر امن اپنی خواہش کے مطابق ملازمت سے علاحدگی کے بعد ریٹائرمنٹ کی زندگی بھی گزار سکتے ہیں اور کسی نئے دارالترجمہ کا رُخ بھی کر سکتے ہیں۔ ''باغ و بہار'' اور ''گنجِ خوبی'' کے دیباچوں نیز ''باغ و بہار'' کے مسودے پر انعام کے لیے لکھی گئی درخواست میں وہ کثیر العیال اور ضرورت مند ہی دکھائی دیتے ہیں، پھر عمر بھی زیادہ نہ تھی اس لیے اُنھوں نے دوسری راہ اختیار کی۔

میر امّن سے متعلق ایک حوالہ گارسیں دتاسی کے ہاں ملتا ہے۔(۳۳) اُنھوں نے مشہور ریختی گو شاعر میر یار علی جان صاحب کو ریختی کے حوالے سے شاعرہ تصوّر کر کے میر امّن کی بیٹی لکھا ہے۔ جس کا ہمارے محققین نے خُوب خُوب مضحکہ اُڑایا، لیکن اِتنا نہ کیا کہ میر امّن سے متعلق اُس حوالے کو جان صاحب کے حالاتِ زندگی سے جوڑ کر ہی دیکھ لیتے۔ اس لیے کہ جان صاحب سے مُتعلق تو تذکرے خاموش نہیں۔

گارسیں دتاسی نے جان صاحب کے والد کا نام میر امّن لکھا ہے۔

ڈاکٹر سید سلیمان حسین نے ''لکھنو کے چند نامور شعراء'' (جلد اوّل) مطبوعہ: سرفراز قومی پریس، لکھنو، طبع اوّل: دسمبر ۱۹۷۳ء میں لکھا ہے کہ جان صاحب کے استاد نواب عاشور علی خاں بن نواب محمد علی خاں، ذی علم رئیس تھے جو اپنے دور میں ''شاعر گر'' مشہور تھے۔ اُنھوں نے ہی جان صاحب کو ریختی کی راہ دکھائی۔

دیگر تذکروں سے پتا چلتا ہے کہ جان صاحب کے کلام کی قدر لکھنؤ میں نہ ہوئی تو وہ دہلی چلے گئے، لیکن جب زمانہ موافق نہ دیکھا تو بھوپال کا سفر کیا اور بالآخر بھوپال سے بھی ناکام ہو کر لکھنؤ پلٹے۔ زوالِ لکھنو (۱۸۵۶ء) کی تاریخ ریختی میں رقم کی:

سر پھوٹا اور نہ خون بہا، ناف ٹل گئی
ایام کی خرابی سے گدی نکل گئی

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران جان صاحب لکھنؤ میں تھے، کہتے ہیں:

وہ سُورمی رنڈی ہوں نہ گوروں سے ڈری ہوں
بھگدڑ میں قدم شہر سے باہر نہ نکالا

جان صاحب کا انتقال ۱۸۸۰ء میں رام پور میں ہُوا۔ اُن کا پہلا دیوان مطبع مرتضوی لکھنؤ سے ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۵ء میں طبع ہُوا۔ دوسرا دیوان، حافظ محمد باقر معروف بہ ''اچھے صاحب'' کے اہتمام سے ۱۲۷۹ھ مطابق ۶۳۔۱۸۶۲ء میں لکھنؤ سے شائع ہُوا، جس میں پہلا دیوان بھی شامل تھا۔

جان صاحب نے باپ کے کثیر الازدواج ہونے کی کیفیت یوں رقم کی ہے :

بے ماں کے ہٹ اٹھاتے نہیں زینہار باپ
جورُو کے منہ سے کرتے ہیں بچّوں کو پیار باپ
پاپوش مارتے نہیں اولاد کو بہن
بعضے نگوڑے ہوتے ہیں ایسے چمار باپ

(۱) مولانا سیّد محمد مبین نقوی الہ آبادی کے مطابق جان صاحب ''اخیر وقت تک رام پور میں رہے اور وہیں انتقال ہُوا۔ کوئی اولاد نرینہ نہیں چھوڑی، لکھنؤ میں ان کا گھر رستم نگر میں تھا۔''

(۲) عبدالغفور نساخ مؤلف ''سخن شعراء'' لکھتے ہیں :

''جان صاحب : میر یار علی خلف میر امّن لکھنوی شاگرد عاشور علی خاں بہادر، ریختی اپنے طرز پر بہت خوب کہتے تھے۔''(۳۴)

(۳) سیّد محمد مبین نقوی الہ آبادی مرتّب ''تاریخِ ریختی معہ دیوان جان صاحب'' کے مطابق :

''ان کے والد میر امّن تو فرخ آباد کے رہنے والے تھے لیکن یہ بچپن ہی میں لکھنؤ پہنچ گئے۔ یہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔''(۳۵)

(۴) محمد عبداللہ خاں خویشگی مولف ''فرہنگِ عامرہ'' نے اُردو زبان کے اربابِ قلم کی فہرس میں میر یار علی جان صاحب کے والد کا نام میر امّن بتایا ہے۔(۳۶)

(۵) نادِم سیتاپوری نے میر امّن کو ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۷ء یا ۱۸۱۸ء تک حیات بتایا ہے۔(۳۷)

مقامِ حیرت ہے کہ ہمارے محققین میر امّن کو ۱۸۰۶ء کے بعد زندہ تصوّر نہیں کرتے جب کہ اُن کے حیات ہونے کے شواہد موجود ہیں۔ سیّد محمد مُبین نقوی الہ آبادی مُرتب ''تاریخ ریختی معہ دیوان جان صاحب'' لکھتے ہیں :

''جان صاحب کی ولادت فرخ آباد میں غالباً ۱۲۳۴ھ (۱۹۔۱۸۱۸ء) میں ہوئی تھی۔ نام تو اُن کا میر

یار علی تھا مگر والدین پیار سے جان صاحب کہتے تھے۔ اِس لیے ریختی کی مناسبت سے اسی عرف کو تخلص قرار دیا۔ ان کے والد میر امّن تو فرخ آباد کے رہنے والے تھے لیکن یہ بچپن ہی میں لکھنو پہنچ گئے تھے۔''

(صفحہ ۳۹ تا ۴۰ سے اقتباس)

اِس تحریر سے میر امّن کا ۱۲۳۴ھ مطابق ۱۸۱۸ء میں فرخ آباد میں قیام ثابت ہے، جبکہ نواب فخر الدین خاں المخاطب بہ شمس الامراء حیدرآباد دکن کی مرتب کردہ کتاب ''ستۂ شمسیہ'' کے دیباچے میں درج ہے کہ ریورینڈ چارلس کی طبعیات سے متعلق کتاب (مطبوعہ ۱۸۱۸ء لندن) حیدرآباد دکن پہنچی تو اسے اردو میں ترجمہ کروانے کا کام مترجمین کو سونپا گیا جن میں ایک نام میر امان علی دہلوی بھی ہے، یعنی میر امن دہلوی۔ ''ستۂ شمسیہ'' جلد: ۵ (انظار) صفحات ۱۷۴ کا ایک قلمی نسخہ مرقومہ ۱۸۱۸ء انجمن ترقی اردو، کراچی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ یہ وہی سال بنتا ہے جب جان صاحب کی فرّخ آباد میں ولادت ہوئی اور اس کے بعد بچپن میں ہی جان صاحب کو لکھنؤ بھیج دیا گیا۔ یقیناً جان صاحب، میر امّن ہی کے بیٹے تھے۔ میر امّن کے اصل نام میر امان علی کی مناسبت سے بیٹے کا نام میر یار علی (عرف جان صاحب) بھی اس خیال کو تقویت پہنچاتا ہے پھر جان صاحب کی ولادت ۱۹۔۱۸۱۸ء کی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ میر امّن فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے مستعفی ہونے کے بعد کچھ عرصہ فرّخ آباد میں مقیم رہے اور اس کے بعد بطور مُترجم دارالترجمہ شمس الامراء حیدرآباد دکن سے منسلک ہوگئے۔ اُنھوں نے اہل وعیال کو لکھنؤ میں چھوڑا اور خود دارالترجمہ کا کام کرتے رہے۔ بہت ممکن ہے میر امّن کے لکھنؤ سے اِس تعلق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے عبدالغفور نساخ نے ''سخن شعراء'' (مرقومہ: ۱۸۶۴ء) میں میر امّن کو میر امّن لکھنوی لکھا ہو۔

حیدرآباد، دکن میں شمس الامراء کا سنگی چھاپہ خانہ ۱۸۲۰ء میں قائم ہو چکا تھا۔ صاف ظاہر کہ اسی سال اِس چھاپہ خانے سے ''مدرسہء فخریہ'' کا اوّلین نصاب شائع ہونا شروع ہوگیا ہوگا اور نصاب ساز کمیٹی نے کم از کم برس بھر پہلے ابتدائی نصاب تیار کرلیا ہوگا، جیسا کہ انجمن ترقی اردو، کراچی میں محفوظ ''ستہء شمسیہ'' جلد: ۵ کے قلمی نسخہ مرقومہ ۱۸۱۸ء سے ثابت ہے۔ جس کے نمایاں مترجمین میں میر امان علی دہلوی (میر امّن) کا نام دیکھنے کو ملتا ہے۔ میر امّن کا فورٹ ولیم کالج سے وابستہ رہنا اس زمانے میں ایک بڑی کوالیفکیشن تھی، نیز یہ کہ میر امّن کی ''باغ و بہار''، ہائی پروفیشنسی اور ڈگری آف آنرز کے امتحانات کی نصابی کتاب تھی۔ ''باغ و بہار'' کے تراجم غیر ملکی زبانوں خصوصاً ارمنی، لاطینی، پرتگالی اور انگریزی میں یا تو ہو چکے تھے یا ہُوا چاہتے تھے۔ ۱۸۳۶ء میں پرتگالی مستشرق پی۔ ایس ڈی روزاریو نے ''باغ و بہار'' کو لاطینی رسم خط میں کلکتہ سے شائع کروایا جسے مونیئر ولیمز نے چارلس ٹریولین کی فرمائش پر دوبارہ طبع

کروایا۔ ولیم ہنٹر کی ''ہندوستانی ڈکشنری'' میں لفظوں کے خیال کے سلسلے میں جن ۴۲ کتب سے اِستفادہ کیا گیا ان میں ''باغ و بہار'' شامل تھی۔

پروفیسر ڈنکن فاربس ایل۔ایل۔ڈی کنگز کالج لندن، ممبر رائل ایشیاٹک سوسائٹی برطانیہ و آئرلینڈ کے مطابق ''باغ و بہار'' کو ۱۸۰۳ء میں جونیئر انگریز ملازمین کی نصابی کتاب تجویز کیا گیا تھا۔ ۳۱ مئی ۱۸۴۴ء میں کورٹ آف ڈائریکٹرز نے جنرل آرڈر مُجریہ ۹۔ جنوری ۱۸۳۷ کی رُو سے جونیئر ملازمین کے علاوہ تمام ملٹری اور میڈیکل جونیئر آفیسرز کے لیے ہندوستانی (اردو) میں امتحان پاس کرنا لازمی قرار دیتے ہوئے امیدواروں کے نصاب میں ''باغ و بہار'' اور ''بے تال پچیسی'' کا ترجمہ اور کتاب خوانی ضروری قرار دیا۔ [۳۸]

قرینِ قیاس ہے کہ شمس الامراء کی طرف سے میر امّن کو ۱۸۰۶ء میں ہی ملازمت کی یقین دہانی کرائی گئی ہوگی، جس کا نتیجہ میر امّن کے استعفیٰ کی صُورت میں ظاہر ہوا اور میر امّن کلکتہ سے فرخ آباد پہنچے اور اس کے بعد اپنے اہل و عیال کو لکھنو میں چھوڑ کر حیدرآباد، دکن چلے آئے اور مدرسہ فخریہ شمس الامراء کے مترجمین میں شامل ہو گئے۔ یاد رہے کہ یہ وہ زمانہ ہے جب فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کا تالیف و ترجمہ کردہ ادب، انگریز سرکار کی وضع کردہ مخصوص تعلیمی پالیسی کے تحت سطحیت کا رُجحان پیدا کر رہا تھا۔ نواب فخر الدین خاں شمس الامراء ثانی نے ۱۸۱۸ء میں ریوری رنٹ چارلس کی کتاب کو ترجمہ کروانے کے بعد داستانوی قصوں کے مقابلے میں سائنٹیفک سوچ کو عام کرنے کی خاطر ۱۸۳۴ء میں ''مدرسہ فخریہ'' اور سائنسی علوم کی ترویج کے لیے رصدگاہ ''جہاں نُما'' حیدرآباد دکن میں قائم کی۔ مدرسہ فخریہ کے نصاب میں یورپی دانش گاہوں کی نصابی کتب کو شامل کیا اور حیدرآبادی طالب العلموں میں سائنٹیفک سوچ کو عام کرنے کی خاطر مغربی علوم و فنون کی نصابی کتب کو مقامی اور فرانسیسی مترجمین سے ترجمہ کروا کر ذاتی سنگی چھاپہ خانے (قیام: ۱۸۲۰ء) سے شائع کیا۔

دارالترجمہ شمس الامراء حیدرآباد دکن سے میر امّن کے منسلک رہنے کی یادگار ''ستۂ شمسیہ'' (تکمیل: ۳۷۔۱۸۳۶ء) نامی کتاب ہے۔ اس کتاب میں شمس الامراء ثانی نواب محمد فخر الدین خاں نے ریوری رنٹ چارلس کے سات سائنسی رسائل (مطبوعہ ۱۸۱۸ء لندن) کا انگریزی سے ترجمہ کروا کر ۸" /۵' کی تقطیع پر ۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۴۰ء میں اپنے سنگی چھاپہ خانے سے طبع کروایا۔ دوسری اور تیسری بار یہ کتاب اسی چھاپہ خانے سے ۱۲۶۶ھ مطابق ۵۰۔۱۸۴۹ء میں چھپی۔ اِس کتاب کا چوتھا ایڈیشن ۱۲۷۲ھ مطابق ۵۶۔۱۸۵۵ء میں مدراس کے مطبع اسلامیہ سے شائع ہوا۔ پانچواں ایڈیشن ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء دہلی سے شائع ہوا۔ چھٹا اور ساتواں ایڈیشن ۱۳۱۶ھ مطابق

۹۹۔۱۸۹۸ء میں منشی امیر احمد کے مطبع سے شائع ہوئے۔ خطِ نسخ میں اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ سائز ۸×۵ $\frac{1}{2}$ صفحات ۲۸۴، نمبر شمار ۵۴۲ (۱۳۲جدید) کے تحت اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدرآباد، آندھراپردیش کے ''کتب خانہ آصفیہ'' میں موجود ہے۔

''ستۂ شمسیہ'' نامی کتاب میں ریوری رنٹ چارلس کے سات رسائل کا اردو ترجمہ پیش کیا گیا، جن کی تفصیل درج ذیل ہے :

(۱) رسالہ علم جرثقیل (ترجمہ) مطبوعہ: سنگی چھاپہ خانہ شمس الامراء حیدرآباد کن
۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۴۰ء

(۲) رسالہ علم ہیئت (ترجمہ) مطبوعہ: سنگی چھاپہ خانہ شمس الامراء حیدرآباد دکن
۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۴۰ء

(۳) رسالہ علم آب (ترجمہ) مطبوعہ: سنگی چھاپہ خانہ شمس الامراء حیدرآباد دکن
۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۸ء

(۴) رسالہ علم ہوا (ترجمہ) مطبوعہ: سنگی چھاپہ خانہ شمس الامراء حیدرآباد دکن
۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۹ء

(۵) رسالہ علم مناظر (ترجمہ) مطبوعہ: سنگی چھاپہ خانہ شمس الامراء حیدرآباد دکن
۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۹ء

(۶) رسالہ علم برقک (ترجمہ) مطبوعہ: سنگی چھاپہ خانہ شمس الامراء حیدرآباد دکن
۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۹ء

(۷) ریوری رنٹ چارلس کا سوالات و جوابات سے متعلق مکمل رسالے کا ترجمہ اس کے علاوہ ہے، جس کے چھے حصے الگ کر کے علم جرثقیل، علم ہیئت، علم آب، علم ہوا، علم مناظر اور علم برقک نامی رسائل کے آخر میں شامل کر دیا گیا۔ یُوں اِن چھے رسائل میں ۱۷۸۱ صفحات کا انگریزی سے ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔

میر امان علی دہلوی یعنی میر امّن، غلام محی الدین متین حیدرآبادی، مسٹر جونس اور موسیو تنڈرس کی مشترکہ کاوش ''ستۂ شمسیہ'' از ریوری رنٹ چارلس کے سائنسی رسائل کی تفصیل درج ذیل ہے :

(۱) رسالہ علمِ جرِ ثقیل :

یہ ''ستہ شمسیہ'' سلسلے کی پہلی جلد ہے، جو ۸ / ۵ کی تقطیع پر ۳۰۷ صفحات پر مشتمل کتاب ہے۔ صفحہ ایک اور دو سے اقتباسات ملاحظہ ہوں :

''اس میں ہیولا اور اس کے انقسامات بے نہایت اور کشش انجماد اور کشش ثقل اور مرکز ثقل اور کمیات حرکت اور جرثقیل کی تمام قوتوں اور شاقوں کا بیان ہے۔''

''طلباء کے واسطے سرکار شمس الامراء بہادر امیر کبیر کے سنگی چھاپہ خانے میں شہر فرخندہ بنیاد حیدرآباد کے درمیان ۱۲۵۶ھ میں مطبوع ہوئی۔''

ابتدا میں ۳ صفحات کی فہرست، کتاب کے آخر میں تین صفحات کا غلط نامہ اور ۴ صفحات میں علم جرِثقیل کے آلوں کی ۱۳۰ اشکال کو لیتھو میں چھاپ کر شاملِ کتاب کیا گیا ہے۔

کتاب کے آخر میں ''پوشیدہ نہ رہے'' کے عنوان کے تحت درج ذیل عبارت شامل کتاب ہے :

> ''حکیم ریوری رنٹ چارلس صاحب نے ۱۸۱۸ء میں سات کتابیں علوم ریاضی کی تیار کر کے جو چھپوائی تھیں ان میں سے چھ کتابیں ...... ترجمہ کر کے ستیہ شمسیہ نام رکھا گیا اور باقی ساتویں کتاب تعریفات اور سوالات علوم مذکور میں اس واسطے لکھی تھی کہ علوم مذکور کی تحصیل کے بعد شاگردوں سے ہر ہر علم کے امتحان کے لیے سوال کر کے جواب اُس کا اُن سے سنے کہ یاد ہے یا نہیں اور ہم نے اس حکیم کے آئین کو بہتر جان کے ساتویں کتاب کا بھی ترجمہ کیا مگر اس میں سے ہر ہر علم کی تعریفات اور کیفیات اور سوالات علٰحدہ کر کے ہر علم کے رسالے میں اسطور شریک کئے کہ آغاز رسالے میں دیباچہ کے بعد تعریفات اور کیفیات اور آخر رسالے میں سوالات اس کے داخل کرنے میں آئے تا استاذ ہر علم کی تعلیم کے بعد اسی کتاب سے شاگردوں سے سوالات کر کے جوابات پوچھے تا دوسری کتاب سے سوالات کی احتیاج نہ ہو۔ تمت بالخیر۔''

ترجمہ سے چند امثال ملاحظہ ہوں :

''عرض خدمت رکھتا ہوں۔''

''آپ نے یہ بات پرسوں کے دن فرمائے تھے۔''

''متوجہ طرف تمھاری تعلیم کے ہوتا ہوں۔''

''ساتھ ایسے ہی اعلیٰ مراتب کے مُتصف ہے۔''

کتاب میں شامل اکثر الفاظ اور اِملا کا استعمال اب متروک ہے۔ مثلاً ''وہ'' کی بجائے ''وے''، ''کو'' کی بجائے ''تیئں''، ''مٹی'' کے بجائے ''ماٹی''، ''کنویں'' کی بجائے ''کُوے''، ''بحث'' کی بجائے ''تکرار''، ''کسی کو'' کی بجائے ''کسوکو''، ''بند ہونا'' کی بجائے ''مُوندھنا'' ''ان سے'' کی بجائے ''ؤن سے''۔

اسی طرح عبارت میں شامل اکثر حروف اور الفاظ کا رسم الخط بھی مختلف ہے۔ مثلاً

ٹ	——	ت
ڑ	——	ز
ٹوٹ	——	توٹ
سننے	——	سنّے
فٹ	——	فوٹ

چند انگریزی اصطلاحوں کا ترجمہ ملاحظہ ہو : پڈین Pudding

پڈین	Pudding
چوب شولہ	Cork
اسفنج	Spunge
خط راہ	Line of direction
ایر پنپ	Air pump

(۲) رسالہ علم ہیئت :

یہ ''ستۂ شمسیہ'' سلسلے کی دوسری جلد ہے جو ۸ / ۵ کی تقطیع پر ۳۴۴ صفحات کی کتاب ہے۔ ابتدا میں دیباچہ اور فہرست کے ۳۱ صفحات، آخر میں دو صفحات کا غلط نامہ اور ۴ صفحات پر کتاب کے متن سے متعلق ۱۲۰ اشکال کو شامل کتاب کیا گیا ہے۔ جملہ کتاب ۲۶ گفتگوؤں پر مشتمل ہے۔ نمونۂ عبارت ملاحظہ ہو :

''پیش از طلوع آفتاب جب مشرق طرف نظر آتا ہے ستارۂ صبح گاہی اور جب بعد از غروب آفتاب مغرب طرف دِکھلائی دیتا ہے، ستارۂ شام گاہی کہلاتا ہے۔ پس جب زہرہ آگے مقام میں ہوتا ہے بشرطیکہ نقطہ تقاطع

پرنہووے ناظر زمین کی نظر سے بالکل محجوب۔''

پہلی گفتگو سے بھی ایک اقتباس دیکھتے چلیے :

تلمیذ کلاں: قبلہ وکعبہ آج کی شب آسمان اس قدر صاف اور غبار سے پاک ہے کہ کبھی ایسا دیکھنے میں نہیں آیا۔''

تلمیذ خرد: جناب واقعی بھائی نے سچ عرض کیا بسبب کثرت صفائی کے بندہ بھی جس قدر چہار سو نظر کرتا ہے تارے بیحد نظر آتے ہیں ان کو کس طور شمار کرنا، کیونکہ سنا ہوں استادوں نے ان کو شمار کیا ہے...... اس مقدمہ مشکل کی راہ دریافت مجھ پر روشن فرمایئے۔''

> استاد: ابھی نہیں چند روز توقف کرو .... بالفعل اور ایک امر کی تعلیم تم کو میری مدنظر ہے۔ سنو جب ہم شب کو اوپر کی طرف یعنی منتہائے مدنظری سر پر کا جس کو آسمان کر تعبیر کرتے ہیں....... فقط آنکھ سے دیکھتے ہیں، وے نجوم بیحد جو ہم کو نظر آتے ہیں صرف باصرے کا دھوکا ہے ...... بدون استعانت دوربین کے ہزار سے زیادہ تارے نہیں نظر آتے۔ پس یہاں سے ثابت ہوا ظاہراً ہم کو جتنے تارے نظر آتے ہیں دراصل وے سب تارے نہیں ہیں بلکہ تخیلہ باصرے کا ہے۔''

کتاب میں شامل غلطت۔ کسو۔ تیئں۔ کنکے۔ ونکے جیسے متروک الفاظ ہیں۔

(۳) رسالہ علم آب :

یہ ''ستۂ شمسیہ'' سلسلے کی تیسری جلد ہے جو ۸ / ۵ کی تقطیع پر ۳۱۲ صفحات کی کتاب ہے۔ آخر میں چار صفحات کا غلط نامہ اور تین صفحات پر علم آب سے متعلق ۳۶ اشکال کو شامل کتاب کیا گیا ہے۔ کتاب کے کچھ صفحات کے حاشیہ پر ''ستۂ شمسیہ'' سلسلے کی دیگر کتب کے حوالے بھی شاملِ کتاب ہیں۔

نمونہ عبارت ملاحظہ ہو :

> ''کسب کیسا ہی آسان ہو، نہیں سمجھنا اس کے عمل میں کچھ خطر نہیں۔ چنانچہ لکھا ہوا دیکھنے میں آیا ہے۔ حکیم اسپالڈین اور اس کا مددگار، وے دونوں اپنے بنائے ہوئے آلے میں بیٹھ کر جہاز شکستہ اور ڈوبے ہوئے مال کے نکالنے کے واسطے دوبار دریا کے اندر جا کر نکلے اور دفعہ سوم جو

ڈوبے ایک ساعت تک رہے جب وقت بہت گزرا اور اوپر کے مددگاروں نے کچھ اشارہ مراجعت کا نہیں پایا، آلہ غوطہ زنی کو اوپر کھینچا، دیکھے کہ دونوں کی روح پرواز ہوگئی تھی۔''

کتاب میں برتے گئے متروک الفاظ درج ذیل ہیں :

ماٹی	———	مٹی
قیمت دار	———	قیمتی
وسکا	———	اُس کا
دوڑنے لاگا	———	دوڑنے لگا
جاگہ	———	جگہ

عبارت میں بعض جگہوں پر ''نے'' کا استعمال ہی نہیں کیا گیا مثلاً ''اور آپ فرمائے تھے۔'' اسی طرح لفظ ''کر'' کا استعمال ملاحظہ ہو : ''امتحان کرد کھلایئے'' (امتحان کر کے دکھلایئے)

کتاب میں برتی گئی چند انگریزی اصطلاحوں کا اردو ترجمہ دیکھتے چلیے :

زبردستی کا پمپ۔	Force pump
ہیڈرا میٹر۔	Hydrametre
علم آب۔	Hydrostatics
علم آب کی ترازو۔	Hydrostatic Balance
چوسنے کا پمپ۔	Sucking pump

(۴) رسالہ علم ہوا :

یہ 'سنۂ شمسیہ' سلسلے کی چوتھی جلد ہے جو ۸/۵ کی تقطیع پر ۳۳۵ صفحات کی کتاب ہے۔ دیباچہ کے علاوہ آخر میں ۴ صفحات کا غلط نامہ اور ۵ صفحات پر علم ہوا سے متعلق ۳۴ آلوں کے نقشے شاملِ کتاب کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب بھی استاد اور شاگرد کی گفتگو کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ ۲۳ ویں گفتگو سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

تلمیذ خرد : حضرت پیرا میٹر کی معنی بیان کیجئے۔

استاد : یہ لفظ یونانی ہے اور اس کے معنی آتش پیما ہے اور یہ ایک آلہ ہے منجمد چیزوں علی

الخصوص معدنیات کے بڑھاؤ کی پیائش کے واسطے جو بہ سبب گرمی کے ان کو حاصل ہوتا ہے
اور چیزیں کتنی بھی تھوڑی پھیلیں اس آلے کی استعانت سے تیسویں شکل کی مانند فقط آنکھ
سے نظر آ دیں گی۔''

کتاب میں بعض مقامات پر حاصل مصدر کی بجائے مصدر کا استعمال کیا گیا ہے۔مثلاً
''تعجب ہے کہ گونجنا اکثر سُننے میں کیوں نہیں آتا''۔
بعض الفاظ کی جمع دکنی قاعدہ کے مطابق بنائی گئی ہے مثلاً سیخ سے سیخاں اور شاخ سے شاخاں۔

(۵) رسالہ علم مناظر :

یہ''ستۂ شمسیہ ''سلسلے کی پانچویں جلد ہے جو ۸ / ۵ کی تقطیع پر ۷۷ صفحات کی کتاب ہے۔شروع میں دیباچہ اور تعریفات علم مناظر کے علاوہ آخر میں ۸ صفحات کا غلط نامہ اور متن سے متعلق ۴۲ اشکال شامل کتاب ہیں۔ ریوری رنٹ چارلس کی اصل کتاب میں علم مقناطیس سے متعلق مختصر رسالہ بھی شامل تھا جسے اس سے الگ کر کے ''ستۂ شمسیہ ''سلسلے کی چھٹی جلد میں داخل کر دیا گیا۔

یہ کتاب بھی سوال جواب کے انداز میں لکھی گئی ہے۔۱۵ ویں گفتگو سے اقتباس ملاحظہ :
تلمیذ خُرد : حضرت بہتر، بندہ ایسا ہی عمل کرے گا لیکن کچھ آپ نے اَبرو اور مژگاں کا ذکر نہ کیا، یہ کس کام پر آتی ہیں۔''
استاد : ابرو بہت آنکھ کو پناہ دیتی ہے جس وقت کہ بہت روشنی آنکھ پر آتی ہے اور کوئی جسم اگر پیشانی پر سے پھسل کر آنکھ پر گرے، آنکھ کو مضرت نہیں پہنچنے دیتی ہے اور مژگاں کام کرتی ہیں آنکھ کے پردے کی مانند، کس واسطے کہ جب کوئی شخص سوتا ہے وہ سنبھالتے ہیں۔حادثہ روشنی کو یعنی زیادہ روشنی آنکھ میں جانے نہیں دیتی ہیں .... اور یہ مژگاں ہزاروں صدمات سے آنکھوں کو بچاتے ہیں اور جو گرد کہ ہوا میں بھری ہوئی ہے اُن کو آنکھوں میں آنے نہیں دیتے ہیں۔''

چند انگریزی اصطلاحوں کا ترجمہ دیکھتے چلیے :

منہ دیکھنے کا آئینہ	Looking glass

کلاں بین	Microscope
منعکس دور بین	Reflecting Telescope
موازی شعاعیں	Convergent Rays
انبساطی شعاعیں	Divergent Rays
منعکس روشنی	Reflected Light
قندیل سحری	Magic lantern
لنٹر / لانتر	Lantern

(۶) رسالہ علم برقک :

یہ ''ستۂ شمسیہ '' سلسلے کی چھٹی جلد ہے جو ۸ / ۵ کی تقطیع پر ۲۰۶ صفحات کی کتاب ہے۔ جس میں علم برقک (یعنی جھٹکے کا علم) اور مقناطیس سے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ دیباچے کے علاوہ آخر میں ۳ صفحات پر ۱۳۱ اشکال اور کتاب کے خاتمے پر متن سے متعلق آلوں کے ۶ نقشے شاملِ کتاب کیے گئے ہیں۔ کتاب میں علم برقک سے متعلق ۱۶ مکالمے، گیال وی نیزم اور علم اور علم مقناطیس کے مُتعلق چار چار مکالمے شامل کیے گیے ہیں۔

تلمیذِ کلاں: ''حضرت آپ نے ابھی ذکر کیا تھا کہ سوئی کو مقناطیس دینے کے بعد وہ جھکتی ہے، کیا جھکاؤ اس کا یکساں رہتا ہے یا کچھ کچھ فرق کرتا ہے؟''

> اُستاد :'' یہ قریب الفہم ہے کہ اسی حالت میں ہوگی۔ اسی جائے میں اور راپٹ صاحب نے کہ قطب نما بنانے والا تھا۔ ناروے کے ملک میں ۱۵۷۶ء میں دریافت کیا کہ جُھکاؤ سوئی کا قریب ۷۲ درجے کے تھا اور اس کی تحقیق بادشاہی مدرسے میں بھی ہوئی اور یہ بات راست نکلی۔''

کتاب کی عبارت میں ڈاکٹر کو ''ڈنکٹر'' اور تلوار کو ''تروار'' لکھا گیا ہے۔ باقی وہ تمام خصوصیات اس کتاب میں بھی موجود ہیں جن کا ذکر دیگر رسائل کے ضمن میں ہوا ہے۔

ریوری رنٹ چارلس کے ان سات رسائل کے علاوہ شمس الامراء کے سنگی چھاپہ خانہ واقع حیدرآباد (دکن) سے طبع ہونے والی دیگر کتب میں دو کتابیں ایسی ہیں جن پر مترجمین کے نام درج نہیں۔

۱۔ ''اصول علم حساب ہندی زبان میں''، مطبوعہ: ۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۳۶ء

۲۔ ''رسالہ کسورات اعشاریہ''مطبوعہ:۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء

اوّل الذکر کتاب کے دیباچے میں اسے ''اہلِ فرنگ کے دستور پر'' لکھی گئی کتاب بتایا گیا ہے، لیکن اس کتاب کا ترجمہ ہونا یوں ثابت ہے کہ کتاب میں سکوں اور اوزان کی شرح برطانوی سکّہ اور اوزان کے مطابق دی گئی ہے بہ صورتِ دیگر حیدرآبادی سکّہ اور حیدرآبادی اوزان استعمال کیے جاتے۔ جب کہ ''رسالہ کسورات اعشاریہ'' کو ترجمہ بتایا گیا ہے نیز اس میں ''ستۂ شمسیہ'' والا سوالات وجوابات کا انداز اختیار کیا گیا۔

شمس الامراء کی مطبوعہ کتب سے ثابت ہے کہ ۳۷۔۱۸۳۶ء تک شمس الامراء کی رصدگاہ ''جہاں نما'' کے شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ میں سیّد شاہ علی (۳۹)، میر شجاعت علی، پنڈت رتن لعل مست، میر امان علی دہلوی (میر امّن)، غلام محی الدین متین حیدرآبادی، موسیو تنڈرس، حافظ مولوی میر شمس الدین محمد فیض، مسٹر جونس اور کیپٹن جوزہ جیسے نثر نگار، شاعر، سائنسدان، انجینئر اور ماہرین لسانیات کل سولہ افراد ملازم تھے۔ جان مرقس ۴۷۔۱۸۴۶ء کے لگ بھگ مترجم مقرر ہوئے، جبکہ ابوعلی، رائے منولال، شیر علی بن محمد قاسم، مرزا جان قندھاری، میر طفیل علی، مولوی احمد اور سیّد عبدالرحمٰن بہت بعد میں بطور مترجم آئے۔ یوں محولہ بالا دونوں کتب کے مترجمین کی تلاش کے سلسلے میں ذرا سی کوشش بھی بارآور ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ سیّد شاہ علی، متوطن اَدھونی اور پنڈت رتن لعل مست ولد چُنیا لعل نے ''رسالہ علم واعمال کرے کا'' (تالیف ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۶ء سنہ طباعت ۱۲۵۷ھ مطابق ۱۸۴۱ء) ترجمہ کیا ہے۔ ان دونوں مترجمین کی زبان بھی سلیس ہے لیکن ''ستۂ شمسیہ'' کی زبان اور ان کی زبان میں واضح فرق محسوس کیا جاسکتا ہے۔ سب سے پہلے ''رسالہ علم واعمال کرے کا'' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

> ''جب زمین، چاند اور سورج کے درمیان میں حائل ہوتی ہے تو زمین کا سایہ چاند پر گر کر اُس کا مانع نُور ہوتا ہے، اسی کو خوف قمر کہتے ہیں اور اس سبب سے خوف قمر حالت بدر میں ہونا ضروری ہے۔'' (ترجمہ : از سیّد شاہ علی و رتن لعل مست)
>
> اب صرف سیّد شاہ علی کی زبان دیکھیے :

''اس ذرّہ بے مقدار شاہ علی متوطن اَدھونی نے مشہور شرح چغمنی کو کہ جس کی عبارت کی دقّت اور معانی کی نزاکت، باریک بینان نازک خیال پر ظاہر وباہر ہے۔ زبان ہندی میں بہ عبارت سلیس و صاف ترجمہ کر کے اُس مہرنیّر (شمس الامراء) کی رائے روشن سے مسائل اصل میں تقدیم و تاخیر کی اور مسئلہ ضعیف کی قوی سے تبدیل۔''
(ترجمہ: ''شرح چغمنی'' کے دیباچے سے)

اس سے قبل سید شاہ علی نے مادری زبان کے ادھونی انگ میں تعلیم وتدریس کے فوائد بیان کیے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ لکھتا ہے :

''دانایان روزگار اور علاقلان تجربہ کار پر پوشیدہ نہیں کہ جس قوم میں زبان مروج سے جوفن تحریر وترقیم پاتا ہے، صاحب زبان نہایت آسانی کے ساتھ اس فن کا فائدہ اٹھاتا ہے بلکہ بہ نسبت دوسری زبان کے مدّت قلیل میں حاصل اور کامل ہوتا ہے۔ کیونکہ جو مدّت وہاں معرفت الفاظ میں جاتی ہے، یہاں وہ تحصیل معانی میں کام آتی ہے۔'' (ترجمہ ''شرح چغمنی'' کے دیباچے سے اقتباس)

''شرح چغمنی'' کا ترجمہ ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء میں کیا گیا، اس کا قلمی نسخہ ادارہ ادبیات اردو، خیریت آباد، حیدرآباد دکن میں محفوظ ہے۔

موازنے کے لیے اب صرف پنڈت رتن لعل مست کی زبان دیکھیے :

''یہ رسالہ ہے موسوم بہ منتخب البصر بیچ علم دورنما کے کہ اسے علم انظار بھی کہتے ہیں اور اس علم کی معلومات سے نقشے اجسام وسطوح کے کھینچے جاتے ہیں ...... اس علم میں اگرچہ ایک کتاب مبسوط فارسی زبان میں موسوم بہ رفیع البصر لکھی ہوئی صاحبزادہ بلند اقبال عالی قدر محمدؐ رفیع الدین خاں المخاطب بہ عمدۃ الدولہ بہادر ...... کی ہے۔''

پنڈت رتن لعل مست کے ترجمہ کردہ ''رسالہ مُنتخب البصر'' کے متن سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

س :''حضرت اگر ہم کو شکل الٹی نظر آتی ہے تو ہم کو سیدھی کیوں نظر آتی ہے ؟''

ج :''ہم لوگوں کو ایک مدّت سے عادی ہوگئی ہے۔ بہ سبب کثرت امتحان کے ذہن تمیز کرتا ہے کہ یہ سیدھی ہے بلکہ اس کے اوپر ایک برہان ساطع یہ ہے جو بچے شیر خوار ہیں ان کے سامنے جو شئے آتی ہے اس کو بلا شبہ پکڑ لیتے ہیں اور حس لامسہ کے سبب سے اور لوگوں کے کہنے سے ان کو چند مدّت میں تمیز سیدھے الٹے کی ہوتی ہے اور ان کی مفصل تکرار اور براہین علم مناظر میں لکھی ہوئی ہے اور یہ علم اسی میں سے وضع ہوا ہے۔ اس کو علم انظار کہتے ہیں.........''

(''رسالہ مُنتخب البصر'' سنہ تالیف ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء سنہ طباعت ۱۲۵۷ھ مطابق ۱۸۴۱ء سے اقتباس)

اب سید شاہ علی اور رتن لعل کے تراجم کی زبان کے مقابلے میں ''اصول علم حساب ہندی زبان میں'' اور'' رسالہ کسورات اعشاریہ'' سے ایک ایک ٹکڑا دیکھیے :

ا۔ ''مرقوم ہے وہ مثال کہ گذری اس میں معنی بخشتی ہے''۔

۲۔ ''اُس کسورات عشر کے اعمال مانند کسور مشہور کے ہوتے ہیں''۔

مندرجہ بالا پہلا ٹکڑا تو ایسا ہے کہ جیسے ''باغ و بہار'' میں سے اُچک لیا گیا ہو۔

دوسرا ٹکڑا ٹیکنیکل ہونے کے باوجود اس بات کی چغلی کھاتا ہے کہ میر امّن دہلوی کا ہی ہے۔ اس لیے کہ اس میں جمع الفاظ کے ساتھ اشارہ قریب 'ان' کی بجائے 'اُس' لکھا گیا ہے، جو ''باغ و بہار'' والے منفرد اسلوب کی پہچان ہے۔ اس کے علاوہ 'اصول علم (۴۰)'، کے ترجمے میں میر امّن دہلوی کی لفظیات اپنی صاف پہچان کرواتی ہے مثلاً ''بغیر'' کی بجائے ''بدون''، ''باوجود'' کی بجائے ''باوصف''، ''اس کے بعد' کی بجائے ''تس پیچھے''، ''ضرورت'' کی بجائے'' حاجت''، ''غلطی'' کی بجائے ''خطا''، ''طریقہ'' کی بجائے ''ڈول''۔

تیسرا مترجم غلام محی الدین متین حیدر آبادی ہے، جس کی زبان کا دکنی انگ (جس کی مثال ''رسالہ علم ہوا'' کے باب میں دی گئی ہے) ان دونوں کتابوں میں ناپید ہے۔ جبکہ حافظ مولوی میر شمس الدین محمد فیض کی زبان مُعرّب ہے اور موسیو تنڈرس کی زبان مُفرّس۔ زبان کی یہ دونوں خصوصیات اِن کتابوں میں نہیں پائی جاتیں۔ باقی رہا مسٹر جونس اور کیپٹن جوزہ کا معاملہ، تو یہ طے ہے کہ یہ دونوں انگریز مُنشی، مقامی مترجمین کی سہولت کے لیے تھے۔ ان کا کام صرف گُنجلک انگریزی عبارت کو صاف کرنا تھا، تاکہ اردو میں ترجمہ کرنا ممکن ہو۔ اب اگر ان دو حضرات میں سے کسی ایک نے میر امان علی (میر امّن) کی مدد کی تو کچھ بعید نہیں۔ لیکن ان دو کتابوں کا اسلوبیاتی تجزیہ ثابت کرتا ہے کہ ان کا ترجمہ میر امّن دہلوی نے ہی کیا۔ بے شک، میر امّن کو انگریزی زبان پر اتنی دسترس حاصل نہ تھی کہ تن تنہا ترجمہ کرتے۔ لیکن ایک ٹیم کی صورت، وہ جس حد تک سُودمند ثابت ہو سکتے تھے، رہے۔ یہ اُن کا اسلوب ثابت کرتا ہے۔

یوں میر امّن دہلوی کی ''باغ و بہار'' اور ''گنج خوبی'' کے علاوہ مطبوعہ کتب کی سطح پر گیارہ (۱۱) انگریزی سے ترجمہ کردہ کتب کا اضافہ، اُس نابغہ روزگار ہستی سے متعلق تحقیق کے دائرے کو وسیع کرتا ہے۔

o

پس نوشت: رشید حسن خاں سے معاملہ:

میرا مقالہ: ''میر امّن دِلّی والے''، ''نقوش'' لاہور، بابت: دسمبر ۱۹۸۷ء میں شائع ہُوا، لیکن **اللھمہ ضِد بہ ضِد** کے مِصداق درج ذیل حقائق رشید حسن خاں کے نزدیک مُتنازعہ فیہ ہیں :

۱۔ میر امّن کی تاریخ پیدائش لگ بھگ ۱۷۵۰ء

۲۔ میر امّن کا اصل نام (میر امان علی دہلوی) اور تخلص (امّن)۔

۳۔ فورٹ ولیم کالج سے جون ۱۸۰۶ء میں مُستعفی ہونے کا اصل سبب بڑھاپا نہیں، پیرانہ سالی کا عذر۔

۴۔ میر یار علی جان صاحب کا میر امّن سے تعلق، یعنی میر امّن کا بیٹا ہونا۔

۵۔ میر امّن کا ''ستۂ شمسیہ'' کے مطابق ۳۷۔۱۸۳۶ء تک حیات ہونا۔

۶۔ میر امّن کا انگریزی سے ترجمہ کردہ نو (۹) رسائل کا مترجم ہونا۔

درج بالا معاملات پر بات کرتے ہوئے میں نے اپنے مقالہ بابت دسمبر ۱۹۸۷ء میں عبدالغفور نساخ مؤلف ''سخن شعراء''، مولوی سیّد محمد مصنف ''اربابِ نثرِ اردو''، حامد حسن قادری مصنف ''داستان تاریخ نثر اردو'، دیباچہ ''ستیہ شمسیہ'' از نواب محمد فخر الدین خاں المخاطب بہ شمس الامراء، گارسیں دتاسی، سیّد محمد مُبین نقوی مُرتّب ''تاریخ یختی مع دیوان جان صاحب'' اور محمد عبداللہ خویشگی مولف ''فرہنگِ عامرہ'' کا حوالہ دیا تھا لیکن یہ تمام کی تمام اسناد رشید حسن خاں صاحب کے لیے قابلِ قبول نہیں، جبکہ میرے کہے کو ردّ کرتے ہوئے گارسیں دتاسی کا نام وہ سرے سے گول کر گئے۔ نیز اُن کا طریق استدلال مُحققانہ نہیں، جارحانہ ہے۔ وہ ردِّ تحقیق میں از حد عُجلت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اِس ''نشاطِ کار'' سے پوری طرح لُطف اندوز ہونے کے لیے رشید حسن خاں کا درج ذیل بیان دیکھتے چلیے :

''رسالہ نقوش (لاہور) کے خاص نمبر (دسمبر ۱۹۸۷ء) میں مرزا حامد بیگ صاحب نے ''میر امّن دِلّی والے'' کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا ہے، جس میں بے بنیاد قیاسات پر درجِ مضمون تفصیلات کی بنیاد رکھی ہے؛ اس کے نتیجے میں وہ بہت آسانی اور روانی کے ساتھ بہت سی باتیں لکھتے چلے گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ میر امّن جب دہلی سے نکلے ہیں ''اُس وقت ان کی عمر تیرہ برس رہی ہوگی، یوں ۱۷۵۰ء کے لگ بھگ میر امّن پیدا ہوئے ہوں گے۔'' اس تعین کی ضرورت مقالہ نگار کو یوں پیش آئی کہ اُنھوں نے یہ لکھا ہے کہ میر امّن بڑھاپے کے سبب سے فورٹ ولیم کالج سے ریٹائر نہیں کیے گئے تھے (جیسا کہ عتیق صدیقی نے معتبر حوالے سے لکھا ہے) بل کہ ''گمانِ غالب ہے کہ میر امّن نے کالج کے بگڑتے ہوئے حالات کے پیشِ نظر بر وقت حیدر آباد کا رُخ کیا ہو'' اور یوں مقالہ نگار نے

نہایت آسانی کے ساتھ میر امّن کو نواب شمس الامراء کے قائم کردہ ''دارالترجمہ'' میں پہنچادیا، جہاں وہ مختلف سائنسی کتابوں کے ترجمے میں شریک رہے۔

ان سب بے بنیاد اور قطعی طور پر نا قابلِ قبول قیاسات کی بنیاد دارالترجمہ کی ایک کتاب ''ستۂ شمسیہ'' پر رکھی گئی ہے، جس کے مقدمے میں نواب شمس الامراء نے لکھا ہے کہ ''میر امان علی دہلوی اور غلام محی الدین حیدر آبادی ...... جو ملازمانِ سرکار ہیں، حکم کرنے میں آیا کہ ان علومِ مذکورہ کو زبانِ انگریزی سے اردو زبان میں ہمارے رُوبرو ترجمہ کریں۔'' مقالہ نگار نے یہ فرض کرلیا کہ ''میر امان علی دہلوی'' کوئی اور نہیں، میر امّن دلّی والے تھے۔ ''زمانی اعتبار سے بھی میر امان علی، میر امّن ہی ہوسکتے ہیں۔ نیز امّن مکمل نام نہیں، تخلص معلوم ہوتا ہے اور یہ تخلص میر امان علی کا موزوں تر ہے'' (نقوش صفحہ ۳۳۶)۔ اس لیے ضروری تھا کہ کم از کم ۱۸۴۰ء تک میر امّن کو زندہ رکھا جائے، ''ستیہء شمسیہ کا دیباچہ میر امّن کو ۱۸۴۰ء تک حیات ثابت کرتا ہے'' (ایضاً ص ۳۴۰) اِس کی صورت انھیں یہ نظر آئی کہ فرض کرلیا جائے کہ وہ ''۱۷۵۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے۔'' مقالہ نگار نے اپنے طویل مقالے میں میر امّن سے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اُس میں سے کوئی ایک بات بھی قابلِ قبول نہیں اور اس کی اصل وجہ وہی ہے کہ قیاسات کی بنیاد مفروضات پر رکھی گئی ہے'' (مقدمہ: ''باغ و بہار'' صفحہ ۲۶ تا ۲۷)

رشید حسن خاں کے اِس بیان کا جائزہ میری معروضات کے تناظر میں لیجیے۔ صاف معلوم ہوجائے گا کہ موصوف نے ''ردِّ کفر'' میں کہاں کہاں ڈنڈی ماری۔

میر امّن کی تاریخِ پیدائش سے متعلق ہوم ڈیپارٹمنٹ، پبلک پروسیڈنگز کا امپیریل ریکارڈ بابت فورٹ ولیم کالج کلکتہ، نئی دہلی بالکل خاموش ہے۔ خود میر امّن نے ''باغ و بہار'' اور ''گنج خوبی'' کے دیباچہ جات اور استعفیٰ سے متعلق عرضی میں اپنی تاریخ پیدائش درج نہیں کی۔ اسی طرح ''باغ و بہار'' کے دیباچے میں میر امّن کے دِلّی چھوڑنے، عظیم آباد (پٹنہ) میں قیام کی مدّت اور اہل و عیال سے متعلق محض اشارے ہی ملتے ہیں۔ البتہ کچھ واضح اشارے بھی ہیں۔ مثلاً

''جہاز غارت ہُوا'' سے مُراد ''منصب دار قدیمی'' اور ''خانہ زاد موروثی'' گھرانے کی بربادی۔ میں نے سورج مل جاٹ کے دہلی پر دوسرے حملے کی تاریخ ۱۷۶۱ء لکھی تھی، جب کہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے مطابق درست تاریخ جمادی الآخر ۱۱۷۷ھ مطابق دسمبر ۱۷۶۳ء ہے (بہ حوالہ دیباچہ: ''نادراتِ شاہی'') اور یہ بات بھی میرے حق میں جاتی ہے۔ امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں :

''مرہٹوں کا زور ٹُوٹا تو جاٹوں نے سر اُٹھایا۔ بھرت پور کا راجہ سُورج مل، اِس گروہ کا سردار تھا۔

ابدالی کے چلے جانے کے بعد اُس نے آگرہ پر قبضہ کرلیا تھا۔ اب جمادی الآخر ۱۱۷۷ھ (دسمبر ۱۷۶۳ء) میں دہلی پر ہلّہ بول دیا۔ وہ اس لڑائی میں مارا گیا تو اُس کے بیٹے جواہر سنگھ نے ملہار راؤ مرہٹہ اور عماد الملک کی مدد سے دوبارہ دہلی کو گھیر لیا۔'' امتیاز علی عرشی کے اس بیان کی بُنیاد ''مفتاح التواریخ'' جیسا مُستند حوالہ ہے۔

اگر سُورج مل جاٹ دہلی پر حملے کے دوران ۲۵ دسمبر ۱۷۶۳ء کو مارا گیا اور اُس کے بیٹے جواہر سنگھ نے ملہار راؤ مرہٹہ سے مدد لے کر دوبارہ دہلی کو گھیرا تو سال ۱۷۶۴ء چڑھ گیا۔ یوں سُورج مل جاٹ کے بیٹے جواہر سنگھ کے زمانۂ اقتدار: ۶۵۔۱۷۶۴ء میں جاگیریں ضبط ہوئیں اور اُس کے بعد میر امّن جلاوطن ہوئے، تو محمد حسین آزاد کی بتائی ہوئی میر امّن کی تاریخ پیدائش بہ عہد محمد شاہ (م: ۱۷۴۸ء) کے مطابق سترہ اٹھارہ برس اور میرے قیاس (۱۸۵۰ء) کے مطابق پندرہ سولہ برس بنتی ہے۔ یُوں والدین کے ایما پر میر امّن کا پندرہ سولہ برس کی عمر میں دِلّی سے عظیم آباد (پٹنہ) کے لیے نکلنا، رشید حسن خاں صاحب کے لیے انہونی بات کیوں کر ہے، سمجھ میں نہیں آیا۔

''سبۂ شمسیہ'' (تکمیل: ۳۷۔۱۸۳۶ء) کے مطابق اگر ۳۷۔۱۸۳۶ء تک میر امّن حیات تھے، تب بھی اُن کی عمر چھیاسی، ستاسی برس سے تجاوز نہیں کرتی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ رشید حسن خاں، میر امّن (پ: لگ بھگ ۱۷۵۰ء) کو بہ وقتِ استعفیٰ (۴ جون ۱۸۰۶ء) محض پچپن (۵۵) چھپن (۵۶) برس کی عمر میں ہی بڈھا کھوسٹ کیوں ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ جب کہ فورٹ ولیم کالج کی انتظامیہ بھی میر امّن کی جانب سے بڑھاپے کے عُذر پر چیں بہ جبیں ہے۔ میر امّن کے اس بیان پر غور کیجیے: ''ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہے۔ کتنے برس بلدۂ عظیم آباد میں دم لیا۔'' اس محاورے اور صیغۂ واحد متکلم سے صاف ظاہر ہے کہ وہ کم عمری میں دِلّی سے تنہا نکلے، عظیم آباد میں جوان ہوئے، شادی کی۔ بصورت دیگر دِلّی سے نکلنے کے بیان میں اہل و عیال کا ذکر ضرور کرتے۔ یہ ایک ایسی داخلی شہادت ہے جو میر امّن کو دِلّی سے نکلتے وقت کم عمر ثابت کرتی ہے۔

میر امّن کے ملازمت سے سُبک دوشی کے باب میں جب رشید حسن خاں یہ فرماتے ہیں کہ: ''۱۸۰۶ء میں جب وہ پیرانہ سالی اور جسمانی معذوری کا عذر کرتے ہیں، تو اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ عمر کے لحاظ سے وہ اُس وقت بڑھاپے کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ محض قیاساً یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اُس وقت اُن کی عمر پینسٹھ سال سے کم نہ ہوگی۔ ستر سال سے بھی کچھ زیادہ ہو، تو بھی یہ قرینِ قیاس رہے گی، بل کہ زیادہ قرینِ قیاس ہوگی۔''

(مقدمہ ''باغ و بہار'' ص ۴۳)

کیا متناقص بالذات (PARADOXICAL) صورتِ احوال ہے۔ میر امّن ''پیرانہ سالی اور جسمانی

معذوری کا عذر'' بھی تراش رہا ہے اور اس کی عمر پینسٹھ سال سے کم بھی نہیں، بلکہ ''ستّر سال سے بھی کچھ زیادہ'' بتائی جا رہی ہے۔ مجھے مطعون کیا گیا مع ثبوت قیاس کرنے پر، جب کہ خاں صاحب کو یہ لائیسنس حاصل ہے کہ جو چاہیں، محاکمہ کے انداز میں کہتے چلے جائیں۔

خود رشید حسن خاں نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے (مقدمہ: ''باغ و بہار'' ص ۵۸) کہ بڑھاپے کے باوجود میر امّن نے ''گنجِ خوبی'' (سالِ تکمیل: ۱۲۱۷ھ مطابق ۳-۱۸۰۲ء) میں گلکرسٹ کے نظامِ املا کی پابندی کیوں کر کی۔ یعنی اتنی مختصر مدّت میں بڈھے ٹھڈے میر امّن نے گلکرسٹ کے وضع کردہ سانچے میں خود کو کیسے ڈھال لیا۔ واضح رہے کہ گلکرسٹ کے ''نظامِ املا'' سے مُراد حروف کے درست تلفظ کی صحیح مخرج سے ادائیگی کے لیے علاماتِ قرأت، الفاظ پر حرکات، نیز مجہول اور لین آوازوں کے لیے مخصوص علامات کا نظام ہے، جسے گلکرسٹ نے برطانوی زیرِ تربیت افسران (طلبہ) کے لیے بطور خاص وضع کیا تھا۔

رشید حسن خاں صاحب اِس صورتِ احوال پر حیران ضرور ہیں لیکن میری یہ بات کسی طور مان کر نہیں دیتے کہ میر امّن، دِلّی سے کم عمری میں نکلے۔ اسی نوع کی ٹھوکر پروفیسر ممتاز حسین نے بھی کھائی تھی، جب اُنھوں نے ''باغ و بہار'' کے دیباچے میں ''گھر میں دس چھوٹے بڑوں کی پرورش'' پانے والا بیان پڑھ کر میر امّن کو قیامِ فورٹ ولیم کالج میں ہی بُڈھا کھوسٹ ثابت کر دیا تھا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر میر امّن، ۴جون ۱۸۰۶ء میں بہ وقتِ استعفیٰ بڈھے کھوسٹ تھے تو ۴مئی ۱۸۰۱ء میں اُن کی عمر کیا رہی ہوگی، جب انھیں ملازمت دی گئی؟ کیا محض پانچ برس میں ناکارہ ہو جانے والے شخص کو بطور ''منشی'' بھرتی کیا جا رہا ہے، اِس سے بطور مُصنّف اور مترجم کام لیا جا رہا ہے اور اُس کی اضافی ذمہ داریوں میں یہ کام بھی شامل ہے کہ وہ قلعہ میں مقیم نوجوان بدیسی افسران کو ہر روز ناشتے کے بعد سے دوپہر کے کھانے تک پڑھائے۔ جبکہ تدریس کا یہی کام اکثر شام کو ہاسٹل کے کمروں میں جا کر بھی کرنا پڑتا تھا۔[۴۱]

رشید حسن خاں نے ردِّ کفر میں یہ نہیں سوچا کہ اگر میں نے میر امّن کی عمر محض اِس لیے گھٹا کر لکھی کہ اُنھیں (۱۸۴۰ء نہیں) ۳۷-۱۸۳۶ء تک حیات ثابت کرنا تھا، تو میں نے میر امّن کا اتنا طویل قیام، عظیم آباد (پٹنہ) میں کیوں ظاہر کیا؟ جب کہ اُنھیں جاگیر کی ضبطی کے بعد بھی کچھ مُدّت دِلّی میں مُقیم ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ سفر سے متعلق میر امّن نے کوئی واضح اشارہ بھی نہیں دیا، نیز عظیم آباد سے متعلق صرف اتنا لکھا کہ ''کتنے برس بلدہ عظیم آباد میں دَم لیا۔ لیکن میرے نزدیک اُن کا عظیم آباد میں قیام مختصر نہیں طویل ہے۔ نتیجہ، میر امّن نے بے شک 'اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا'' لیکن پھر بھی ''شور بور'' بہ معنیٰ ''شرابور'' اور ''بہری'' بہ معنیٰ ''چندہ'' جیسے پُوربی اثرات سے بچ نہ سکے۔ اسی

طویل قیام کے سبب سیدعزیزالدین احمد بلخی المتخلص بہ رازؔ عظیم آبادی مؤلف ''تاریخ شعرائے بہار''(۴۲) اور خواجہ عبدالمجید مؤلف ''جامع اللغات''(۴۳) نے میر امّن کو عظیم آباد کا باشندہ لکھا ہے۔

اب اگر میں نے یہ کہا کہ میر امّن، پیرانہ سالی یا جسمانی معذوری کے سبب ریٹائر نہیں ہوئے، تو رشید حسن خاں کو یہ بات مان لینے میں کیا چیز مانع ہے؟ محض اس لیے کہ اُن کے خیال میں، میر امّن بوڑھے ہو گئے اور دارالترجمہ حیدرآباد، دکن میں کام کرنے کے قابل نہ رہے تھے۔ اگر ایسا ہی ہے تو وہ یہ کیوں نہیں بتاتے کہ ۴ جون ۱۸۰۶ء میں میر امّن مستعفی ہو کر کدھر گئے؟ جب کہ یہ بات تو طے ہے کہ میر امّن نے استعفیٰ دیا، یا ایسا عذر تراشا کہ اُنھیں کالج سے فارغ کر دیا جائے۔ اِس عذر کی تصدیق عتیق صدیقی کے مضمون مطبوعہ: ''ہماری زبان''، نیز پروسیڈنگز آف دی کالج آف فورٹ، ہوم میسلینیس ریکارڈ نمبر ۵۶۰ بابت: ۴ جون ۱۸۰۶ء، صفحہ ۱۳۶، نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی (بھارت) سے بھی ہوتی ہے۔ کالج کونسل، فورٹ ولیم کالج کے ریکارڈ کے مطابق :

''۴ جون ۱۸۰۶ء کو فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی شعبہ کے پروفیسر کی شکایت پر کہ میر امّن نے ایک طالب علم کو پڑھانے سے انکار کیا ہے، کالج کونسل کے سامنے پیش کیے گئے۔ الزام کو تسلیم کرتے ہوئے پیرانہ سالی اور جسمانی معذوری کا اُنھوں نے عذر پیش کیا۔ اُن کا بیان سُننے کے بعد کالج کونسل اِس نتیجے پر پہنچی کہ میر امّن کالج کی خدمات سے سُبک دوش ہونے کے خواہش مند معلوم ہوتے ہیں، طے پایا کہ اِس مہینے کی تنخواہ کے علاوہ اور چار مہینوں کی تنخواہ دے کے کالج کی خدمات سے سُبک دوش کیا جائے۔''(۴۴) عذر تراشنے کی بات تو عتیق صدیقی نے بھی کی ہے۔ اُس سے کیا مُراد ہے؟ اب اگر عتیق صدیقی نے یہ لکھا کہ وہ ریٹائر ہوئے، تو غلط نہیں لکھا؛ لیکن عتیق صدیقی نے یہ کہاں لکھا کہ میر امّن، پیرانہ سالی و جسمانی معذوری تک پہنچ کر ریٹائر ہوئے؟ جب کہ میر امّن کے مُستعفی ہونے کے فوراً بعد وفات کے تصور کو ''ہماری زبان'' علی گڑھ بابت: ۵ اکتوبر ۱۹۵۹ء میں عتیق صدیقی بھی غلط ثابت کر چکے ہیں۔

گلکرسٹ کے کالج چھوڑنے کے بعد اُن کے قریبی حلقے کے لوگوں میں میر امّن کی طرح میر بہادر علی حسینی نارنولی نے بھی یہی کیا۔ اُنھوں نے بھی فورٹ ولیم کالج سے ۱۸۰۶ء ہی میں فراغت پالی۔ راسخ ۱۲۲۰ھ مطابق ۱۸۰۶ء میں کلکتہ میں تھے۔ اُنھوں نے ''مثنویاتِ راسخ'' میں میر شیر علی افسوس، کاظم علی جواں اور مظہر علی وِلا کا ذکر تو کیا، حسینی کا نام نہیں لیا۔ نیز میر بہادر علی حُسینی نے شہاب الدین کی فارسی تصنیف ''تاریخ آسام'' کا اردو ترجمہ ۱۲۲۰ھ مطابق ۶-۱۸۰۵ء میں کیا تھا، جو فورٹ ولیم کالج سے شائع نہیں ہوا۔ حُسینی کا ترجمہ کردہ گلکرسٹ کے سلسلہ لسانیات

کا تیسرا حصّہ ''رسالہ گلکرسٹ'' بھی پہلی بار ۱۲۳۵ھ مطابق ۲۰۔۱۸۱۹ء میں طبع ہُوا (دیکھیے: مقدمہ: ''قواعدِ زبان اردو'' (رسالہ گلکرسٹ) از خلیل الرحمٰن داؤدی مطبوعہ مجلسِ ترقی ادب لاہور طبع اوّل: دسمبر ۱۹۶۲ء)۔ یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ حسینی بھی ۱۸۰۶ء میں فورٹ ولیم کالج چھوڑ کر کہیں اور مصروفِ کار تھے۔

میرامّن کی کارکردگی سے متعلق جس پروفیسر کی شکایت پر کالج کونسل کی کارروائی بابت: ۴ جون ۱۸۰۶ء عمل میں آئی، وہ کپتان جیمز مَوئٹ تھا، جس نے ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے استعفیٰ کے ٹھیک ایک سال اور سات ماہ بعد جنرل سر رابرٹ ایبر کرامبی کی سفارش پر ۱۶ ستمبر ۱۸۰۵ء کو ہندوستانی شعبے کا چارج سنبھالا۔ کپتان جیمز مَوئٹ ۱۹ جنوری ۱۸۰۴ء سے اس عہدہ کے حصول کے لیے کوشاں تھا۔ بنگال اسٹیبلشمنٹ کی انجینئرنگ کور کے اسی کپتان کے نام گلکرسٹ نے ''باغ و بہار'' کی، اور وہ گلکرسٹ کی مُسلسل دل آزاری کا باعث بنتا رہا۔ حکامِ بالا تک گلکرسٹ کے خلاف شکایات بھی اُسی نے پہنچائیں۔ ہندوستانی پریس کلکتہ (جو گلکرسٹ کی ذاتی پریس تھی) سے طباعت کے متعلق خُرد بُرد کے الزامات بھی اُسی کے تراشے ہوئے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کالج کی ناسازگار فضا کو دیکھتے ہوئے میرامّن سے قبل ۲۳ فروری ۱۸۰۴ء میں میرامّن کے مُحسن ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے فورٹ ولیم کالج کی ملازمت چھوڑنے کے لیے خرابیِ صحت کا بہانہ بنایا اور کالج کونسل کے سیکرٹری، روتھ مین کو استعفیٰ لکھ بھیجا۔ عتیق صدیقی کے مطابق گلکرسٹ کا استعفیٰ ۲۴ فروری ۱۸۰۴ء کو منظور کرلیا گیا۔

یُوں فورٹ ولیم کالج کی ملازمت از خود چھوڑنے سے متعلق گلکرسٹ اور میرامّن کا انداز نہ صرف ملتا جلتا ہے بلکہ اُن کا فیصلہ بھی بَروقت اس لیے تھا کہ ۲۷ جنوری ۱۸۰۲ء میں (جب کالج کو قائم ہوئے دو سال بھی نہ ہوئے تھے) فورٹ ولیم کالج کے بانی لارڈ مارکوئس ولزلی (گورنر جنرل مئی ۱۷۹۸ء تا ۲۹ اگست ۱۸۰۵ء) کو کورٹ آف ڈائریکٹرز، برطانیہ کی جانب سے یہ چِٹھی موصول ہوئی کہ کالج فوری طور پر بند کر دیا جائے، لیکن لارڈ ولزلی نے کالج کونسل کو کالج بند کرنے سے مُتعلق ۳۱ دسمبر ۱۸۰۳ء تک روک دیا اور ۵۔ اگست ۱۸۰۲ء کو اُس چِٹھی سے متعلق کورٹ آف ڈائریکٹرز کو ایک طویل سفارشی خط لکھا۔ وہ لکھتا ہے: ''....... کورٹ کے حکم کی تعمیل کی جاتی ہے تو اِس وقت جو فتنے بَرپا ہوں گے، وہ میں یہاں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ کالج کو قائم رہنا چاہیے، بصورت دیگر سلطنت ختم ہو جائے گی۔''(۴۵)

لارڈ ولزلی کے اِس خط کے جواب میں کورٹ آف ڈائریکٹرز نے چِٹھی (محررہ: ۲ ستمبر ۱۸۰۳ء) کے تحت چند پابندیوں کے ساتھ کالج کو تا حکمِ ثانی جاری رکھنے کی اجازت دی۔ (۴۶) لیکن جب لارڈ ولزلی ۲۹ اگست ۱۸۰۵ء

میں مُستعفی ہوکر ۵ اکتوبر ۱۸۰۵ء کو غازی پور میں اچانک انتقال کر گیا تو کورٹ آف ڈائریکٹرز نے ۲۱ مئی ۱۸۰۶ء سے ہیلی بری (برطانیہ) میں اسی نوع کا ایک کالج قائم کرنے اور فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کے اخراجات گھٹانے کا فیصلہ سُنا دیا۔ نتیجے کے طور پر فورٹ ولیم کالج کے تدریسی عملے میں جبری تخفیف کر دی گئی۔ جنوری ۱۸۰۷ء میں کالج کے اخراجات گھٹانے کے ساتھ ساتھ پرووسٹ اور نائب پرووسٹ کے عہدے ختم کر دیئے گئے اور مُنشیوں کی تعداد گھٹا دی گئی۔

ایسے میں اگر جان گلکرسٹ (پ: ۱۷۵۹ء) بعداز استعفیٰ ۱۸۰۴ء میں برطانیہ واپس جا کر ایڈنبرا یونیورسٹی سے ایل۔ایل۔ڈی کی اعزازی ڈاکٹریٹ پاتا ہے، ۱۸۰۶ء تا ۱۲۔۱۸۱۵ء Haileybury College (نزد برٹ فرڈ) میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کو لگ بھگ دس برس تک ہندوستانی زبانوں کی تعلیم دیتا ہے، ۱۸۱۶ء تا ۱۸۱۸ء دو برس پرائیویٹ سطح پر انڈین سول سروس (ICS) کے اُمیدواران کی رہبری کرتا ہے، ۱۸۱۸ء تا ۱۸۲۵ء سات برس اورینٹل انسٹی ٹیوٹ میں بطور پروفیسر تدریسی خدمات انجام دیتا ہے اور مُجلہ ''رسالہ'' کے کئی شمارے مُرتب کرتا ہے، ۱۸۲۵ء تا ۱۸۳۹ء چودہ برس پرائیویٹ حیثیت میں انڈین سول سروس کے ملازمین کی راہنمائی کرتا ہے اور تبدیلی آب وہوا کے لیے فرانس جاتا ہے، جہاں پیرس میں ۹ جنوری ۱۸۴۱ء میں بہ عمر بیاسی برس اُس نے انتقال کیا، تو کیا میر امّن (پ: لگ بھگ ۱۷۵۰ء) کا ۴ جون ۱۸۰۶ء میں کلکتہ سے حیدر آباد دکن پہنچ جانا اور ''ستۂ شمسیہ'' کے دیباچہ کے سنہ تحریر ۳۷۔۱۸۳۶ء تک بہ عمر چھیاسی برس زندہ رہنا اتنا ہی ناقابل فہم ہے، جتنا کہ رشید حسن خاں نے قیاس کیا؟

میں نے ''ستۂ شمسیہ'' کے دیباچہ محررہ: ۳۷-۱۸۳۶ء از شمس الامراء ثانی، نواب محمد فخر الدین خاں تک یا اس سے کچھ پہلے تک میر امّن کو حیات لکھا تو رشید حسن خاں اور ڈاکٹر گیان چند چیں بہ جبیں ہوئے لیکن چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ انھی خطوط پر کام کرتے ہوئے جے پور (بھارت) کے ڈاکٹر فیروز احمد نے میر امّن کے ۱۸۱۳ء تک حیات ہونے کا ایک ثبوت ڈھونڈھ نکالا۔ اُنھوں نے ''باغ و بہار'' کے ایک انگلش مترجم ایل۔ایف اسمتھ کے "The Tale of Four Durwesh"، مطبوعہ: منروا پریس، کلکتہ، طبع اوّل ۱۸۱۳ء کے دیباچہ محررہ ۱۸۱۳ء میں سے چند سطور درج کی ہیں، ملاحظہ ہوں:

> "I hope, my friend Meer Umman may raise a smile exhilarate a languid hour. He will likewise instruct those who wish to view the outre pictures of eastern manners, his Genii and Demons, his Fairies and his Angels, formed parts of his religions and creed...."

(''باغ و بہار'': خطی نسخۂ جے پور بہ خط: امام علی اسدی ۱۲۴۷ھ مطابق ۱۸۳۲ء، ناشر: ڈاکٹر فیروز احمد، D-109،

شانتی نگر، بالمقابل این۔بی۔سی روڈ، جے پور، بھارت، طبع اوّل:۲۰۱۲ء، ص:۱۴)

اسی لیے کہتے ہیں کہ تحقیق کسی کی میراث نہیں۔کوئی وقت جاتا ہے کہ میر امان علی دہلوی پر تحقیق مزید ہوگی اور ثابت یہی ہوگا کہ میر امان علی دہلوی کو گلکرسٹ نے ''میر امّن'' بنایا،۱۸۰۶ء کے بعد میر امّن فورٹ ولیم کالج، کلکتہ سے نکل کر نواب شمس الامراء تک پہنچے۔

رام بابو سکسینہ نے ''تاریخ ادب اردو'' کے حصۂ نثر سے متعلق باب اوّل میں میر امّن سے متعلق آخری سطر میں لکھا ہے:''ڈاکٹر ایس۔ڈبلیو فیلن نے خود میر امّن کی زبانی سُنا تھا کہ اُن کو کسی سے فنِ شعر میں تلمذ نہیں۔'' میر امّن سے فیلن کی ملاقات کا حوالہ محمد یحییٰ تنہا نے بھی ''سیر المصنفین'' میں دیا ہے۔یاد رہے کہ ایس۔ڈبلیو فیلن کی پیدائش ۱۸۱۷ء بہ مقام کلکتہ ہے۔اُس نے ۱۸۳۷ء میں بیس برس کی عمر میں محکمہ تعلیم بنگال میں ملازمت اختیار کی۔اب اگر فیلن نے یہ کہا کہ اُس نے میر امّن کی زبانی سُنا، تو اپنی پیدائش ۱۸۱۷ء سے قبل یا پیدائش ۱۸۱۷ء کے فوراً بعد وہ میر امّن سے بات کرنے سے رہا۔اُس کے میر امّن سے بات کرنے کا زمانہ کیا رہا ہوگا؟ کیا ۳۷۔۱۸۳۶ء ہی ممکن نہیں؟؟ یُوں ۳۷۔۱۸۳۶ء تک میر امّن کے حیات ہونے کا اِس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا؟

رشید حسن خاں اور ڈاکٹر گیان چند کو بتانا چاہیے تھا کہ وہ ''میر امان علی دہلوی'' کون ہے، جس کا حوالہ بطور مترجم ''ستۂ شمسیہ'' کے دیباچہ میں آیا۔''میر امان علی دہلوی'' نامی ایک ایسا شخص، جو محض ایک آدھ نہیں، انگریزی سے ترجمہ کردہ نو (۹) کتب کا مترجم ہے۔نیز یہ بھی بتانا ضروری تھا کہ انگریزی سے ترجمہ کردہ ''ستۂ شمسیہ، سلسلے کے دو رسائل بہ عنوان ''منتخب البصر'' اور ''اصول علمِ حساب'' کی زبان، اُس دور میں میر امّن کے علاوہ کون لکھ سکتا تھا؟ جس کا نام ''میر امان علی دہلوی'' بھی ہو اور جس کے نام کو 'ستۂ شمسیہ' کے دیباچے میں متین حیدر آبادی، مسٹر جونس اور موسیو تنڈرس کے ناموں پر فوقیت دی جائے۔

رشید حسن خاں، میر امّن کے نام اور تخلص سے متعلق بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کریم الدّین نے اپنے تذکرے ''طبقات شعراء ہند'' میں ''امان ولطف'' کے تحت لکھا ہے:''تخلص میر امان دہلوی جو کہ مشہور بہ تخلص امّن ہے۔یہ تخلص اُس نے اپنے اشعارِ متفرقہ میں اختیار کیا ہے'' (طبع اوّل کی عکسی اشاعت، اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ، ص ۲۳۶)۔یعنی اِس تذکرے میں اُن کا نام ''میر امان'' ملتا ہے اور تذکرہ نگار نے ''امّن'' کو تخلص بتایا ہے؛ مگر ان میں سے کوئی بات درست نہیں۔کریم الدین نے اپنے ماخذ کا حوالہ دیا نہیں، اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ چوں کہ اُنھوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ تخلص ''امّن'' تھا، اس لیے یہ بھی قیاس اماں لیا کہ پھر اُن کا نام ''میر امان' ہوگا۔لیکن یہ وہی بات ہے جس کے لیے کہا گیا ہے کہ بِناءِ الفاسد علی الفاسد۔انھوں نے یہ جو لکھا ہے کہ

''یہ تخلص اُس نے اپنے اشعارِ متفرقہ میں اختیار کیا ہے'' تو یہ قطعی طور پر درست نہیں۔ میر امّن نے اپنے کسی بھی شعر میں اپنا تخلص ''امّن'' نظم نہیں کیا ہے (اور نہ کہیں اور یہ بات لکھی ہے) البتہ اُنھوں نے اپنا تخلص ''لطف'' ضرور نظم کیا ہے۔ اِس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ کریم الدین نے نام اور تخلص کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ اُن کا اپنا ایسا گمان اور قیاس ہے جو قابلِ قبول نہیں؛ مگر بعد کے لوگوں نے اِس کی تکرار کی ہے۔ مولوی محمد یحییٰ تنہا نے اپنی کتاب میں لکھا ہے: ''آپ کا اصلی نام میر امان ہے اور امّن تخلص ہے۔ اگر چہ کہیں کہیں اشعار میں اپنا تخلص لُطف بھی ظاہر کیا ہے'' (سیر المصنفین، مُرتبہ ڈاکٹر امیر اللہ شاہین، ص ۷۳) مولوی صاحب نے حوالہ نہیں دیا، مگر خیال یہ ہے کہ کریم الدین کا تذکرہ اُن کے پیشِ نظر رہا ہے، اس بنا پر کہ (میری معلومات کی حد تک) کریم الدین سے پہلے کسی اور نے ''میر امّن'' کا نام ''میر امان'' اور اُن کا تخلص ''امّن'' نہیں لکھا ہے۔ ہاں آخری ٹکڑا مولوی صاحب کا اپنا اضافہ ہے۔ مولوی سیّد محمد نے اپنی کتاب اربابِ نثرِ اردو میں لکھا ہے: ''بیان کیا جاتا ہے کہ اُن کا اصلی نام میر امان تھا اور امّن تخلص، مگر وہ میر امّن کے نام سے مشہور ہیں ...... اُن کا تخلص امّن تھا۔ سیر المصنفین کے مولّف نے لکھا ہے کہ وہ کبھی اپنا تخلص لُطف بھی کرتے تھے، مگر کوئی سند یا حوالہ نہیں بیان کیا، البتہ باغ و بہار کے خاتمے پر میر امّن نے جو ابیات لکھی ہیں...... اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لطف بھی تخلص کرتے تھے۔ (ص ۵۸) یعنی ''میر امان'' نام اور ''امّن'' تخلص کے اِس مفروضے کا سلسلہ کریم الدین کے تذکرے تک پہنچتا ہے۔'' (رشید حسن خاں: مقدمہ: ''باغ و بہار'' ص ۲۸ تا ۲۹)

رشید حسن خاں کا یہ بیان پڑھ کر ایک مقولہ یاد آ گیا، الٰہی مرا بیامرز دیگراں را تو دانی۔ خاں صاحب کا یہ بیان بلا شک وشبہ مُسند حوالہ جات سے بے خبری کا واضح ثبوت ہے۔ تذکرہ ''طبقات شعراء ہند'' ہرگز مولوی کریم الدین کا تحریر کردہ تذکرہ نہیں، یہ تو گارسیں دتاسی کی ''تاریخ ہندوی و ہندوستانی لٹریچر Histore de la Litterature Hindoui et Hindoustani کی پہلی جلد Biographic et Bibliographic مطبوعہ: پیرس، طبع اوّل: ۱۸۳۹ء کا ترجمہ مع اضافہ جات ہے۔ ''طبقات شعراء ہند'' کے سرورق کی تحریر ملاحظہ ہو:

طبقات شعراء ہند

ترجمہ از

تاریخ ہندوی و ہندوستانی لٹریچر

از

گارسیں دتاسی

مترجمہ

الیف فیلن صاحب ومولوی کریم الدین

باہتمام

سیّداشرف علی مطبع العلوم مدرسہ دہلوی میں چھپی

قیمت چھ روپے

۱۸۴۸ء

دہلی کالج

گارسیں دتاسی نے اپنے خطبات میں دوجگہ اِس ترجمے کا ذکر کیا ہے،مُلاحظہ ہو:

۱۔ ''یہ درحقیقت میری تاریخ کی پہلی جلد سے حذف واضافہ کے ساتھ تالیف کی گئی ہے،جس سے وہ ایک نئی کتاب ہوگئی ہے اور استفادہ کے لیے کارآمد ہے۔'' (خطبات گارساں دتاسی،مطبوعہ:انجمن ترقی اُردو(ہند) اور نگ آباد،دکن،طبع اوّل:۱۹۳۵ء ص۹۶)

۲۔ ''شعرائے اردو کا تذکرہ مسٹر ایف فیلن صاحب بہادر اور مولوی کریم الدین نے کارسندٹسی کی تاریخ سے ۱۸۴۸ء میں ترجمہ کیا اور نوسو چونسٹھ شاعروں اردو گو کے اشعار اور حال بھی دواوین سے منتخب کرکے اُس میں مُندرج کردیا گیا۔'' (ص۲۵۶)

اب یہی کہا جاسکتا ہے کہ جناب حوالہ تو سرورق کی عبارت نے پیش کردیا،اب آگے کی کہیے۔یادرہے کہ گارسیں دتاسی (پ:۱۷۹۴ءم:۱۸۷۸ء)،ایف۔فیلن اور مولوی کریم الدین،میر امّن کے قریبی معاصرین ہیں اور گارسیں دتاسی کی ''تاریخ ہندوی وہندوستانی لٹریچر'' کو حوالہ جات کے باب میں اہم مآخذ شمار کیا جاتا ہے،بطور خاص،نظرثانی شُدہ ایڈیشن:طبع اوّل ۱۸۷۰ء۔

میر امّن کے باب میں گارسیں دتاسی کو بطور معاصر مُحقق،اس لیے بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے کہ میر امّن کی شخصیت اور اُس کا کام دتاسی کے لیے ہمیشہ خصوصی دلچسپی کا باعث رہا۔''خطبات گارسیں دتاسی'' بابت:۳دسمبر ۱۸۵۰ء تا ۶دسمبر ۱۸۶۹ء میں جگہ جگہ میر امّن اور ''باغ وبہار'' کا حوالہ ملتا ہے۔۲۹نومبر ۱۸۵۳ء (چوتھا خطبہ) میں گارسیں دتاسی بتاتے ہیں:

''باغ وبہار'' ۱۸۵۳ء سے السنہء مشرقیہ (جہاں وخود پروفیسر تھے) کے نصاب میں شامل ہوگئی۔''

(''خطبات گارساں دتاسی'' ص۴۱)

پانچویں خطبہ بابت ۴دسمبر ۱۸۵۴ء میں کہتے ہیں: ''قصہء چہار درویش،ایک تو میر امّن کا ہے،جس کا

نام ''باغ و بہار'' ہے (یہ تاریخی نام ہے) اور سول، ملٹری عہدہ داروں کے نصاب کے امتحان میں داخل ہے۔'' (ص ۱۵۷)

دسویں خطبہ بابت: فروری ۱۸۶۱ء میں کہتے ہیں: ''میں اس سال ''باغ و بہار'' فارسی اور لاطینی، ہر دو رسمِ تحریر میں پڑھاؤں گا۔'' (ص ۲۹۱)

۲۱ویں خطبہ بابت: یکم دسمبر ۱۸۶۲ء میں ڈنکن فاربس سے متعلق بتاتے ہیں: ''موصوف نے ''باغ و بہار'' کا چوتھا ایڈیشن فارسی رسم الخط میں نکالا ہے۔'' (ص ۳۴۸) اِسی خطبے میں کہتے ہیں: ''باغ و بہار کے ایڈیشن جو لاطینی رسم الخط میں شائع ہوئے ہیں، ہاتھوں ہاتھ بک رہے ہیں۔ سنہ ۱۸۳۶ء میں ایک پرتگالی پی۔ ایس۔ ڈی روزا نے اس کا ایک ایڈیشن ہندوستان کے دارالسلطنت کلکتہ میں طبع کرایا تھا۔'' (ص ۳۴۸۔ ۳۴۹) اس کے بعد اڑھائی صفحات میں ''باغ و بہار'' کے موضوع پر بات کی ہے (دیکھیے: ص ۳۴۹ تا ۳۵۱) غرضیکہ گارسیں دتاسی کے خُطبات، جنھیں بہ زبانِ اردو، انجمن نے ۱۹۳۵ء میں شائع کیا (یا دیگر خُطبات جنھیں مقالات کا نام دیا گیا) اور ''تاریخ ہندوی و ہندوستانی لٹریچر'' مطبوعہ پیرس، طبع اوّل: ۱۸۳۹ء و نظر ثانی شدہ ایڈیشن، مطبوعہ پیرس، طبع اوّل: ۱۸۷۰ء میں میر امّن اور اُس کا کام، گارسیں دتاسی کا موضوع خاص رہا ہے۔ بے شک دتاسی کی ''تاریخ ہندوی و ہندوستانی لٹریچر'' کا پہلا ایڈیشن ۱۸۳۹ء میں پیرس (فرانس) سے شائع ہُوا، لیکن ان کا یہ کام اُس برس ہا برس کی خط کتابت پر مبنی ہے، جو دتاسی اور میر امّن کے قریبی معاصرین کے مابین رہی۔

دتاسی کی تاریخ (بہ زبان فرانسیسی) کی پہلی اشاعت کو بنیاد بنا کر مرتّب و ترجمہ کیے گئے تذکرے ''طبقاتِ شعراء ہند'' پر پہلا نام ایف۔ فیلن کا ہے، جن کا ذکر کرتے ہوئے گارسیں دتاسی ''صاحب بہادر'' لکھتے ہیں۔ یاد رہے کہ ایف۔ فیلن کی عمر کا بیشتر حصّہ کلکتہ اور اس کے گرد و نواح میں گزرا۔ اُن کا قیام پانی پت میں بھی رہا۔ مولوی کریم الدین پانی پتی سے اُن کا دوستانہ تھا۔ دتاسی نے لکھا ہے کہ ایف۔ فیلن نے ہندی اور اُردو محاورات بھی کتابی صورت میں یکجا کیے تھے۔ [۴۷]

جہاں تک ''طبقاتِ شُعراء ہند'' کے دوسرے مترجم/مرتّب مولوی کریم الدّین پانی پتی (پ: ۱۸۹۳ء۔ م: ۱۸۷۸ء) کا معاملہ ہے تو وہ ''موضح اللسان''، مطبوعہ: ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء کے مصنف ہونے کے علاوہ علوم و فنون کے مدرسہ آگرہ کے مدرس اوّل اردو تھے، میر امّن کے قریبی معاصر تھے۔ اکثر معاملات میں کریم الدّین کا بیان سند کا درجہ رکھتا ہے۔ اہم بات یہ کہ مولوی کریم الدین ۱۷۹۳ء کی پیدائش ہیں۔ اب اگر میر امّن جون ۱۸۰۶ء میں مستعفی ہوتے ہی راہیِ ملک عدم نہیں ہوگئے (جیسا کہ خاں صاحب کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے)، تو کریم

الدین نے میر امّن کا کچھ زمانہ تو یقیناً دیکھا۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ رشید حسن خاں صاحب، گارسیں دتاسی، ڈاکٹر ایس۔ ڈبلیو فیلن، ایف۔فیلن اور کریم الدین سے بڑھ کر،کس مُعاصر گواہی کے طالب ہیں؟ کیا میر امّن کے یہ چاروں قریبی معاصرین اپنے طور پر ہی اہم ترین حوالہ نہیں؟؟

اب ملاحظہ ہو، نو دریافت کردہ ایک اہم حوالہ، گارسیں دتاسی کی بہ زبان فرانسیسی : '' تاریخ ہندوی و ہندوستانی لٹریچر'' ("Histoire De La Litterature Hindouie et Hindoustanie") کے نظرِثانی شدہ ایڈیشن، مطبوعہ پیرس (جلد اوّل) طبع اوّل : ۱۸۷۰ء کی وہ عبارت ، جہاں '' امّن '' تخلص کے تحت گارسیں دتاسی لکھتے ہیں :

'' امّن (میر) دہلوی (حاشیہ میں درج ہے :'' کریم نے اس کا نام '' امان '' لکھا ہے اور اس نے لکھا ہے کہ '' امّن '' اُس نے بطور تخلص کے اختیار کیا۔'' امّن ''، امان علی کا ایک گنوار تلفظ ہے) '' ہندی مینول '' میں گلکرسٹ نے اُس کا ذکر '' لُطف '' تخلص کے تحت کیا ہے۔ بہت ممکن ہے یہ تخلص (لطف) انھوں نے اپنی فارسی شاعری کے لیے اختیار کیا ہو۔ایک بہت معروف خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ فطری طور پر شعر گوئی کی طرف مائل تھے (یہاں حاشیے میں دتاسی نے '' گنج خوبی '' کے دیباچہ کا حوالہ دیا ہے) انھوں نے خالص اردو زبان کا استعمال کیا، جو دہلی کے گرد ونواح میں شرفاء کی زبان تھی۔اُن کے والدین کا بھی اُس اشرافیہ سے تعلق تھا اور اُن کا خاندان، ہمایوں کے عہد حکومت کے بعد مُغلوں کا ملازم رہا۔مُغلوں نے انہیں نہ صرف القابات وخطابات سے نوازا بلکہ جاگیر بھی عطا کی .... (آگے '' باغ و بہار '' کے دیباچہ سے حوالہ دیا گیا ہے) .... '' باغ و بہار '' کلکتہ سے کئی بار شائع ہوئی ..... ۱۸۲۲ء اور ۱۸۴۰ء میں مدراس سے، ۱۸۳۲ء اور ۱۸۳۴ء میں کانپور سے، دہلی اور میرٹھ سے یہ کتاب کئی بار شائع ہوئی۔ اِس کا ایک نُسخہ لاطینی رسم الخط میں بھی شائع ہوا ہے۔انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چُکا ہے، بہت شاندار ترجمہ لیوس فریڈنڈ سمتھ کا کیا ہُوا، جس کے ساتھ عمدہ حواشی شاملِ کتاب ہیں۔لیکن یہ ایڈیشن بہت نایاب ہے .... اِس داستان کی بنیاد امیر خُسرو کا فارسی قصہ ہے، جس کے اردو تراجم میں مسلمان مترجمین (شعراء) نے اپنے مخصوص اسالیب بیان کو اپنایا ہے۔خسرو نے نظام الدین اولیاء کے لیے لکھا۔نظام الدّین اولیاء کو '' زری زر بخش '' بھی کہا جاتا ہے۔(یہاں حاشیہ میں درج ہے :'' میری کتاب "Memoire sur la religion musulmane dans l 'Inde" صفحہ ۱۰۴ و بعد دیکھیے) .... اِس قصّے کے جو حوالہ جات ہیں، اُنھیں ولیم جونز نے سراہا ہے (یہاں حاشیہ میں ولیم جونز کی کتاب "Diss. on the musical Modes" ایشاٹک ریسرچز جلد دوم صفحہ ۶۳ کا حوالہ دیا گیا ہے) .... میر امّن نے '' باغ و بہار '' کے بعد گلکرسٹ کے کہنے پر '' اَخلاقِ مُحسنی '' کا ترجمہ کیا (یہاں حاشیہ میں درج ہے

کہ ''یہ چوالیس صفحات کی کتاب ہے، جس کا ایسٹ انڈیا آفس میں ایک نسخہ موجود ہے، جس پر درج ہے کہ یہ کتاب ۱۸۰۴ء میں زیرِ طبع ہے۔'') یہ ترجمہ ''گنجِ خوبی'' کے عنوان سے دیوناگری رسم الخط میں کلکتہ سے شائع ہُوا۔ ''گنجِ خوبی'' کا ایک فارسی مخطوطہ بھی پایا جاتا ہے، جو سینڈفورڈ آرنوٹ Sandford Arnot (سال وفات: ۱۸۳۱ء) کے پاس محفوظ تھا .... امّن نے اِن دو کتب کے علاوہ ایک دیوان بھی یادگار چھوڑا۔ وہ اُس زمانے کے فورٹ ولیم کالج کے استاد تھے۔ ایم۔ رومر (M. Raumer) کے پاس امّن کے ہاتھ کی تحریر کردہ بہت سی منظومات محفوظ تھیں۔ ''اخلاق محسنی' کا اردو ترجمہ بہ عنوان'' گنجِ خوبی''، ہگلی کے غلام حیدر نے ۱۸۴۶ء میں مرتّب کیا، جس کے ۳۶۶ صفحات ہیں .... ''اخلاقِ جلالی'' کا ایک ترجمہ، جو دہلی سے ۱۸۳۰ء میں شائع ہُوا .... سیّد احمد (مرادسرسیّد احمد خاں) نے میر امّن کو ہندوستانی نثر نگاروں میں اہم مقام دیا ہے (یہاں حاشیہ میں درج ہے کہ ''آ ثار الصنادید'' کا اردو سے متعلق باب دیکھیے'') یعنی، جو مقام اردو شاعری میں میر تقی میر کا ہے، وہی مقام اردو نثر میں میر امّن کا ہے۔''

(فرانسیسی زبان سے اردو ترجمہ: ص ۲۰۷ تا ۲۱۲)

اب اگر رشید حسن خاں صاحب، محض ''ہندی مینول'' مرتبہ گلکرسٹ (۴۸) کے پہلے اور آخری صفحات کا عکس (مشمولہ: ''باغ و بہار'' مرتبہ: رشید حسن خاں) فراہم کر کے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ میر امّن کا اصل نام میر امان علی نہیں تھا یا اُن کا تخلص، ''امّن'' نہیں 'لُطف'' تھا، تو اُن کی بات کیسے مان لی جائے؟ گارسیں دتاسی نے واضح طور پر لکھا ہے کہ ''امّن، امان علی کا ایک گنوار تلفظ ہے۔'' تخلص ''لطف'' کو دتاسی نہیں مانتے اور اِس معاملے کو فارسی کلام سے ثبوت کا محتاج قرار دیتے ہیں۔ ''گنجِ خوبی'' کا دیباچہ بھی یہ ثابت کرتا ہے کہ 'لُطف''، میر امّن کا تخلص نہ تھا۔ میر امّن لکھتے ہیں: ''اور عین مقابلے کے وقت کا یہ قطعہ لُطف کا ہے۔''

دتاسی، فیلن اور کریم الدین کی معاصر گواہیاں میر امّن کا اصل نام ''میر امان علی'' اور تخلص ''امّن'' ظاہر کر رہی ہیں، جبکہ دیگر قریبی معاصرین و محققین خصوصاً محمد یحیٰ تنہا (''سیر المصنفین'' مرتبہ: امیر اللہ شاہین صفحہ ۷۱۔۷۳)، مولوی سیّد محمد (''اربابِ نثر اردو'' صفحہ ۴۲)، مولانا حامد حسن قادری (''داستان تاریخ اردو'' صفحہ ۴۸) اور سید عزیز الدین احمد بلخی المتخلص راز عظیم آبادی (''تاریخ شعرائے بہار'' صفحہ ۶۶) نے بھی اصل نام ''میر امان'' اور ''تخلص امّن'' لکھا ہے البتہ یحیٰ تنہا نے میر امان علی کے دو تخلص ''امّن'' اور 'لُطف''، بتائے۔ جب کہ دتاسی نے اِس شبہ کا اظہار کیا کہ ''بہت ممکن ہے یہ تخلص (لطف) انھوں نے اپنی فارسی شاعری کے لیے اختیار کیا ہو۔'' یوں فی الوقت، رشید حسن خاں کی خواہش کے احترام میں ڈاکٹر وحید قریشی کی تحقیق پر صرف اتنا اضافہ ہی ہوسکتا ہے کہ ممکن ہے معاملہ 'نیّر، رخشاں''

والا ہو۔اب اگر میر امّن ، اپنے معاصر، گلکرسٹ کے دوست اور کلکتہ ہی میں مقیم معروف شاعر مرزا علی لطف کے ہم تخلص تھے اور اپنے فارسی کلام میں ''لطف'' تخلص کرتے تھے، تو بھی یہ معاملہ میر امّن کے اردو یا فارسی کلام سے ثبوت کا محتاج رہے گا۔ بہت ممکن ہے مُستقبل قریب یا بعید میں کوئی محقق میر امّن کے شاگردِ خاص ایم۔ رومر کے نامعلوم کتب خانے سے میر امّن کے ہاتھ کی تحریر کردہ اردو/فارسی منظومات ڈھونڈ نکالے، یا وہ غیر مطبوعہ ''دیوان'' ہی مل جائے، جس کا ذکر دتاسی نے کیا ہے تو یہ معاملہ صاف ہو جائے گا۔لیکن فی الوقت رشید حسن خاں کا اِس بات پر اڑ جانا کہ ''میر امّن'' اصل نام ہے اور ''میر امان علی'' اصل نام ہو ہی نہیں سکتا، تو یہ ایک بے معنی حُجّت کے سوا اور کچھ نہیں۔

کل کلاں اگر کوئی یہ کہے کہ گلکرسٹ کی انگریزی اُردو لغت المعروف "A GRAMMAR OF THE HINDOOSTANEE LANGUAGE" کے سرورق نیز حصہ اوّل وحصہ دوم پر جو فارسی شعر مع انگریزی ترجمہ درج ہے اور گلکرسٹ ہی کی افعالِ فارسی مع مصادر و مترادفات ہندوستانی در فارسی و انگریزی سے متعلق تالیف پر درج فارسی مصرع گلکرسٹ ہی کا کلام ہے، تو میں اُن کا کیا بگاڑ سکتا ہوں۔لیکن رشید حسن خاں کے علم میں یہ بات یقیناً رہی ہوگی کہ اُس زمانے میں کتاب کا مادۂ تاریخ مختلف شعراء نکالتے تھے، جن کا نام کبھی تو کتاب پر دے دیا جاتا تھا اور کبھی نہیں۔شمس الامراء حیدرآباد (دکن) کی بیشتر کتب کا مادہ، تاریخ میر شمس الدین محمد فیض کا نکالا ہُوا ہے۔چند ایک کتب پر اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا اور بیشتر کتب میں نہیں۔میرا کہنا یہ ہے کہ ''باغ و بہار'' کے ساتھ مرزا علی لطف کا یہی معاملہ رہا۔گو، میر امّن شاعر تھے۔گارسیں دتاسی کے بیان سے ثابت ہے۔

رشید حسن خاں نے میر امّن کی اولاد اور اہلِ خانہ کے باب میں میرے بیان کو یُوں جُھٹلایا ہے :

''مرزا حامد بیگ نے اپنے محولہ بالا مقالے میں لکھنؤ کے مشہور ریختی گو، جانصاحب کو میر امّن کا بیٹا بتایا ہے، لکھا ہے: ''قیاس غالب ہے کہ جانصاحب، میر امّن کے بیٹے تھے۔میر امّن کے اصل نام میر امان علی کی مناسبت سے بیٹے کا نام میر یار علی (عرف جانصاحب) بھی اس قیاس کو تقویت پہنچاتا ہے۔'' مقالہ نگار نے اپنے قیاس کی بنیاد تذکرہ سخنِ شُعرا (تالیف عبدالغفور نسّاخ) کے اندراج پر رکھی ہے، نسّاخ نے ''جانصاحب'' کے لیے لکھا ہے :

''جانصاحب، میر یار علی، خلفِ میر امّن لکھنوی، شاگرد عاشور علی خاں بہادر۔ ریختی اپنے طرز پر خُوب کہتے تھے۔'' اس کے بعد اُنھوں نے سیّد محمد مبین نقوی مُرتب ''تاریخِ ریختی مع دیوان جانصاحب'' کی عبارت کا اقتباس اِس طرح دیا ہے : ''جانصاحب کی ولادت فرخ آباد میں غالباً ۱۲۳۴ھ (۱۹-۱۸۱۸ء) میں ہوئی تھی۔نام تو اُن کا میر یار علی تھا، مگر والدین پیار سے جان صاحب کہتے تھے ...... ان کے والد میر امّن تو فرخ آباد کے

رہنے والے تھے، لیکن یہ بچپن ہی میں لکھنؤ پہنچ گئے تھے.........نساخ اور مُبین نقوی کے بیانات میں میر امّن کے لکھنوی اور فرّخ آبادی ہونے کے اختلاف کی مقالہ نگار نے تاویل اِس طرح کی ہے: ''کہا جاسکتا ہے کہ میر امّن، فورٹ ولیم کالج سے مُستعفی ہونے کے بعد کچھ عرصہ فرّخ آباد میں مُقیم رہے، اور اُس کے بعد بہ طور مُترجم دارالترجمہ شمس الامراء حیدرآباد، دکن سے منسلک ہو گئے۔ انھوں نے اہلِ وعیال کو لکھنوء میں چھوڑا اور خود دارالترجمہ کا کام کرتے رہے۔ بہت ممکن ہے میر امّن کے لکھنوَ سے اس تعلق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے عبدالغفور نساخ نے سخن شعرا میں ...... میر امّن کو لکھنوی لکھا ہو۔'' مقالہ نگار نے جو کچھ لکھا، وہ سب ایسے مفروضات کا سلسلہ ہے، جس کی ایک کڑی بھی درست نہیں۔ اِن میں سے کوئی ایک بات بھی قابلِ قبول نہیں۔ اُن کو ایک جگہ ''میر امان علی'' کے نام نے مغالطے میں مبتلا کیا، اور دوسری جگہ ''میر امّن'' نے۔ جو کچھ اُنھوں نے لکھا، اُس میں سے کسی ایک بات کا بھی ثبوت نہ اُن کے پاس ہے اور نہ کہیں اور موجود ہے۔ محض مفروضات، جو ''کہا جاسکتا ہے'' جیسے فقروں کے تحت معرضِ اظہار میں آئے ہیں۔'' (رشید حسن خاں: مقدمہ: ''باغ و بہار'' ص ۳۷۔۳۸)

اب اگر رشید حسن خاں کی جانب سے میرے بیان کو حسبِ منشا توڑ مروڑ کر بیان کرنے کے سبب، قارئین کا حافظہ یکسر جواب نہیں دے گیا، تو اُنھیں یاد ہوگا کہ میں نے میر یار علی جانصاحب کی ولدیت اور جائے پیدائش (پ: ۱۹۔۱۸۱۸ء فرخ آباد) کا ذکر کرتے ہوئے عبدالغفور نساخ (جنھوں نے میر امّن کے نام کے بعد ''لکھنوی'' لکھا) اور سیّد مُبین نقوی (جنھوں نے میر امّن کو ''فرخ آبادی'' کہا) کے علاوہ ''سنۂ شمسیہ'' کے دیباچہ از نواب محمد فخرالدین خاں محررہ: ۱۲۵۳ھ مطابق ۳۷-۱۸۳۶ء (جس میں واضح طور پر ''میر امان علی دہلوی'' درج ہے) اور گارسیں دتاسی (جس نے جانصاحب کو میر امّن کی بیٹی کہا) کے حوالے بھی دیئے تھے۔ جنہیں رشید حسن خاں گول کر گئے۔ نساخ اور مُبین نقوی کے بیانات میں میر امّن کو ''لکھنوی'' اور ''فرخ آبادی'' کہنے کے اختلاف کو رفع کرنے کے لیے خود نساخ کا بیان بھی غور طلب ہے۔ نساخ لکھتے ہیں: ''جانصاحب، میر یار علی خلف میر امّن لکھنوی، شاگرد عاشور علی خاں بہادر ......''۔ خاں صاحب نے یہ نہیں سوچا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ نساخ، جانصاحب کو ''لکھنوی'' کہنا چاہ رہے ہوں اور ''لکھنوی'' لکھ گئے میر امّن کے نام کے بعد۔ اس لیے کہ کسی ایک تذکرہ نگار نے بھی میر امّن کو لکھنوی نہیں لکھا۔ نہ اُس دور میں ''میر امّن لکھنوی'' نامی کوئی ایسا نامور شخص تھا، جس کا نام اور کام تذکروں کی زینت بنتا۔ جب کہ میر یار علی جانصاحب کے نام کے ساتھ ہمیشہ ''لکھنوی'' لکھا جاتا رہا ہے۔

اِس عبارت میں گنجائش کہاں بنتی ہے ''لکھنوی'' لکھنے کی، یہ نکتہ توجہ چاہتا ہے۔

نساخ کے تذکرہ ''سخنِ شعراء'' سے اسی نوع کی دیگر امثال ملاحظہ ہوں:

''ثمر تخلص مرزا علی ولد مرزا جعفر علی لکھنوی شاگرد صوفی صاحب دیوان گورے'' (ص ۹۸)

''عیش تخلص حافظ الٰہی بخش خلف سیف اللہ دہلوی مُقیم میرٹھ شاگرد امداد حسین ظہور'' (ص ۳۴۰)

''عیشی تخلص طالب علی خاں ولد علی بخش خاں لکھنوی شاگرد مرزا قتیل۔'' (ص ۳۴۰)

درخشاں تخلص سید علی جان مخاطب بہ مہتاب الدولہ ولد میر مُغل لکھنوی مُتوطن خراساں مقیم مٹیا بُرج متعلق کلکتہ۔'' (ص ۱۵۸)

میر یار علی جانصاحب کی ولادت، فرخ آباد کی ثابت ہے، جب کہ اُن کا بچپن لکھنو میں گزرا۔ ''میر امان علی'' اور ''میر یار علی'' میں ناموں کی مناسبت کیا ثابت کرتی ہے؟ نیز میر یار علی جانصاحب کی ولادت ۱۹۔۱۸۱۸ء کی ہے، جب ''ستۂ شمسیہ'' کا مترجم میر امان علی دہلوی، جلد: ۵ بابت: ''انظار'' کا قلمی نسخہ مرقومہ ۱۸۱۸ء (مخزونہ کتب خانۂ خاص، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی) تیار کرواتا ہے۔

یُوں درجِ بالا شواہد کی بُنیاد پر اگر میں نے یہ لکھا کہ: ''کہا جاسکتا ہے کہ میر امّن، فورٹ ولیم کالج سے مستعفی ہونے کے بعد کچھ عرصہ فرّخ آباد میں مقیم رہے .... انھوں نے اہل و عیال کو لکھنؤ میں چھوڑا اور خود دارالترجمہ کا کام کرتے رہے''۔ تو کیا غلط لکھا؟ جب کہ میرے اِس بیان پر گارسیں دتاسی نیز سیّد محسن علی محسن لکھنوی مصنف تذکرہ: ''سراپا سخن'' مُہر تصدیق ثبت کرر ہے ہیں۔

گارسیں دتاسی، اپنے پانچویں خطبہ بابت: ۴ دسمبر ۱۸۵۴ء میں ہندوستانی شاعرات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :

''وہ، جان (میر یار علی جانصاحب) کہلاتی تھی۔ وہ فرّخ آباد کی رہنے والی تھی، مگر زیادہ تر لکھنوء میں رہتی تھی، جہاں اس کی شاعری کی بڑی شہرت تھی۔ عنفوان شباب ہی میں اُس نے موسیقی، ادب کا شوق پیدا کیا .... اُس کا کلام لکھنو میں سنہ ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء) میں شائع ہُوا، جو زنانہ بولی میں ہے۔ اُس وقت اُس کی عمر ۳۶ سال کی تھی۔''

مولوی عبدالحق نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ مُصنف کو نام اور کلام سے دھوکا ہوا ہے۔ یہ عورت نہیں، مرد ہے اور اردو کے مشہور شاعر ہیں، جو عورتوں کی زبان میں شعر کہتے ہیں۔ (ص ۱۳۱)

گارسیں دتاسی نے بہ زبان فرانسیسی ''تاریخ ہندوی و ہندوستانی''[(۴۹)] جلد دوم (نظر ثانی شدہ ایڈیشن) مطبوعہ: پیرس، طبع اول: ۱۸۷۰ء میں لکھا ہے :

''جان (میر یار علی جانصاحب یا صاحب جان) مُحسن کے تذکرے میں اُسے ''ریختی کی جان'' کہا گیا ہے۔''جان صاحب'' کو''جی صاحب'' کے ساتھ خلط ملط کر دیا جاتا ہے۔ یہ ایک پڑھی لکھی خاتون، میر امّن کی بیٹی تھی اور فرّخ آباد میں پیدا ہوئی، لیکن زیادہ تر لکھنؤ میں رہی، جہاں اس نے ادبی شہرت حاصل کی۔ اس کے بعد وہ اورنگ آباد اور بھوپال میں بھی رہائش پذیر رہی۔ علاوہ ازایں موسیقی اور ادب میں بھی دلچسپی لیتی تھی۔ فارسی کا بھی شوق تھا۔''گلستاں''،''بوستاں'' اور''بہارِ دانش'' پڑھی، آخر کار وہ نواب عاشور علی خاں بہادر کی شاگردی میں ہندوستانی شاعری کرتی رہی۔ کریم الدّین نے اُس کا ذکر بطور استاد کیا ہے۔ وہ اُس سے شاعری میں اصلاح لیتا رہا۔ اُس کا مجموعۂ کلام لکھنؤ سے ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۵ء میں شائع ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ۲۶ یا ۲۷ برس تھی۔ مجموعۂ کلام بہ عنوان:''دیوانِ میر یار علی''، جس کے تقریباً پچاسی (۸۵) دوہرے صفحات ہیں اور حواشی پر بھی کلام درج ہے (یہاں حاشیہ میں دتاسی لکھتے ہیں کہ:''اُس کا ایک اور ایڈیشن اِمسال مطبع حیدری سے چھپا، اس ایڈیشن میں زیادہ تر منظومات شامل ہیں اور اس کے حواشی پر''فسانۂ عجائب''شائع کی گئی ہے۔'') اِس شعری مجموعہ میں معاصر ہندوستان کی روح کی عکاسی ملتی ہے اور اس حوالے سے اس کا شُمار اعلا شُعراء میں ہوتا ہے۔ اس نے خواتین سے مخصوص زبان میں شاعری کی، جسے''ریختی'' کہا جاتا ہے۔ یہ وہ زبان ہے، جو زنان خانوں میں برتی جاتی ہے اور اس میں عورات کے جذبات کو پیش کیا جاتا ہے ...... اس شاعرہ کا تذکرہ نہ صرف کریم الدّین نے کیا ہے بلکہ مُحسن نے بھی کیا۔'' (ص:۸۲۔۸۳)

صاف ظاہر ہے کہ یہاں بھی دتاسی کو جان صاب کی ریختی کے نسوانی لحن نے دھوکہ دیا، اور وہ جان صاحب کو میر امّن کا''بیٹا'' لکھنے کی بجائے''بیٹی'' لکھ گئے۔

اب آیئے میر یار علی جانصاحب کی ولدیت کے باب میں ایک اور مُستند حوالہ بھی دیکھتے چلیے، جس کا اشارہ گارسیں دتاسی کے بیان میں موجود ہے۔ سیّد مُحسن علی مُحسن لکھنوی (پ: لگ بھگ ۱۸۸۶ء۔ م: ۱۲۸۷ھ مطابق ۱۸۷۰ء) تذکرہ:''سراپا سخن'' (مخزونہ: پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور) مطبوعہ: نولکشور، لکھنؤ طبع اوّل: ۱۲۷۷ھ مطابق ۶۱۔۱۸۶۰ء کے حاشیہ (صفحہ ۳۰) پر لکھتے ہیں:

''ریختی گو میر یار علی جانصاحب خلف میر امّن، صاحبِ دیوان، شاگرد نواب عاشور علی خان بہادر۔''

تصدیق مذید کے طور پر تذکرے میں بال، چوٹی، زُلف، کاکل، گیسو کے باب میں جانصاب سے متعلق یہی باتیں بار بار دوہرائی گئی ہیں۔ تذکرے سے ثابت ہے کہ مُحسن لکھنوی، ۱۳ ویں صدی ہجری کے عشر اوّل کی پیدائش ہیں، یعنی

میر امّن کے جُون ۱۸۰۶ء میں فورٹ ولیم کالج سے مستعفی ہونے کے وقت تذکرہ نگار مُحسن لکھنوی بیس برس کے تھے۔ تذکرہ ''سراپا سخن'' کے صفحہ ۳۸۷ تا ۳۹۶ پر اِس تذکرے کی تالیف سے متعلق مُتعدد شُعراء کے قطعہ ہائے تاریخ، نیز مُحسن لکھنوی کے قطعہء تاریخ سے معلوم ہوتا ہے اِس تذکرے کا اوّلین ڈرافٹ ۱۲۶۹ھ مطابق ۵۳-۱۸۵۲ء میں مکمل ہُوا، گو تذکرے میں اعضائے جسمانی سے متعلق حواشی میں اشعار کے اضافے سالِ طباعت ۶۱-۱۸۶۰ء تک ہوتے رہے۔ شعراء اردو، بالخصوص لکھنوی شعراء کی ولدیت، سلسلہء تلمذ اور جائے سکونت کے حوالے سے یہ ایک مُستند ماخذ ہے۔ مُحسن کا دعویٰ ہے کہ مواد کی فراہمی کے ضمن میں اُنھوں نے اپنے وسیع حلقہء احباب کے توسط سے، اور اکثر براہِ راست شُعراء سے رجوع کیا۔

نستاخ اور مُبین نقوی کے بیانات میں میر امّن کے ''لکھنوی'' اور ''فرّخ آبادی'' ہونے کے اختلافات کو رفع کرنے کے لیے کیا درج بالا مُستند شہادتیں کافی نہیں؟ ردِّ تحقیق کی بہترین صورت تو ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ آپ سند کے ساتھ ردّ کریں۔ مثال کے طور پر یہ ثابت کریں کہ میر یار علی جانصاحب کے والد میر امّن، ''باغ و بہار'' اور ''گنجِ خُوبی'' کے مُصنّف / مُترجم میر امّن سے الگ شخصیت تھے۔ اُن کی نمایاں شناخت کیا تھی کہ مُحسن لکھنوی اور عبدالغفور نستاخ جیسے میر امّن کے قریبی معاصرین کے علاوہ گارسیں دتاسی بھی ''میر امّن دہلوی'' کو جان صاحب کا والد بتلا رہا ہے۔ اُس دور کے معروف شاعر جان صاحب کا ذکر کرتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ اُس کے والد کا نام لینا اور یہ کہنا کہ میر امّن کی بیٹی (یا بیٹا) ہے، سے کیا مُراد ہے؟ جب کہ زمانہ بھی وہی رہا ہو، جس میں ''باغ و بہار'' کے مُصنّف کے طور پر میر امّن نے شہرت پائی۔

رشید حسن خاں اور ڈاکٹر گیان چند ردِّ کُفر کے طور پر یہ ثابت تو کرتے کہ ''ستۂ شمسیہ'' کا ایک ایسا نام ور مُترجم میر امان علی دہلوی کون تھا، جس کا نام ''بیاضِ متین'' کے مُرتب غلام محی الدین متین حیدر آبادی، برطانوی مترجم جونس اور فرانسیسی ماہر لسانیات موسیو تنڈرس کے ناموں سے بھی پہلے لیا گیا؟ کیا اِن تین جانی مانی شخصیات کے ناموں سے پہلے میر امان علی دہلوی کے نام کو درج کرنے میں مترجم کی کسی بڑی شناخت کو دخل نہیں؟

O

باغ و بہار :

''نوطرزِ مُرصّع'' کی باز تخلیق، بہ عنوان: ''چار درویش'' از میر امّن بعد از نظرِ ثانی بہ عنوان: ''باغ و بہار'' ہندوستانی چھاپا خانہ، کلکتہ سے پہلی بار ۱۸۰۴ء میں شائع ہوئی۔ سرورق کے دائیں جانب سالِ اشاعت: ۱۸۰۳ء اور

بائیں جانب ۱۸۰۴ء درج ہے۔

''باغ و بہار'' کے سرورق (Title) اور پس سرورق (BackTitle) نیز انتساب سے متعلق کتاب کا اندرونی پس سرورق (بہ زبانِ انگریزی) دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کے شعبہ ہندوستانی کے صدر پروفیسر جان بارتھ وک گلکرسٹ کی زیرِ نگرانی شائع ہوئی۔ کتاب کا انتساب بھی کپٹن جیمز موئٹ کے نام جان گلکرسٹ ہی کر رہے ہیں۔ اِس لیے شک وشبہے کی گنجائش نہیں کہ مقدمہ بہ عنوان: PREFACE کی انگریزی تحریر جان گلکرسٹ کی ہے۔ ڈنکن فاربس اور مونیئر ولیمز بھی اِسی نتیجے پر پہنچے تھے۔

پس سرورق کی عبارت مُلاحظہ ہو :

" Under the superitendence of John Gilchrist for the use of the students in the College of Fort William."

اندرون پس سرورق پر انتساب سے متعلق تحریر درجِ ذیل ہے :

" This work is inscribed as a token of respect for his zeal and ability in the cultivation of Hindoostanee learning to CAPTAIN JAMES MOUAT of the corps of engineers on the Bengal establishment, By his sincere friend, JOHN GILCHRIST"

''باغ و بہار'' کے سرورق (بہ زبان انگریزی) پر واضح الفاظ میں درج ہے کہ ''باغ و بہار'' ایک مقبول عام فارسی داستان کا ترجمہ ہے۔ میر محمد حسین عطا خاں تحسین کی ''نوطرزِ مرصّع'' بطور اصل مآخذ کا حوالہ سرورق (بہ زبان اردو) کے علاوہ گلکرسٹ کے تحریر کردہ مقدمہ میں موجود ہے۔ جب کہ میر امّن نے ''باغ و بہار'' کے دیباچہ میں ''قصہ چہار درویش'' (فارسی) کے خالق کے طور پر امیر خسرو کا نام لیا ہے اور تحسین کی ''نوطرزِ مرصّع'' کا ذکر نہیں کیا۔ میر امّن نے بتایا ہے کہ یہ کتاب گلکرسٹ کی فرمائش پر قلم بند کی گئی۔ میر امّن نے بعد از نظر ثانی ''باغ و بہار'' کا سالِ تکمیل ۱۲۱۷ھ درج کیا ہے اور لکھا ہے ۱۲۱۷ھ کے آغاز میں نظرِ ثانی کا کام مکمل ہُوا۔ اِس سے یہ مُراد ہے کہ مئی۔ جُون ۱۸۰۲ء میں ''باغ و بہار'' مکمل ہوئی۔

فارسی قصۂ چہار درویش کے معلومہ نُسخوں اور ''نوطرزِ مُرصّع'' میں شامل کرداروں، نیز وقوعہ جات کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اس داستان کا خمیر الف لیلہٰ، قصہ حاتم طائی، قصہ گل باصنوبر اور قصہ گلِ بکاؤلی سے اُٹھا۔ تحسین کی ''نوطرزِ مُرصّع'' پر فاتی نیشاپوری کے تحریر کردہ منظوم قصّے کے اثرات نمایاں ہیں اور میر امّن کا تحسین

سے اخذ و استفادہ ہمارے سامنے ہے۔

ابتداً ''چاردرویش'' اور بعدازنظرِ ثانی، ''باغ و بہار'' از میر امّن تک اس داستان نے مرزا محمد ربیع انجب (مصنف: فارسی قصۂ چہار درویش) تا حکیم محمد علی وتحسین کم وبیش چار منازل ارتقاء طے کر لی تھیں۔یعنی تحسین کی ''نو طرزِ مرصّع'' کی تکمیل:۸۶۔۱۷۸۵ءتک یہ قصہ اپنے اندر بتدریج گونا گوں رنگینیوں کو سمیٹتا چلا گیا، جس کی آخری اور تکمیلی صورت میر امّن کی ''باغ و بہار'' تھی۔تفصیل کے لیے میری اسی کتاب میں دیکھیے: ''باغ و بہار'' از میر امّن کا ماخذ: ''قصۂ چہار درویش'' از مرزا ربیع انجب، ص: ۷۵

''باغ و بہار''، جو فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کی نصابی ضروریات کے تحت ''نو طرزِ مرصّع'' کی بازتخلیق (RE-CREATION) ہے، ہندوستان میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان (اردو) سے انگریز سول افسران کو متعارف کروانے کا سب سے مُعتبر ذریعہ بنی۔

۲۴۔نومبر ۱۸۰۰ء میں بہ طور سرٹیفکیٹ منشی میر امّن کو فورٹ ولیم کالج کی جانب سے یہ کام سونپا گیا کہ وہ اس مقبول عام داستان: ''قصۂ چہار درویش'' کو از سرِ نو تخلیق کرتے ہوئے روزمرہ اور عوامی محاورے کو برتیں۔یوں، میر امّن؛ جو اردو زبان پر کامل عبور رکھتے تھے، نے اِس نصابی ضرورت کے تحت روزمرہ اور عوامی محاورے کو برتنے کی پابندی اِس حد تک کی کہ لُغت اور اِملائی ضابطوں کو بھی پسِ پُشت ڈال دیا۔علاوہ ازایں میر امّن نے اِس چیز کا اہتمام بھی کیا کہ انگریز افسران ایک ہی لفظ کی ادائیگی کے مختلف طریقے جان لیں۔مثال کے طور پر KING کے لیے کہیں تو ''بادشاہ'' اور کہیں ''پادشاہ'' برتا گیا۔نیز یہ کہ

''باغ و بہار'' میں اُس دَور کے مہد تا لحد رسوم و رواج، شاہانہ وعوامی کھانوں اور ملبوسات کے علاوہ نشست و برخاست کی ہر صورت موجود ہے۔یہاں تک کہ شیعہ مسلک کا بھی ایک کردار موجود ہے، جو ہندوستان کی ہندو اور سُنی العقیدہ مُسلم اکثریت کے طور اطوار کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ مُغل شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد میں کُچلے گئے اس اقلیتی مُسلم فرقے کے بنیادی اعتقادات سے کماحقہٗ متعارف کرواتا ہے۔اس حوالے سے میر امّن کا اپنا بیان بھی اہم ہے کہ وہ چہاردہ معصومین کی دِل سے عزت کرتے ہیں اور، کرداری سطح پر ایک خضر صورت بزرگ سے بھی متعارف کروایا گیا ہے جو اپنا نام ''علی'' بتاتے ہیں۔اِسی طرح ایک جگہ مُتعہ کا حوالہ آیا ہے، جو عارضی شادی کی ایک صورت ہے اور جس کی اجازت صرف حالتِ اضطرار میں ہے۔

''باغ و بہار'' میں کوشش کر کے ایسے مواقع پیدا کیے گئے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کی جاسکیں۔معاشرتی آداب کی تفصیلات کے علاوہ ملبُوسات اور ادنیٰ واعلیٰ عہدوں سے لے کر بری و بحری سواریوں تک کے نام

اِسی حوالے سے آئے ہیں۔ ''سیر دوسرے درویش کی'' میں جہاں ایک کشتی ضروری اسباب کے لیے کافی تھی، وہاں نواڑے، بَجرے، مورپنکھی، پلوار، لچکے، کھیلنے، اُلاق اور پٹیلیوں ــــــ غرضیکہ انواع واقسام کی کشتیوں کا ذکر کر دیا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اِس انوع کی تفصیلات بیان میں رکاوٹ نہیں بنتیں۔ یہ تفصیلات فراہم کرنے کا فائدہ یہ ہُوا کہ دوسو برس قبل کی مختلف النوع اشیاء کے نام اوران کے کوائف ''باغ و بہار'' میں محفوظ ہو گئے۔

''باغ و بہار'' سے متعلق پہلی بہاشناسی (APPRAISAL) پروفیسر جان گلکرسٹ کی تحریر کردہ ہے، جو ''باغ و بہار'' طبع اوّل: ۱۸۰۳-۴ء کے ساتھ بطور مقدمہ شامل ہے۔ سرسیّد احمد خان اور میرزا غالب سے لےکر آج تک کے ہراہم ناقد اور محقق نے ''باغ و بہار'' کو موضوع بحث بنایا اور سراہا، جن میں پی۔ ایس روزاریو، لیوس فریڈنڈ سمتھ، محمد یحیٰ تنہا، گارسیں دتاسی، ڈنکن فاربس، ڈاکٹر ایس۔ ڈبلیو فیلن، مولوی سیّد محمد، میجر ڈی۔ سی فِلٹ، مونیئر ولیمز، حافظ محمود شیرانی، مولوی عبدالحق، ممتاز حسین، امتیاز علی تاج، کلیم الدین احمد، سیّد عابد علی عابد، ڈاکٹر سیّد عبداللہ، سیّد وقار عظیم، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، حمید احمد خاں، ڈاکٹر سہیل بخاری، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، سیّد قدرت نقوی، سیّد محمد عقیل، ڈاکٹر سلیم اختر اور ژاں ماریک شامل ہیں۔

پروفیسر ڈنکن فاربس نے اپنی مرتّب کردہ ''باغ و بہار'' مطبوعہ لندن، طبع اوّل: ۱۸۴۶ء کے پیش لفظ میں لکھا: ''ہندوستانی زبان میں اب تک ضبطِ تحریر میں لائے گئے تمام ادبی کارناموں میں ''باغ و بہار'' کی برتری مُسلّم اور عالمگیر ہے۔''

دوسو برس بعد حقیقت کیا ہے؟ اسے جانچنے اور پرکھنے کے لیے حتی الامکان درست متن اور اُس ناقدانہ نظر کی ضرورت ہے، جو داستانوی ادب سے مخصوص ہے۔ اِس لیے کہ ادبیاتِ عالَم میں داستانیں ہمارے اجتماعی لاشعور کا ایک ایسا بیرومیٹر ہیں، جن کے ذریعے خواص وعوام کے مُعتقدات، تہذیبی سرگرمیوں، محبت اور نفرت کی انتہاؤں پر انسان کی فتح یابی اور ناکامی کو دیکھا اور پرکھا جاسکتا ہے۔ لیکن ''باغ و بہار'' کا کسی بھی پہلو سے جائزہ لینے سے پہلے ہمیں یہ بات جان لینی چاہیے کہ یہ طبع زاد تخلیق نہیں، میر محمد حسین عطا خاں تحسین کی ''نوطرزِ مرصّع'' (۱۷۶۸ء تا ۱۷۸۵-۸۶ء) کی دوسو برس پرانی بازتخلیق (RECREATION) ہے۔ ایک ایسی داستان، جس میں حقیقی زندگی اور حقیقی انسانی کردار ہیں تو سہی لیکن حقیقی زندگی سے واقعات کی جُوت اور کرداری سطح پر لچک کی تلاش ایک بےسُود عمل ہوگا، اس لیے کہ یہ تو ناول سے مخصوص ہیں۔ داستان سے تمثیلی قصّے اور ناول کے بیچ نہ صرف ذہنی ارتقاء کا طویل فاصلہ حائل ہے بلکہ ان تینوں اصناف میں پیش کردہ مواد اور تکنیک میں بھی فرق ہے۔ داستان اور تمثیلی

قصّے کے تار و پود کی اُٹھان زندگی سے تو ہے لیکن مبنی بر حقیقت نہیں۔ داستان میں دو جمع دو، برابر چار نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ دو جمع دو، برابر پانچ یا دو جمع دو، برابر تین بھی ہو سکتے ہیں۔ اس لیے کہ داستان میں پیش کردہ زندگی کا ایک تار خواب و خیال کے ساتھ بھی جُڑا ہُوا ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ داستان میں پیش کردہ حقائق پر ہر لحظہ تخیل کا ایک سحر آفریں سایہ لرزتا رہتا ہے۔ یہ تو گُمان کا ممکن ہے۔ ایسی دنیاؤں کی سیر، جن میں فطرت پر مافوق کو فوقیت حاصل ہے۔ داستانوں کی ہونی طے ہے۔ ہونی کے حیلوں میں اسباب و علل کی تلاش سے کچھ حاصل نہیں۔ ''باغ و بہار' میں بھی دیکھی بھالی اور برتی ہوئی زندگی کے ساتھ انجانی اور انہونی کے حاصل کو پانچ قصّوں کی صورت کچھ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ ہم زندگی کی نئی معنویت سے آشنا ہو کر زندگی کے تلخ حقائق کا مردانہ وار سامنا کرنے اور زندگی کے آلام کو سہنے کا طریق سیکھتے ہیں۔

''باغ و بہار'' میں کرداری سطح پر پائے جانے والے انسانی رویّوں اور اخلاقیات کی بنیاد آج سے تین سو برس قبل کا وہ طرزِ احساس ہے، جس کی سپلائی لائین بیک وقت عرب، فارس اور ہند کے قدیم انسانی ماضی سے جڑی ہُوئی ہے۔ یہ ہمارے اُسی مشرقی اجتماعی لاشعور کا کرشمہ ہے کہ ''باغ و بہار'' میں پیش کردہ حقائق اپنی اصل شکل و شباہت کی بجائے تجریدی (ABSTRACT) صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ قدیم بغداد اور نیشا پور کی گلیاں عظیم آباد اور دِلّی کی گلیوں سے آملتی ہیں۔ ہم قدیم بصرہ سے نکلتے ہیں تو چار قدم چل کر محمد شاہی عہد کی قدیم دِلّی یا مُلک زیر باد میں جا نکلتے ہیں۔ یوں تخیل، تمثیل میں اور حقائق، تخیل میں ڈھل کر کبھی تو اخلاقیات کا درس بن جاتے ہیں (جس سے گارسیں دتاسی کو چڑ ہے) اور کبھی عریانیت کا نمونہ، جس پر کپتان ڈبلیو۔ این لیس ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن بنگال و پرنسپل کلکتہ یونیورسٹی معترض ہوئے۔ اس داستان کا علامتی پہلو یہ ہے کہ پانچوں قصّے صوفیانہ رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ یہ چار درویشوں اور ایک بادشاہ کا جسمانی سفر بھی ہے اور رُوحانی سفر بھی۔

گارسیں دتاسی نے اپنے ایک خُطبے میں ''باغ و بہار'' کو موضوعِ بحث بناتے ہوئے بڑی عمدہ بات کی ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''اِن قصّوں میں ہر صفحے پر آپ کو قومی خصوصیات ملیں گی، جو ہمارے لیے اصلی ہندوستان، خاص کر اسلامی ہندوستان کے سمجھنے میں بہت کارآمد ہوں گی۔'' اِس حوالے سے دیکھیں تو ''باغ و بہار'' محض دہلوی تہذیب کی عکاس نہیں۔ اس کا پھیلاؤ اِس سے کہیں زیادہ ہے۔ ''باغ و بہار''، عکاس ہے عہدِ عالمگیری کے جاہ و جلال کی، محمد شاہی عہد کی عیش سے مملو زندگی کی، مُغلیہ سلطنت کے دورِ زوال کی اور پُورب تا پچھم، ہندو مُسلم تہذیبوں کے اتصال سے جنم لینے والی ثقافت کی۔

''باغ و بہار'' کی روایتِ اوّل : چار درویش

پس منظر : اِنگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کی مجلسِ نظماء(Court of directors) نے بنگال میں انگریز راج کی راہ میں حائل سب سے بڑی رکاوٹوں، نواب سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان سے نبرد آزما ہونے سے بہت پہلے مُغلیہ سرکاری زبان فارسی اور عوامی زبان اردو کو مقامی لوگوں کے مذہبی اور معاشرتی رویوں کی تفہیم کا بہترین ذریعہ خیال کرتے ہوئے ۲۲۔دسمبر ۱۶۷۷ء میں قلعہ سینٹ جارج، مدراس کو ایک مراسلہ بھجوایا تھا، جس میں کہا گیا تھا کہ:''اس بات کا اعادہ کیا جاتا ہے کہ کمپنی کے جو ملازمین فارسی سیکھیں گے، اُن کو دس پاؤنڈ اور جو اِنڈستان (یعنی اردو) سیکھیں گے، اُنھیں بیس پاؤنڈ بطورِ انعام دیے جائیں گے۔''

ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۶۹۰ء میں اپنا مرکزی آفس ہُگلی سے کلکتہ منتقل کر دیا اور انگلستان کے بادشاہ ولیم سوم کے نام پر ایک قلعہ ''فورٹ ولیم'' ۱۶۹۶ء تا ۱۷۰۲ء میں تعمیر کروایا۔ ٹیپو سلطان کی شہادت (۴مئی ۱۷۹۹ء) سے بہت پہلے نواب سراج الدولہ نے اپنی زیرِ تسلط حدود میں کمپنی کی بڑھتی ہوئی عملداری کو روکنے کے لیے ۱۷۵۶ء میں اُس قلعے پر قبضہ کر لیا تھا۔ جون ۱۷۵۷ء میں نواب سراج الدولہ کی کمپنی کے ہاتھوں شکست و شہادت اور قلعہ کے حصول کے بعد اُسے مسمار کروا کے کمپنی نے کلکتہ کے قدرے شمال میں یہی قلعہ ۱۷۷۳ء میں دوبارہ تعمیر کروایا اور ۱۷۷۴ء میں بنگال پر گورنر راج قائم کر دیا۔ برطانوی ہند کے پہلے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کے ۱۷۸۵ء میں مُستعفی ہو جانے کے تیرہ برس بعد مئی ۱۷۹۸ء میں جب لارڈ مارکوئس رچرڈ ولزلی (م: غازی پور ۵ اکتوبر ۱۸۰۵ء) بطور گورنر جنرل، کلکتہ پہنچا تو اُس نے سات ماہ کی قلیل مدت میں ہی محسوس کر لیا کہ انگلستان سے ہندوستان آنے والے ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز اَفسران کو ہندوستانی باشندوں کے مذہبی، معاشرتی رویّوں اور اعتقادات سے ناواقفیت، نیز ہندوستان میں بولی جانے والی زبانوں سے شُد بُد نہ ہونے کے سبب قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور نو واردِ افسران اپنا کام اُس طرح انجام نہیں دے پاتے جو اُن کے منصب اور ذمہ داری کے لیے لازم ہے۔

اُس وقت صورتِ احوال یہ تھی کہ ہندوؤں کی قدیمی مُقدّس زبان سنسکرت کے علاوہ مُسلم حملہ آور حکمرانوں کے ساتھ چلی آنے والی زبانوں خصوصاً عربی، فارسی اور تُرکی کا چلن ہندوستان میں قدیم وقتوں سے تھا۔ ہندوستان کی علاقائی زبانوں میں مغرب اور شمال مغرب میں بولی جانے والی پنجابی (اور اُس کے مُختلف انگ: سرائیکی، پوٹھوہاری، ہندکو اور چھاچھی)، سندھی، پشتو، کشمیری، مکرانی اور تھرّی۔ بلوچستان اور سندھ کو چھوڑ کر مغربی حصے کی راجستھانی، مرہٹی اور گجراتی۔ جنوبی حصے کی: تامل، تیلگو، ملیالم، کناڑا، اُڑیہ، ٹولو، لوڈا اور کوڈرکو۔ مشرقی حصے

کی بنگالی، آسامی، اراکانی، اَودھی، میتھلی اور مگدھی۔ دہلی اور اطراف دہلی کی زبانوں میں برج بھاشا، بنگارو اور قنوجی تھیں۔صورتِ حالات کا جائزہ لینے کے بعد لارڈ ولزلی نے ۲۱ دسمبر ۱۷۹۸ء کو ایک حُکم نامہ جاری کیا۔(دیکھیے : "DAWN OF NEW INDIA" از برجندرا ناتھ مُکرجی، مطبوعہ: کلکتہ: ۱۹۲۷ء ص ۹۹) اس حُکم نامے کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملٹری اور جُونیئر میڈیکل افسران کے لیے ۱۸۰۱ء سے ہندوستان میں تحریر و تقریر کی سطح پر مُروّج زبانوں: سنسکرت، عربی، فارسی، انڈستان (یعنی اردو)، بنگالی، تیلگو، کنڑی، مرہٹی اور تامل میں طے شدہ نصاب کے مطابق تحریری و زبانی امتحان پاس کرنا لازمی قرار دے دیا گیا۔یُوں لارڈ ولزلی کے ایما پر کمپنی کے زیرِ تسلط حدود میں زبانوں کی تدریس سے متعلق جان گلکرسٹ کا قائم کردہ ادارہ "ORIENTAL SEMINARY"، ہُگلی (قیام: جنوری ۱۷۹۹ء) وجود میں آیا۔

اُس مدرسے میں کمپنی کے ایما پر اسسٹنٹ سرجن حیوانات جان بارتھ وِک گلکرسٹ (ہندوستان آمد: ۸۲۔۱۷۸۱ء) کمپنی کے جونیئر سِول ملازمین کو انڈستان (یعنی اردو) کی تعلیم اس لیے دیتا تھا کہ اُس نے ہندوستان میں اپنے مختصر قیام کے دوران اردو زبان پر کامل دسترس حاصل کر لی تھی اور ORIENTAL SEMINARY کے قیام (جنوری : ۱۷۹۹ء) تک اُس کی درج ذیل کتب بھی شائع ہو چکی تھیں :

۱۔ ''انگریزی، ہندوستانی ڈکشنری'' (جلد اوّل) کلکتہ، طبع اوّل: ۸۷۔۱۷۸۶ء

۲۔ ''ہندوستانی زبان کے قواعد'، کلکتہ، طبع اوّل: ۱۷۹۶ء

اب حُکم نامہ لارڈ ولزلی (۲۱ دسمبر ۱۷۹۸ء) کے ضمیمہ کے طور پر دوٹوک انداز میں یہ ہدایت جاری کی گئی کہ انگریز سِول ملازمین کے اِس تربیتی کورس کے اِنعقاد کا اہتمام جان گلکرسٹ کا ادارہ ORIENTAL SEMINARY کرے گا۔ (دیکھیے: "BENGAL, PAST AND PRESENT" جلد: ۷، جنوری تا جون ۱۹۱۱ء۔ ص: ۵)

''باغ و بہار'' مُرتبہ: ڈنکن فاربس مطبوعہ، لندن: ۱۸۴۹ء کے دیباچہ میں بھی یہی بات کی گئی ہے، البتہ ORIENTAL SEMINARY کا حوالہ نہیں دیا گیا۔

لارڈ ولزلی نے فورٹ ولیم (تعمیرِ نو: ۱۷۵۷ء تا ۱۷۷۳ء) کے بہترین استعمال کے پیشِ نظر مجلسِ نُظما کی پیشگی منظوری لیے بغیر ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کا فیصلہ کر لیا اور سُرخ فیتے سے بچ نکلنے کے لیے ٹیپو سلطان کی سرنگا پٹم میں شکست و شہادت، اور سقوطِ میسور (۴ مئی ۱۷۹۹ء) کی پہلی سالگرہ (۴ مئی ۱۸۰۰ء) کو کالج کا یومِ تاسیس قرار دے دیا۔ جب کہ عملاً فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کا قیام سقوطِ میسور کے چودہ ماہ بعد یعنی ۱۷ صفر ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء کو عمل میں آیا۔یُوں ۱۷ اگست ۱۸۰۰ء میں گلکرسٹ کے ہُگلی سے فورٹ ولیم کالج منتقل ہو جانے پر

"DAWN OF NEW INDIA" ہنگلی کا وجود از خود ختم ہو گیا۔ ORIENTAL SEMINARY از برجندرناتھ بینرجی، مطبوعہ کلکتہ: ۱۹۲۷ء، ص ۹۹، ''منتخبات کلکتہ گزٹ'' مرتبہ: ڈبلیو۔ ایس سٹین کار جلد: سوم، صفحہ ۷۱ مطبوعہ کلکتہ: ۱۸۶۸ء اور "BENGAL, PAST AND PRESENT" جلد ہفتم ص ۷ کے مطابق ۲۴ نومبر ۱۸۰۰ء بروز سوموار سے فورٹ ولیم کالج، کلکتہ میں ہندوستانی زبانوں سے متعلق ۹ شعبہ جات قائم کر کے عربی، فارسی، سنسکرت، انڈستان (یعنی اردو) بنگالی، تلگو، مرہٹی، کنٹری اور تامل زبانوں کی تدریس کا کام شروع ہوا۔

اُس وقت تک لیفٹیننٹ جان بیلی (پروفیسر عربی)، لیفٹیننٹ کرک پیٹرک، فرانسس گلیڈون اور این۔ بی ایڈمانسٹن (پروفیسران فارسی)، لمسڈن (اسسٹنٹ پروفیسر فارسی)، ولیم کیری اسسٹنٹ پروفیسر (سنسکرت و بنگالی) اور جان بارتھ وِک گلکرسٹ (پروفیسر ہندوستانی یعنی اردو) کے علاوہ فورٹ ولیم کالج کے زبان و ادب سے متعلق تدریسی عملے میں کوئی اور نام دکھائی نہیں دیتا۔ جب کہ ہندوستانی شعبہ میں ایڈورڈ سکاٹ وارنگ اور مظہر علی (اسسٹنٹ پروفیسران) کی تقرری بالترتیب ۶ جنوری ۱۸۰۱ء اور ۲۷ نومبر ۱۸۰۱ء کو عمل میں آئی (بہ حوالہ: ایشیاٹک اینول رجسٹر ۱۸۰۱ء لندن (۱۸۰۲ء) ص ۳۱۔۳۲)

۲۹ اپریل ۱۸۰۱ء کو فارسی، عربی اور بنگالی کے علاوہ ہندوستانی (اردو) شعبہ جات کے لیے ایک چیف منشی (بہ مشاہرہ ۲۰۰ روپے ماہانہ)، ایک سیکنڈ منشی (بہ مشاہرہ ۱۰۰ روپے ماہانہ) اور ۱۲ منشی (بہ مشاہرہ ۴۰ روپے ماہانہ) بھرتی کرنے کی منظوری دی گئی اور فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کی جانب سے اِن اسامیوں کو باقاعدہ مُشتہر کیا گیا۔

تدریسی عملے کی کمی کے پیشِ نظر ۲۴ نومبر ۱۸۰۰ء میں تدریسی سرگرمیوں کے آغاز سے ہی دیسی ''سرٹیفکیٹ مُنشیوں'' کی ضرورت محسوس کی گئی۔ یُوں میر بہادر علی حسینی نارنولی، تاری چرن متر، مرتضیٰ خاں، غلام اکبر، نصر اللہ، میر امّن، غلام اشرف، ہلال الدین، محمد صادق، رحمت اللہ خاں، غلام غوث، کندن لال، کاشی راج اور میر حیدر بخش حیدری (جن کے نام آگے چل کر ۴ مئی ۱۸۰۱ء کو کالج کونسل نے بطور سیکنڈ منشی و مُنشی منظور کیے) آغازِ تدریس سے ہی عارضی طور پر بطور سرٹیفکیٹ مُنشی، فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہو گئے، جن میں سے ایک نام میر امّن کا بھی ہے۔ میر بہادر علی حسینی نارنولی کا گلکرسٹ سے تعارف ORIENTAL SEMINARY ہنگلی (آغاز: جنوری ۱۷۹۹ء۔ اختتام: اگست ۱۸۰۰ء) میں ہُوا، اِس لیے کہ دیسی سرٹیفکیٹ مُنشیوں کا سلسلہ ORIENTAL SEMINARY ہنگلی سے چلا۔ یوں میر بہادر علی حسینی نارنولی، اس قابل ہوئے کہ میر امّن کا تعارف گلکرسٹ سے کرواسکیں۔

میر امّن کے اپنے بیان سے پتا چلتا ہے کہ جب نواب دلاور جنگ کے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں

کی قریب دو سال کی اتالیقی کے بعد میر بہادر علی حسینی نارنولی کی معرفت گلکرسٹ تک رسائی ہوئی تو گلکرسٹ نے للولال جی کوی کی طرح میر امّن کو بھی ۲۴ نومبر ۱۸۰۰ء میں ہی ''سرٹیفکیٹ مُنشی'' کے طور پر فورٹ ولیم کالج کے لئے تحسین کی ''نوطرِ مُرصّع'' نئے سرے سے تخلیق (Re-create) کرنے کو دی۔ فورٹ ولیم کالج کے ''سرٹیفکیٹ منشیوں'' کا حوالہ ڈاکٹر لکشمی ساگر وارشنے اور ڈاکٹر عبدالسنان نے دیا ہے (دیکھیے: ''للولال جی کوی'' از ابو سعادت جلیلی، مطبوعہ: لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع اوّل: جون ۲۰۰۲ء ص:۵۱) سرٹیفکیٹ منشی کا عہدہ، چیف مُنشی (یہ مشاہرہ دو سو روپے ماہانہ)، سیکنڈ منشی (سو روپے ماہانہ) اور مُنشی (چالیس روپے ماہانہ) سے بھی چھوٹا (کنٹریکٹ پر غیر مستقل) ہوتا تھا۔ ڈاکٹر عبدالسنان کے مطابق ''سرٹیفکیٹ مُنشی'' کا کام فورٹ ولیم کالج میں مقیم زیرِ تربیت انگریز افسران کے کمروں میں جا کر پڑھانا ہوتا تھا۔ گویا یہ فورٹ ولیم کالج میں دیسی مُنشیوں کی تعیناتی کا زینہ تھا۔ بعد میں عُہدہ، حسبِ ضرورت ولیاقت مستقل بنیادوں پر دے دیا جاتا تھا۔ کالج کونسل کی کارروائی (۲۹ اپریل ۱۸۰۱ء) میں میر امّن کی اِس حیثیت کی طرف اِشارہ مِلتا ہے۔

فورٹ ولیم کالج میں آغازِ تدریس سے پہلے ۲۴ نومبر ۱۸۰۰ء کو میر بہادر علی حسینی کی معرفت میر امّن کی ملاقات گلکرسٹ سے ہوئی تو میر امّن نے خیال کیا کہ ''حضور تک جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ، کے رسائی ہوئی۔ بارے، طالع کی مدد سے ایسے جواں مرد کا دامن ہاتھ لگا ہے، چاہیے کہ دِن کچھ بھلے آویں۔'' انھیں دنوں گلکرسٹ نے میر امّن سے ''نوطرزِ مرصّع'' کو نئے سرے سے لکھنے کی فرمائش کی۔ جسے میر امّن نے ''حکمِ حضور'' کہا ہے۔ یُوں سرٹیفکیٹ مُنشیوں کی یہ عارضی ملازمت ۲۴ نومبر ۱۸۰۰ء تا ۴ مئی ۱۸۰۱ء رہی اور ۴ مئی ۱۸۰۱ء کو کالج کونسل کی میٹنگ میں چیف مُنشی کا عہدہ خالی رکھ کر میر بہادر علی حسینی نارنولی (سیکنڈ منشی)، تاری چرن مِتر (سیکنڈ منشی)، مرتضٰی خاں (منشی)، غلام اکبر (منشی)، نصر اللہ (منشی)، میر امّن (مُنشی)، غلام اشرف (مُنشی) ہلال الدین (منشی)، محمد صادق (منشی) رحمت اللہ خاں (منشی)، غلام غوث (منشی)، گندن لال (منشی)، کاشی راج (منشی) اور میر حیدر بخش حیدری (منشی) مُستقل کر دیے گئے۔ یہ الگ قصّہ ہے کہ محمد صادق، رحمت اللہ خاں اور کاشی راج کو ۲ نومبر ۱۸۰۲ء میں فارغ کر دیا گیا اور اُن کی جگہ سیّد جعفر، محمد تقی، مبارک محی الدین اور اسد علی کی بھرتی عمل میں آئی۔

میر بہادر علی حسینی نارنولی تا میر حیدر بخش حیدری (بشمول میر امّن) چودہ سرٹیفکیٹ مُنشیوں کی اس عارضی ملازمت (۲۴ نومبر ۱۸۰۰ء تا ۴ مئی ۱۸۰۱ء) کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ اگر یہ لوگ ۴ مئی ۱۸۰۱ء کو ہی فورٹ ولیم کالج میں آئے تو میر امّن نے ''باغ و بہار'' کا اوّلین مسودہ بہ عنوان ''چار درویش'' محض تین ماہ کی مختصر مدّت میں کیسے تیار کر لیا، جب کہ دیگر مُنشیوں کی طرح اُن کے فرائض منصبی میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ صبح ۱۰ بجے سے ایک بجے تک کالج میں

حاضر رہیں تا کہ طلبہ جب چاہیں اُن سے مدد لے سکیں۔ جب کہ شام کو بھی طلبہ کے کمروں میں جا کر تدریسی کام کرنا پڑتا تھا۔ میں نے تین ماہ کی مختصر مدّت اس لیے لکھی ہے کہ گلکرسٹ کی رپورٹ کے مطابق ۱۲۔ جنوری ۱۸۰۲ء تک میر امّن کی ''چار درویش'' کے ۵۸ صفحات ہرکارہ پریس، کلکتہ سے چھپ چکے تھے۔

''چار درویش'' کے تحریر کردہ مسودے کی کاپیاں تیار کروانے، مواد کو پریس وردی بنانے اور قدیم ٹریڈل مشین پر ۵۸ صفحات کو چھاپے چڑھانے کا عمل کم از کم چار پانچ ماہ کا طالب تھا۔ البتہ ۲۴ نومبر ۱۸۰۰ء تا اپریل ۱۸۰۱ء معقول مدّت معلوم ہوتی ہے، جس میں ''باغ و بہار'' کی اوّلین صورت یعنی ''چار درویش'' تکمیل کو پہنچی۔ اِس کی تصدیق پرنٹ آرڈر سے بھی ہوتی ہے۔ نیز ۲۴ نومبر ۱۸۰۰ء میں تدریسی سرگرمیوں کے آغاز پر محض سات پروفیسران پر مشتمل عملہ اتنے بڑے پروگرام کو چلانے کے لیے ناکافی تھا اور اُس کمی کو پُورا کرنے کے لیے مذکورہ بالا دیسی مُنشیوں سے مدد لیے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ بلکہ یہ سلسلہ آگے بھی چلا۔ میر شیر علی افسوس، کاظم علی جواں، مظہر علی خاں وِلا اور للو لال جی کوی، ۷ جنوری ۱۸۰۲ء میں اور مرزا فطرت ۵ دسمبر ۱۸۰۳ء میں فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہوئے۔

فی الوقت ''باغ و بہار'' کی روایتِ اوّل بہ عنوان: ''چار درویش'' کا کوئی ایک بھی ایسا خطی نسخہ دستیاب نہیں، جسے میر امّن نے قلم بند کیا ہو یا اپنی نگرانی میں نقل کروا کر اُس پر مہرِ تصدیق ثبت کی ہو۔ ماضی میں ڈنکن فاربس کا یہ دعویٰ رہا ہے کہ اُس نے ''باغ و بہار'' مطبوعہ: ڈبلیو۔ ایچ ایلین اینڈ کمپنی، پال مال ایس۔ ڈبلیو، لندن: ۱۸۴۶ء مرتب کرتے وقت ''باغ و بہار' مطبوعہ: ہندوستانی چھاپا خانہ، کلکتہ طبع اوّل: ۴۔۱۸۰۳ء کو بنیاد بنایا اور موازنۂ متن کے لیے گلکرسٹ کو میر امّن کی جانب سے فراہم کردہ خطی نسخے اور میر امّن کے شاگردِ خاص ایم۔ رومر کی تحویل میں رہنے والا نسخہ سامنے رکھا۔ فاربس لکھتے ہیں :

" The text is taken from the edition of 1803, printed at Calcutta, Collated at the same time with the two manuscripts, one in my own possession, probability the very which belonged to the late Dr.Gilchrist, and in all copy of the work which Mr. Amman himself wrote,and presented to the learned Doctor for approbation. The other was Copy belonging to Mr. Romer, of the honourable companies civil service, who was pupil of Mr. Amman, written partly by under the Superintendence of the author."

(دیباچہ: ''باغ و بہار'' مطبوعہ: ڈبلیو۔ ایچ ایلین اینڈ کو، لندن طبع اوّل: ۱۸۴۶ء)

ڈنکن فاربس کے اپنے دعوے کے مطابق فاربس کی مرتّب کردہ ''باغ و بہار'' (ترمیم شدہ ایڈیشن) مطبوعہ: ولیم۔ ایچ ایلن اینڈ کمپنی، لندن طبع چہارم: ۱۸۷۳ء (جس کی دائیں جانب سال اشاعت: ۱۸۶۰ء اور بائیں جانب فرہنگ کے بعد ۱۸۷۳ء درج ہے) ایک ایسا ایڈیشن ہے جسے مرتّب کرنے سے قبل (۱۸۴۹ء) فاربس کی رسائی رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں محفوظ ''باغ و بہار'' کے ایک اور خطّی نسخے تک بھی ہو گئی تھی۔ یعنی اس ایڈیشن (۱۸۷۳ء) میں ترامیم کی خرابی کے باوجود ایک خُوبی یہ ہے کہ اُس وقت فاربس کے سامنے تین خطّی نسخے تھے۔ گارسیں دتاسی کی تحویل میں رہنے والے ایک خطّی نسخے (مُحررہ: ۱۲۱۷ھ مطابق: ۳۔۱۸۰۲ء) کا ذکر ڈاکٹر ثریا حسین نے کیا ہے۔

رشید حسن خاں نے انڈیا آفس لائبریری، لندن کے جس خطّی نسخے، بہ عنوان: ''چہار درویش'' کو تدوینِ متن کے لیے بطور مآخذ منتخب کیا، اُس کے تعارف میں انڈیا آفس لائبریری، لندن کی فہرست مخطوطات میں درج ہے:

''۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ء عیسوی میں مکمل ہوئی اور اصلی کتاب کے نام پر اِس کا نام ''چہار درویش'' رکھا گیا، لیکن ''باغ و بہار'' کے نام سے مشہور ہوئی، جو اس کا تاریخی نام ہے۔'' پہلی بات تو یہ کہ انڈیا آفس لائبریری، لندن سے فراہم کردہ یہ نُسخہ نظر ثانی شدہ ''باغ و بہار'' کا خطّی نسخہ نہیں، پھر جیسا کہ خود رشید حسن خاں نے تسلیم کیا ہے کہ یہ ترقیمہ سے خالی ہے اور اُسے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے ہاتھ کی تحریر نہیں، نہ مُصنف کی تصدیق شدہ نقل ہے۔ اس کے ابتدائیہ میں بھی کوئی تحریر نہیں ملتی، جس سے اس نسخے کی حقیقت معلوم ہو۔ رشید حسن خاں یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ بعض مقامات پر متن کی ایسی غلطیاں دکھائی دیتی ہیں، جو اِس خطّی نسخے کو کم سواد ثابت کرتی ہیں۔ اِس لیے نظر ثانی شُدہ ''باغ و بہار'' یا ''باغ و بہار'' کی روایتِ اوّل: ''چہار درویش'' (تکمیل: ۱۲۱۵ھ مطابق جنوری تا اپریل ۱۸۰۱ء) کے مُستند خطّی نسخے کو دیکھنے اور اُسے بطور مُستند مآخذ برتنے کی خواہش اُس وقت تک ایک آرزو ہی رہے گی، جب تک کہ ڈنکن فاربس کے زیرِ استعمال رہنے والے، گلکرسٹ یا ایم۔ رومر کے ذاتی کتب خانوں میں شامل رہنے والے خطّی نسخوں یا گارسیں دتاسی کی تحویل میں رہنے والے خطّی نسخے کی دریافت عمل میں نہیں آتی۔ کم سواد نسخوں کا حوالہ دینے سے کیا حاصل؟

ہندی مینول میں ''باغ و بہار'' کی روایتِ اوّل: چار درویش:

جہاں تک ''ہندی مینول'' (THE HINDEE MANUAL OR CASKET OF INDIA)

مطبوعہ ہندوستانی پریس، کلکتہ: اپریل ۱۸۰۲ء کا تعلق ہے تو اُس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور میں موجود ہے۔ میری نظر سے بھی گزرا ہے اور ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے ۶۴۔۱۹۶۳ء میں اُسے مجلس ترقی ادب، لاہور کے لیے ''بیتال پچیسی'' اردو ترجمہ: للّو لال جی کوی، نظرثانی: مظہر علی خاں ولا مرتّب کرتے وقت دیکھا اور برتا ہے۔ لیکن ''اخلاق ہندی''، ''مرثیہء مسکیں''، ''سنگھاسن بتیسی''، ''مادھول نل کام کندلا''، ''شکنتلا''، ''بیتال پچیسی''، ''توتا کہانی''، ''نثر بے نظیر''، ''باغ اردو'' یا ''باغ و بہار'' مرتّب کرتے ہوئے رشید حسن خاں کی طرح ''ہندی مینول'' کو موازنہء متن کے لیے برتنا اُتنا ہی لایعنی فعل ہے، جتنا کہ غیر مُستند اور کم سواد خطّی نسخے کو برتنا۔

کالج کونسل، فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی چٹھی بابت اشاعتِ کُتب بنام گلکرسٹ بابت: یکم فروری ۱۸۰۲ء کے مطابق ''اخلاقِ ہندی'' اور ''توتا کہانی'' کی طباعت کا آغاز ٹیلی گراف پریس، کلکتہ سے ابھی ہُوا ہی تھا، ''سنگھاسن بتیسی'' کے ہرکارہ پریس کلکتہ سے محض چھتیس صفحات، ڈراما: ''شکنتلا'' کے کلکتہ گزٹ پریس سے محض چوبیس صفحات، میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان'' کے منثور ترجمے ''نثر بے نظیر'' کے کلکتہ گزٹ پریس سے چھتیس صفحات، شیخ سعدی کی فارسی تصنیف ''گلستان'' کے منثور ترجمے ''باغ اردو'' کے سپرو پریس کلکتہ سے محض چند صفحات، ''ہندوستانی پرنسپلز'' کے مارننگ پوسٹ پریس کلکتہ سے چالیس صفحات، ''باغ و بہار'' بہ عنوان: ''چار درویش'' کے ہرکارہ پریس، کلکتہ سے اٹھاون صفحات طبع ہو چکے تھے کہ ۱۹ فروری ۱۸۰۲ء میں کالج کونسل کی جانب سے یہ حکم ملا کہ مختلف چھاپہ خانوں میں زیرِ طبع کتب کے جتنے اجزاء چھپ چکے ہیں، اُن کا انتخاب مع انتخاب ''مرثیہء مسکیں'' از میر عبداللہ مسکین، کُل پانچ سو صفحات کی ایک انتھالوجی تیار کروالی جائے، جس پر دس ہزار روپے سے زائد خرچ نہ اُٹھے۔ یُوں ''ہندی مینول'' (۱۸۰۲ء) کی تیاری عمل میں آئی۔ واضح رہے کہ ''ہندی مینول'' میں ''مادھونل کام کندلا'' اور ''بیتال پچیسی'' کے انتخاب کو شامل کرنے کے لیے ''ہندوستانی پرنسپلز'' کو نکال باہر کیا گیا۔

بطور صدر شعبہ ہندوستانی، گلکرسٹ کی تخمینہ رپورٹ (۱۲ جنوری ۱۸۰۲ء) بابت: زیرِ طبع کتب کی اشاعت، بنام کالج کونسل کے جواب میں کالج کونسل نے زیرِ طبع کتب کی اشاعت محض اس لیے روک دی تھی کہ گلکرسٹ نے ۱۲ جولائی ۱۸۰۱ء کو پرنٹ آرڈر جاری کرنے سے قبل کالج کی ضروریات کے پیشِ نظر مسودات کو نظرِ ثانی کے عمل سے نہیں گزارا تھا اور پیشگی منظوری لیے بغیر اسی تاریخ میں مختلف چھاپہ خانوں کو پرنٹ آرڈر جاری کر دیا تھا۔

گلکرسٹ کی تخمینہ رپورٹ کے جواب میں کالج کونسل کی چٹھی بابت: یکم فروری ۱۸۰۲ء سے ثابت ہے کہ ۱۲ جولائی ۱۸۰۱ء میں بغرضِ طباعت ہرکارہ پریس، کلکتہ کو بھجوائی جانے والی ''باغ و بہار'' کی روایتِ اوّل بہ عنوان: ''چار درویش'' (تکمیل: ۲۴ نومبر ۱۸۰۰ء تک اپریل ۱۸۰۱ء) گلکرسٹ کے نظامِ املا سمیت اُس حتمی اور شافی نظرِ ثانی

سے خالی تھی، جو کالج کونسل کو منظور تھی۔

۱۹ فروری ۱۸۰۲ء کو جب کالج کونسل کی جانب سے جُملہ کتب کی اشاعت روک دی گئی تو ہرکارہ پریس سے ''چہار درویش'' کے ۱۰۲ صفحات طبع ہو چکے تھے۔ ۱۹ فروری ۱۸۰۲ء ہی کو کالج کونسل کی منظوری کے بعد ۱۲۔ اپریل ۱۸۰۲ء کو ان ۱۰۲ صفحات کی طباعت پر اُٹھنے والی رقم (ایک ہزار تین سو سینتیس روپے) ہرکارہ پریس کلکتہ کو ادا کر دی گئی۔

یوں ''ہندی مینول'' میں شامل ''باغ و بہار'' کا ۱۰۲ صفحات پر مشتمل متن، وہ متن یقیناً نہیں، جسے بے وطن میر امان علی امّن نے اپریل ۱۹۰۲ء میں ''ہندی مینول'' کی اشاعت کے بعد، بعد از نظر ثانی ''ہزار جدّ و کد سے اُردوے مُعلاّ کی زبان میں باغ و بہار بنایا۔''

''ہندی مینول'' (اپریل ۱۸۰۲ء) میں شامل ''باغ و بہار'' کا متن ۲۴ نومبر ۱۸۰۰ء تا اپریل ۱۸۰۱ء کی درمیانی مدّت میں تیار کردہ وہ متن ہے جسے رشید حسن خان کی طرح ''باغ و بہار'' کا نظر ثانی شدہ حتمی متن شمار کرنا سرے سے غلط ہے، لہٰذا اُسے تدوینِ متن میں بطور بنیادی مآخذ نہیں برتا جا سکتا۔

عُجلت میں تیار کردہ ''ہندی مینول'' تحقیقی اعتبار سے بھی مُستند مآخذ قطعاً نہیں۔ مثال کے طور پر ''ہندی مینول'' ''سنگھاسن بتیسی'' (مآخذ سنسکرت) تالیف از فقیر دکنی مصنفہ عہدِ شاہ عالم کو ''مرزا کاظم علی جواں و سری للّو جی لال'' کا ترجمہ ظاہر کر رہا ہے۔ جب کہ یہ للّو لال جی کوی کا کیا ہُوا ترجمہ ہے، یعنی نہ صرف مترجم کا نام غلط درج کیا گیا بلکہ شریک مترجم کے طور پر مرزا کاظم علی جواں کا نام بھی دے دیا گیا۔ مرزا کاظم علی جواں نے نظر ثانی کا کام کیا، اُن کا نام بطور مترجم کتاب کے ظاہر کرنا، درست نہیں۔ ترجمہ در ترجمہ فقیر دکنی کی ''سنگھاسن بتیسی'' اور اِس کتاب کے متن میں واقعاتی سطح پر بھی اختلاف پایا جاتا ہے، جس کی صراحت ضروری تھی۔ (تفصیلات کے لیے دیکھیے: ''للّو لال جی کوی'' از ابوسعادت جلیلی مطبوعہ: مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع اوّل: جون ۲۰۰۲ء، صفحہ ۶۰)

اِسی طرح ''ہندی مَینول'' میں ''بیتال پچیسی'' کو ''مظہر علی خاں ولا و سری للّو جی لال'' کی تصنیف یا ترجمہ ظاہر کیا گیا ہے۔ جب کہ یہ للّو لال جی کوی کا ۱۸۰۱ء میں کیا ہُوا برج بھاشا سے اُردو ترجمہ ہے۔ بطور مترجم، للّو لال جی کوی کا نام دیا جانا چاہیے تھا اور بطور معاون مظہر علی خاں ولا کا۔ (تفصیلات کے لیے دیکھیے: ''کوی پرچے'' از للّو لال جی کوی)

''اخلاقِ ہندی'' کا مصنف یا مؤلف میر بہادر علی حسینی کو ظاہر کیا گیا ہے، جب کہ یہ بھی ترجمہ در ترجمہ کتاب ہے۔ ''ہتوپدیش'' (سنسکرت) سے فارسی ترجمہ (نصیر الدین شاہ بہادر کے حکم سے) مفتی تاج الدین بن معین الدین الملکی نے بہ عنوان ''مفرح القلوب'' کیا تھا، یہ اسی کتاب کا فارسی سے اردو ترجمہ ہے۔

برج بھاشا کے قصہ ''مادھونل کام کندلا'' از موتی رام کبشیر کو مظہر علی خاں وِلا اور سری للو لال جی کی تصنیف یا تالیف ظاہر کیا گیا ہے۔ للو لال جی کوی کا نام بھی غلط لکھا گیا اور قصے کو ادھورا نام ''مادھونل'' دیا گیا۔

''شکنتلا'' (سنسکرت) کالی داس کا ڈراما ہے۔ فرخ سیر کے عہد میں نواج کوی نے اسے برج بھاشا میں منظوم ترجمہ کیا جسے بنیاد بنا کر للو لال جی کوی اور مرزا کاظم علی جواں نے ۱۸۰۱ء میں ترجمہ کیا۔ ہندی مینول سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ''مرزا کاظم علی جواں اور سری للو جی لال'' کی تصنیف یا تالیف ہے۔

ہندی مینول میں ''بیتال پچیسی'' کے اصل سنسکرت مآخذ ۱۲ویں تا ۱۵ویں صدی کا حوالہ نہیں ملتا۔ مظہر علی خاں وِلا اور سری للو جی لال کی تصنیف یا تالیف ظاہر کیا گیا ہے۔ جب کہ اس کا اصل مآخذ سنسکرت ہے۔ عہد اکبری (۱۶۰۴ء) میں اسے برج بھاشا میں نظم کیا گیا۔ اس کے بعد گنگا دھر یا جگدیش نے ''وکرم ولاس'' کے عنوان سے ۱۶۸۲ء میں برج بھاشا میں نظم کیا۔ للو لال جی کوی اور مظہر علی خاں ولا نے سورت سر کے سنسکرت سے برج بھاشا میں کیے گئے ترجمہ (۱۷۴۰ء) کو بنیاد بنا کر تالیف و ترجمہ کا کام ۱۸۰۱ء میں مکمل کیا۔ اس کتاب کے حوالے سے بھی للو لال جی کوی کا نام غلط درج کیا گیا یعنی ''سری للو جی لال''۔

''توتا کہانی'' کا مآخذ سیّد محمد قادری کا ''طوطی نامہ'' (فارسی) قبل ۱۷۲۹ء ہے۔ جب کہ ''ہندی مینول'' میں ''توتا کہانی'' کو حیدر بخش حیدری کی تصنیف یا تالیف ظاہر کیا گیا ہے۔ اصل مصنف کا نام نہیں ملتا۔

''نثر بے نظیر'' تالیف از میر بہادر علی حسینی نارنولی (۱۸۰۱ء) درحقیقت میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان'' کی منثور صورت ہے۔ لیکن ہندی مینول سے یہ معلوم نہیں ہوتا۔

''ہندی مینول'' میں ''باغِ اردو'' کے مصنف یا مؤلف کے طور پر میر شیر علی افسوس کا نام ملتا ہے جب کہ ''باغِ اردو'' شیخ سعدی کی ''گلستان'' (فارسی) کا اُردو ترجمہ ہے۔

''ہندی مینول'' میں جس طرح للو لال جی کوی کے نام کو ''للو جی لال'' یا ''سری للو لال'' لکھا گیا اُسی طرح میر امان علی امّن کے نام کو ''میر امن لطف'' درج کیا گیا۔

درج بالا امثال کی روشنی میں جس طرح ''ہندی مینول'' اچھا تحقیقی مآخذ نہیں، اُسی طرح وہ نہ تو مصنف کے خطی نسخے کی جگہ لے سکتا ہے؛ نہ اُس قلمی نُسخے کی، جسے مُصنف کے کسی دوست، عزیز یا قرابت دار نے رقم کیا ہو؛ نہ اُس قلمی نسخے کی، جسے کسی اعلیٰ شخصیت کے لیے بطورِ خاص تیار کیا گیا ہو اور نسخہ مُصنف کی نظر سے گزر چُکا ہو اور جس کی استنادی حیثیت میں اشتباہ نہ ہو۔

یوں خطّی نُسخے کی عدم دستیابی کے سبب ''ہندی مینول'' میں شامل میر امّن کی نظرِ ثانی سے خالی ''باغ و بہار''

کے اَجزا کو دیکھا تو جا سکتا ہے لیکن اُسے رشید حسن خان کی طرح موازنہ ءمتن کے لیے برتنے سے بہتر ہے کہ "باغ و بہار" کی طباعتِ اوّل کلکتہ: ۱۸۰۴ء کو چُنا جائے۔

O

"باغ و بہار" از میر امّن کا مآخذ: "قصۂ چہار درویش" از مرزا ربیع انجب:

میر امّن کی "باغ و بہار" کی اشاعتِ اوّل مطبوعہ: ہندوستانی چھاپا خانہ، کلکتہ (۱۲۱۸ھ مطابق ۴-۱۸۰۳ء) کے سرورق پر "باغ و بہار" کا مآخذ "قصہء چہار درویش" کا فارسی سے اردو ترجمہ: "نوطرزِ مُرصّع" از عطا حسین خاں بتایا گیا ہے۔ "باغ و بہار" نہ تو ترجمہ ہے اور نہ طبع زاد تخلیق؛ اسے "Re-creation" یا "بازتخلیق" کہا جا سکتا ہے۔

مہر چند کھتری مہر لکھتے ہیں: "انھیں دنوں میں عطا حسین خاں نے چہار درویش کا قصہ فارسی سے ہندی میں تضمین کر کے "نوطرزِ مُرصّع" نام رکھا .... ریختہ زبان میں الفاظِ دقیق اور عبارتِ رنگین سے موزوں کیا ہے، اِس سبب سے مطبوع انگریزوں کے تئیں ہُوا۔" (دیباچہ: "ملک محمد و گیتی افروز"، زمانۂ تحریر: ۸۹-۱۷۸۸ء)

جب کہ "باغ و بہار" کی اشاعتِ اوّل میں انگریزی کی جو تحریر بہ عُنوان: "Preface" از جان بارتھ وِک گلکرسٹ شامل ہے، اُس سے بھی یہ تاثر ملتا ہے کہ تحسین نے یہ ترجمہ کسی انگریز کی فرمائش پر کیا۔ خاص طور پر "Objectionable" کا لفظ غور طلب ہے:

> " UTA HOOSUEN KHAN orignally translated it, under the name of NUO-TURZI MOORUSSU; but as a specimen of this language, it was rendered objectionable, by his retaining too much of the phraseology andidiom of the Persian and Arabic."

"نوطرزِ مُرصّع" کا سببِ تالیف، اُس کتاب کے مؤلف میر محمد حسین عطا خاں تحسین ولد میر باقر خاں شوق، ساکن اٹاوہ نے یُوں بیان کیا ہے:

"ایک مرتبہ نواب مبارز الملک، افتخار الدولہ جنرل سمتھ بہادر صولت جنگ سالارِ فوج انگریزی کی ہم راہی میں بجرے پر کلکتے کا سفر در پیش آیا۔ خالی بیٹھے بیٹھے دل گھٹنے لگا تو ایک عزیز نے جو ہم راہ تھا، یہ قصہ سُنانا شروع کیا۔ بہت پسند آیا اور اُسی وقت سے زبانِ ہندی میں لکھنے کی دُھن لگ گئی۔" (دیباچہ: "اِنشائے نوطرزِ مرصّع" مطبوعہ: بمبئی طبع اوّل: ۱۸۴۶ء)

یقیناً جنرل رچرڈ سمتھ اِس قصّے کے مُحرّکِ اوّل اُس وقت بنے ہوں گے جب میر تحسین نے جنوری ۱۷۶۸ء تا ۱۹ ستمبر ۱۷۶۸ء میں بطور میر منشی، اُن کی معیت میں اِلٰہ آباد سے واپسی پر کلکتے تک دریائے گنگا کا سفر (لگ بھگ آٹھ ماہ) ایک ہی بجرے میں کیا۔ بعد از آں جنرل رچرڈ سمتھ ہی کے حُکم پر میر تحسین کا قیام عظیم آباد (پٹنہ) میں بطور وکیل نظامت رہا۔ ۱۷۷۲ء میں فیض آباد کے ریزیڈنٹ کپتان ہارپر کے قانونی مُشیر رہے۔ اُن کے والد دربارِ اُودھ سے وابستہ تھے، جن کی وفات کے بعد اُن کی جگہ لینے کو وزیر الممالک نواب برہان الملک شجاع الدولہ ابوالمنصور خاں صفدر جنگ (نواب اودھ) کی سرکار میں پہنچے۔ میر تحسین لکھتے ہیں: ''ایک روز تقریباً دو چار فقرے اِس داستان کے کہ اوّل ذکر اس بیان کا کر گیا ہوں، بیچ سمع مبارک حضرتِ ولی نعمت کے پہنچے، از بس کہ شاہدِ رعنا اِس حکایت دل فریب کا جلوہ گری کے عالم میں شوخ و شنگ ہے، توجۂ دِل سے قبولِ خاطر و منظور نظر اشرف کے کر کے فرمایا کہ: ''از سر تا پا اس محبوب پسندیدہ دِل ہا کے تئیں زیورِ عبارت سے آراستہ کر۔''

یُوں نواب شجاع الدولہ، شاہِ اُودھ (پ: ۱۷۳۱ء۔ م: ۱۷۷۵ء) کی وفات اور اُن کے بیٹے نواب آصف الدولہ کی تخت نشینی: ۱۷۷۵ء کے بعد ''نوطرزِ مُرصّع'' تکمیل کو پہنچی اور نواب آصف الدولہ کی تعریف میں لکھے گئے چند جُملوں اور ایک قصیدے کے اضافے کے ساتھ ۱۷۷۵ء ہی میں نواب آصف الدولہ کے حضور پیش کی گئی۔ محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں ''نوطرزِ مرصّع'' کا سالِ تالیف ۱۷۹۸ء اور بلوم فیلڈ نے ۱۷۸۰ء رقم کیا ہے۔ یہ دونوں تاریخیں یکسر غلط ہیں۔ ''نوطرز مُرصّع'' ۱۷۶۸ء تا ۱۷۷۵ء کی تصنیف / تالیف ہے۔ یعنی ''نوطرزِ مُرصّع'' کی تکمیل میر امّن کی ''باغ و بہار'' رولِتِ اوّل بہ عنوان: ''چار درویش'' تکمیل: ۱۲۱۵ھ مطابق جنوری تا اپریل ۱۸۰۱ء سے ٹھیک پچیس برس قبل کی ہے۔

میر محمد حسین عطا خاں تحسین کی ''نوطرزِ مُرصّع'' پہلی بار ''انشائے نوطرزِ مُرصّع'' کے عنوان سے کمپنی کے ایک انگریز افسر کی زیرِ نگرانی بمبئی سے ۱۸۴۶ء میں شائع ہوئی۔ یعنی ''باغ و بہار'' کی اشاعتِ اوّل، کلکتہ: ۱۸۰۴ء سے ٹھیک بیالیس برس بعد ''نوطرزِ مرصّع'' زمانہ تکمیل: ۱۷۶۸ء تا ۱۷۷۵ء، کتابی صورت میں سامنے آئی۔ اِس سے یہ بھی طے پایا کہ میر امّن کے پیشِ نظر ''نوطرزِ مُرصّع'' کا کوئی خطّی نسخہ رہا۔ اختلافِ متن کا بھی یہی سبب ہے۔

میر امّن نے مدرسے کے مُختار کار صاحبوں کے نام عرضی میں یہ تو لکھا ہے کہ: ''حُکمِ اِشتہار کا سُن کر، چار درویشوں کے قصّے کو ہزار جدّ و کد سے اُردوئے مُعلّا کی زبان میں باغ و بہار بنایا'' لیکن نہ تو عرضی میں اور نا ہی ''باغ و بہار'' کے دیباچے میں میر محمد حسین عطا خاں تحسین یا ''نوطرزِ مُرصّع'' کا حوالہ دیا۔ بس یہی دیکھ کر مولوی عبدالحق نے

میر امّن پر سرقہ کا الزام رکھا۔ جب کہ ''باغ و بہار'' کی اشاعتِ اوّل، کلکتہ: ۱۸۰۴ء کے سرورق کی عبارت میں یہ صراحت یہ حوالہ موجود ہے۔

''باغ و بہار'' کے ایک اہم مُترجم ایل۔ ایف۔ سمتھ (L.F.SMITH) ''باغ و بہار'' کی اشاعتِ اوّل: ۱۸۰۳۔۴ء کے سرورق کی عبارت اور میر امّن کے بیانات (دیباچہ وعرضی) کے اِس فرق کے پیشِ نظر یہ بات تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ ''باغ و بہار'' کا مآخذ ضرور ''نوطرزِ مُرصّع'' رہی ہوگی۔ جب کہ مولوی عبدالحق نے ''نوطرزِ مُرصّع'' اور ''باغ و بہار'' کی عبارات اور واقعات کا موازنہ کر کے یہ ثابت کیا کہ ''باغ و بہار'' کا مآخذ ''نوطرزِ مُرصّع'' ہی ہے اور میر امّن نے جان بُوجھ کر تحسین یا ''نوطرزِ مُرصّع'' کا ذکر دیباچہ وعرضی میں نہیں کیا۔ مقامِ حیرت ہے کہ ''باغ و بہار'' کی تدوین سے پہلے یا تدوینِ متن کے دوران مولوی عبدالحق کی نظروں سے ''باغ و بہار'' کا کوئی ایسا نسخہ نہیں گزرا، جس میں سرورق کا اعتراف اور Preface از جان بارتھ وِک گلکرسٹ، دونوں شامل ہوتے۔

''باغ و بہار'' از میر امّن، اشاعتِ اوّل، مطبوعہ: ہندوستانی چھاپا خانہ، کلکتہ: ۱۸۰۴ء کے سرورق کی عبارت درجِ ذیل ہے:

''ماخذ اُس کا نوطرزِ مُرصّع، وہ ترجمہ کیا ہُوا عطا حسین خاں کا ہے فارسی قِصّہ چار درویش سے۔'' یہی بات Preface (بہ زبانِ انگریزی) از جان بارتھوک گلکرسٹ سے بھی ثابت ہے۔ گلکرسٹ لکھتے ہیں:

''ماضی بعید میں یہ قصّہ، بہ زبانِ فارسی، بہ عنوان: ''قصّہ چہار درویش'' یا ''چار درویشوں کی کہانی''، خاصا سراہا گیا ہے .... فارسی سے اس قصّے کا اُردو ترجمہ عطا حسین خاں نے ''نوطرزِ مُرصّع'' کے عنوان سے کیا تھا، لیکن وہ ترجمہ اردو زبان کے نثر پارے کے طور پر قابلِ اعتراض یوں تھا کہ اُس میں فارسی اور عربی لفظیات اور مُحاورات کی بُہتات تھی۔ اِس نُقص کو دُور کرنے کے لیے مقامی عالم میر امّن دِلّی والے نے، جو کہ فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہیں؛ اسی قدیمی ترجمے کو بنیاد بنا کر یہ یکسر نیا اسلوب وضع کیا۔''

ایل۔ ایف۔ سمتھ اور مولوی عبدالحق کے الگ الگ شُبہات کی بُنیاد میر امّن کا یہ بیان ہے:

''گلکرسٹ صاحب نے کہ ہمیشہ اِقبال اُن کا بُلند رہے، جب تلک گنگا جمنا بہے، لُطف سے فرمایا کہ اِس قصّے کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں، جو اُردو کے لوگ ہندو مُسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص وعوام آپس میں بولتے چالتے ہیں، ترجمہ کرو۔'' (دیباچہ از میر امّن)

میر تحسین کی ''نوطرزِ مرصّع'' سے متعلق مہر چند کھتری مہر کا یہ کہنا کہ: ''مطبوع انگریزوں کے نہیں ہُوا'' اور گلکرسٹ کا اُسے ''قابل اعتراض'' کہنا، یہ ثابت کرتا ہے کہ ''نوطرزِ مُرصّع'' تالیف / ترجمہ کرنے کی تحریک جنرل

رچرڈ سمتھ (م: یکم ستمبر ۱۷۹۰ء) کی جانب سے ہوئی، جن کی معیت میں میر تحسین نے جنوری ۱۷۶۸ء تا ۱۹ ستمبر ۱۷۶۸ء اِلٰہ آباد سے کلکتے تک کا سفر کیا۔ یاد رہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی مجلسِ نُظماء کی جانب سے قلعہ سینٹ جارج مدراس کے نام جاری کردہ چِٹھی بابت ۲۲ دسمبر ۱۶۷۷ء میں واضح طور پر یہ اعلان کیا گیا تھا کہ: ''کمپنی کے جو ملازمین...... انڈستان (یعنی اردو) سیکھیں گے، اُنھیں بیس پاؤنڈ بطورِ انعام دیئے جائیں گے۔'' اُس کے بعد نومبر ۱۸۰۰ء میں ''نوطرزِ مرصّع'' کے خطّی نُسخے کا فورٹ ولیم کالج سے گلکرسٹ کی معرفت میر امّن تک مُنتقل ہونا اور ۱۸۴۶ء میں بمبئی سے ''نوطرزِ مُرصّع'' کا ایک انگریز افسر کی نگرانی میں شائع ہونا بھی یہی ثابت کرتا ہے کہ ''نوطرزِ مُرصّع'' کی تالیف/ترجمہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی زبان فہمی سے متعلق منصوبہ بندی کا حِصّہ تھا۔

میر محمد حسین عطا خاں تحسین کی ''نوطرزِ مُرصّع'' کو مہر چند کھتری مہر کی جانب سے ''الفاظِ دقیق'' قرار دینا اور گلکرسٹ کا ''قابلِ اعتراض یُوں کہ اس میں فارسی اور عربی لفظیات اور محاورات کی بہتات تھی''، کہنا بھی یکسر درست نہیں۔ ''نوطرزِ مُرصّع'' اور ''باغ و بہار'' کا موازنہ ثابت کرتا ہے کہ میر تحسین کا طرزِ تحریر کچھ ایسا اَدق نہیں، جتنا کہ ہمارے ناقدین اور محققین نے ظاہر کیا۔ ''نوطرزِ مُرصّع'' اور ''باغ و بہار کے طرزِ بیان میں وہی فرق ہے، جو میر تحسین کی تخلیقی آزادروی اور میر امّن کی نصابی مجبوریوں کے تحت قلم کاری کا فرق ہے۔ جب ملکہ، خلوت چاہتے ہوئے، دائی سے کہتی ہے:

''شاید تُجھے نیند آتی ہے۔'' تو اُس کے جواب میں دائی کہتی ہے:

''ہاں مُجھ پر خواب نے غلبہ کیا ہے۔'' (''باغ و بہار'' از میر امّن)

''واقعی، ملکہ کو صاحبِ کرامت کہا چاہیے۔'' (''نوطرزِ مُرصّع'' از میر تحسین)

میر امّن لکھتے ہیں: ''اے جاہل! ہمارے بڑے بُت میں کیا بُرائی دیکھی جو غائب خُدا کی پَرستش کرنے لگا؟'' (باغ و بہار)

میر تحسین لکھتے ہیں: ''اے جاہل! بُتِ بزرگ سے کیا بدی دیکھی کہ پَرستش خُدائے نادیدہ کی کرتا ہے؟'' (''نوطرزِ مُرصّع)

درجِ بالا موازنہ، متن سے مضامین کی قُربت بھی ثابت ہے۔ اِس ضمن میں دیگر امثال بھی دیکھتے چلیے:

(۱) پہلا درویش، جس جراح سے مدد لیتا ہے، اُس کا نام فارسی قصّہٴ چہار درویش کے کسی معلومہ نُسخے میں نہیں مِلتا۔ جب کہ ''نوطرزِ مُرصّع'' میں میر تحسین نے جراح کا نام ''عیسیٰ جراح'' لکھا ہے۔ میر امّن کی ''باغ و بہار'' میں بھی یہی نام مِلتا ہے۔

(۲) قصہ چہار درویش (فارسی) کے جملہ معلومہ نسخوں میں ''سیر پہلے درویش کی'' کا جراح حددرجہ غُصیل ہے۔ جب کہ ''نوطرزِ مُرصّع'' میں ایسا نہیں۔ میر تحسین نے اُسے حددرجہ حلیم الطبع ظاہر کیا ہے، اور یہی صُورت میر امّن کی ''باغ و بہار'' میں بھی ملتی ہے۔

(۳) قصہء چہار درویش (فارسی) کے معلومہ نُسخوں میں یوسف سوداگر کی معشوقہ، حددرجہ خوبصورت ہے، جب کہ میر تحسین کی ''نوطرزِ مُرصّع'' میں اُسے حددرجہ بدصُورت بتایا گیا اور میر امّن کی ''باغ و بہار'' میں بھی وہ بدصُورت ہی ہے۔ اِسی نوع کی امثال سے مولوی عبدالحق نے مُجلّہ ''اردو'' بابت: جولائی ۱۹۳۰ء میں یہ ثابت کیا کہ میر امّن کی ''باغ و بہار'' کا مآخذ میر محمد حسین عطا خاں تحسین کی ''نوطرزِ مُرصّع'' ہی ہے، فارسی قصہ چہار درویش نہیں۔ یہ طے ہے کہ جان بارتھ وِک گلکرسٹ کی فرمائش پر میر تحسین کی ''نوطرزِ مُرصّع'' کی بازتخلیق (recreation) ہی ''باغ و بہار'' کی صورت میں سامنے آئی اور وہ بھی ضروریاتِ مدرسہ فورٹ ولیم کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے۔

''باغ و بہار'' کے مآخذ سے متعلق میر امّن اور گلکرسٹ کے بیانات گمراہ کُن ہیں۔ میر امّن لکھتے ہیں: ''قصہ چار درویش کا، اِبتداء میں امیر خُسرو دہلوی نے اِس تقریب سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیا زری زربخش؛ جواُن کے پیر تھے،...... اُن کی طبیعت ماندی ہوئی، تب مُرشد کے دِل بہلانے کے واسطے امیر خُسرو یہ قصہ ہمیشہ کہتے اور بیمارداری میں حاضر رہتے، اللہ نے چندروز میں شِفادی۔''

(دیباچہ ''باغ و بہار'' از میر امّن)

گِلکرسٹ کہتے ہیں:

> " This work has long been admired in the original Persian, under the name of the " Qissui chuhar durwesh" or " The tale of the four dervises", it was composed in the beautiful tongue by Umeer khoosro, for the purpose of entertaining his friend and religious instructor Nizam ood deen uoliya, during afit of sickness."

(مقدمہ بہ عنوان: "Preface" (بہ زبان انگریزی) مشمولہ: ''باغ و بہار' اشاعت اوّل، کلکتہ: ۱۸۰۴)

سب سے پہلے ۱۹ویں صدی کے مشہور مُستشرق سر ولیم اوسلے نے اِس روایت کو غلط کہا اور اُس کے بعد حافظ محمود شیرانی نے ثابت کر دیا کہ بنیادی فارسی مآخذ، یعنی ''قصہء چہار درویش'' امیر خُسرو کی تالیف نہیں۔

(تفصیلات کے لیے دیکھیے، مقالہ: ''قصہء چہار درویش'' از شیرانی، مطبوعہ: ''کارواں'' لاہور، سالنامہ: ۱۹۳۳ء)

جس طرح امیر خُسرو کے نام کے ساتھ بہت سا اِلحاقی کلام، آلاتِ موسیقی اور راگ راگنیاں منسوب ہیں، اُسی طرح فارسی قصہَ چہار درویش بھی اُن کے نام کے ساتھ منسوب کر دیا گیا۔ امیر خُسرو (م: ۷۲۵ھ مطابق ۲۵-۱۳۲۴ء) کا تعلق غیاث الدین بلبن (م: ۱۲۸۶ء) کے دربار سے تھا، اور اُس دور میں تو کیا اُس کے بہت بعد تک اِس قصّے کا کہیں نام ونشان نہیں ملتا، حتیٰ کہ جلال الدین محمد اکبر (تخت نشینی: ۱۵۵۶ء۔م: ۱۶۰۵ء) کے عہدِ حکومت میں قصّے کہانیوں کی سطح پر ''سنگھاسن بتیسی' سنسکرت سے فارسی ترجمہ از مُلا عبدالقادر بدایُونی (۹۸۲ھ مطابق ۷۵-۱۵۷۴ء)، ''نل دمن'' سنسکرت ناٹک کا منظوم فارسی ترجمہ از مُلا عبدالقادر بدایونی، ''عیار دانش'' سنسکرت (کلیلہ دمنہ) سے فارسی ترجمہ از ابوالفضل (۹۹۶ھ مطابق ۸۸-۱۵۸۷ء)، ''سلیمان وبلقیس'' از ابوالفیض فیضی فیاضی، ''نل دمن'' سنسکرٹ ناٹک کا فارسی ترجمہ از ابوالفیض فیضی فیاضی، ''بحرالاسما'' ترجمہ از مُلا عبدالقادر بدایونی، ''کشکول'' (منظوم ومنثور تحریریں) از ابوالفضل اور ''قصہء امیر حمزہ'' (نام مصنف، موءلف ندارد) کے علاوہ کچھ نہیں مِلتا۔ نیز قصہء چہار درویش (فارسی) کا معلومہ قدیم تر نُسخہ برٹش میوزیم لائبریری، لندن اوائل ۱۸ویں صدی کا ہے۔ اِس سے پہلے اِس قصّے کا وجود نہ تھا۔ جب کہ امیر خسرو کی پیدائش: ۱۲۵۳ء بہ مقام پٹیالی اور وفات: ۱۳۲۵ء بہ مقام دِلّی کی ہے۔ حافظ محمود شیرانی کی تحقیق کے مُطابق ۱۔ فارسی قصہَ چہار درویش کا مُصنف فِرقہ اثنا عشری کا رُکن دکھائی دیتا ہے جب کہ امیر خُسرو، سُنی العقیدہ تھے۔ ۲۔ فارسی قصہ چہار درویش کے معلومہ نسخوں میں حافظ، نظیری، فُغانی، عُرفی، غیرتی اور شاپور کے اشعار کی شمولیت ثابت کرتی ہے کہ اس قصّے کا تعلق امیر خسرو کے عہد سے ہو نہیں سکتا، اس لیے کہ یہ تمام شعراء بہت بعد کے ہیں۔ ۳۔ رائج الوقت فارسی نسخوں میں سے کسی ایک کی زبان بھی ایسی نہیں، جسے امیر خُسرو یا اُن کے عہد کی زبان کہا جاسکے۔ ۴۔ فرنگیوں سے متعلق فراہم کردہ معلومات کا تعلق مُغلیہ دور سے تو ہوسکتا ہے، امیر خُسرو کے عہد سے نہیں ۵۔ خواجہ سگ پرست کے قصّے میں دُوربین (ایجاد: ۱۷ویں صدی عیسوی) کا حوالہ قصہ چہار درویش کو جدید الاصل ثابت کرتا ہے۔

(بہ حوالہ ''قصہ چہار درویش'' و ''باغ وبہار کا تحقیقی مطالعہ'' از حافظ محمود شیرانی)

یُوں طے پایا کہ قصہَ چہار درویش (فارسی) سے امیر خُسرو کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ محض ایک غلط روایت ہے، جسے ''باغ وبہار'' کے دیباچہ از میرامّن اور ''باغ وبہار'' کے مقدمہ (بہ زبان انگریزی) از گلکرسٹ سے فروغ مِلا۔

سر ولیم اوسلے کی فہرست مخطوطات: "Oriental Collections" ۱۷۹۸ء کے نمبر شمار ۲۱۷ کی

روشنی میں حافظ محمود شیرانی کا دریافت کردہ حکیم محمد علی الخاطب بہ معصوم خاں کا بلا عنوان فارسی قصہ بابت چار درویشوں کے (زمانۂ تحریر: بہ عہد محمد شاہی۔ کتاب: ۱۱۴۶ھ مطابق ۱۷۳۳ء)، ''چہار درویش'' از صفی، ''نوطرزِ مُرصّع'' از میر محمد حسین عطا خاں تحسین (زمانۂ تکمیل: ۱۷۶۸ء تا ۱۷۷۵ء) اور قصۂ چہار درویش کا اُردو ترجمہ: ''نوطرزِ مرصّع'' تاریخی نام: ''باغ و بہار'' (۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۱ء) از محمد غوث زریں، اِس روایت سے خالی ہیں۔ البتہ فارسی قصۂ چہار درویش از میر احمد خلف شاہ محمد، مطبوعہ: ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء، جو میر امّن کی ''باغ و بہار'' (مطبوعہ: ۱۸۰۳-۴ء) سے پچھتر برس بعد کی چیز ہے، میں یہ غلط روایت موجود ہے، جو یقیناً میر امّن کی ''باغ و بہار'' کے ذریعے عام ہوئی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''باغ و بہار'' کے اصل مآخذ یعنی فارسی قصۂ چہار درویش کا خالق کون ہے؟ اس سوال کا جواب ڈھونڈتے ہوئے حافظ محمود شیرانی نے حکیم محمد علی الخاطب بہ معصوم خاں کا بلا عنوان فارسی قصہ بابت چار درویشوں کے بہ عنوان: ''حکایاتِ عجیب و غریب'' (تحریر: بہ عہد مغل حکمراں محمد شاہ بادشاہ رنگیلا)، زمانۂ کتابت: ۱۱۴۶ھ مطابق ۱۷۳۳ء نام کاتب: عبدالکریم) ڈھونڈ نکالا۔ حکیم محمد علی کا مآخذ کیا رہا، کچھ معلوم نہیں۔

ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں محفوظ، مولوی عبدالحق کے دریافت کردہ فارسی قصے ''چہار درویش'' از صفی کے خطی نُسخے کے آغاز میں درج منظوم حمد میں ''صفی'' تخلص دیکھ کر مولوی عبدالحق نے لکھا: ''خُسرو جیسے زبردست اور پُرگو شاعر سے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ کسی دوسرے غیر معروف شاعر کی نظم حمد میں نقل کرتے، یہ اُن کی طبیعت سے بعید معلوم ہوتا ہے۔ اس سے یہ شُبہ اور قوی ہوتا ہے کہ یہ قصہ امیر خُسرو کا لکھا ہوا نہیں ہے۔'' (مقدمہ: باغ و بہار) حافظ محمود شیرانی اور عبدالحق کے بعد ڈاکٹر گیان چند نے بوڈلین لائبریری آکسفرڈ (قیام: ۱۶۰۲ء) میں موجود قصۂ چہار درویش (فارسی) کے ایک خطی نسخے سے متعارف کروایا۔ بوڈلین لائبریری کی فہرستِ مخطوطات حصّہ اوّل، سیریل نمبر ۴۴۳ کے تحت اِس خطی نسخے کا اندراج ملتا ہے۔ اِس خطی نسخے کے خاتمہ کتاب سے تاریخِ تکمیل: ۱۷۲۸ء معلوم ہوتی ہے: ''روز یکشنبہ بتاریخ بست و ہفتم شہر شعبان ۱۱۴۱ھ۔'' یعنی کتابت ۱۷۲۸ء میں مکمل ہوئی۔ اِس خطی نسخے سے مصنف کا نام معلوم نہیں ہوتا، نہ امیر خسرو کی جانب کوئی اشارہ ملتا ہے۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ شجاع الدین محمد خاں ناظم صوبۂ اڑیسہ کے لیے یہ نسخہ میر امّن کی ''باغ و بہار'' (تکمیل: جنوری تا اپریل ۱۸۰۱ء) سے تہتر برس قبل کاتب جمال الدین نے تیار کیا۔ یہ نُسخہ، شیرانی کے دریافت کردہ نُسخے (۱۷۳۳ء) سے پانچ برس پہلے کا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند نے ''اردو کی نثری داستانیں'' اور ''محمود شیرانی مرحوم سے میرے استفادات'' مشمولہ: ''ارمغانِ شیرانی'' مطبوعہ: لاہور: شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، طبع اوّل: ۲۰۰۲ء ص: ۳۴ میں لکھا ہے کہ مُسلم یونیورسٹی آزاد لائبریری علی گڑھ کے ذخیرہ حبیب گنج میں قصۂ چہار درویش کا ایک فارسی خطی نُسخہ مُحررہ ۱۱۲۴ھ مطابق ۱۷۱۲ء موجود ہے۔ لیکن اُن کے علاوہ وہ نُسخہ کسی نے دیکھا نہیں، نہ اُس کی موجودگی ثابت ہے۔

برٹش میوزیم، لندن کے کتب خانے میں البتہ فارسی قصۂ چہار درویش کے چار خطی نُسخے موجود ہیں، جن میں سے قدیم تر نُسخے کی بابت ڈاکٹر چارلس ریو نے لکھا ہے کہ ''وہ اوائل اٹھارویں صدی عیسوی کا نُسخہ ہے۔ یہ نُسخہ رنگین اور مُرصّع ہے اور معلومہ نُسخوں میں قدیم تر، لیکن اصل مُصنّف کا نام ظاہر نہیں کرتا۔'' اِس نُسخے کو اوائل ۱۸ ویں صدی عیسوی کا قرار دینا بھی مبنی بر قیاس ہے۔ سب سے پہلے حافظ محمود شیرانی (۱۹۳۳) اور سیّد سجّاد نے اپنے تحقیقی مضمون (بہ زبان انگریزی) بہ عنوان: "AN EARLY WRITER OF MODERN URDU" مطبوعہ: ''اسلامک کلچر'' حیدر آباد، دکن شمارہ: ۱، جلد: ۱۴ بابت جنوری ۱۹۳۹ء میں فارسی قصہ ''چہار درویش'' کے اصل مُصنّف کے طور پر حاجی ربیع انجب کا نام لیا تھا۔ سیّد سجّاد کے بیان کی بُنیاد کشن چند اِخلاص اور غلام ہمدانی مصحفی کے تذکرے تھے۔ بے شک، کشن چند اِخلاص نے تذکرہ: ''ہمیشہ بہار'' (شُعرائے فارسی) موٴلفہ: ۱۷۲۳ء) اور مصحفی نے فارسی تذکرہ: ''عقدِ ثریا'' (مؤلفہ: ۱۷۸۵ء) میں حاجی ربیع مغربی انجب کا ذکر کیا ہے۔

ڈاکٹر سیّد سجّاد کے اِس بیان پر تحقیقِ مزید کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے میں نے کشن چند اور مُصحفی کے بیانات کو چُنا:

کِشن چند اِخلاص نے تذکرہ: ''ہمیشہ بہار'' (شُعرائے فارسی) میں انجب کا نام مرزا محمد ربیع انجب اصفہانی، درج کیا ہے اور اُسے ''گُلِ سرسبد سخن دانی'' کہا ہے لیکن اُس کے ''مُصنف قصۂ چہار درویش'' ہونے کا ذکر نہیں کیا۔ (دیکھیے: تذکرہ: ''ہمیشہ بہار'' مُرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی، مطبوعہ: کراچی: انجمن ترقی اردو (پاکستان)، طبع اوّل: ۱۹۷۳ء ص: ۱۸) فارسی تذکرہ ''ریاض العارفین'' از آفتاب رائے لکھنوی (مخطوطہ: محررہ ۹ مئی ۱۸۸۳ء مخزونہ انجمن ترقی اردو، کراچی (پاکستان) میں انجب کو شاعر فارسی و اردو۔ صاحب دیوان۔ مصنف: ''نہر الفصاحت'' اور ''نسخہ شعرة اللسانی'' میرزا محمد حسن قتیل کا دوست بتایا گیا ہے۔

غلام ہمدانی مُصحفی نے لکھا ہے:

''نادرِ رُوزگار شخصیت انجب، مشہور بہ حاجی ربیع انجب شاگردِ مرتضیٰ قُلی بیگ انگینہ والائے اصفہانی۔ اُس

کے اپنے بیان کے مُطابق جائے ولادت اُندلس تھا، جو سرزمینِ مغرب میں واقع ہے؛ لہٰذا اُسے اکثر ''حاجی مغربی'' کے نام سے بھی پُکارا جاتا تھا۔ اُندلس سے وہ کم عُمری میں اصفہان (ایران) پہنچا، جہاں تیس برس کسبِ علوم میں مصروف رہا، بعدازآں اُس نے حج کیا اور سیر و سیاحت کرتا ہُوا ہندوستان وارد ہُوا۔ یہاں کے اکابرین و اُمراء سے مُلاقاتیں کیں اور اُن کے قریب ہو گیا۔ وہ ہمیشہ مجالس و محافل میں صاحبِ توقیر اور ممتاز رہا۔ جب اہلِ دارالخلافہ کے حالات ناگفتہ بہ ہو گئے تو اُس نے خاموشی سے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ اللہ کی عنایات پر بھروسا کیا اور کسی کے در پر سوالی بن کر نہ گیا۔ اُس کی طبعِ بُلند سات برس کی عمر سے شعر گوئی کی طرف مائل تھی .... اپنی وفات سے پچاس برس پہلے پانچ لاکھ اشعار کہہ چُکا تھا۔ وہ اپنے اشعار اِس خیال سے کسی کو نہ دیتا کہ شعر گوئی دیوانوں کا کام ہے، اہلِ دانش و حکمت کو اِس سے کیا واسطہ .... اُس کی جتنی تصانیف میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھیں اُن میں مولانا نِظامی گنجوی کے خمسہ کا جواب، جو اُس کے ہاتھ کی تحریر تھی اور ایک بڑا دیوان، جو تقریباً ساٹھ ہزار اشعار پر مُشتمل تھا؛ ایک ضخیم کتاب اثنا عشریہ کے عقائد سے متعلق اور ''قصہء چہار درویش'' نثری تحریریں تھیں۔ الغرض اُس کی تصانیف اگر صندوقوں میں جمع کی جاتیں تو ایک اُونٹ کا بوجھ تھیں، سب کی سب چوری ہو گئیں۔ اُن چوری شُدہ کتب میں ''مہا بھارت'' کے اٹھارہ پَرَت بھی تھے جو اُس نے اپنے ایک عزیز کی فرمائش پر نظم کیے تھے۔ روحیلوں کی لُوٹ مار میں ایک شخص اپنا خریدا ہُوا مال لایا تو اُس سامان میں ایک جِلد اُنھی اٹھارہ پَرَتوں (اَدھیایوں) پر مشتمل تھی .... اُس کا مذہب حکیمانہ تھا، اِس لیے وہ اکابرین و اولیاء اور بڑے بڑے اساتذہ کا ذکر حقارت سے کرتا تھا۔ کہتے ہیں اُس کی عمر ایک سو سات سال کی تھی .... اُس کی عمر کے آخری حصے میں مُصنف اُس کی زیارت کے شوق میں ایک دن اُس کے ہاں گیا۔ میں نے ایک ایسے شخص کو دیکھا، جو نہایت نحیف اور قریب المرگ تھا۔ اُس نے مجھ سے شعر سُنانے کی فرمائش کی .... اور کہا کہ کبھی کبھی آ جایا کرو۔ ایک ماہ بعد میں دوبارہ گیا .... جب میری اُس ملاقات کو پانچ چھے ماہ گزر گئے تو وہ اپنی بیماری کے سبب اِس جہانِ فانی کو الوداع کہہ گیا۔ ازرُوِ قیاس اُس کی عمر سو سال سے زیادہ تھی۔ وہ اپنا نسب نامہ شیخ عبدالقادر گیلانی سے مِلاتا تھا اور شیخ محمد علی حزیں کو اپنا ہمشیرزادہ کہتا تھا۔''

اُردو ترجمہ: ''عقدِ ثریا'' (تذکرہ فارسی گویاں) مُرتبہ: مولوی عبدالحق، مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی طبع دوم: ۱۹۷۸ء۔ ص: ۲۵ تا ۲۶)

غُلام ہمدانی مُصحفی کے درجِ بالا بیان سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں، اُنھیں بھی دیکھتے چلیے:

مُصحفی (پ: ۱۷۵۰ء امروہہ۔ م: ۱۸۲۵ء لکھنوء) کے قیامِ دِلّی کا زمانہ ۱۷۶۷ء تا ۱۷۸۷ء ہے۔ مُصحفی

جب امروہہ سے نکلے اور آنولہ اور اودھ سے ہوتے ہوئے ۱۶۷۷ء میں دِلّی پہنچے تو بعید نہیں کہ بطور اردو اور فارسی شاعر کے، اُنھوں نے ایک بڑے فارسی گو شاعر کے طور پر حاجی ربیع انجب کا نام سُن رکھا ہو۔ لہٰذا قیاس غالب ہے کہ ۱۶۷۷ء ہی میں اُنھوں نے حاجی ربیع انجب سے پہلی ملاقات کی ہوگی۔ دوسری ملاقات کی درمیانی مُدت ایک ماہ کی ہے اور اُس دوسری ملاقات کے پانچ چھے ماہ بعد اُنھیں انجب کی وفات کا پتا چلا۔ بے شک ۱۶۷۸ء کا سنہ مقرر کر لیجیے، جب انجب نے ایک سوسات برس کی عمر میں وفات پائی۔ یوں انجب کا سالِ پیدائش ۱۵۷۱ء بنا۔ لڑکپن سے اگر نو دس برس کی عمر مُراد لی جائے تو انجب ۱۵۷۱۔۱۵۷۰ء میں اُندلس سے اصفہان پہنچا۔ کسبِ علوم میں تیس برس صرف کرنے کے بعد ۱۶۰۰ء میں اصفہان سے چالیس اکتالیس برس کی عمر میں بغرضِ حج نکلا۔ اب اگر اصفہان سے نکل کر بطور اثنا عشری کے براستہ جنوبی عراق، شہر بصرہ سے ہو کر مکہ پہنچا اور بعد از فریضۂ حج، سیر و سیاحت کرتے ہوئے واپسی پر براستہ ایران، ہندوستان کے لیے نکلا تو اصفہان، زاہدان، چمن اور مُلتان سے ہوتے ہوئے دِلّی پہنچا۔ اور اگر براستہ افغانستان آیا تو اصفہان، برجند، ہرات، کابل، پشاور، اٹک، ٹیکسلا، جہلم اور لاہور سے ہوتے ہوئے دِلّی وارد ہُوا۔ یہ سیر و سیاحت اور واپسی کا سفر اگر دو اڑھائی برس پر بھی محیط تھا تو انجب نے ۱۶۰۳۔۱۶۰۲ء میں عظیم مُغلیہ سلطنت یعنی عہدِ عالمگیری کی آخری جھلک دیکھی۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی حکومت کا نصف آخر بطور خاص فارسی شاعری کے پھلنے پُھولنے کا زمانہ ہے۔ یُوں، انجب اُس دور کی دِلّی کے اکابرین و اُمراء کی مجالس و محافل میں بطور فارسی کے ایک پُرگو شاعر اور عالم کے ۱۶۰۳۔۱۶۰۲ء تا ۱۷۰۷ء چار پانچ برس صاحبِ توقیر اور ممتاز رہا۔ اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد دارالخلافہ میں ہمہ جہتی انحطاط کی صُورت دیکھنے کو ملی، جب اورنگ زیب عالمگیر کے بیٹوں میں جانشینی کی جنگ کا آغاز ہُوا۔ ہر طرف بے چینی پھیلی اور باغی قوتوں کو سر اُٹھانے کا موقع مِلا۔ اِس محاربے میں بالآخر مُعظّم کامیاب ہُوا لیکن ۱۷۱۲ء میں وفات پا گیا۔ اُس کی لاش پُورا ایک مہینہ بے گور و کفن پڑی سڑتی رہی اور بیٹے باہمی محاذ آرائی میں جُتے رہے۔ جہاں دار شاہ حکمران بنا تو اُمراء و عمائدین کی پگڑیاں اُچھلیں اور محض چند ماہ ہی میں انتظامِ سلطنت پارہ پارہ ہو گیا۔

چور اُچکّوں کے بلا روک ٹوک دندناتے پھرنے کا یہی زمانہ ہے۔ بہت ممکن ہے انجب کے ابتدائی دواوین اور دیگر تصانیف کی چوری کی واردات اُسی زمانے میں ہوئی ہو، جب انجب ایک اُونٹ کے بوجھ جتنی تصانیف سے محروم ہُوا۔ ۱۷۰۷ء کے بعد اہلِ دارالخلافہ کے انھی ناگفتہ بہ حالات کے سبب انجب نے گوشہ نشینی اختیار کی۔

نظامی گنجوی کے خمسہ کا جواب، ایک بڑا دیوان، اثنا عشریہ کے عقائد سے مُتعلق ضخیم کتاب اور ''قصۂ چہار

درویش'' انجب کی ایسی تصانیف ہیں جنھیں مُصحفی نے ۶۸۔۱۷۶۷ء میں اپنی آنکھوں سے دیکھا۔۱۷۱۳ء میں جہاندار شاہ قتل ہُوا اور ساداتِ بارہہ کے سیّد عبداللہ خاں اور سیّد حسین خاں کی مدد سے فرخ سیر تخت نشین ہُوا۔ جسے من مانی کی سزا کے طور پر سیّد برادران نے آنکھوں میں سلائیاں پھروا کر پہلے تو اندھا کیا اور اس کے بعد ۱۷۱۹ء میں قتل کروا دیا۔ اُس کے بعد یکے بعد دیگرے رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ حکمران بنے۔ اوّل الذکر کو محض دو ماہ اور ثانی الذکر کو تین ماہ کی حکمرانی نصیب ہُوئی۔ یُوں ۱۷۰۷ء سے گوشہ نشیں، انجب کے حالات بگڑتے چلے گئے۔ محمد شاہ رنگیلا ۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء حکمراں رہا لیکن اُس کی حکومت دِلّی اور آگرہ تک محدود تھی۔ اِس دوران میں نادر شاہ نے (۱۷۳۹ء) دِلّی کو لُوٹا۔ احمد شاہ کے دورِ حکومت ۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء میں روحیلوں نے لُوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ جس میں انجب کے ترجمہ کردہ ''مہابھارت'' کے اٹھارہ ادھیائے، چوروں سے خریدے گئے سامان میں دکھائی دیئے۔

انجب کا ''قصہء چہار درویش'' یقیناً فارسی میں لکھا گیا۔ اردو میں لکھنے کی شہادت نہ گلشن چند اِخلاص سے ملتی ہے، نہ مُصحفی سے۔ انجب کی ہندوستان آمد (۱۷۰۲ء) تا گوشہ نشینی (۱۷۰۷ء) کی درمیانی مُدّت اِتنی نہیں بنتی کہ علمی و شعری مجالس و محافل کے بکھر جانے پر انجب اگر اردو نثر لکھنے پر راغب ہُوا تو اُس نے اُردو زبان اور محاورے پر بھی وہ عبور حاصل کر لیا، جو ''قصہء چہار درویش'' کی نمایاں پہچان ہے۔ اِس لیے یہ سوال، سوال ہی رہے گا کہ حافظ محمود شیرانی کے دریافت کردہ فارسی قصہ بابت چار درویشوں کے بہ عنوان: ''حکایاتِ عجیب و غریب'' (تحریر: بہ عہد محمد شاہی، کتابت: ۱۷۳۳ء) از حکیم محمد علی کی بُنیاد کیا تھی۔ اِس ضمن میں بھی محض قیاس ہی کیا جا سکتا ہے کہ اگر بقول مُصحفی، حاجی مرزا محمد ربیع انجب نے اشعار تو بیچے نہیں۔ اب اگر اُس نے گُزر اوقات کے لیے قصہ گوئی اختیار کی (جس کی طرف مُصحفی نے کوئی اشارہ نہیں کیا اور یہ محض ایک خیال ہے) تو اِمکان اِس بات کا ہے کہ اُس کے تحریر کردہ قصے کا انوکھا پن اور انجب کا طرزِ بیان اِس قصّے کو اٹھارہ تا بیس برسوں میں اتنا مقبول بنا گیا کہ اُس دور کے قصہ گو، انجب کے فارسی قصّے کو اُردو میں بیان کرتے رہے اور اُن کے بیان کو بنیاد بنا کر حکیم محمد علی نے شجاع الدین محمد خاں، ناظمِ اُڑیسہ کے لیے اسے دوبارہ فارسی میں رقم کیا۔ اِسے محض ایک قیاس یا خیال سمجھ لیجیے، لیکن یہ طے ہے کہ حاجی مرزا محمد ربیع انجب اصفہانی سے پہلے اِس قصّے کا سُراغ نہیں ملتا۔

(۱) فارسی قصہ چہار درویش کا مُصنّف فرقہ اثناعشری کا رُکن دکھائی دیتا ہے (جو کہ انجب تھا۔ اُس نے بقول مُصحفی اپنے عقائد سے مُتعلق ایک ضخیم کتاب لکھی) اور قصّے کے متعدد مقامات مُصنّف کو خلفائے اربعہ میں سے حضرت علیؓ کی خلافت کا قائل ثابت کرتے ہیں۔ یہی صورت ''باغ و بہار'' میں بھی موجود ہے۔

(۲) فارسی قصہ چہار درویش کا مُصنّف گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے، ایک جہاں دیدہ شخص ہے۔ انجب کی

پیدائش اُندلس (اسپین) یورپ کی ہے، ایران میں تیس برس گزارے، فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے نکلا تو بصرہ، کربلا، نجفِ اشرف (عراق) کے علاوہ دیگر عرب دُنیا کی سیر کی، اُس میں مُلک شام بھی شامل رہا ہوگا۔ سیر و سیاحت کرتے ہوئے دِلّی (ہندوستان) آیا۔ ''باغ و بہار'' میں آذربائیجان، استنبول، اصفہان، ایران، بُخارا، بدخشاں، بصرہ، بلخ، دمشق، روم، زنگ، شام، عمان، قسطنطنیہ، کابل، نیشاپور اور یمن کے نام دیکھنے کو ملتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے ان ناموں میں بنگالا، چین اور شاہجہان آباد کا اضافہ میر امّن کی طرف سے کیا گیا۔

(۳) فارسی قصہ چہار درویش میں دربار سے متعلق عہدوں (از قسم: میر بحر، میر بخشی، میر شکار، دیوان، میر عمارت، ثابت خانی اور قراول بادشاہی)، ادنیٰ و اعلیٰ مُلازموں و مُلازماؤں کی نسل اور اُن کی ذمہ داریوں (از قسم: قُورچی، آب دار، قلماقنی، اُردا بیگی، اُردو کے لوگ، انگا، چھوچھو، دائی، دَدّا، باری دار، باز دار، برقنداز، بکاوَل، بہلیے، پیادے، تُرکنیاں، چوب دار، خاص بردار، خان خواص، خانساماں، خواجہ سرا/ خوجے، خواصیں، کَلال، گرز بردار، گُوربان، محلی اور یساول)، اعلیٰ درجے کی مجالس و محافل میں روزمرہ استعمال کی اشیاء (از قسم: ادقچہ، بکاولی، تورا، توراپوش، تختہ نرد، چوگوشہ اور سِلفچی)، اُمراء کے کھانوں (از قسم: آتشِ خاص، بادامی، بُورانی، پَن بھتا، فالودہ، دو پیازہ، ساقِ عروس، شیر مال، شب دیگ، شیر برنج اور باقر خانی جسے عہد شاہجہانی میں الہ آباد کے حاکم باقر خاں م: ۱۶۳۷ء نے ایجاد کیا) اعلیٰ قسم کے پارچہ جات کے ناموں (از قسم: بادلا، پشمینہ اور جامدانی)، اُمراء کے پہناووں (از قسم: پشواز اور چار قُب) کے علاوہ تول کے باٹوں اور خیموں سے متعلق تفصیلات کا ہندوستان کے دارالخلافہ دِلّی اور عہدِ عالمگیری سے متعلق ہونا بھی یہی ثابت کرتا ہے کہ اکابرین و اُمراء کے ساتھ بیٹھے اُٹھے بغیر ایسا کچھ ضبطِ تحریر میں لانا ممکن نہیں۔ جب کہ انجب کو عہد عالمگیری کے آخری چار پانچ برس یہ اعزاز اور سہولت حاصل رہی۔

(۴) منظر ناموں کے اعتبار سے ''الف لیلہ'' اور ''قصہ حاتم طائی'' عرب دُنیا سے متعلق ہیں، ''قصہ گُل باصنوبر'' ایران سے اور ''قصہ گُلِ بکاوَلی'' ہندوستان سے متعلق۔ فارسی قصہ چہار درویش میں انھی قصوں سے اخذ و استفادہ کیا گیا، لیکن باز تخلیق کی شان پیدا کر کے۔ ان علاقہ جات سے شناسائی کا انجب سے بڑھ کر کون دعوے دار ہوسکتا ہے؟

(۵) فارسی قصہ چہار درویش کا بحری سفر، لڑکپن میں انجب کے اُندلس سے بحری جہاز کے ذریعے ایران پہنچنے کی دُھندلی یاد کا اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

(۶) فارسی قصہ چہار درویش میں کچھ مقامات ایسے ہیں، جہاں محسوس ہوتا ہے جیسے عربی مُحاورے کو من و عن ترجمہ کر دیا گیا ہو۔ فارسی پر مہارت اور عربی سے شُد بُد مُصنف کی جانب ایک واضح اشارہ ہے۔

(۷) حافظ، فُغانی، عُرفی، غیرتی، نظیری اور شاہ پور کے اشعار کا داخلِ قصہ ہونا ایک عجیب و غریب اشارا ہے

مُصنّف کی جانب۔ حافظ (م:۹۱۔۱۳۹۰ء) کا شیراز، ایران سے تعلق اور حافظ شیرازی کے ددھیال کا اصفہان کے مُضافات میں ہونا۔ فُغانی (م:۱۵۱۹ء) عُرفی (م:۹۱۔۱۵۹۰ء) اور غیرتی کا شیراز سے تعلق۔ نظیری (م:۹۹۔۱۵۹۸ء) کا خراساں اور کاشان سے تعلق یعنی سب کے سب شعراء کا تعلق ایران کے اُن علاقوں سے ہے جو انجب کے دیکھے بھالے علاقے ہیں۔ یہ الگ بات کہ عُرفی، نظیری اور شاپور ایران سے نکل کر ہندوستان کے درباروں سے وابستہ رہے۔

(۸) فارسی قصّہ چہار درویش کے مرکزی کرداروں میں سے بادشاہ آزاد بخت کا تعلق مُلکِ روم سے، پہلا درویش مُلک یمن کا، دوسرا درویش مُلکِ فارس کا، تیسرا درویش مُلکِ عجم کا۔ خواجہ سگ پرست کے قصّے میں نیشاپور (ایران) اور جزیرہ فرنگ (جو یورپ کا کوئی بھی جزیرہ ہوسکتا ہے) کا حوالہ۔ یہ سارے انجب کے دیکھے بھالے علاقے تھے۔

مرزا محمد ربیع انجب نے فارسی قصّہ چہار درویش کب تحریر کیا؟ اِس ضمن میں وثوق سے کچھ کہنا ممکن نہیں۔ محض قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ اُس کے قیامِ دِلّی ۷۔۱۷۰۲ء کی یادگار ہے۔ یہ خیال کرنا کہ اس قصّے کی تکمیل انجب کے قیامِ دلّی ۷۔۱۷۰۲ء کی محض اس لیے نہیں ہوسکتی کہ تیسرے درویش کے قصّے میں فرنگی لڑکی اور جزیرہ فرنگ کا حوالہ آیا، تو عرض ہے کہ عہدِ عالمگیری میں اہلِ فرنگ یا فرنگیوں سے مُراد اہلِ یورپ (نصارا) تھے، محض برطانیہ کے باشندے نہیں۔ ''فرنگ'' درحقیقت ''فرینک'' کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ فرینک جرمن تھے، جنھوں نے ۵ویں صدی عیسوی میں گال (یعنی فرانس) کو تہ و بالا کر کے حکومت کی۔ انجب کے قیامِ اُندلس (سپین) کے زمانے میں، فرنگی اُس کے دیکھے بھالے لوگ تھے۔

جہاں تک ہندوستان میں فرنگیوں کی موجودگی کا تعلق ہے تو پُرتگالیوں (PORTUGUESE) نے واسکوڈے گاما کی کالی کٹ (ہندوستان) آمد ۱۴۹۸ء کے بعد ۱۵۱۰ء میں گوا، ۱۵۲۱ء میں چال، ۱۵۳۴ء میں دیو، باسین اور بمبئی اور ۱۵۵۹ء میں دامان پر قبضہ مکمل کرلیا تھا۔ ۱۷۰۰ء میں ولندیزی یعنی DUTCH (اہلِ ہالینڈ) نیگا پٹم، مدراس، پولیکات، بملی پٹم اور کوچین پر قابض دکھائی دیتے ہیں۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۶۱۱ء میں سُورت، کالی کٹ اور میسولی پٹم میں تجارتی دفاتر قائم کیے اور ۱۶۹۶ء میں اورنگ زیب عالمگیر کے پوتے شہزادہ عظیم الشان سے چوٹا نٹی، کلکتہ اور گوند پور کے قصبہ جات قیمتاً خریدے۔ فرانسیسیوں (FRENCH) نے ۱۶۶۹ء میں مسولی پٹم اور ۱۶۷۴ء میں پانڈی چری پر قبضہ مکمل کیا۔ اہلِ ڈنمارک (DANISH) ۱۷ویں صدی میں سیرام پُور (بنگال) پر قابض تھے۔ جب کہ اطالوی سائنس دان گلیلیو نے ۱۶۰۹ء میں دُوربین ایجاد کی تھی۔

باغ و بہار کی اسلوبیاتی ساخت :

''اردو نثر لکھنے والوں میں میر امّن، جن نے ''باغ و بہار'' لکھا، سب پر فوق لے گیا۔ حقیقت میں نظم لکھنے میں جیسا کمال میر کو ہے، نثر لکھنے میں ویسا کمال میر امّن کو ہے۔'' (سرسیّد احمد خاں)

''لُطفِ بیان کے لحاظ سے ''باغ و بہار'' سب سے عُمدہ ہے۔'' (غالب)

''میر امّن جو کچھ لکھتے ہیں اپنے وقت کی نہایت فصیح و سلیس زبان میں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اُن کو زبان پر بڑی قُدرت تھی۔'' (محمد یحییٰ تنہا)

''باغ و بہار'' کی مقبولیت اور شہرت کا اصلی راز اس کی زبان اور طرزِ بیان میں پنہاں ہے۔'' (مولوی سیّد محمد)

''اردو کی پرانی کتابوں میں کوئی کتاب زبان کی فصاحت اور سلاست کے لحاظ سے اس سے لگا نہیں کھاتی۔'' (مولوی عبدالحق)

''میر امّن کی عبارت میں رنگینی، استعاروں کے ایجاز و اختصار اور محاوروں کے برتنے سے پیدا ہوئی ہے، نہ کہ ''استعاروں کے ہاتھ پاؤں توڑنے سے''۔ (ممتاز حسین)

''اس کے اسلوب میں ایک مخصوص آہنگ ہے اور ایک خاص ہمواری ہے۔'' (عابد علی عابد)

''میر امّن نے عام طور پر اپنی نثر کو شاعرانہ طریقوں سے زندہ کرنے کی بجائے نثر کے خاص وسائل کے ذریعے مؤثر بنایا ہے۔ اُن کی اثر آفرینی کا بڑا حربہ تکرارِ الفاظ اور تابع مہمل کا استعمال ہے جس سے جوش اور خوش آہنگی پیدا کرنا مقصود ہے۔'' (ڈاکٹر سیّد عبداللہ)

''اُس کی اِنشاء اُس کی بقا کی ذمہ دار ہے۔ اُس میں جو زبان بول چال میں استعمال ہوتی ہے، اُس کا اوجِ کمال ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بے تکلف باتیں کر رہا ہے اور اُس کی باتیں ادب ہیں۔'' (کلیم الدین احمد)

''اردو نثر، روزمرہ کی روانی اور ٹھیٹھ محاورے کے لُطف سے پہلی مرتبہ ''باغ و بہار'' میں آشنا ہوئی۔'' (حمید احمد خاں)

''انھوں نے اردو کو ایک نیا اندازِ بیان دیا اور خاص نکتہ رسی سے کام لے کر اُس کو ہندی و فارسی کے الفاظ سے سجایا۔ وہ ایک مجدّد کی طرح ہیں۔'' (ڈاکٹر اعجاز حسین)

o

درجِ بالا آراء میں میر امّن کی اسلوبیاتی ساخت سے متعلق بہت سے اِشارے موجود ہیں لیکن میر امّن کا نثری بُت محض یہی کچھ نہیں۔ ہمارے ناقدین کا یہ کہنا کہ میر امّن، دِلّی کا روزمرہ اور محاورہ لکھ رہے تھے، درست

نہیں۔ باغ و بہار کی تکمیل (نومبر ۱۸۰۰ء تا ۱۸۰۲ء) کے زمانے میں شاہ حاتم (م:۱۷۸۲ء) کی اصلاحِ زبان کی تحریک کو بے شک دیوان زادہ کے دیباچے تک محدود نہ بھی کہیں، تو بھی یہ دیکھیں کہ میر امّن، دِلّی سے نکلے کب؟ اُس دور میں تو خود دِلّی، اُردوے مُعلا سے محروم ہے۔ پھر یہ دیکھیں کہ میر امّن کو دِلّی کا محاورہ سُننے اور برتنے کے لیے وقت کتنا مِلا؟

اُس دور کی اکھاڑ پچھاڑ، اندرونی خلفشار اور بیرونی حملہ آوروں نے ہی تو میر امّن کو در بدر کیا۔ بے شک، میر امّن کے قریبی معاصرین میرزا رفیع سودا (م:۱۷۸۱ء) اور میر محمد تقی میر (م:۱۸۱۰ء) کی زبان اور میر امّن کی زبان کا موازنہ کر لیجیے۔ میر امّن نے عوامی بول چال کا لہجہ اور ذخیرہ الفاظ سمیٹنے کا جتن کیا۔ لفظیات کے اشتراک کے سبب مجھے تو ایک ہی شاعر ایسا دکھائی دیا جو میر امّن (م:۱۸۳۶ء) سے قریب ہے، اور وہ ہے ولی محمد نظیر اکبر آبادی (م:۱۶ اگست ۱۸۳۰ء)۔

میر امّن اور نظیر اکبر آبادی، دونوں تذکیر و تانیث کے معاملے میں روزمرہ کی حد تک غلط العوام برتنے کے عادی تھے، نیز دونوں کے ہاں ایک ہی لفظ کے کئی کئی اِملا دیکھنے کو ملتے ہیں: جیسے گانْو، گانوں، گاؤں۔ گنْوا، گُوا، گنْواں، گُوے۔ اکثر مقامات پر "ماں" کو "ما" لکھا لیکن خواجہ سگ پرست والے قصّے میں ایک جگہ "ماں" بھی لکھا ہے۔ اُنھوں نے بے شک اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا، لیکن دہلی کے روزمرہ کو صحتِ لغوی پر ترجیح دی۔ مثال کے طور پر: "میں نے باوجود سلطنت کے ایسا جواہر کبھو نہ دیکھا تھا۔" "کھانے اقسام اقسام کے"۔ یعنی جمع کے صیغہ کو واحد کے معنوں میں برتنا یا جمع کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے واحد کو برتنا۔ اِسی طرح جمع الجمع لکھنا۔ مثال کے طور پر: سلاطینوں، اُمراؤں۔ یک لفظی سطح پر "مہربانی" کی جگہ "مہربانگی"، "جنھوں" کی بجائے "جن نے"، "ٹھنڈی" کی بجائے "ٹھنڈھی"، "تلاش" کی بجائے "تالاش"، "لمبا" کی بجائے "لنْبا"، "بضد" کی بجائے "بجد"، "ٹھنڈک" کی بجائے "ٹھنڈھک"، "دُکان" کی بجائے "دوکان"، "بھوک" کی بجائے "بُھوکھ"، "بیوپاری" کی بجائے "بِپاری"، "نہتے" کی بجائے "نہتھے"، "زچہ" کی بجائے "جچا"، "سامنے" کی بجائے "سامھنے"، "جُھوٹ" کی بجائے "جُھوٹھ"، "جُھوٹا" کی بجائے "جُھوٹھا"، "بٹھایا" کی بجائے "بیٹھایا"، "دِکھاتا" کی بجائے "دیکھاتا"، "کاروبار" کی بجائے "کاربار"، "بے تحاشا" کی بجائے "بے تحاشی"، "ہونٹ" کی بجائے "ہونٹھ"، "بھٹیار خانہ" کی بجائے "بھٹھیار خانہ"، "تاکید" کی بجائے "تقلید"، "بھیک" کی بجائے "بھیکھ" اور "بھیجا" کی بجائے "بھجایا" لکھنا۔ نیز یہ کہ میر امّن نے کچھ ایسے الفاظ بھی برتے ہیں، جو پُورب (عظیم آباد/پٹنہ) میں طویل قیام کی چُغلی کھاتے ہیں۔ مثال کے طور پر "چندہ جمع کر کے" کی بجائے "بہری کر کر" اور "شرابور" کی بجائے "شوربُور" لکھنا۔

میر امّن کے ہاں بعض مقامات پر محاورے کی جو صُورت دیکھنے کو ملتی ہے، اُس کی وضع وقت نے بدل دی۔ مثال کے طور پر میر امّن لکھتے ہیں: ''حیرت نے لیا''، اَب ''حیرت ہوئی'' لکھا اور بولا جاتا ہے۔ میر امّن لکھتے ہیں: ''نتھنوں میں دَم ہے''، جدید صورت: ''دَم میں دَم ہے''۔ میر امّن لکھتے ہیں: ''کروٹیں کھا کر''۔ جدید صورت: ''کروٹیں لے کر''۔ میر امّن لکھتے ہیں: ''زمین پھاٹے تو میں سما جاؤں''، جدید صورت: ''زمین پھٹے تو سما جاؤں''۔

میر امّن کے ہاں مُترادفات کا استعمال بھی توجہ طلب ہے۔ ایک مثال: ''مُشکل کٹھن پیش آئی۔''

میر محمد حسین عطا خاں تحسین اور میر امّن سے قبل اردو نثر پر دکنی لب ولہجہ حاوی دکھائی دیتا ہے اور ہندی بھاشا یا دوسری پراکرتوں کے الفاظ کا استعمال عام ہے۔ جب کہ تحسین اور میر امّن کے ہاں پراکرتوں کی جگہ بالعموم فارسی و عربی تراکیب و الفاظ اور بالخصوص ایک مقام پر ہندی نے لے لی۔ یُوں ''نوطرزِ مُرصّع'' اور ''باغ و بہار'' کی نثری سُنت اردو نثر کے لیے ایک اہم موڑ ثابت ہوئی۔

میر امّن کے ہاں زبان کی سطح پر عوامی بول چال سے قریب رہنے کی کوشش میں محاورات و اندازِ بیان کا ترک و اختیار درج ذیل نقشے سے واضح ہوگا :-

	باغ و بہار میں شامل لفظِ قدیم	لفظِ حال
(۱)	آگے ہی	پہلے ہی
(۲)	اپنی جوگا	اپنے لائق
(۳)	(جُوتا) اڑایا	(جُوتا) پہنا
(۴)	استدعا کر	درخواست کر
(۵)	(نشان) اُکھڑ آیا	(نشان) اُبھر آیا
(۶)	اَن بول	گونگا
(۷)	اُن کر	پلٹ کر
(۸)	انوٹھا	نرالا
(۹)	اینچنا	کھینچنا
(۱۰)	بات بول کر	کہہ کر
(۱۱)	بَت کہاؤ	مُفصّل گفتگو

(۱۲)	بَتیاتے ہیں	باتیں کرتے ہیں
(۱۳)	بَجِد	بَضد
(۱۴)	بدا ہے	طے شُدہ ہے
(۱۵)	برپا ہیں	قائم ہیں
(۱۶)	بعید ہے	خلاف ہے
(۱۷)	بَلیا لُوں	صدقے جاؤں
(۱۸)	بِنْدھلا کر	پُھسلا کر
(۱۹)	بھاوے	اچّھی لگے/اچّھا لگے
(۲۰)	بھجایا	بھیجا/بھجوایا
(۲۱)	بُھلاوا	دھوکا
(۲۲)	بھیانک ہوکر	پریشان ہوکر
(۲۳)	(دروازہ) بَیڑا	(دروازہ) بھیڑا
(۲۴)	بے وسواس ہوکر	بے خوف ہوکر

نوٹ: میر امّن کے الفاظ اور تراکیب کی یہ امثال صرف الف اور ب کی پٹّی سے لی گئی ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ''فرہنگِ باغ و بہار'' میں ''پ'' تا ''ی''۔ بالخصوص ''ی'' کی پٹی میں ''یہہ'' اور ''یے'' کے الفاظ خصوصی توجہ چاہتے ہیں۔ ''یہہ'' قریب کھڑے کسی ایک فرد کے لیے برتا ہے اور ''یے'' ایک سے زاید افراد کے لیے۔

اِسی طرح میر امّن، زبان کے ورتارے میں تخلیقی اور اجتہادی شان پیدا کرنے میں بھی کوشاں دکھائی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''انتظار کرنا'' کی بجائے فارسی محاورے انتظار کشیدن کی طرز پر ''انتظار کھینچنا''؛ ''جب نشہ چڑھتا ہے'' کی بجائے ''جب نشہ طلوع ہوتا ہے''؛ ''بہت آرزو ہے'' کی بجائے ''آرزو کمال ہے''؛ ''بدلی گھر کرآئی تھی'' کی بجائے ''بدلی گھمنڈ رہی تھی''؛ ''کچھ بھی نہ کہا'' کی بجائے ''ایک بات مُنہ پر نہ رکھی''؛ ''غیر عورت پر نگاہ مت ڈال'' کی بجائے ''بگانے سَتر پر نگاہ مت کر''؛ ''سوئم ہوگیا'' کی بجائے ''پُھول اُٹھ چکے'' اور ''طے کرلیا'' کی بجائے ''جی میں ٹھہرالیا''۔

میر امّن اکثر، عبارت میں ایک خاص طرح کا صَوتی تاثر پیدا کرنے کے لیے مُبتدا و خبر کی ترتیب بدل کر من پسند نتائج حاصل کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر: ''ماباپ کے نام کو سبب لاج لگنے کا ہے۔''؛ ''کب شام ہو کہ

میر امطلب تمام ہو۔" یا "بڑی فجر ہوئی"۔ اسی طرح مضاف ومضاف الیہ کی ترتیب بدل کر بھی انھوں نے عبارت میں اپنا من پسند تاثر قائم کیا ہے۔

میر امّن کے ہاں "ادنیٰ" کے لیے "اَدنا" اور "اعلیٰ" کے لیے "اعلا" کی املائی صورت بھی دیکھنے کو ملتی ہے، جسے انجمن ترقی اردو (ہند) اور بھارت کے بعض دیگر اداروں نے اپنالیا۔

"باغ و بہار" میں کچھ صورتیں مُحاورے اور لغت کے خلاف جانے کی بھی دکھائی دیتی ہیں مثلاً:

(۱) "شاہ بندر کو دستگیر کر کے اِس مُسلماں کے حوالے کریں۔" دستگیر کے معنی ہیں مُعاون یا مددگار کے، جب کہ میر امّن نے یہ لفظ "ہاتھ باندھ کر" کے مفہوم میں برتا ہے۔

(۲) "اچّھا اگر تم نہیں رہتے ہو تو میں ہی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔ میں تُجھ کو اپنی جان کے برابر جانتا ہوں۔" "تم" اور "تجھ" میں شُتر گُربہ کی صُورت ہے۔ اِس نوع کی امثال میر امّن اور فورٹ ولیم کالج کے مُصنفین ومترجمین، بلکہ اُس دور کے بیشتر قلم کاروں کے ہاں مل جاتی ہیں۔

(۳) میر امّن بعض مقامات پر دو یکساں حروف میں سے ایک حرف کم کر دیتے ہیں جیسے: "نااُمید" کو "نامید"، "اُس سے" کو "اُسے" اور "سُننے" کو "سُنے" لکھتے ہیں۔

(۴) "باغ و بہار" میں بعض الفاظ کی تذکیر و تانیث بھی محلِ نظر ہے۔ مثلاً: "سوچ" کو مذکر اور "غور"، "خم"، "شک" اور "خِلعت" کو مؤنث لکھنا۔

مولوی عبدالحق نے صرف ونحو، نیز محاورے کے حوالے سے درج ذیل دس معاملات کی جانب اشارہ کیا ہے :-

(۱) جمع مؤنث اسم کے ساتھ فعل کی جمع، ان سے یا اِمدادی فعل کے ساتھ اصل فعل کی جمع کا استعمال جیسے :

"دو کشتیاں امانت حضور میں اُس پری کے گُزرانیاں۔"

"یہ باتیں ہوتیاں تھیں۔"

"گھوڑے کی باگیں ڈال دیاں۔"

(۲) "نے" کا استعمال یا ترک، بعض افعال کے ساتھ، جو حال کے محاورے کے خلاف ہے :-

"القصہ رات کو چکے، یہ دونوں بھائی اور کوتوال کے ڈنڈے نے مجھے اُس پہاڑ پر لے گئے۔"

"ذرا سُرت آئی تو میں اپنے تئیں مُردہ خیال کیا۔"

"اس پروانگی کے سُنتے ہی جوان نے آداب بجالایا۔"

(۳) ''جب تلک'' کا استعمال، بغیر ''نہ'' کے: ''پر میں نے پنڈ نہ چھوڑا، جب تلک وہ راضی ہُوا۔''

(۴) ''رنڈی'' بہ معنی عورت اور ''یتیم'' بہ معنی غُلام لکھنا۔

(۵) ''تم کو'' کی جگہ ''تمھوں کو'' لکھنا۔ گو یہ صورت صرف ایک جگہ دیکھنے کو ملتی ہے۔

(۶) ''نماز کر رہا تھا''۔ ''نماز کردن'' (فارسی) کا ترجمہ ہے۔

(۷) ''ہوا نرم نرم بہتی تھی۔'' ہوا کا بہنا، پُرانا محاورہ ہے۔

(۸) غلط اِملا کی بعض صُورتیں مثلاً جیسا بولنے میں آتا ہے، ویسا لکھ دینا :
''جُمیرات'' (جُمعرات)، ''مُرصّے'' (مرصّع)، ''کہوتو صحیح'' (کہوتو سہی)

(۹) اکثر مقامات پر اردو مُضاف، مُضاف الیہ فارسی طرز پر برتے ہیں اور اردو حروفِ اضافت آخر میں لکھے ہیں مثلاً : ''موافق معمول کی تقریر و خوش گوئی اس کی''۔
ایک مقام پر اضافتِ توصیفی لکھ کر موصوف کی جمع بنائی ہے :
''اور وہ خانہ زادِ موروثیوں کی قدر سمجھے گا۔'' بقول مولوی عبدالحق اگر خانہ زاد کی اضافت، کاتب کی غلطی بھی شمار کی جائے تب بھی ''موروثیوں'' بول چال کے لحاظ سے درست نہیں۔

(۱۰) ''سار'' کا لفظ جیسے یا مانند کے لیے جگہ جگہ برتا گیا ہے : ''تم سار کا محبوب''، ''تجھ سار''۔ سار کا لفظ بہ معنی جیسے یا مانند، شمالی ہند میں مستعمل رہا ہے۔ بقول مولوی عبدالحق، یہ لفظ دکن میں ''سری'' ہو گیا۔

O

میر امّن نے ''باغ و بہار'' میں صنائع بدائع، نیز شعری وسائل سے بھی کام لیا ہے اور اکثر مقامات پر کامیاب رہے ہیں :

(۱) ''تُو نے اپنی عنایت سے سب کچھ دیا، لیکن ایک اِس اندھیرے گھر کا دیا نہ دیا۔'' (صنعتِ تجنیس)

(۲) ''خُدا نے مار کر پھر جلا دیا۔'' (تضاد)

(۳) ''غُصّے کی آگ میں پھک رہی ہوں، آخر جل بَل کر بھوبل ہو جاؤں گی۔'' (مراۃ النظیر)

میر امّن، اکثر ہم قافیہ الفاظ استعمال میں لاتے ہیں، جن سے تکلف کی نہیں، بے ساختگی کی فضا بنتی ہے:
''سُبحان اللہ، کیا صانع ہے کہ جس نے ایک مُٹھی خاک سے کیا کیا صُورتیں اور مٹی کی مُورتیں پیدا کیں۔''
''معلوم نہیں خود بخود کیا غضب ٹُوٹا، جو اُن کا آرام اور کھانا پینا چھُوٹا۔''

میر امّن کے ہاں تشبیہات کا استعمال، خوب صُورتی پیدا کرنے کا باعث بنا۔ اُن کی برتی ہوئی تشبیہات پیچیدہ، غیر مانوس اور دُور دراز کار نہیں:

(۱) ''وہ بھتنی بھی اُس جوان پری زاد کے گلے لپٹ گئی، سچ مچ یہ تماشا ہُوا جیسے چودھویں رات کے چاند کو گہن لگتا ہے۔''

(۲) ''تمام دن جیسے روزہ دار شام ہونے کا انتظار کھینچتا ہے، میں نے بھی وہ روز ویسی ہی بے قراری سے کاٹا۔''

میر امّن نے زبان پر محاورے کا رنگ چڑھانے کے لیے تابع مہمل کا استعمال کثرت سے کیا، جس سے تحریری زبان کی اجنبیت، بول چال کی مانوسیت میں ڈھل گئی، جیسے:

''ایسے خیالوں میں گھبرا کر کپڑے وپڑے پھینک پھانک دیئے''۔ ''گھاٹ باٹ اِس دُنیا کا دیکھوں''۔ ''بانٹ بونٹ لینا''۔ ''مناونا کر''۔ ''دوڑتا دُھوپتا ساتھ ہولیا''۔ ''عین مین''۔ ''ننگا مننگا فقیر بن کر''۔

یہی صورت میر امّن نے اپنی وضع کردہ لفظیات سے بھی پیدا کی، جیسے: اِندر کا اکھاڑا کہوں یا پریوں کا اتارا۔ ہوا نرم نرم بہتی ہے۔ میرا نام لیوا، پانی دیویا کوئی نہیں۔ بدلی بھی گھمنڈ رہی تھی، بُوندیا بھی پڑ رہی تھیں۔ بادشاہ نے چاروں صورتوں کو طلب کیا۔ جب اُس کا نشہ طلوع ہوتا۔ جب تلک نتھنوں میں دم ہے۔ جل بَل کر بُھوبل ہو جاؤں گی۔

میر امّن نے کچھ الفاظ ایسے بھی برتے، جن کا تعلق بے شک دِلّی کے روزمرہ سے ہے لیکن انشاء و ادب میں اُن الفاظ کا چلن اور ورتارا عام نہیں، جیسے: چیلا، بلبلی، پھساہنڈے، ناتھ، انچت، بتیانا، (جوتا) اڑیانا۔ اِس حوالے سے دیکھیں تو میر امّن یکسر زنانہ اور گھریلو کہاوتوں کو بھی برتنے میں پہل کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، جیسے: بیل نہ کودا، کودی گون، یہ تماشا دیکھے کون۔ ادسر چُو کے ڈومنی، گاوے تال بے تال۔ سر سے سر واہ، جب بیل مُھوٹی رائی رائی ہوگئی۔

یُوں ''باغ و بہار'' اردو کی پہلی داستان ہے جس میں کوشش کی گئی ہے کہ کردار وہی زبان بولیں جو اُن کی طبقاتی حیثیت، ذہنی سطح اور نفسی کیفیت کے مطابق ہو۔ اِس ضمن میں میر امّن پُوری طرح کامیاب نہیں رہے، لیکن انھوں نے کوشش ضرور کی۔ اُن کے بعض نسوانی کرداروں سے قطع نظر عورات کے اکثر مکالموں میں انھوں نے لب و لہجے، زنانہ محاورے اور زنانہ لہجے کے لوچ کا خیال رکھا۔ اِس خصوص میں مُلک زیر باد کی کنیا کے مکالمے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں یہ خوبی ہندی الفاظ کے ورتارے سے پیدا ہوئی۔ جب کہ ''باغ و بہار'' کی پہلی شہزادی اور

کٹنی کے مکالموں کی سب سے بڑی خوبی اُن کی سماجی حیثیت کا تعین ہے۔ پہلے درویش کے مکالمے میں ہر جگہ ''پادشاہ'' ملتا ہے لیکن جب وہ بصرے کی شہزادی کی کہانی سُن کر خود بڑبڑاتا ہے تو ''پادشاہ'' نہیں ''بادشاہ'' کہتا ہے۔ یہ بہت باریک فرق ہے اور مکالمے کا کمال، جسے میر امّن نے جان بُوجھ کر روا رکھا۔

دلی کے روزمرہ اور عام بول چال کے الفاظ جیسے ''بجد''، ''چُبلا''، ''کوتوال کے ڈنڈے''، ''بلّی'' اور ''ناتھ'' مکالموں میں خُوب سجے ہیں۔ یہی صورت جمع الجمع (جیسے: سلاطینوں، اُمراؤں) اور یک لفظی سطح پر برتے گئے عوامی تلفظ (جیسے: مہربانگی، لنبا، ٹھنڈھک، بھجایا، بُھوکھ، بیپاری اور نہتھے) کی ہے۔

میر امّن نے تو مکالموں کو عوامی بول چال سے قریب رکھنے کی خاطر یہاں تک کیا کہ درست اِملائی صورت کو بھی عوامی تلفظ پر قربان کر دیا، جیسے: ''سہی'' کی بجائے ''صحیح''، ''ماں' کی بجائے ''ما''، ''مُرصّع'' کی بجائے ''مُرصّے'' اور ''جمعرات'' کی بجائے ''جمیرات'' لکھا۔

''باغ و بہار'' کی زبان و بیان میں سادگی و سلاست کا عنصر، جس کی ہر ناقد نے تعریف کی؛ اُس کا سبب ''باغ و بہار'' کا نصابی کتاب ہونا ہے اور فورٹ ولیم کالج کے مصنفین، مؤلفین و مترجمین کی قدرِ مشترک۔ مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی طرح اسے محض ''سادگی و سلاست'' تک محدود کر دینا بھی درست نہیں۔ یہ ننانوے فیصد روزمرہ ہے اور فورٹ ولیم کالج میں زیرِ تربیت سول سروس کے عُہدہ داران کا عوام سے رابطہ بحال کرنے کا وسیلہ۔

میر امّن کا اسلوب سادہ و سلیس ہرگز نہیں۔ اس میں سجع متوازن، سجع متوازی اور سجع مُطرف کے علاوہ قوافی کا ایک خاص نظام دکھائی دیتا ہے۔ جس سے میر امّن کی نثر میں ایک خاص طرح کے آہنگ نے جنم لیا اور اُس آہنگ کی بنیاد حرکت پر ہے۔ جسے میر امّن نے ہر قیمت پر برقرار رکھنے کے لیے جمع الجمع (سلاطینوں، اُمراؤں) اور یک لفظی سطح پر عوامی تلفظ (مہربانگی، لنبا، ٹھنڈھک، بھجایا، ماباپ، بُھوکھ، بیپاری، نہتھے) کو برتا۔ یُوں میر امّن کے اسلوب کو محض ''سادہ و سلیس'' کہنے سے اُس تخلیقی توانائی کا حق ادا نہیں ہوتا جو ''باغ و بہار'' میں پائی جاتی ہے۔ میر امّن کی تخلیقیت تب اُجاگر ہوتی ہے، جب ہم کالج ہٰذا کے دیگر مُصنفین، موٴلفین و مُترجمین تا سر سید احمد خاں کے ہاں دکھائی دینے والی سادگی و سلاست میں جھلکنے والے سپاٹ پن کے مقابل ''باغ و بہار'' کو رکھ کر دیکھیں۔ بصورتِ دیگر سادگی و سلاست کا نقشِ اوّل تو ''آئینِ لشکری'' (۱۷۹۸ء) اور نقشِ ثانی: ''نوطرزِ مرصّع' (۱۸۴۶ء) ہے۔ طے شُدہ مفروضوں پر نہ جایئے؛ ''آئینِ لشکری' اور ''نوطرزِ مُرصّع'' کو ایک نظر دیکھ لیجیے۔

سجع وقوافی کے اہتمام کے ساتھ ساتھ ''باغ و بہار'' کی تخلیقی نثر کی سپلائی لائین جامع مسجد دِلّی کی سیڑھیوں کی راہ سے فصیل بند شہر دِلّی اور پُوربی ہندوستان سے جُڑی ہوئی ہے اور اِس جُڑت نے میر امّن کے ہاں نہ صرف دِلّی کے روزمرہ اور محاورے کی فوقیت کا احساس اُجاگر کیا، بلکہ اُردو کو بطور آزاد اور خُودمختار (INDEPENDENT) ہندوستانی زبان کے برتنے کا شعور بخشا، فارسی کا ضمیمہ نہیں بننے دیا۔ مُلک زیرباد کی کتیا کے مکالموں کی سطح پر ہندی کا استعمال اسی خودمختاری (INDEPENDENCE) کا اعلامیہ ہے اور ''پِتا''، ''منتری''، ''مہاراج''، ''ماتا''، ''دِیوان کا پُوت'' اور ''سُندر'' جیسے ہندی الفاظ کا استعمال بطورِ خاص توجہ طلب۔ اب اگر ہم اُردو کو آزاد اور خودمختار زبان کے طور پر زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم ''باغ و بہار'' میں موجود الفاظ ومحاورات کی معنویت سے ازسرِنو رُوشناس ہونے کا جتن کریں۔

O

تحقیقِ متن: چند معروضات :

تحقیقِ متن سے مُراد مصنف کے اصل متن کی بازتشکیل ہے۔ اِس ضمن میں اگرچہ مُصنف کے خطّی نُسخے کے نقل بہ مُہر مُصنف یا بہ تجدیدِ نظر مُصنف بھی قابلِ اعتبار تصوّر کی جاتی ہے، لیکن ''باغ و بہار'' کے معاملے میں مُشکل یہ ہے کہ نہ تو ''باغ و بہار'' کی روایتِ اوّل: ''چار درویش'' (تکمیل: ۱۲۱۵ھ مطابق جنوری تا اپریل ۱۸۰۱ء) کا، نہ بعد از نظرِ ثانی ''باغ و بہار'' (تکمیل: ۱۲۱۷ھ مطابق مئی تا جون ۱۸۰۲ء) کا کوئی ایسا خطّی نسخہ دستیاب ہے جو میر امّن کے ہاتھ کا تیار کردہ ہو یا میر امّن کے تیار کردہ نُسخے کی نقل بہ مُہر مُصنف ہو یا کسی بھی حوالے سے بہ تجدیدِ نظر از مُصنف شُمار کیا جاسکے۔

پروفیسر ڈنکن فاربس کا ۱۸۴۶ء میں شائع کردہ متن محض اِس لیے قابلِ اعتبار تصوّر کیا گیا کہ ڈنکن فاربس کا دعویٰ بڑا تھا۔ فاربس نے ۱۸۴۹ء میں ''باغ و بہار'' اشاعتِ اوّل: ۱۸۰۴ء کو بُنیادی متن مان کر مُقابلے کے لیے میر امّن کی جانب سے گلکرسٹ کو پیش کیا جانے والا خطّی نسخہ اور میر امّن کے شاگردِ خاص ایم۔ رومر کی ذاتی تحویل میں رہنے والے تصدیق شدہ قلمی نُسخے کو برتنے کا دعویٰ کیا۔ فاربس کا یہ ایک ایسا دعویٰ ہے، جسے قبول کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ حقیقت کیا تھی، کچھ کہا نہیں جاسکتا، لیکن ڈنکن فاربس کا ۱۸۲۳ء تا ۱۸۲۶ء ہندوستان میں موجود ہونا، گلکرسٹ سے قُربت اور برطانیہ میں گلکرسٹ کے مُعاون پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنا؛ چند ایسے حقائق ہیں جو فاربس کے دعویٰ کی سچائی کی دلیل ہوسکتے ہیں۔

گِلکرسٹ سے متعلق بہت سوں نے لِکھا لیکن کسی اور تحریر سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ میر امّن کی جانب سے فورٹ ولیم کالج کے صدر شعبہ ہندوستانی کو برائے اشاعت پیش کیے جانے والے COPY TEXT (خواہ روایتِ اوّل: ''چار درویش'' کا ہو یا بعد از نظرِ ثانی ''باغ و بہار'' کا) بعد از استعفیٰ گِلکرسٹ کی ذاتی تحویل میں رہے۔ اِسی طرح ایم۔ رومر کی تحویل میں رہنے والے تصدیق شدہ قلمی نُسخے کی خبر بھی ہمیں فاربس کے مُقدمہ ''باغ و بہار'' مطبوعہ: ڈبلیو۔ ایچ ایلن اینڈ کو، لندن طبع اوّل ۱۸۴۶ء کے ذریعے ملتی ہے۔ یہی معاملہ فاربس کے مُرتّب کردہ ایڈیشن لندن: ۱۸۴۹ء کی اضافی بنیاد بننے والے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے خطّی نُسخے کا بھی ہے۔ ''باغ و بہار'' کے ایک خطّی نُسخے (۱۲۱۷ھ مطابق ۳-۱۸۰۲ء) کا حوالہ ڈاکٹر ثریا حسین کی مُرتّب کردہ: ''فہرست کتب خانہ گارسیں دتاسی'' میں دکھائی دیتا ہے۔ ثُریا حسین کے مطابق دتاسی کے ذاتی کتب خانہ کی فہارس کے مطابق ''باغ و بہار'' کا ایک خطّی نُسخہ دتاسی کی تحویل میں رہا، جس کی موجودگی اِس وقت ثابت نہیں۔ جب کہ گارسیں دتاسی کے جُملہ خُطبات، مقالات اور اُن کی تحریر کردہ:

"HISTOIRE DE LA LI LITTERATURE HINDOUI ET HINDOUSTANI"

مطبوعہ: پیرس، طبع اوّل: ۱۸۳۹ء و نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن مطبوعہ: پیرس: ۱۸۷۰ء اِس ضمن میں خاموش ہیں۔ یُوں ڈنکن فاربس کے فراہم کردہ متن ۱۸۴۶ء تا ۱۸۴۹ء کی اہمیت بہر طور ہے، لیکن صرف اور محض مقابلے کے لیے، نہ کہ انتخابِ متن کے لیے۔ یہ بات میں اس لیے کر رہا ہوں کہ ڈنکن فاربس کے پیش کردہ متن میں میر امّن کی قائم کردہ پیرا بندی تبدیل کر دی گئی ہے، اکثر مقامات پر جُملہ کی بُنت مشکوک ہے نیز فاربس کی جانب سے متن میں قوسین کا استعمال میر امّن کے نثری آہنگ کو بُری طرح مجروح کرتا ہے۔

اب رہ گئی بات انڈیا آفس لائبریری، لندن میں موجود ''چار درویش'' کے اُس خطّی نُسخے کی، جس کی دستیابی کی اِطلاع رشید حسن خاں نے دی؛ تو وہ نہ میر امّن کی تحریر ہے، نہ تصدیق شدہ نقل۔ ترقیمہ و مُصنّف کی مُہرِ تصدیق سے عاری اُس کم سواد خطّی نُسخے کو تو مقابلے کے لیے برتنا بھی خطرناک ہے۔ البتہ، جہاں تک پیرابندی کا معاملہ ہے تو رشید حسن خاں کے متن میں یہ خطّی نُسخہ قدرے کارآمد دکھائی دیا، لیکن سو فیصد نہیں۔ اِس کمی کی نشان دہی ''حواشی و حوالہ جات: بابت مُقابلہ متون'' میں کر دی گئی ہے۔

مختصر یہ کہ جب تک نظرِ ثانی شدہ ''باغ و بہار'' (تکمیل: ۱۲۱۷ھ مطابق مئی تا جون ۱۸۰۲ء) کا کوئی مُصدقہ قلمی نسخہ سامنے نہیں آ جاتا، تدوینِ متن کے سلسلے میں ہمیں مقابلہ متون ہی کرنا پڑے گا، اور کسی مُستند نُسخے کی پیروی۔

بُنیادی مآخذ کے چُناؤ کے سلسلے میں قدامت کی اپنی اہمیت ہے لیکن اگر قدامت اِس دعویٰ کے ساتھ ہو کہ ایک سے زائد صاحبانِ علم نے تصدیق کی تو بنیادی مآخذ کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔ لہٰذا میں نے کلکتہ کے ممتاز مولویوں کے مُرتّب کردہ متن کو ازسرِ نو مُتعارف کروانے کا جتن کیا ہے۔ مقابلہ متون اِس غرض سے کیا کہ دیگر نُسخوں کا فرق سامنے آجائے۔

O

ہمارا مآخذی نُسخہ: نُسخۂ فیض اللہ مطبوعہ کلکتہ: طبع چہارم: ۱۲۵۹ھ مطابق ۱۸۴۳ء

سرورق کی عبارت:

BAGH O BUHAR

A TRANSLATION

INTO THE HINDOOSTANEE TONGUE

OF THE CELEBRATED PERSIAN TALE

ENTITLED

QISSUE CHUHAR DURVESH

BY

MEER UMMUN

UNDER THE SUPERINTENDENCE OF THE LEARNED MOULUVEES

LAST EDITION

MUCH IMPROVED

CULCUTTA

PRINTED BY L.MENDES, AT THE COMMERCIAL ADVERTISER

PRESS, NO.58, COSSITOLL

1839

یہ درحقیقت مئی ۱۸۴۳ء کا ایڈیشن ہے۔ جس میں محمد فیض اللہ کی تحریر کردہ خاتمہ کتاب کی عِبارت درجِ ذیل ہے:

''سب پر ظاہر ہووے کہ احقر العباد محمد فیض اللہ نے سابق میں اِس کتاب کو تین مرتبہ چھپوایا تھا۔ طالبانِ

زبانِ اُردو کو اُسے بہت فایدہ پہنچا لیکن اب ایک جلد بھی اُسے پائی نہیں جاتی ۔ اِس واسطے یہہ خاکسار نے سنہ ۱۲۵۹ ہجری میں پھر چھپوائی تو کوئی فائدہ سے اِس کے محروم نہ رہے اور مجھ نحیف کو سات دُعاء خیر کے یاد کرے ۔''

خاتمۂ کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چوتھا نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن: ۱۲۵۹ھ مطابق ۱۸۴۳ء ہے۔ جب کہ اُس دور کی اشاعتی مجبوریوں کے سبب سرورق پر تیسرے ایڈیشن کی سنہ (۱۸۳۹ء) دکھائی دیتی ہے ۔ ہمارے مآخذی نُسخے کا آغاز دائیں طرف سے ہی ہوتا ہے جب کہ سرورق بہ زبان انگریزی، کتاب کی بائیں جانب ہے۔ دائیں جانب آغاز کتاب کی پیشانی پر فورٹ ولیم کالج کی بیضوی مہر ثبت ہے اور ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے نیچے اُسی طرزِ تحریر میں ہولڈر کے ساتھ "College of Fortwilliam" لکھا ہُوا دکھائی دیتا ہے، جس کا نمونہ عتیق صدیقی نے اپنی کتاب ''گلکرسٹ اور اُس کا عہد'' میں فراہم کیا تھا۔ اِس نُسخے کے بائیں جانب پھر اُسی طرزِ تحریر میں " College of Fortwilliam " درج ہے اور اُسی ہولڈر کے ساتھ درجِ ذیل عبارت دیکھنے کو ملتی ہے :

" Returned by Moulovee Aleem instead of the

College copy of Bagh o Buhar of May 1843. "

اِس سے ثابت ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے مُنشی مولوی علیم نے فورٹ ولیم کالج لائبریری سے حاصل کردہ ایڈیشن مئی ۱۸۴۳ء کے گُم ہو جانے کے باعث کتاب کے بدلے کتاب کے طور پر یہ نُسخہ فورٹ ولیم کالج لائبریری میں جمع کروایا۔ یُوں یہ نُسخہ ۱۸۴۳ء میں فورٹ ولیم کالج کی لائبریری کا حصّہ بنا اور اب پنجاب یونیورسٹی (نیو کیمپس) لاہور کے اورینٹل سیکشن کے گوشۂ نوادر میں " الف ۶۸۸ الف .CLASS NO ۸۹۱٫۴۳۳ - Book NO " کے تحت محفوظ ذخیرۂ حافظ محمود شیرانی کا یہ نُسخہ ۱۹۲ مطبوعہ صفحات پر مشتمل ہے ۔ خاتمہ کتاب کے بعد صفحہ ۱۹۱ پر ''فہرست باغ و بہار'' (مندرجات مع صفحہ نمبر) اور صفحہ ۱۹۲ پر اغلاط نامہ دکھائی دیتا ہے۔

ہمارے مآخذی نُسخے : نُسخۂ فیض اللہ، مرتبہ: ممتاز مولویان (۱۸۴۳ء) کی درجِ ذیل خُوبیاں کسی بھی قدیم و جدید مطبوعہ نُسخے میں دیکھنے کو نہیں ملتیں :

۱۔ اِس نُسخے کی پَیرابندی (PARAGRAPHING) عمدہ ہے۔ مُصنّف کی قائم کردہ پیرابندی کسی بھی متن کا ایک ممتاز حصّہ ہوتی ہے، جس میں کسی ایک سلسلۂ خیال کو آگے بڑھایا جاتا ہے۔ ہمارے پیشِ نظر نُسخے کی خُوبی یہ ہے کہ رشید حسن خاں نے خطّی نُسخے اور ہندی متنوں کی روشنی میں پیرابندی کے ضمن میں جو آدھے ادھورے نتائج برآمد کیے، وہ ہمارے پیش کردہ متن میں آپ سو فیصد درست پائیں گے۔ پیرابندی کے حوالے سے رشید حسن خاں نے

جہاں جہاں ٹھوکر کھائی، اُس کی نشان دہی ''حواشی وحوالہ جات: بابت مقابلہ متون'' میں کردی گئی ہے۔

۲۔ ڈنکن فاربس نے پہلی مرتبہ ''باغ وبہار'' کے متن میں قوسین کا استعمال کیا اور فاربس کے تتبع میں مولوی عبدالحق، ممتاز حسین، ابوالخیر کشفی، ممتاز منگلوری اور رشید حسن خاں نے یہی انداز اپنایا۔ مثال کے طور پر :

(ا) ''شہر قُسطنطنیہ (جس کو استنبول کہتے ہیں) اُس کا پائے تخت تھا۔''

(ب) ''ایک دن وہ بہن (جو بجائے والِدہ کے میری خاطر رکھتی تھی) کہنے لگی۔''

(ج) ''بعض بعض باتیں (جو خیال میں نہیں آتیں اور نہیں کُھلتیں) حُضور میں پُوچھوں گا۔''

(سَیر پہلے درویش کی)

مقامِ حیرت ہے کہ ایک طرف تو جُملہ مُرتبینِ ''باغ و بہار''، میر امّن کے نثری آہنگ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور دوسری طرف قوسین کا استعمال کر کے میر امّن کا نثری آہنگ مجروح کرنے میں جُٹے ہیں۔ جبکہ ہمارے پیشِ نظر نُسخے میں یہ خرابی دیکھنے کو نہیں ملتی۔

۳۔ تمام قدیم وجدید نُسخوں میں ایک خامی یہ بھی دیکھی گئی کہ قصہ جات کے آغاز کے لیے میر امّن کے قائم کردہ عنوانات تبدیل کر دیے گئے۔ مثال کے طور پر داستان کا آغاز ''شروع قصے کا'' کے عنوان سے ہوتا ہے جب کہ بیشتر نُسخوں میں یہ عنوان تبدیل کر کے ''شروع قصے میں'' کر دیا گیا۔ ہمارے مآخذی نُسخے میں عنوانات کی تبدیلی دیکھنے کو نہیں ملتی۔

۴۔ تصحیحِ متن کے باب میں جُملہ مُرتبینِ باغ و بہار، مقابلہ متون اور ضمیمہ جات کے ذریعے جو کچھ نتائج برآمد کرتے ہیں اور اُس پر بھی کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچتے، وہ حقائق حتمی صُورت میں ہمارے مآخذی نُسخے میں موجود ہیں۔

۵۔ درجِ بالا حقائق کی روشنی میں ہمارے مآخذی نُسخے کے سرورق پر درج "MUCH IMPROVED" کے دعوے سے ہی نہیں فاربس کے نُسخۂ لندن: ۱۸۴۹ء، کشفی کے نسخۂ کلکتہ ۱۸۳۹ء اور رشید حسن خاں کے مُرتّبہ متن: ۱۹۹۲ء سے مقابلہ بھی یہ ثابت کرتا ہے کہ ہمارے مآخذی متن کے مُرتبین نے متن کی تیاری میں میر امّن کے خطی نُسخے یا تصدیق شدہ نقل کو بنیاد بنایا۔ بعید نہیں کہ میر امّن کا خطی نُسخہ یا خطی نُسخے کی مصدقہ نقل اُس دور کے مُنشیوں کی دسترس میں ہو۔ یہی سبب ہے کہ اِس سے بہتر متن، قدیم وجدید مطبوعہ نُسخوں میں دیکھنے کو نہیں مِلتا۔ مثال کے طور پر ''چوتھے درویش کی سیر'' کے وسط (دیکھیے زیرِ نظر ایڈیشن، ص ۲۶۱) میں پیراگراف کے آخر میں یوں لکھا ہے: ''اب اگر ان کو ستاوے گا تو مزا پاوے گا۔''

ڈنکن فاربس نے ۱۸۴۶ء کے نسخہ میں ''مزا'' کی جگہ ''سزا'' درج کیا تھا۔ بعد ازآں ۱۸۴۹ء کے ایڈیشن

میں اسے ''مزا'' کر دیا۔ واضح رہے کہ یہ وہ مقام تھا جسے مونیئر ولیمز ''مزار'' پڑھتا رہا اور اپنے مرتب کردہ متن میں اس نے لفظ ''مزا'' کو ''سزا'' درج کیا۔

O

ہمارے مآخذی نُسخے: نُسخہ فیض اللہ، مطبوعہ کلکتہ: ۱۸۴۳ء میں پیرابندی کے لیے جہاں پیراگراف ختم ہو رہا ہے وہاں پُھول کا نشان ڈال کر کچھ خالی جگہ چھوڑتے ہوئے نیا پیراگراف قائم کر دیا گیا ہے۔ سکتہ اور وقفہ کے لیے ایک ہی جیسے پھول کا نشان مِلتا ہے۔ دیگر رموزِ اوقاف کا استعمال ہُوا تو ہے لیکن کم کم۔ زبر اور زیر کے علاوہ کچھ مقامات پر تشدید کا استعمال بھی دکھائی دیتا ہے۔ یائے مجہول اپنی مکمل شکل میں بھی ملتی ہے لیکن اکثر مقامات پر اُس کی شکل یائے معروف جیسی ہے، لیکن اُس کا دائرہ بڑا ہے اور یائے معروف کا دائرہ قدرے چھوٹا۔ لہٰذا اُن دونوں میں پہچان مُشکل نہیں رہتی۔ نُون اور نُونِ غُنّہ کا فرق اکثر مقامات پر معدوم ہے۔ حروف کے جوڑ مِلاتے ہوئے ''ب'' کا نُقطہ شوشے کے ساتھ جُڑ جاتا ہے۔ ''ٹ'' کے لیے ''ت'' کے نقطوں پر سیدھی لکیر ملتی ہے۔ حروف کے جوڑ مِلاتے ہوئے ''پ'' کے تین نُقطے غیر واضح رہتے ہیں لیکن جب ''ب'' کے ساتھ ''پ'' کو مِلا کر دیکھیں تو ''پ'' کی پہچان مُشکل نہیں رہتی۔ یہ قدیم چھاپہ خانوں کی مجبوریاں ہیں۔ طباعت کی یہ صُورت اُن برطانوی ساخت کی ٹریڈل مشینوں سے یادگار ہے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہل کاروں کے ساتھ ۱۸ویں صدی عیسوی میں ہندوستان پہنچیں۔

جہاں تک اِملا کا معاملہ ہے تو میں نے اِنتقادی متن کے اِملا اور تلفُّظ کو چھیڑے بغیر سوائے ''یہہ'' کو ''یہ'' کرنے کے، ٹائپ کمپوزر کی جانب سے جوڑ کر لکھے گئے الفاظ کو الگ الگ کر دیا ہے۔ میر امّن کا اِملا: لیئے، کیئے، دکھایئے، رکھیئے، کیجیئے، لیجیئے، چلیئے، پہچانیئے، چاہیئے، لایئے، چھڑ کیئے اور بہلیئے وغیرہ کو برقرار رکھا گیا ہے۔ میر امّن بعض مقامات پر ''ز'' کی بجائے ''ذ'' استعمال کرتے ہیں۔ اُسے بھی برقرار رکھا گیا ہے۔ لفظ کے بیچ میں نونِ غُنّہ کے لیے، ہمارے ہاں کمپیوٹر پر اُردو کمپوزنگ کے نظام (In page) میں وہ علامت موجود نہیں، جو کاتب حضرات برتتے آئے ہیں، یعنی انگریزی حرف " U " کی طرح کا نشان۔ جب کہ مولوی عبدالحق نے ''قواعدِ اردو'' میں اِس کے لیے اُلٹی جزم "V" تجویز کی ہے۔ میرے پیش کردہ متن میں آپ کو نُونِ غُنّہ کے لیے اُلٹی جزم اور پیش کی درمیانی صُورت دیکھنے کو ملے گی، جس کا استعمال جائز ہے۔ (دیکھیے: ''فرہنگِ تلفظ'' مُرتبہ: شان الحق حقی، مطبوعہ: اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان پاکستان، طبع دوم: ۲۰۰۲ء) میں اپنے اِس عمل کو دیگر مُرتّبین کی طرح ''جدید اِملا'' کا نام نہیں دیتا، نہ اِس دعوے اور اعلان کے ساتھ یہ کام کیا گیا کہ ''باغ و بہار کی قدیم اِملائی صُورت اب متروک ہے۔'' اِس لیے کہ ہم ترک

کرنے والے کون ہوتے ہیں؟ میر امّن ''سُننے'' کو ''سُنتے'' اور ''اُس سے'' کو ''اُستے'' لکھتے ہیں، مَیں نے اُسے برقرار رکھا۔ ہاں جو چیز محاورے کی سطح پر اب بول چال میں کم دیکھی جاتی ہے، اُس کی نشان دہی ممکن ہے۔ جس کی وضاحت ''حواشی وحوالہ جات: بابت مقابلہ متون'' میں کردی ہے۔ یہاں یہ وضاحت کردینا بھی ضروری ہے کہ میں یائے معروف و یائے مجہول کی کج بحثی میں نہیں پڑا۔ اس لیے کہ ہمارے مآخذی نُسخے میں یائے معروف اور یائے مجہول کی پہچان کہیں بھی مسئلہ نہیں بنی۔ اِس کے باوجود اگر علمی سطح پر قاری کو اپنا ذہن صاف کرنے کی ضرورت محسوس ہوتو ''خطوطِ غالب'' مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم، جلد دوم میں میرزا غالب کا مکتوب بنام چودھری عبدالغفور سرور ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ وضاحت بھی کردوں کہ میرزا غالب اسے ایک لایعنی بحث ہی تصور کرتے تھے۔ نیز یہ کہ میرزا نے اِس ضمن میں صوتیات سے بحث کی ہے، امورِ اِملا سے متعلق نہیں۔ جب کہ ''باغ و بہار'' کے اِنتقادی متن کے حوالے سے اِن مباحث کو چھیڑنا یا تذکیر و تانیث کی بحث میں پڑنا میرا مسئلہ رہا ہی نہیں۔ بعض مُرتّبینِ ''باغ و بہار'' اِس عمل سے گزر کر اپنے علم کا بوجھ بلاوجہ قاری کے ناتواں کندھوں پر ڈالتے ہوئے اکثر چُٹیا سے چُٹلا بڑا کردیتے ہیں۔ مثال کے طور پر رشید حسن خاں کے پیش کردہ متن کے ساتھ ہر صفحے پر ضمیمہ: ایک (بابت: تشریحات، اختلافِ نُسخ، انتسابِ اشعار، افراد، مقامات، عمارتیں) کے علاوہ ضمیمہ: دو (بابت: تلفظ و اِملا) کے لیے قائم کردہ دو طرح کے نمبر شمار اور اشارے قاری کے لیے قدم قدم پر رُکاوٹ کا باعث بنتے ہیں، جن سے ''باغ و بہار'' کی قرأت کا لُطف غارت ہو جاتا ہے۔ جب کہ ''ضمیمہ: تین'' ایک الگ کھتونی ہے۔ میں نے ایسا نہیں کیا، نہ اِس کی ضرورت محسوس کی۔

میں تدوینِ متن کے معاملے میں انتخابی (ECLECTIC) اسکول کے مقابلے میں جرمن بِبلیوگرافک اسکول کا قائل ہوں۔ اِس لیے اپنے مآخذی نُسخے (EXEMPLAR) کے متن کی تہذیب کے مرحلے سے گُزرتے ہوئے درجِ ذیل متون کے اختلافات: ''حواشی وحوالہ جات: بابت مقابلہ متون'' کے سپُرد کررہا ہوں :

۱۔ ''باغ و بہار'' مطبوعہ کلکتہ: ہندوستان پریس، طبعِ اوّل: ۱۸۰۴ء

اِس کی تفصیلات آپ ''باغ و بہار کی روایت اوّل: چار درویش''، ''باغ و بہار کا مآخذ'' اور ''باغ و بہار'' کے عنوانات کے تحت ملاحظہ کرچکے۔

۲۔ ''باغ و بہار'' مُرتبہ: ڈنکن فاربس ایل۔ ایل۔ ڈی، مطبوعہ لندن: ولیم ایچ۔ ایلن اینڈ کمپنی، کے۔ ولیم واٹس پریس، ایڈیشن ۱۸۴۹ء۔ یہ اُس متن سے زیادہ بہتر متن ہے جو کے۔ ولیم واٹس پریس، لندن سے پہلی بار ۱۸۴۶ء میں شائع کیا گیا تھا۔ اِسے ''باغ و بہار'' کا مکمل متن کہنا چاہیے۔ فاربس ۱۸۵۱ء تک کے ایڈیشنوں میں یہی

متن پیش کرتے رہے۔ متن میں ترامیم کی صورت ولیم ایچ۔ ایلن اینڈ کو، لندن ایڈیشن چہارم: ۱۸۶۰ء (جو درحقیقت ۱۸۷۳ء کی اشاعت ہے) میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ فاربس کے مطابق ۱۸۴۶ء کے ایڈیشن میں مآخذی نُسخے کے طور پر ''باغ و بہار'' کی اوّلین اشاعت مطبوعہ کلکتہ: ۱۸۰۴ء (جسے فاربس نے ۱۸۰۳ء لکھا ہے) کو برتا گیا اور موازنہ کے لیے گلکرسٹ اور ایم۔ رومر کی تحویل میں رہنے والے دو خطّی نسخے برتے گئے۔ جب کہ ۱۸۴۹ء کا ایڈیشن اِس لیے بھی قابلِ لحاظ ہے بقول فاربس، اُنھوں نے ۱۸۴۹ء کے ایڈیشن میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں موجود ''باغ و بہار'' کے خطّی نُسخے کو برتا (بہ حوالہ: دیباچہ طبع دوم ۱۸۴۹ء، مُحررہ: جنوری ۱۸۴۹ء) اور ۱۸۴۶ء والے متن کی بہت سی غلطیاں دُور کر دیں۔ فاربس کا مُرتّب کردہ یہ متن بلا شبہ قابلِ لحاظ ہے لیکن متن میں قوسین کا استعمال اُن کی اِختراع ہے۔

۳۔ ''باغ و بہار'' مُرتبہ: مولوی عبدالحق، مطبوعہ دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند) طبع دوم: ۱۹۴۴ء کُل صفحات ۲۳۵ مع دیباچہ ۲۶ صفحات و مختصر فرہنگ مشتمل بر ۸ صفحات۔ اِس نُسخے کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۱ء میں شائع ہُوا۔ مولوی عبدالحق نے اپنے مآخذی نُسخے کا حوالہ کہیں نہیں دیا لیکن بغور دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے پیش کردہ متن کی بنیاد ''باغ و بہار'' مرتبہ: ڈنکن فاربس مطبوعہ لندن: ولیم ایچ۔ ایلن اینڈ کمپنی: کے۔ ولیم واٹس پریس: طبع اوّل: ۱۸۴۶ء ہے۔ البتہ بعض مقامات پر فاربس کے متن سے اُن کا پیش کردہ متن مختلف بھی ہے۔ جس کی بنیاد مونیئر ولیمز کا نسخہ (۱۸۵۹ء) بنا، لیکن اُنھوں نے بتایا نہیں۔ فاربس سے اِسی اختلافِ متن کے سبب میں نے عبدالحق کے نسخے کو بھی مُقابلے کے لیے چُنا، لیکن اِس نُسخے کا سب سے جاندار حصّہ عبدالحق کا تحریر کردہ مُقدّمہ ہے۔ جس کے بعض مندرجات سے اختلاف کی بنا پر حافظ محمود شیرانی نے ''باغ و بہار کا تحقیقی مطالعہ'' اور ''قصّہ چہار درویش'' جیسے اہم مقالے لکھے۔ واضح رہے کہ مولوی عبدالحق نے اِس نسخے کی تدوین کا کام ۱۹۲۹ء میں شروع کر دیا تھا۔ اِس نُسخے کے پہلے ایڈیشن ۱۹۳۱ء سے قبل مُجلہ ''اردو'' انجمن ترقی اردو، ہند، بابت: جولائی ۱۹۳۰ء میں اُن کا مقالہ ''باغ و بہار کا مآخذ'' شائع ہُوا۔ یہ طے ہے کہ اِس نسخے کی تدوین کے دوران میں ''باغ و بہار'' کی اوّلین اشاعت (۱۸۰۴ء اُن کی نظر سے نہیں گزری۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت اُن کی جانب سے میر امّن پر یہ الزام ہے: ''مگر نوطرزِ مرصّع کا ذکر صاف اُڑا گئے۔''

۴۔ ''باغ و بہار'' مُرتبہ: ممتاز حسین، مطبوعہ کراچی: اردو ٹرسٹ، طبع اوّل: نومبر ۱۹۵۸ء کُل صفحات ۳۶۷ مع مُفصّل مقدمہ و فرہنگ بر ۳۹ صفحات۔

اِس متن کا مآخذی نُسخہ ''باغ و بہار'' مرتبہ: ڈنکن فاربس، مطبوعہ لندن: ولیم ایچ۔ ایلن اینڈ کو: کے۔ ولیم واٹس پریس، ایڈیشن ۱۸۴۹ء ہے۔ لیکن کمپوزنگ کی اغلاط اِتنی زیادہ ہیں کہ فاربس کا اصل متن پہچانا نہیں جاتا، بلکہ

بعض مقامات پر تو متن از حد گمراہ کُن ہے۔ اِختلافِ متن ظاہر کرنے کو یہ نسخہ اِس لیے چُنا گیا کہ ہماری جامعات میں یہ نُسخہ شاملِ نصاب رہا ہے اور بعض مقامات پر اب بھی شاملِ نصاب ہے۔ اِس نُسخے کے مقدمے میں ممتاز حسین کی تنقیدی بصیرت نمایاں ہے، جو ''باغ و بہار'' کے ناقدین کے لیے ہمیشہ مشعلِ راہ رہے گی۔

۵۔ ''باغ و بہار'' مُرتبہ: ابوالخیر کشفی، مطبوعہ کراچی: اردو اکیڈمی (سندھ) طبع اوّل: ۱۹۶۴ء کُل صفحات ۳۶۸ مع مُفصّل مقدمہ، حوالہ جات، حواشی و فرہنگ۔ طبع دوم: ۱۹۹۲ء کُل صفحات ۳۱۸۔

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے لکھا ہے کہ اِس متن کا مآخذی نُسخہ: ''باغ و بہار'' مُرتبہ: ممتاز مولویان، مطبوعہ کلکتہ: ۱۸۳۹ء ہے۔ اگر یہ وہی نُسخہ ہوتا، جسے ہم نے مآخذی نُسخے کے طور پر برتا ہے تو خاتمہ کتاب دیکھ کر کشفی صاحب یہ کبھی نہ لکھتے کہ یہ ۱۹۳۹ء کی اشاعت ہے، بلکہ ''چوتھا ایڈیشن: ۱۸۴۳ء'' لکھتے۔ اِس لیے یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اُنھوں نے ۱۸۳۹ء ہی کے ایڈیشن کو مآخذی متن کے طور پر برتا۔ لیکن انھوں نے تدوین میں انتخابی (ECLECTIC) طریقہء کار برت کر کہیں تو ڈنکن فاربس اور کہیں مولوی عبدالحق اور ممتاز حسین کے پیش کردہ متون کو اپنا راہ نما بنایا۔ نتیجے کے طور پر کہیں کی اینٹ، کہیں کا روڑا والا حساب ہوگیا۔ فاربس کا نُسخہ مطبوعہ لندن، ایڈیشن ۱۸۴۹ء بھی اُن کے پاس محض چند روز رہا اور اُس کے بعد اُنھوں نے ممتاز حسین کے نُسخے (نومبر ۱۹۵۸ء) پر بھروسا کیا، جس کی بنیاد فاربس کا نُسخہ: ۱۸۴۹ء ہے۔ لیکن سب جانتے ہیں کہ سہوِ کمپوزنگ اور پُروف خوانی نہ ہونے کے سبب ممتاز حسین کے پیش کردہ متن کا کیا حال ہُوا۔

افسوس کہ ڈاکٹر کشفی کے مُرتب کردہ متن کی دونوں اشاعتوں میں ''باغ و بہار'' کے مآخذی متن: نُسخہء کلکتہ (۱۸۳۹ء) تک رسائی ممکن نہ ہوسکی۔ اِس کے دو اسباب تھے۔ پہلا سبب تو یہ کشفی صاحب نے تدوینِ متن کے جُملہ اُصولوں کو بُھلا کر اِنتقادی متن کے اِملا اور تلفظ کو اپنے طور پر تبدیل کردیا۔ مثال کے طور پر ''وو'' کو ''وہ''، ''سامھنے'' کو ''سامنے''، ''دے'' کو ''وہ''، ''یے'' کو ''یہ''، ''بے تحاشی'' کو ''بے تحاشا''، ''لات مکّی'' کو ''لات مکّے''، ''بھٹیاروں'' کو ''بھٹیاروں''، ''پچتانا'' کو ''پچھتانا''، ''پیسا'' کو ''پیسہ''، ''اُڑھ کر'' کو ''اَوڑھ کر''، ''شہزادا'' کو ''شہزادہ''، ''ناخُون'' کو ''ناخن''، ''گنبذ'' کو ''گنبد''، ''سے'' کو ''سو''، ''نمود'' کو ''نمودار''، ''ہوئیں'' کو ''ہوئی''، ''مُوا'' کو ''مرا''، ''ہُشیار'' کو ''ہوشیار''، ''روپیا'' کو ''روپیہ''، ''بھروسا'' کو ''بھروسہ''، ''گُھرک کر'' کو ''گُھڑک کر''، ''چیونٹی'' کو ''چیونٹی''، ''کبھو'' کو ''کبھی''، ''کِسو'' کو ''کِسی''، ''ادنا'' کو ''ادنیٰ''، ''پچتایا'' کو ''پچھتایا''، ''یعنے'' کو ''یعنی''، ''چُونما'' کو ''چُوما''، ''کھوپری'' کو ''کھوپڑی''، ''دونو'' کو ''دونوں''، ''ناشتا'' کو ''ناشتہ''، ''بُھوکھا'' کو ''بُھوکا''، ''ٹھنڈھا'' کو ''ٹھنڈا''، ''راجہ'' کو ''راجا''، ''ادنا'' کو ''ادنیٰ''، ''جُھوٹھ'' کو ''جُھوٹ''، ''جُھوٹھا'' کو ''جھوٹا''، ''

دوکان'' کو''دُکان''، ''کاربار'' کو''کاروبار''، ''بچا'' کو''زچہ''، ''آنسو پونچھنے'' کو''آنسو پوچھنے''، ''سختیاں کھینچیں'' کو''سختیاں کھینچی''، ''گاڑداب دیکھو'' کو''داب گاڑ دیکھو''، ''لون مرچیں'' کو''لون مرچ''، ''اُسنے'' کو''اُس سے''، ''کوٹھوری'' کو''کوٹھری''، ''ڈاڑھ کر'' کو''دھاڑ کر'' کر دیا۔ عبارت کی پیرا بندی میں بھی اُنھوں نے مآخذی متن کی پابندی نہیں کی۔ فاربس کے قائم کردہ قوسین اِن کے ہاں بھی دکھائی دیتے ہیں جب کہ نُسخہء کلکتہ: ۱۸۳۹ء میں قوسین موجود ہی نہیں۔ دُوسرا سبب یہ کہ متن میں انھوں نے جب اور جیسے چاہا، تبدیلی کر لی۔ پروف خوانی کے فُقدان، ناقص طباعت اور سہوِ کتابت نے رہی سہی کسر بھی نکال دی۔ البتہ ڈاکٹر کشفی کا تحریر کردہ مقدمہ، حوالہ جات وحواشی اور ہر صفحے پر فراہم کردہ فرہنگ کارآمد چیزیں ہیں۔ اُن کا تحریر کردہ مقالہ: ''باغ و بہار کا ماخذ، نوطرزِ مُرصّع'' مطبوعہ ''ماہِ نو'' کراچی بابت: جولائی ۱۹۶۴ء اِس کتاب کے مقدمے کا حصّہ ہے۔

۶۔ ''باغ و بہار'' مُرتبہ: رشید حسن خاں، مطبوعہ لاہور: نقوش پبلشرز طبع اوّل: ۱۹۹۲ء کل صفحات: ۱۱۷، مع مقدمہ، حواشی وحوالہ جات، فرہنگ مُشتمل بر ۶۴ صفحات۔

رشید حسن خاں نے ترتیبِ متن میں انتخابی (ECLECTIC) طریقہء کار سے کام لیا ہے لیکن اُن کے بنیادی مآخذات میں ''باغ و بہار'' اشاعتِ اوّل، کلکتہ: ۱۸۰۴ء اور ڈنکن فاربس کے مُرتب کردہ متن: ''باغ و بہار'' مطبوعہ لندن: ۱۸۴۶ء کے ساتھ تام جھام کے لیے ''ہندی مینول'' (اپریل ۱۸۰۲ء) میں شامل قبل از نظرِ ثانی ''باغ و بہار'' کا نامکمل متن بھی شامل ہے اور ''باغ و بہار'' کا ترقیمہ اور تصدیقِ مصنف سے خالی ایک کم سواد خطّی نُسخہ بھی۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''میں نے جب مکتبہ جامعہ کے لیے ''معیاری ادب'' کے سلسلے میں ''باغ و بہار'' کو مرتب کیا تھا، تو اُس وقت فاربس کے مُرتبہ نُسخے کی چوتھی اشاعت کو سامنے رکھا تھا (اِس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اشاعتِ اوّل اُس وقت مجھے نہیں مل سکی تھی) لیکن اب میں نے چوتھی اشاعت کی بجائے، اُس کی پہلی اشاعت (۱۸۴۶ء) کو سامنے رکھا ہے۔''

(مُقدمہ: صفحہ ۹۰)

مکتبہ جامعہ والے اوّلین ایڈیشن (اگست: ۱۹۶۴ء) کے پیش لفظ (صفحہ ۷) میں بھی اُنھوں نے یہی کہا ہے کہ اُن کا ایک مآخذ فاربس کے مُرتبہ نُسخے کی چوتھی اشاعت: ۱۸۶۰ء ہے، لیکن اُن کے یہ دونوں بیانات ہیں سراسر غلط۔ اگر ۱۹۶۴ء میں اُنھوں نے فاربس کی چوتھی اشاعت کو بنیاد بنایا تو اُن کے پیش کردہ متن میں وہ حذف شُدہ حصے، کس طرح شامل ہو گئے، جنھیں فاربس نے ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن و پرنسپل کلکتہ یونیورسٹی کی درخواست پر چوتھی اشاعت: ۱۸۶۰ء (درحقیقت ۱۸۷۳ء) سے نکال باہر کیا تھا؟ یُوں کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح

خاں صاحب کو۱۹۶۴ء میں فاربس کی مرتّب کردہ ''باغ و بہار'' مطبوعہ لندن: طبع اوّل: ۱۸۴۶ء دستیاب نہیں ہوئی تھی ،اُسی طرح ۱۹۶۴ء میں اُنھیں فاربس کی مُرتب کردہ ''باغ و بہار'' کی چوتھی اشاعت: ۱۸۶۰ء (درحقیقت ۱۸۷۳ء) بھی مُیَسر نہیں آئی تھی ،اور اُنھوں نے ''باغ و بہار'' مُرتبہ ممتاز حسین مطبوعہ کراچی ،طبع اوّل: نومبر ۱۹۵۸ء ہی سے کام چلالیا تھا۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت رشید حسن خاں کا درجِ ذیل بیان ہے:

''..... چوتھا ایڈیشن لندن ہی سے ۱۸۶۰ء میں شائع ہُوا تھا۔ یہ نُسخہ میرے سامنے ہے۔ باغ و بہار کی اشاعتِ اوّل میں اور اِس میں بعض معمولی اختلافات ہیں۔''

(پیش لفظ: ''باغ و بہار''، دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ طبع اوّل: اگست ۱۹۶۴ء ص: ۷)

اہلِ علم جانتے ہیں کہ فاربس کی مُرتب کردہ ''باغ و بہار'' مطبوعہ: لندن، طبع چہارم: ۱۸۶۰ء (درحقیقت ۱۸۷۳ء) کے متن میں سے تمام فحش حصے حذف کر دیے گئے یا اپنے الفاظ میں مفہوم بیان کر دیا گیا، اور یہ ''معمولی اختلافات'' نہیں ہیں۔

اِس نوع کی لاپروائی مُحقق کو بے اعتبار بنا دیتی ہے اور اگر اُس کے کام کو مقابلے کے لیے چُنا جائے تو محنت قدرے زیادہ کرنا پڑتی ہے۔ مجھے بھی تہذیبِ متن کے اِس کام میں خاں صاحب کے بیانات کو بار بار جانچنا پرکھنا پڑا۔ ایک مثال تو آپ نے ملاحظہ کی، اب دُوسری مثال دیکھیے:

رشید حسن خاں نے ''باغ و بہار'' مُرتبہ: ڈنکن فاربس، مطبوعہ: لندن: ولیم والٹس پریس، طبع اوّل: ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۵ء کو مقابلہ متون کے لیے چُنا، جس کے آخری صفحے پر سالِ طباعت: ۱۸۴۶ء درج ہے۔ بلاشُبہ وہ سچّے ہیں، اِس لیے کہ چھاپے خانے: ولیم والٹس، لندن کی وضاحت ہوگئی۔ بصورتِ دیگر اگر وہ محض اشاعتِ اوّل، لندن: ۱۸۴۶ء لکھتے تو شک کی گنجائش نکل آتی۔ واضح رہے کہ فاربس کی مُرتب کردہ ''باغ و بہار'' طبع اوّل: ۱۸۴۶ء ولیم ایچ۔ ایلن اینڈ کمپنی، لندن کی ولیم والٹس پریس سے شائع کردہ کتاب ہے۔ کتاب کے سرورق پر واضح طور پر درج ہے:

" Published under the authority of the Hon. The East-India Company."

رشید حسن خاں نے صرف پریس کا نام دیا ہے، پبلشر کا حوالہ نہیں دیا۔

یہاں تک تو خیر گزری، لیکن جب رشید حسن خاں یہ کہتے ہیں کہ: ''پہلی بار لندن سے ۱۸۴۶ء میں اور چوتھی بار وہیں سے ۱۸۶۰ء میں شائع ہُوا تھا۔'' (مُقدمہ: صفحہ ۹۰) تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کِس اشاعتی ادارے کا ۱۸۶۰ء والا ایڈیشن؟

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ فاربس کی مُرتبہ ''باغ و بہار'' کے لندن سے ۱۸۴۶ء، ۱۸۴۹، ۱۸۵۱ء اور ۱۸۶۰ء میں ایڈیشن نکلے، لیکن کس اِدارے نے شائع کیے، یہ کوئی نہیں بتاتا۔ اس لیے کہ کسی نے ایک اشاعت دیکھی اور کسی نے دو اِشاعتیں۔ بعضوں نے ایک ہی اشاعت دیکھی اور دُوسروں کے لکھے سے دیگر اشاعتوں کے حوالے اُچک لیے۔ رشید حسن خاں نے بھی یہی کچھ کیا۔ اِس لیے کہ ''باغ و بہار'' (مع فرہنگ اردو انگریزی) مرتبہ: ڈنکن فاربس مطبوعہ لندن: ولیم ایچ۔ ایلن اینڈ کمپنی بُک سیلرز ٹو دی آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی 7۔ لیڈن ہال سٹریٹ لندن، طبع چہارم پر بے شک سالِ اشاعت ۱۸۶۰ء درج ہے لیکن فرہنگ اردو انگریزی کے بعد ۱۸۷۳ء بھی درج ہے۔ یعنی یہ ایڈیشن (طبع چہارم) ڈنکن فاربس کی وفات (۱۸۶۸ء) کے پانچ برس بعد کی اشاعت ہے۔ اس لیے خاں صاحب کا اُسے ''طبع چہارم: ۱۸۶۰ء'' کہنا، درست نہیں۔ یہ اشاعت ۱۸۷۳ء کی ہے اور اُس کا ایک نُسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے اورینٹل سیکشن میں محفوظ ہے اور میری نظر سے گزر چکا ہے۔

رشید حسن خاں کے بیانات کی چھان پھٹک کے طُفیل میری نظر سے فاربس کی مُرتب کردہ ایک اشاعت (مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری) ایسی بھی گزری جس پر طبع چہارم: ۱۸۵۹ء درج ہے۔ جب کہ گارسیں دتاسی اپنے ۱۲ویں خطبے بابت: ۱۸۶۲ء میں کہتے ہیں کہ ڈنکن فاربس کا مُرتب کردہ ''باغ و بہار'' کا رومن رسم الخط میں چوتھا ایڈیشن ۱۸۶۱ء میں شائع ہُوا۔ واضح رہے کہ فاربس کے لندن ہی سے رومن رسم الخط میں ''باغ و بہار'' کے دو ایڈیشن ۱۸۴۶ء اور ۱۸۵۹ء میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ایک کا حوالہ دتاسی نے دیا ہے۔ جب کہ میری نظر سے فاربس کا مرتب کردہ فارسی رسم الخط میں ایک ایسا ایڈیشن (مخزونہ: پنجاب یونیورسٹی لائبریری اورینٹل سیکشن، لاہور) بھی گزرا ہے جو Sampson Low Co لندن سے ۱۸۵۷ء میں شائع ہُوا۔ اُس کے کل صفحات ۳۱۵ ہیں۔ چوتھی اشاعت تو یہ بھی ہے۔ اِس لیے کہ معلومہ تیسری اشاعت ۱۸۵۱ء کی ہے۔ آخر میں یہ وضاحت کردوں کہ فاربس کی مُرتب کردہ ''باغ و بہار'' سوائے ۱۸۵۷ء کی اشاعت (Sampson Law Co. London) کے بقیہ تمام اشاعتیں ۱۸۴۶، ۱۸۴۹، ۱۸۵۱، ۱۸۵۹، ۱۸۶۰ (درحقیقت ۱۸۷۳ء) ولیم ایچ۔ ایلن اینڈ کمپنی لندن کی ہیں۔

رشید حسن خاں نے ''باغ و بہار'' کے متن میں مکالموں کے لیے واوین (INVERTED COMMAS) کا استعمال نہیں کیا، صرف رابطہ (COLON) کا نشان دے دیا ہے، جو رموزِ اوقاف کے خلاف ہے۔ اِنتقادی متن میں وہ جُملہ ءِ مُعترضہ کے لیے قوسین (BRACKETS) کا استعمال کرتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ اِس عمل سے میر امّن کا نثری آہنگ مجروح ہو رہا ہے۔ جب کہ ''باغ و بہار'' کا نثری آہنگ اور سجع کاری کا نِظام، درست اوقاف

نگاری کا مُتقاضی ہے۔ میر امّن نے اِتنا نظر ٹِکا کر کام کیا کہ اُس کی نثری بُنت میں قوسین کی گُنجائش ہی نہیں بنتی۔ پھر فِکشن میں قوسین کا استعمال، کیا معنی؟ یہ تو اُس دَور کی چیز ہی نہیں ہے۔ میر شیر علی افسوس کی ''باغِ اردو''، حیدر بخش حیدری کی ''توتا کہانی'' اور ''آرائشِ محفل''، خلیل علی خاں اشک کی ''داستانِ امیر حمزہ''، سید اِنشاء اللہ خاں اِنشاء کی ''داستانِ انشاء المعروف داستان رانی کیتکی اور کنور اُودے بھان کی'' سے لے کر مرزا رجب علی بیگ سرُور کی ''فسانۂ عجائب'' تک چلے آیئے، آپ کو قوسین کا استعمال دکھائی نہیں دے گا۔ بے شک، گلکرسٹ کا تحریر کردہ مُقدمہ، مشمولہ ''باغ و بہار'' مطبوعہ کلکتہ، طبعِ اوّل: ۱۸۰۴ء کو اُٹھا کر دیکھ لیجیے، گلکرسٹ نے اپنی مختصر تحریر میں ایک طرف تو میر تحسین اور میر امّن کے طرزِ تحریر سے متعلق حساس مُشاہدے اور بے خوف گواہی کا مُظاہرہ کیا ہے اور دُوسری طرف حقائق اور معلومات کا وفور ہے، لیکن ہر دو اقسام کے اظہار کی اس باہمی کش مکش کو قوسین کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں پڑی۔ مولوی عبدالحق کے مطابق جُملۂ مُعترضہ سے پہلے اور آخر میں خط (——) یا سکتہ (،) یا وقفہ (؛) کی علامت ہونی چاہیے۔ قوسین کی بیخ تو ''باغ و بہار'' کے متن کے ساتھ ڈنکن فاربس کی لگائی ہوئی ہے اور تحقیقِ متن میں ڈنکن فاربس کی پیروی ضروری نہیں۔

اہم بات یہ ہے کہ رشید حسن خاں نے مُقابلہ متون کے لیے فاربس کی مُرتّب کردہ ''باغ و بہار'' کی دو اشاعتوں (پہلی: ۱۸۴۶ء اور چوتھی، ۱۸۶۰ء: درحقیقت ۱۸۷۳ء) کو چُنا۔ (دیکھیے: مقدّمہ از رشید حسن خاں، ص: ۹۰) اور طریق کار کی وضاحت کرتے ہوئے مقدمہ کے صفحہ ۱۲۸ پر نمبر شمار: ۴ کے تحت ''مُرتبۂ ڈنکن فاربس: ف'' کے عنوان سے صرف ایک اشارہ دیا، جب کہ اشاعتیں دو ہیں اور دونوں اِشاعتوں کے متن میں بہت فرق ہے۔ اِسے کیا کہیں؟ کیا تدوینِ متن کے اصول و ضوابط سے لاعِلمی —— کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

لاپروائی کی اِنتہا یہ ہے کہ رشید حسن خاں نے مُقابلہ متون کے لیے فاربس کی مُرتّب کردہ اُن دو اشاعتوں کو چُنا، جو ناقص ہیں۔ فاربس نے جنوری ۱۸۴۹ء میں تحریر کردہ مُقدّمہ بابت طباعتِ دوم، مطبوعہ: ولیم ایچ۔ ایلین اینڈ کو، لندن: ۱۸۴۹ء میں لکھا ہے کہ ۱۸۴۶ء والے ایڈیشن میں کچھ غلطیاں رہ گئی تھیں، جنھیں ۱۸۴۹ء کے ایڈیشن میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں موجود ''باغ و بہار'' کے خطّی نُسخے کے ساتھ موازنہ سے دُور کر دیا گیا ہے۔ جب کہ فاربس کی مُرتّب کردہ ''باغ و بہار'' ایڈیشن: ۱۸۶۰ء (درحقیقت ۱۸۷۳ء) اِس حوالے سے ناقص ہے کہ اُنھوں نے کپٹن ڈبلیو۔ این۔ لیس، ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن و پرنسپل کلکتہ یونیورسٹی کی چٹھی محررہ: ۸-اگست ۱۸۵۹ء کے مطابق متن میں ترامیم کا کام کیا: ''باغ و بہار'' کے مُخرب الاخلاق حِصّوں کو حذف کر دیا یا اپنے الفاظ میں ردّ و بدل کے

ساتھ بیان کر دیا۔

فی زمانہ نار رشید حسن خاں کے مُرتب کردہ ''باغ و بہار'' کے متن، اُن کے تحریر کردہ مقدمہ اور ضمیمہ جات کو سراہنے والوں کی کمی نہیں۔ ڈاکٹر گیان چند نے تو اُنھیں ''خُدائے تحقیق'' تک کہہ دیا۔

جب کہ رشید حسن خاں کا اِملائی نظام (بالخصوص، اعراب کا استعمال)، جو اکثر مقامات پر خرابی کا باعث بنتا ہے؛ اُس سے درگزر بھی کریں، تو بھی رشید حسن خاں کے تحریر کردہ مقدمے اور اُن کے قائم کردہ ضمیمہ جات میں چند بہت نمایاں اغلاط ایسی ہیں، جن کی نشان دہی نہ کرنا ریسرچ اسکالرز کے ساتھ ناانصافی ہوگی، لہٰذا عرض کرتا ہوں:-

رشید حسن خاں کے تحریر کردہ مُقدمے میں اشتیاقِ توقیر بالجبر کی صُورت دکھائی دیتی ہے، جسے فنِ تحقیق میں ہمیشہ ایک خطرناک میلان قرار دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر اُن کی بیان کردہ، میر امّن کی دِلّی سے عظیم آباد اور عظیم آباد سے کلکتہ میں آمد سے مُتعلق جُملہ کہانی بلا ثبوت مبنی بر قیاس ہے۔ میر امّن کے تحریر کردہ ''باغ و بہار'' کے دیباچے سے جس طرح اُنھوں نے قیاس کیا، کوئی اور مُحقق قیاس ہی کی بنیاد پر اُن سے یکسر مُختلف بیان بھی صادر کرسکتا ہے۔ مثلاً میرے بیان اور رشید حسن خاں کے بیان میں نمایاں فرق ہے۔ اِس سے قبل ڈاکٹر وحید قریشی اور ممتاز حسین نے بھی اپنے اپنے طور پر قیاس کیا اور اِک دُوجے سے یکسر مُختلف نتائج اخذ کیے۔ ایسا تو ہوگا، اِس لیے کہ قیاس ہے، مبنی بر ثبوت حق الیقین کی منزل نہیں۔ لیکن رشید حسن خاں جدالِ احسن کے قائل نہیں۔ وہ تحقیق میں قیاس کی اہمیت کو تسلیم بھی کرتے ہیں اور نہیں بھی کرتے۔ یعنی دیگر مُحققین کو رَدّ کرنے میں جہاں ضرورت پڑی قیاس کر لیا، بہ صورتِ دیگر عُجلت میں جو جی چاہا، بیان داغ دیا۔

وطن، علاقہ اور مُحلّہ کے باب میں وہ میر امّن کو بغیر کسی مُعتبر شہادت کے ''سیّد'' اور قیاس کی بنیاد پر پُرانے شہر دِلّی کے مُحلہ سیّد واڑہ کا باسی قرار دیتے ہیں (ص:۳۴)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ میر امّن کو سیّد قرار دینے سے متعلق اُن کے تیقُّن کی بُنیاد کیا ہے؟ نیز میر امّن کیا اِس لیے سیّد واڑہ کے باسی تھے کہ میر حسن اور میر بدیع کی رہائش اُس مُحلّے میں رہی؟؟ اگر ایسا ہی ہے تو میر بہادر علی حُسینی بھی پُرانی دِلّی کے مُحلہ سیّد واڑہ کے باسی قرار پائے۔ لیکن یہ کہنے کی غلطی رشید حسن خاں نے کی نہیں۔ وہ حُسینی کو سیّد واڑہ، پُرانی دِلّی کا باشندہ بتانے سے اِس لیے باز رہے کہ مُشفق خواجہ نے حُسینی کو بستی ''سوانا'' کا باشندہ بتایا ہے۔ مُشفق خواجہ لکھتے ہیں کہ یہ وہ بستی تھی جو ''شہر تھانیسر کے تیرہ کوس دکھن، دِلّی سے پانچ منزل مغرب'' میں تھی۔ (جائزہ ''مخطوطات اردو'' ص:۱۰۰۱)

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ میر بہادر علی حسینی کا تعلق قصبہ ''نارنول'' سے تھا۔ یہ قدیمی قصبہ، پُرانی دِلّی سے پچاس کوس کے فاصلے پر اب بھی موجود ہے جو ایک زمانے میں ریاست پٹیالہ کا حصہ رہا ہے۔ میر بہادر علی حسینی کا نام فورٹ ولیم کالج کے ریکارڈ میں ''میر بہادر علی حسینی نارنولی'' مِلتا ہے۔ احسن مارہروی، ''نمونہء منثورات'' مطبوعہ علی گڑھ: مُسلم یونیورسٹی پریس، طبع اوّل: ۱۹۳۰ء کے صفحہ ۹۳ پر ''اخلاقِ ہندی'' کا تعارف کرواتے ہوئے اُن کا نام ''بہادر علی حسینی نارنولی'' ہی لکھتے ہیں۔ میں نے اپنے مقالہ (دسمبر ۱۹۸۷ء) میں بھی ایسے ہی لکھا تھا۔ بُرا ہو اُس ''نشاطِ کار'' کا، جس کے سبب رشید حسن خاں نے مشفق خواجہ کے بیان پر بھروسا کر کے محض مجھے ردّ کرنے کو یہ نادر اطلاع فراہم کی کہ ''میر بہادر علی حسینی بستی ''سوانا'' کے رہنے والے تھے۔'' (رشید حسن خاں: ص: ۲۶۵۔ سطر ۵)

میر امان علی/ میر امّن اور میر بہادر علی حسینی نارنولی کے ناموں کا سابقہ، یعنی ''میر'' کا لفظ (ف۔ مذکر) ۱۔ امیر کا مخفف ۲۔ سردار، حاکم، سالار، سرگروہ، رئیس یا وہ شخص جو سبقت لے جائے۔ بلوچستان، سندھ اور کشمیر میں ''میر'' کا لفظ انہی معنوں میں نام کا حصہ بنتا ہے ۳۔ ''میر'' کا لفظ کشمیریوں کی ایک ذات بھی ظاہر کرتا ہے اور کشمیری سیّد زادہ بھی مُراد لی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے ''قصہء مہر افروز و دلبر'' سے متعلق لکھتے ہوئے بتایا ہے کہ سادات کا ایک مختصر سا خاندان کشمیر سے آ کر دلّی میں بس گیا تھا۔ ان لوگوں کے نام کے ساتھ ''میر'' دکھائی دیتا ہے۔ (''فکر و نظر'' علی گڑھ شمارہ: ۳)

اب اگر یہ مختصر سا خاندان ہی تھا تو کیا ضروری ہے کہ میر حسن، میر بدیع اور میر امّن اُسی خاندان کے رُکن ہوں؟ کیا ضروری ہے کہ ان تینوں کی رہائش ''سیدواڑہ'' کی ہو؟ ایسا ہے بھی نہیں۔ رشید حسن خاں محض یہ لکھ کر کہ ''میر امّن سیّد تھے (یہ ان کے نام سے ظاہر ہے)'' (ص: ۳۴)۔ کس طرح قطعی حکم صادر فرما دیتے ہیں؟

جہاں تک میر امّن کے شیعہ ہونے کا معاملہ ہے تو اُس کی طرف اشارہ، میں نے اپنے مضمون (''میر امّن دِلّی والے''، مطبوعہ: ''نقوش'' بابت: دسمبر ۱۹۸۷ء) میں کر دیا تھا۔ اِس ضمن میں میرے ذکر سے اِجتناب سمجھ میں نہیں آیا۔ مُقدّمہ کے صفحہ ۳۶ پر وہ بات اس طرح کر رہے ہیں جیسے یہ اُن کی تحقیق ہو۔

رشید حسن خاں نے صفحہ ۶۸ کے حاشیے میں ڈنکن فاربس کے حوالے سے میر امّن کے شاگرد خاص کا نام ''جان رومر'' لکھا ہے، جو غلط ہے۔ اُس کا نام جان رومر نہیں، ایم۔ رومر (M. RAUMER) تھا۔ دیکھیے: گارسیں دتاسی کی "HISTOIRE DE LA LITTERATURE HINDOUIE ET HINDOUSTANIE" نظر ثانی شدہ ایڈیشن مطبوعہ پیرس (جلد اوّل) طبع اوّل: ۱۸۷۰ء، ص ۲۱۱

رشید حسن خاں کے قائم کردہ ضمیمہ نمبر 1 کے صفحہ ۳۷۴ پر حوالہ نمبر ۷ کے تحت میر امّن کے برتتے ہوئے

ایک لفظ ''رنڈیا'' سے متعلق لکھا گیا ہے کہ یہ لفظ ڈنکن فاربس کے مرتب کردہ ''باغ و بہار'' کے پہلے ایڈیشن میں حرف ''ڈ'' کے نیچے زیر کے ساتھ ملتا ہے۔ اب اگر یہی صورت انھیں پلیٹس اور فیلن کے ہاں بھی مل گئی تو آصفیہ کا حوالہ دینے کی ضرورت کیا تھی، سمجھ میں نہیں آیا۔ اسی طرح ضمیمہ نمبر 1 کے صفحہ ۳۷۵ پر ''باغ و بہار'' کے صفحہ ۲۱۴ سے متعلق حوالہ نمبر ۴ میں برتے گئے لفظ ''بڑ چوڈ'' سے متعلق رشید حسن خاں لکھتے ہیں کہ باغ و بہار کی طباعت اوّل (۱۸۰۴ء) میں یہ لفظ اعراب کے بغیر موجود ہے جبکہ فیلن اور پلیٹس نے اسے حرف ''ب'' پر پیش کے ساتھ لکھا اور عبدالحق نے بھی اسی طرح لکھا۔ اب اگر ''فرہنگ آصفیہ'' میں ''ب'' کے نیچے زیر لگا کر لکھا گیا ہے تو کیا ضروری نہ تھا کہ فیلن اور پلیٹس پر بس کرتے اور اگر تسلی نہیں ہو رہی تھی تو ''جامع اللغات'' از خواجہ عبدالمجید مطبوعہ لاہور: ملک دین محمد اینڈ سنز: جلد اوّل، طبع اوّل: جنوری ۱۹۳۳ء پر بھی ایک نظر ڈال لیتے، جس کی جلد اوّل ص: ۴۵۸ پر ''بڑ چوڈ'' کو پیش کے ساتھ بھی ظاہر کیا گیا ہے اور زبر کے ساتھ بھی۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں: ''سماعت کا یہ عالم ہے کہ عموماً ''بَڑ چوڈ'' سنا گیا ہے۔'' اُن کی سماعت کے قربان جائیں، بعض اوقات خاں صاحب چھچھوندر کی شناخت کے بعد اُس کی پسلیاں بھی گننے بیٹھ جاتے ہیں لیکن مُستند حوالے پھر بھی اُن کی نظروں سے اُوجھل ہی رہتے ہیں۔

اِسی نوع کی ایک مثال اور ملاحظہ ہو۔ میرے مآخذ ''نسخہء فیض اللہ'' کے مطابق میر امّن نے لفظ ''منڈھپ'' برتا، ''باغ و بہار'' طباعتِ اوّل میں ''منڈپ'' درج ہے۔ فیلن نے فرہنگ میں اسے ''منڈھپ'' بتایا لیکن متن میں ''منڈپ'' لکھا لہٰذا خاں صاحب ''باغ و بہار'' کا متن مرتّب کرتے ہوئے کہیں ''منڈھپ'' درج کرتے ہیں اور کہیں ''منڈپ''۔

ضمیمہ نمبر ایک اور دو کے بیشتر مقامات پر انھوں نے جو الفاظ ''باغ و بہار'' میں شامل مکالموں سے لیے ہیں، وہاں اِس پر غور نہیں کیا کہ بیان کِس کا ہے۔ راوی کا یا کسی کردار کا۔ بولنے والا کون ہے اور اُس کا کِس علاقے سے تعلق ہے۔ یُوں اگر کسی مخصوص علاقے سے ہی کوئی لفظ بیان میں آیا تو اُسے ویسے ہی رہنے دینا چاہیے تھا جبکہ مختلف لُغات کو سامنے رکھ کر خاں صاحب نے متن کا حلیہ بگاڑ دیا۔ مثال کے طور پر ''بینچ ڈالا'' (ص ۲۹) ''بینچ لاؤ'' (ص ۹۳) اور ''بینچ کر'' (ص ۹۳) لکھا ہے۔ یہ راوی کا بیان ہے۔ ''بینچنا'' مصدر کے مشتقات متعدد مقامات پر آئے ہیں، کہیں بغیر نون غنہ اور کہیں مع نون غنہ کے۔ ایسا کیوں ہے؟ اِس پر غور کرنے کی ضرورت تھی۔ اعلیٰ فکشن نگار، مکالموں اور راوی کے بیانات میں فرق روا رکھتا ہے۔ جبکہ خاں صاحب نے ضمیمہ جات میں محاکمے دے دے کر میر امّن کی اصل عبارت کا سارا حُسن غارت کر دیا۔ ''باغ و بہار'' کے کِردار کا تعلق مختلف تہذیبی منطقوں اور مختلف النوع علاقہ جات سے ہے۔ اُن علاقہ جات میں لفظ کا تلفُّظ کیا رہا، اس پر کام کرنے کی ضرورت تھی۔ جہاں تک

''باغ و بہار'' کی طباعت اوّل :۱۸۰۴ء سے متعلق مطبوعہ نسخے اور پریس وردی مُسوّدے کا تعلق ہے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ گلکرسٹ کے وضع کردہ نظامِ اِملا نے اُسے کتنا سنوارا اور کتنا بگاڑا۔ مزید یہ کہ اسے شیر علی افسوس نے بھی بہ نظرِ اصلاح دیکھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خاں صاحب نے عادتاً گہرائی کو ناپنا ہی تھا تو ضمیمہ :۲ بابت: تلفظ اور اِملا میں اِس بات پر کیوں نہ توجہ دی کہ تحسین کی ''نوطرزِ مُرصع'' نے میر امّن کی زبان کو کس طور متاثر کیا؟

رشید حسن خاں نے میر امّن اور بہادر علی حسینی کے فورٹ ولیم کالج میں تقرر اور اُن کے مشاہرہ سے متعلق گمراہ کن معلومات فراہم کی ہیں۔ جہاں انھوں نے میر بہادر علی حسینی نارنولی کو آغاز (۴ مئی ۱۸۰۱ء) میں ہی ''چیف مُنشی'' لکھا اور اُن کی تنخواہ دوسو روپے بتائی، وہیں میر امّن کو ''ماتحت مُنشی'' ظاہر کیا جو سراسر غلط ہے۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں: ''..... دلچسپ بات یہ ہے کہ خود میر بہادر علی حسینی کا تقرر بھی اُسی تاریخ کو ہُوا تھا؛ یعنی یہ دونوں (میر امّن اور بہادر علی حسینی) ایک ساتھ ملازم ہوئے تھے۔ میر امّن نے جو حُسینی کے وسیلے سے رسائی حاصل کی، تو اس سے یہ ظاہر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حسینی کی رسائی گل کرسٹ تک اس تاریخ تقرر سے کچھ پہلے ہی سے تھی۔ اِس قیاس کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ جہاں میر امّن کا تقرر ''ماتحت مُنشی'' کی حیثیت سے ہُوا، وہاں حُسینی کا تقرر ''چیف مُنشی'' کے طور پر، دوسو ۲۰۰ روپے ماہانہ مشاہرے پر ہُوا تھا۔'' (ص: ۴۱،۴۲)

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ۴ مئی ۱۸۰۱ء کو مختلف شعبہ جات کے لیے درج ذیل تقرریاں عمل میں آئیں :

۱۔	میر بہادر علی حسینی نارنولی	سیکنڈ مُنشی	ماہانہ تنخواہ ۸۰ روپے
۲۔	تاری چرن متر	سیکنڈ مُنشی	ماہانہ تنخواہ ۸۰ روپے
۳۔	مرتضٰی خان	مُنشی	ماہانہ تنخواہ ۴۰ روپے
۴۔	غلام اکبر	مُنشی	ماہانہ تنخواہ ۴۰ روپے
۵۔	نصر اللہ	مُنشی	ماہانہ تنخواہ ۴۰ روپے
۶۔	میر امّن	مُنشی	ماہانہ تنخواہ ۴۰ روپے
۷۔	غلام اشرف	مُنشی	ماہانہ تنخواہ ۴۰ روپے
۸۔	ہلال الدین	مُنشی	ماہانہ تنخواہ ۴۰ روپے
۹۔	محمد صادق	مُنشی	ماہانہ تنخواہ ۴۰ روپے
۱۰۔	رحمت اللہ خاں	مُنشی	ماہانہ تنخواہ ۴۰ روپے

۱۱۔	غلام غوث	منشی	ماہانہ تنخواہ ۴۰ روپے
۱۲۔	کندن لال	منشی	ماہانہ تنخواہ ۴۰ روپے
۱۳۔	کاشی راج	منشی	ماہانہ تنخواہ ۴۰ روپے
۱۴۔	میر حیدر بخش حیدری	منشی	ماہانہ تنخواہ ۴۰ روپے

ایشیاٹک اینول رجسٹر ۱۸۰۱ء لندن (۱۸۰۲ء) کے صفحہ ۳۰۔۳۲ پر وضاحت کے ساتھ درج ہے کہ ''چیف منشی'' بہ مشاہرہ دوسو روپے ماہوار کی اسامی خالی رکھی گئی۔ یہی بات پروسیڈنگز آف دی کالج، ہوم میسلنکس جلد: 1 بابت ۲۹ اپریل ۱۸۰۱ء تا ۴ ستمبر ۱۸۰۵ء ص ۱ تا ۳۔ امپیریل ریکارڈ ڈیپارٹمنٹ، نئی دہلی سے بھی ثابت ہے کہ اگست ۱۸۰۳ء کو گلکرسٹ نے کالج کونسل کے نام جو چٹھی لکھی اُس میں میر بہادر علی حسینی سے متعلق سفارش کی گئی ہے کہ اگر انھیں انعام نہیں دیا جاتا تو کم از کم ان کی تنخواہ ۸۰ روپے ماہوار سے ۱۰۰ روپے ماہانہ کر دی جائے۔ یوں طے پایا کہ میر بہادر علی حسینی ۱۹۔ اگست ۱۸۰۳ء تک ''سیکنڈ منشی'' (بہ مشاہرہ ۸۰ روپے ماہوار) کے طور پر کام کر رہے تھے۔ چیف مُنشی بن نہیں سکتے تھے جس کی تنخواہ دوسو روپے طے تھی، اِس لیے سو روپے تنخواہ کی سفارش کی گئی۔

میر امّن کے باب میں عتیق صدیقی کا ''گلکرسٹ اور اُس کا عہد'' طبع دوم، ص ۱۲۱ میں یہ کہنا کہ ''ہندوستانی شعبے میں ''ماتحت منشی'' کی حیثیت سے چالیس روپے ماہانہ پر اُن کا (یعنی میر امّن کا) تقرر ہُوا تھا۔'' یکسر غلط ہے۔ ۴ مئی ۱۸۰۱ء کو بہ وقت تقرر، میر امّن کو ''مُنشی'' (بہ مشاہرہ ۴۰ روپے ماہوار) بھرتی کیا گیا، نہ کہ ''ماتحت مُنشی''۔ عتیق صدیقی مرحوم نے ''گل کرسٹ اور اُس کا عہد'' کے صفحہ ۱۷۶ پر ہندوستانی شعبہ کے مُنشیوں کی فہرست رقم کرتے ہوئے یہ غلطی دوہرائی کہ میر امّن کا تقرر ''ماتحت منشی'' (بہ مشاہرہ چالیس روپے ماہانہ) کے ہُوا۔ ''گلکرسٹ اور اُس کا عہد'' از عتیق صدیقی کے صفحہ ۱۲۱ اور صفحہ ۱۷۶ کے ان بیانات پر بلا تحقیق تکیہ کرتے ہوئے رشید حسن خاں نے فورٹ ولیم کالج میں بہ وقتِ تقرر میر امّن کو ''ماتحت منشی'' (بہ مشاہرہ چالیس روپے ماہوار) بتایا۔ یہ غور نہیں کیا کہ چالیس روپے ماہانہ تو ''مُنشی'' کو دیا جاتا تھا، نیز یہ کہ ۴ مئی ۱۸۰۱ء کو صرف دو سیکنڈ منشی بہ مُشاہرہ اسی روپے ماہوار بھرتی کیے گئے تھے، یعنی میر بہادر علی حسینی اور تاری چرن متر، جب کہ ''چیف مُنشی'' بہ مشاہرہ دوسو روپے ماہوار کی اسامی خالی رکھی گئی تھی۔

عتیق صدیقی کے بیان پر بلا تحقیق صاد کرنے والے رشید حسن خاں یہ نہیں جانتے کہ عُہدے کے لحاظ سے "Second Munshi" کا درجہ چیف مُنشی (Chief Munshi) کے بعد کا ہے، اور تیسرے درجے پر ''مُنشی''

کام کر رہے تھے۔ ''چیف مُنشی'' دو سو روپے، ''سیکنڈ مُنشی'' اسی روپے اور ''مُنشی'' چالیس روپے ماہانہ تنخواہ پاتے تھے۔ مُنشی بھرتی کرنے سے قبل ''سرٹیفکیٹ مُنشی'' مقرر کرنے کا اختیار صدرِ شعبہ کا تھا۔

یہ طے ہے کہ میر بہادر علی حُسینی بہ وقتِ تقرر (۴ مئی ۱۸۰۱ء) سیکنڈ مُنشی (Second Munshi) بھرتی ہوئے اور میر امّن کا تقرر بطور ''مُنشی'' کے ہُوا۔ میر امّن ۲۴ نومبر ۱۸۰۰ء میں بہ طور ''سرٹیفکیٹ مُنشی'' کام کرنے لگے تھے۔

رشید حسن خاں کے یُوں ٹھوکر پہ ٹھوکر کھاتے چلے جانے کا سبب وہی ''نشاطِ کار'' ہے جو اکثر احتیاط کے تقاضوں کو نظر انداز کر دینے پر مجبور کرتی ہے۔ رشید حسن خاں نے میر بہادر علی حُسینی کے تقرر سے متعلق ڈاکٹر صدیق الرّحمان قدوائی کی تحقیق اور میر امّن کے تقرر سے مُتعلق عتیق صدیقی کے بیانات پر بھروسا کیا اور یہ ''نادِر اِطلاعات'' فراہم کر بیٹھے۔

O

مقابلۂ متن کے لیے مُنتخب کردہ درج بالا پانچ نُسخوں کے علاوہ آپ کو میرے تحریر کردہ مُقدّمے، ''حوالہ جات و حواشی: بابت مقابلہ متون'' اور فرہنگِ باغ و بہار'' میں کہیں کہیں درجِ ذیل کُتب کے حوالے بھی دکھائی دیں گے:۔

(۱) ''باغ و بہار'' (انگریزی ترجمہ) مترجم: ایل۔ ایف سمتھ، مطبوعہ کلکتہ، طبع اوّل: ۱۸۱۳ء طبع دوم، لندن: ۱۸۵۱ء

(۲) ''باغ و بہار'' مطبوعہ نامی کریمی، بمبئی طبع اوّل: ۱۹۱۸ء

(۳) ''باغ و بہار'' (رومن رسم الخط میں) مُرتّبہ: پی۔ ایس روزاریو، مطبوعہ: کلکتہ: طبع اوّل: ۱۸۳۶ء

(۴) ''باغ و بہار'' مطبوعہ: دہلی: مطبع محمدی، طبع اوّل: ۱۲۶۳ھ مطابق ۴۷۔۱۸۴۶ء

(۵) ''باغ و بہار'' مطبوعہ: کلکتہ، طبع اوّل: ۱۲۶۸ھ مطابق ۵۲۔۱۸۵۱ء

(٦) ''باغ و بہار'' مطبوعہ: کانپور: مطبع مُصطفائی، زیرِ نگرانی: قاضی محمد اسماعیل مُدرس فورٹ ولیم کالج، کلکتہ، طبع اوّل: ۲۰ ربیع الاوّل ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۲ دسمبر ۱۸۵۴ء (صفحات: ۱٦۷)

خاتمہ کتاب میں درجِ ذیل دعویٰ کیا گیا ہے:

''یہ کتاب بعینہٖ مُطابق اُس نُسخے کی کہ کالج میں داخلِ درس صاحبانِ ذی شان ہے اور معرفت قاضی محمد اسماعیل صاحب مدرس صاحبانِ ممدوح کے ہاتھ آیا۔ تاریخ بیسویں ربیع الاوّل ۱۲۷۱ ہجری مطابق ۱۲ دسمبر ۱۸۵۴ء، باہتمام قلِ بنی نوع انسان محمد عبدالرحمٰن، مطبع مصطفائی واقع کانپور میں چھپی اور بعد تیاری کے ملاحظے سے قاضی صاحب موصوف کے گزر کر اُن کے دستخط سے مزیّن ہوئی۔

''مخزونہ: پنجاب یونیورسٹی لائبریری (اورینٹل سیکشن)، لاہور۔ اس ایڈیشن کی بنیاد وہی نسخہ ہے جو کپتان روبک کی زیرِ نگرانی ۱۹ مارچ ۱۸۱۳ء کو کلکتہ سے برائے فورٹ ولیم کالج شائع ہوا۔

(۷) ''باغ و بہار'' مطبوعہ: کانپور: مطبع مسیحائی، طبع اوّل: ۱۲۷۲ھ مطابق ۵۶۔۱۸۵۵ء

بہ اہتمام: مولوی سیّد محمد حسن لکھنوی، کتابت: مسیح الزّمان ولد مولوی نور محمد مُلتانی، مقیم فیل خانہ بازار، کانپور۔ کُل صفحات: ۱۰۸ چرمی جلد میں۔

اِس نُسخے میں ہر کردار کی کہانی کا الگ سے عنوان قائم کیا گیا ہے جیسے: ''قصہ مُلک شام کی شہزادی کا'' (صفحہ ۱۲)، ''قصہ بصرہ کی شاہزادی کا'' (صفحہ ۳۸)، ''قصہ مُلک نیمروز کی شہزادی کا'' (صفحہ ۴۲)، ''قصہ بادشاہ روم کا'' (صفحہ ۵۱)، ''بیان پیدا ہونے شہزادہ بختیار اور سرسبز ہونے گلشن مُراد چاروں درویشوں کا'' (صفحہ ۱۰۳) مخزونہ: پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور۔

(۸) ''باغ و بہار'' (انگریزی ترجمہ) مترجم: ایڈورڈ بی۔ ایسٹ وِک، مطبوعہ: لندن: میسرز لانگ مین اینڈ کمپنی، طبع اوّل: ۱۸۵۹ء

ایسٹ انڈیا کالج آف ہیلی بری کے پروفیسر ایسٹ وِک (پ: ۱۸۱۴ء۔ م: ۱۸۸۳ء) اس سے قبل ''پریم ساگر'' ترجمہ: ۱۸۰۳ء از للو لال جی کوی کو بہ زبانِ انگریزی ترجمہ کر کے ۱۸۵۱ء میں ہرٹفورڈ، برطانیہ سے شائع کروا چکے تھے۔ ایسٹ وِک کی انگریزی میں ترجمہ کردہ ''باغ و بہار'' کا ایک ایڈیشن ہرٹ فورڈ، برطانیہ سے ۱۸۷۷ء میں بھی نکلا۔

(۹) ''باغ و بہار'' (رومن رسم الخط میں) مرتبہ: مونیئر ولیمز، مطبوعہ: لانگ مین گرین، لانگ مین اینڈ رابرٹس لندن، طبع اوّل: ۱۸۵۹ء کُل صفحات ۲۴۰ (مع دیباچہ، حواشی و فرہنگ) یہ نُسخہ SIR. CHARLES TREVELYAN گورنر مدراس کی فرمائش پر پروفیسر مونیئر ولیمز، یونیورسٹی کالج آکسفرڈ و سابق پروفیسر شعبہ سنسکرت ایسٹ انڈیا کالج، ہیلی بری نے رومن رسم الخط میں تیار کیا۔ مونیئر ولیمز کہتے ہیں کہ پیش کردہ متن ''باغ و بہار'' مرتبہ: پی۔ ایس روزاریو، مطبوعہ کلکتہ: ۱۸۳۶ء پر مبنی ہے۔ دتا سی نے اسے روزاریو کا چربہ کہا ہے۔ ہر صفحے پر حاشیے میں مشکل الفاظ کی فرہنگ دے دی گئی ہے۔

(۱۰) ''باغ و بہار'' مُرتبہ: ڈنکن فاربس، مطبوعہ: لندن: ولیم ایچ۔ ایلن اینڈ کمپنی، طبع چہارم: ۱۸۷۳ء کُل صفحات: ۳۱۵ مع فرہنگ اُردو/انگریزی مشتمل بر ۱۲۳ صفحات۔ واضح رہے کہ پروفیسر ڈنکن فاربس

(پ:۱۷۹۸ء۔م:۱۸۶۸ء) نے اپنے مُرتب کردہ متن (لندن ۱۸۴۶ء اور ۱۸۶۲ء) میں تبدیلیاں کیں۔ ۱۸۴۹ء کے ایڈیشن تک اُن کی رسائی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی لائبریری میں موجود "باغ و بہار" کے ایک اور خطی نُسخے تک بھی ہوگئی تھی۔ ۱۸۷۳ء کے ایڈیشن کی سب سے بڑی خوبی اوقاف نگاری اور اعراب ہیں لیکن اِسی ایڈیشن میں انھوں نے کپتان ڈبلیو۔این۔لیس ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن و پرنسپل کلکتہ یونیورسٹی کی درخواست پر متن میں ترامیم کا کام کیا، "باغ و بہار" کے مخرب الاخلاق حصّوں کو حذف کردیا یا اپنے الفاظ میں بیان کردیا۔یُوں اِس ایڈیشن کا متن اپنا اعتبار کھو بیٹھا۔اس ایڈیشن پر سالِ اشاعت ۱۸۶۰ء درج ہے لیکن بائیں جانب اردو انگریزی فرہنگ کے بعد ۱۸۷۳ء بھی درج ہے۔ فاربس نے ۱۸۶۸ء سے قبل یہ کام مکمل کرلیا تھا۔ ۱۸۶۸ء میں اُن کا انتقال ہوگیا تو اثاثوں سے متعلق قانونی کارروائیوں نے اِس ایڈیشن کی اشاعت مؤخر کردی۔یوں یہ ایڈیشن ۱۸۷۳ء میں شائع ہُوا۔اِس دوران میں فاربس کا مرتب کردہ رومن رسم الخط میں "باغ و بہار" کا ایک ایڈیشن لندن سے ۱۸۶۱ء میں شائع ہو چُکا تھا، جس کا حوالہ گارسیں دِتاسی نے اپنے ۱۲ویں خطبے بابت: یکم دسمبر ۱۸۶۲ء میں دیا ہے۔ "باغ و بہار" (مرتبہ ڈنکن فاربس: ۱۸۷۳ء کے اورینٹل سیکشن، پنجاب یونیورسٹی، لائبریری، لاہور میں موجود نُسخے کے ہر صفحے پر سِکّے پینسل سے انگریزی میں تیار کردہ ایک شاندار فرہنگ بھی دکھائی دیتی ہے۔ کِس نے تیار کی، کچھ پتا نہیں چلتا۔ میرا قیاس یہ ہے کہ یہ کام جے۔ایف۔بنیز (J.F. BANESS) کا کیا ہوا ہے۔ جنھوں نے "باغ و بہار" کا ایک انتخاب بہ زبان انگریزی، ۱۸۸۷ء میں شائع کروایا۔ پھر ایک ایڈیشن ۱۸۸۹ء میں نکلا۔

(۱۱) "باغ و بہار" ترجمہ بہ زبان فرانسیسی از پروفیسر گارسیں دتاسی، مطبوعہ پیرس، طبع اوّل: ۱۸۷۸ء

(۱۲) "منتخباتِ باغ و بہار" (انگریزی ترجمہ) از جے۔ایف۔بنیز (J.F. BANESS) طبع اوّل: ۱۸۸۷ء (مع فرہنگ)

(۱۳) "باغ و بہار" مطبوعہ: میرٹھ: مطبع جوالا پرشاد، طبع اوّل: س۔ن (صفحات ۱۲۸) مخزونہ: پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور۔

(۱۴) "باغ و بہار" (خلاصہ) از محی الدین قادری زور، مطبوعہ: حیدرآباد دکن: سب رس کتاب گھر طبع اوّل: س۔ن مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور

(۱۵) ''باغ و بہار'' مطبوعہ: کلکتہ، ایڈیشن: س۔ن، صفحات ۴۶۹ (مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور)
اس ایڈیشن میں گُلِ بکاؤلی، آرائشِ محفل، اخلاقِ ہندی، شکنتلا اور حکایاتِ لطیف کے علاوہ شُعرائے ہند کے مُنتخب اشعار بھی شامل ہیں۔

(۱۶) ''باغ و بہار'' انگریزی ترجمہ از منشی عدالت خاں، ایڈیٹر: اسد الزّماں مطبوعہ کلکتہ: بپٹسٹ مشن پریس، طبع ہشتم: ۱۹۰۱ (مع فرہنگ) کل صفحات: ۲۲۲ مخزونہ یونیورسٹی لائبریری، لاہور۔

(۱۷) ''باغ و بہار'' مرتبہ: میجر ڈی۔سی۔فِلٹ (MAJ D.C.PHILLOTT) مطبوعہ کلکتہ: بپٹسٹ مشن پریس، طبع چہارم: ۱۹۰۵ء۔ کُل صفحات: ۳۷۹

یہ کتاب برطانوی فوجی و دیگر افسران کے شعبہ جاتی امتحانات نیز ہائر و سیکنڈری لیول کے امتحان کے لیے بطورِ خاص طبع کی گئی۔.................. دلچسپ بات یہ ہے کہ کتاب پر میر امّن کا نام درج نہیں کیا گیا۔ مخزونہ پنجاب یُونیورسٹی لائبریری، لاہور۔

(۱۸) ''باغ و بہار'' ترجمہ بہ زبان چیک از جان میرک (JAN MAREK) مطبوعہ چیکوسلواکیہ، طبع اوّل: ۱۹۶۳ء۔ چیک زبان میں اِس کا عنوان: "PRIBEHYCTYRDRVISU" ہے۔

(۱۹) ''باغ و بہار'' مُرتبہ: ڈاکٹر ممتاز منگلوری، مطبوعہ: لاہور: مکتبہ خیابانِ ادب طبع اوّل: اکتوبر ۱۹۶۶ء۔ مع مُقدمہ و اختلافات۔ تکملہ کے طور پر دو مضامین: ''باغ و بہار کی زندہ نثر'' از ڈاکٹر سیّد عبداللہ اور ''باغ و بہار'' از مولوی عبدالحق شاملِ کتاب ہیں۔ اِس کتاب کا دُوسرا ایڈیشن ستمبر ۱۹۸۲ء میں شائع ہُوا۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری کا طریقۂ کار سراسر انتخابی (ECLECTIC) ہے۔ انھوں نے مقابلہ متن کے لیے موئیز ولیمز کا نُسخہ (رومن رسم الخط) مطبوعہ لانگ مین گرین، لانگ مین اینڈ رابرٹس، لندن طبع اوّل: ۱۸۵۹ء، ڈنکن فاربس کے دو ایڈیشنوں: مطبوعہ لندن (رومن رسم الخط) ۱۸۵۹ء و مطبوعہ لندن (اُردو ٹائپ) ۱۸۵۴ء، نُسخۂ فیض اللہ، مطبوعہ کلکتہ: ۱۸۳۹ء اور نُسخہ مطبوعہ ناگی کریمی، بمبئی: ۱۹۱۸ء کو چُنا۔

یہ کتاب پہلی بار اردو سائنس بورڈ، لاہور سے ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ اب دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، سے اس کا نظرِ ثانی شُدہ مُصوّر ایڈیشن نذرِ قارئین ہے۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ
پروفیسر و سابق صدر شعبہ اردو
گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ اسلامیہ کالج، لاہور
۵۔ نومبر ۲۰۱۶ء، لاہور

حواشی وحوالہ جات:

(۱) میر امّن کے قریبی معاصرین میں شمس الامراء کے دارالترجمہ سے منسلک ایک نامور مترجم پنڈت رتن لعل مستؔ ولد چُنیا لعل کے ساتھ بھی یہی کچھ ہُوا۔ نواب فخر الدین خاں نے رسالہ ''منتخب البصر'' (سال تصنیف ۱۲۵۳ھ مطابق ۳۸۔۱۸۳۷ء) مخزونہ قومی عجائب گھر، کراچی، پاکستان کے سرورق پر ''رتن لال'' نام شائع کیا۔

(۲) ''باغ و بہار'' مع مقدمہ وفرہنگ مرتبہ: ممتاز حسین، پروفیسر: مطبوعہ: کراچی: اردو ٹرسٹ: طبع اوّل، نومبر ۱۹۵۸ء —— پروفیسر صاحب نے اس کتاب کے دیباچہ کو ''باغ و بہار کا تحقیقی مطالعہ''، کے عنوان سے اپنی کتاب ''نقدِ حرف'' مطبوعہ مکتبہ اسلوب، کراچی طبع اوّل: ۱۹۸۵ء میں بھی شامل کیا ہے۔

(۳) پروسیڈنگز آف دی کالج آف فورٹ ولیم، (جلد دوم) امپیریل ریکارڈ ڈیپارٹمنٹ نیشنل آرکائیوز، نئی دہلی۔ ہوم مسلینئس ریکارڈ (بابت: ایسٹ انڈیا کمپنی) نمبر ۵۶۰، مورخہ ۴ جون ۱۸۰۶، ص ۱۳۶

(۴) دیباچہ: ''باغ و بہار ایک تجزیہ''، از ڈاکٹر وحید قریشی، مطبوعہ: لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، طبع اوّل: ۱۹۶۸ء طبع دوم: نصرت پبلشرز، لکھنؤ (بھارت) ۱۹۸۲ء

(۵) بہ حوالہ: ''نمونہ منثورات''، مرتبہ: احسن مارہروی: اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان: طبع ثانی: ۱۹۸۶ء، صفحہ ۸۷

(۶) ایضاً صفحہ ۸۷۔ واضح رہے کہ بقول احسن مارہروی، یہ تذکرہ حیدر آباد دکن کی ایک طغیانی میں بہہ گیا تھا جسے مولوی عبداللہ خاں حیدر آبادی نے پہلی بار دارالاشاعت پنجاب: رفاہِ عام اسٹیم پریس، لاہور سے ۱۹۰۶ء میں طبع کروایا۔

(۷) ''گل کرسٹ اور اس کا عہد'' میں عتیق صدیقی بھی اسی نتیجہ پر پہنچے۔

(۸) بہ حوالہ : "THE FALL OF THE MUGHAL EMPIRE" از جادو ناتھ سرکار، جلد اوّل، ص ۲۷۱

(۹) ''واقعات دار الحکومت دہلی''، جلد اوّل، صفحہ ۶۶۳

(۱۰) بحوالہ: ''باغ و بہار'' مرتبہ: ممتاز حسین: کراچی: اردو ٹرسٹ: طبع اوّل: نومبر ۱۹۵۸ء

(۱۱) "Reverend" مُراد اَبِ مقدّس / تقدّس مآب۔ کیتھولک فرقے میں پادری کی جگہ ''ریورنڈ'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

(۱۲) یکم جنوری ۱۸۰۵ء سے وائس پرووسٹ کا عہدہ ختم کر دیا گیا تھا۔

(۱۳) پروسیڈنگز آف دی کالج آف فورٹ ولیم، ۲۹۔اپریل ۱۸۰۱ء، ہوم ڈیپارٹمنٹ (ایسٹ انڈیا کمپنی) مسلینئس ریکارڈ جلد نمبر ا بابت: ۲۹۔اپریل ۱۸۰۱ء ــــ ۴ ستمبر ۱۸۰۵ء صفحہ ا تا ۳ امپیریل ریکارڈ ڈیپارٹمنٹ نیشنل آرکائیوز نئی دہلی (بھارت)۔

(۱۴) بہ حوالہ: ایشیا ٹک اینول رجسٹر ۱۸۰۱ء لندن (۱۸۰۲ء) صفحہ ۳۱۔۳۲۔''آرائش محفل'' کے دیباچہ میں شیر علی افسوس نے ڈاکٹر جان گلکرسٹ کو ''صاحب مدرّس ہندی'' لکھا ہے۔

(۱۵) ''دی یورپیئن اِن انڈیا''، از چارلس ڈوئلے وکیپٹن ٹامس ولیمز، مطبوعہ: لندن، ۱۸۱۳ء

(۱۶) دیکھیے: ''اربابِ نثر اردو''، از سیّد محمد، مطبوعہ: حیدر آباد: ۱۹۲۷ء ص ۳۹

(۱۷) دیکھیے: ''گِل کرسٹ اور اس کا عہد''، از عتیق صدیقی، صفحہ ۱۹۰۔۱۹۴ ــــ فورٹ ولیم کالج کے لیے مطبع احمدی، کلکتہ کا شائع کردہ (۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۶ء) ۳۶۸ صفحات پر مشتمل ''گنجِ خُوبی'' کا ایک نسخہ کراچی یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔

(۱۸) مزید دیکھیے: کالج کونسل کی رپورٹ بابت ۲۰۔ستمبر ۱۸۰۴ء

(۱۹) بہ حوالہ پروسیڈنگز آف دی کالج آف فورٹ ولیم

(۲۰) ایضاً

(۲۱) ایضاً

(۲۲) ''باغ و بہار کا تحقیقی مطالعہ''، مشمولہ ''مقالاتِ شیرانی'' و مطبوعہ: ''کاروان'' لاہور سالنامہ ۱۹۳۳ء

(۲۳) تفصیلات کے لیے دیکھیے: ''اردو کی نثری داستانیں''، از ڈاکٹر گیان چند: کراچی: انجمن ترقی اردو، طبع اوّل ۱۹۵۴ء

(۲۴) ''باغ و بہار''، مرتبہ: ڈنکن فاربس، مطبوعہ: لندن: ایڈیشن ۱۸۶۰ء (درحقیقت ۱۸۷۳ء)

(۲۵) پروسیڈنگز آف دی کالج آف فورٹ ولیم

(۲۶) پہلی بار ''چار درویش'' کے ۵۸ صفحات ہرکارہ پریس کلکتہ سے چھے ماہ میں طبع ہوئے۔ دیکھیے: گلکرسٹ کی چٹھی بنام کالج کونسل، مورخہ ۱۲۔جنوری ۱۸۰۲ء

(۲۷) پروسیڈنگز آف دی کالج آف فورٹ ولیم۔

(۲۸) بیشتر کتب میں میر بہادر علی حسینی نارنولی کو ۱۸۰۱ء میں ہی چیف منشی یا ہیڈ منشی بتایا گیا ہے، جو درست نہیں۔

(۲۹) پروسیڈنگز آف دی کالج آف فورٹ ولیم۔

(۳۰) ایضاً

(۳۱) میر امّن کے استعفیٰ سے متعلق یہی بات عتیق صدیقی نے ''ہماری زبان'' والے مضمون میں بھی کی۔

(۳۲) پروسیڈنگز آف دی کالج آف فورٹ ولیم، جلد دوم نمبر ۱۰۶

(۳۳) بہ حوالہ: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد اوّل) مطبوعہ: انجمن ترقی اردو (ہند) طبع اوّل 1935ء ص ۱۳۱

(۳۴) بہ حوالہ: ''سخنِ شعراء'' از عبدالغفور نساخ (تالیف: ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ء) مُرتبہ: عطا کاکوی: مطبوعہ: پٹنہ: عظیم الشان بک ڈپو سلطان گنج، طبع اوّل: مئی ۱۹۷۲ء، صفحہ ۴۹

(۳۵) بہ حوالہ: ''تاریخ ریختی معہ دیوان جان صاحب''، مرتبہ: سیّد محمد مبین نقوی الہ آبادی۔ ناشر: عبدالواسع جعفری: الہ آباد: مطبع انوار احمدی، س۔ن

(۳۶) بہ حوالہ: ''فرہنگِ عامرہ'' مؤلفہ: محمد عبداللہ خویشگی مطبوعہ: کراچی: ٹائمز پریس، طبع چہارم: جون ۱۹۵۷ء، صفحہ نمبر ۲۲۷

(۳۷) بہ حوالہ: ''فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی''، از نادم سیتاپوری مطبوعہ: لکھنؤ: ادارہ فروغ اُردو: ۱۹۵۹ء

(۳۸) بہ حوالہ: پیش لفظ: ''باغ و بہار'' مرتبہ: ڈنکن فاربس: لندن طبع چہارم ۱۸۶۰ء (درحقیقت ۱۸۷۳ء) پروفیسر ڈنکن فاربس نے ''باغ و بہار'' مطبوعہ: کلکتہ ۱۸۰۳-۴ء، بنیادی متن ''باغ و بہار'' ملکیت ڈاکٹر جان گلکرسٹ اور سول سروس سے متعلق میر امّن کے شاگرد ایم۔ رومر کے تیار کردہ متن کو بنیاد بنا کر ''باغ و بہار'' کو لندن سے ۱۸۴۶ء میں طبع کروایا۔ واضح رہے کہ ڈنکن فاربس نے ''باغ و بہار'' کو لندن ہی سے ۱۸۴۹ء میں طبع کرواتے وقت رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ایک مخطوطے سے موازنہ متن اور خصوصی جائزہ کے بعد اعراب واوقاف میں بعض تبدیلیاں کرنے کے ساتھ ساتھ طبع چہارم: ۱۸۷۳ء میں کپٹن ڈبلیو۔ این۔ لیس، ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن و پرنسپل کلکتہ یونی ورسٹی کے ایما پر ''باغ و بہار'' کے مخرب الاخلاق حصّوں کو حذف کر دیا تھا۔

(۳۹) مرتّب ''انوار بدریہ'' قلعہ ادھونی حیدر آباد دکن کے رہنے والے تھے۔ شاہ علی کا تصنیف کردہ ایک رسالہ ''شمس الہیت'' زمانۂ تصنیف ۱۲۵۰ھ مطابق ۳۵-۱۸۳۴ء قومی عجائب گھر، کراچی (پاکستان) میں محفوظ ہے۔

(۴۰) بہ حوالہ: ۵۵۳ نمبر شاملات ۳۰۶ سائز ۹x۱۸ صفحات ۱۹ سطر ۲۰ خط نستعلیق۔ قلمی مخطوطہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدر آباد آندھرا پردیش کے کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

(۴۱) دیکھیے: ''دی یورپیئن اِن انڈیا'' از چارلس ڈوئلے و کپٹن ٹامس ولیمز، مطبوعہ: لندن: ۱۸۱۳ء

(۴۲) ''تاریخ شعرائے بہار'' (جلد اوّل: ۱۷۳۷ء تا ۱۸۸۲ء) مطبوعہ: دی قومی پریس لمیٹڈ، بانکی پور، پٹنہ (عظیم آباد) طبع اوّل: ۱۳۵۰ھ مطابق ۱۹۳۱ء

(۴۳) ''جامع اللغات'' از خواجہ عبدالمجید، مطبوعہ: ملک دین محمد اینڈ سنز، لاہور طبع اوّل: جلد اوّل جنوری ۱۹۳۳ء، جلد چہارم: جنوری ۱۹۳۵ء، ص ۲۷۶

(۴۴) پروسیڈنگز آف دی کالج آف فورٹ ولیم، جلد دوم ہوم مسلینئس ریکارڈ (ایسٹ انڈیا کمپنی) نمبر ۵۶۰، مورخہ ۴ جون ۱۸۰۶ء ص ۱۳۶، نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی، بھارت۔

(۴۵) پروسیڈنگز آف دی کالج آف فورٹ ولیم۔

(۴۶) ایضاً۔ یاد رہے کہ ۲۴ جنوری ۱۸۵۴ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہوم ڈیپارٹمنٹ کی سپریم کونسل نے فورٹ ولیم کالج ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔

(۴۷) دیکھیے: ''خطباتِ گارساں دتاسی'' ص ۲۷۸ تا ۲۷۹

(۴۸) یہ طے ہے اور اسی حوالے سے میں نے اپنے مقالہ کے آغاز میں کہا تھا کہ ڈاکٹر گلکرسٹ نے میر امان علی کا جہاں کہیں بھی ذکر کیا، اُسے ''میر امّن'' ہی لکھا۔ ''باغ و بہار'' اور ''گنجِ خوبی'' پر یہی نام ''میر امّن'' دیا۔ علاوہ ازیں ''میر امّن لُطف'' بھی ملتا ہے۔ گلکرسٹ کی کتاب بہ زبانِ انگریزی:
"STRANGER'S EAST INDIAN GUIDE TO THE EAST INDIAN GUIDE HINDOOSTANI" کے صفحہ ۱۲۷ پر گلکرسٹ نے ''میر امن لطف'' درج کیا ہے۔

(۴۹) "HISTOIRE DE LA LITTERATURE HINDOUIE ET HINDOUSTANIE"
جلد دوم، مطبوعہ: پیرس (فرانس) طبع اوّل: ۱۸۷۰ء

O

جان بارتھوک گلکرسٹ *

مُقدّمہ

ماضی بعید میں یہ قِصّہ، بہ زبانِ فارسی، بہ عنوان: ''قصہء چہار درویش'' یا ''چار دَرویشوں کی کہانی''، خاصا سراہا گیا ہے۔ جسے شیریں بیاں امیر خُسرو نے اپنے پیر و مُرشد نظام الدین اولیاء کی ناسازیِ طبع کے دَوران، اُن کا جی بہلانے کی خاطر تخلیق کیا۔ فارسی سے اِس قِصّے کا اُردو ترجمہ عطا حسین خاں نے ''نوطرزِ مُرصّع'' کے عُنوان سے کیا تھا، لیکن وہ ترجمہ اُردو زبان کے نثر پارے کے طور پر قابلِ اعتراض یُوں تھا کہ اُس میں فارسی اور عربی لفظیات اور محاورات کی بُہتات تھی۔ اِس نُقص کو دُور کرنے کے لیے مقامی عالِم میر امّن دِلّی والے نے، جو کہ فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہیں؛ اُسی قدیمی ترجمے کو بُنیاد بنا کر یہ یکسر نیا اسلوب وضع کیا۔ یُوں، وہ جس طرح کا سہل و سادہ اسلوب تراشنے میں کامیاب ہُوئے، اُس کا اندازہ ہندوستانی زبان کا کوئی بھی مُحقق کر سکتا ہے۔ اُنھوں نے ریختہ کے محاورے کو جس طرح کی صحت اور صفائی کے ساتھ برتا ہے، وہ اُن کی زبان دانی کا بیّن ثبوت ہے۔

اِس قِصّے میں ایشیائی عادات و خصائل اور رسوم و رواج کا ذِکر مرغوبِ طبع ہے اور اُن کے بیان سے جنم لینے والی کلاسیکی طہارت کو دیکھ کر یہ گُمان گزرتا ہے، جیسے یہ قصہ طبع زاد ہو۔ اِسی خصوصیت کے سبب یہ کام اُس تخلیقی سرمائے میں ایک بیش بہا اضافہ ہے، جو کہ حال ہی میں ہندوستان کی مقبول تر زبان میں اشاعت پذیر ہُوا ہے۔

O

ترجمہ: "Preface" (بہ زبانِ انگریزی) مشمولہ: ''باغ و بہار'' مطبوعہ: ہندوستانی پریس، کلکتہ، طبع اوّل: ۱۸۰۴ء

* پروفیسر ڈنکن فاربس اور پروفیسر مونیئر ولیمز نے بھی اِس تحریر کو گلکرسٹ ہی کی تحریر قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

میر امّن دِلّی والے : مونو گراف

اصل نام : میر امان علی

قلمی نام : میر امّن دِلّی والے، مشہور بہ تخلص امّن۔

پیدائش : لگ بھگ ۱۷۵۰ء بہ مقام دِلّی، بہ عہد محمد شاہ۔

وفات : ''باغ و بہار'' کے ایک انگلش مترجم ایل۔ ایف سمتھ، مترجم و مرتب: "The Tale of Four Derwesh"، مطبوعہ: منروا پریس، کلکتہ، طبع اوّل ۱۸۱۳ء کے دیباچہ کے مطابق میر امّن ۱۸۱۳ء تک تو بہر طور حیات تھے۔ نادم سیتاپوری نے ''فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی''، مطبوعہ: ادارہ فروغ اردو، لکھنو، طبع اوّل ۱۹۵۹ء میں میر امّن کو ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۔۱۸۱۷ء تک حیات بتایا ہے۔ انیس بیس سال کی عمر میں ڈاکٹر ایس ڈبلیو فیلن (پ: ۱۸۱۷ء) کی میر امّن سے ملاقات ہوئی۔ یوں ثابت ہے کہ ۳۷۔۱۸۳۶ء میں میر امّن حیات تھے۔

مختصر حالاتِ زندگی : میر امان علی امّن کا بارہ امامی شیعہ اثناعشری خاندان مغل شہنشاہ نصیر الدین ہمایوں کے عہد سے لے کر شاہ عالم ثانی کے عہد حکومت تک منصب دار قدیمی اور ''خانہ زاد موروثی'' شمار کیا جاتا تھا اور اُن کے خاندان کا یہ لقب مغل شاہی دفتر میں درج تھا۔ سورج مل جاٹ کے بیٹے جواہر سنگھ نے دہلی پر قبضے (۶۵۔۱۷۶۴ء) کے بعد اِن کی خاندانی جاگیر ضبط کی۔ اس سے قبل احمد شاہ ابدالی نے دہلی شہر کو اجاڑ کر رکھ دیا تھا۔ میر امّن، والدین کے ایما پر تیرہ، چودہ برس کی عمر میں تنِ تنہا قسمت آزمائی کے لیے پُورب کی طرف نکلے۔ عظیم آباد (پٹنہ) میں جوان ہوئے اور شادی کی۔ بعد میں دیگر گھر کے افراد بھی عظیم آباد پہنچ گئے۔ عظیم آباد میں لگ بھگ بتیس برس قیام رہا۔ اِس دوران میں علمی استعداد بڑھائی۔ ۱۷۹۷ء میں "ORIENTAL SEMINARY" ہگلی میں مقیم تھے جب منشیوں کی ضرورت محسوس کی گئی تو گھر والوں کو عظیم آباد میں چھوڑ کر کلکتہ پہنچے۔ کچھ مدت بے روزگار رہے۔ قریب دو برس نواب دِلاور جنگ کے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کے اتالیق رہے۔ فورٹ ولیم کالج، کلکتہ میں تدریسی سرگرمیوں کا آغاز ۴

نومبر ۱۸۰۰ء کو ہُوا تو دیسی سرٹیفکیٹ منشیوں کی ضرورت محسوس کی گئی، یوں میر بہادر علی حسینی نارنولی کی معرفت پروفیسر شعبہ ہندوستانی جان بارتھ وِک گلکرسٹ سے ملاقات ہوئی۔ گلکرسٹ نے میر امّن کو سرٹیفکیٹ منشی (۲۴ نومبر ۱۸۰۰ء تا ۴ مئی ۱۸۰۱ء) چُن کر کے محمد حسین عطا خاں تحسین کی کتاب ''نوطرزِ مرصّع'' کا ایک خطی نسخہ دے کر وہی داستان از سر نو لکھنے کو کہا۔ اس کے چھے ماہ بعد ۴ مئی ۱۸۰۱ء میں میر امّن بطور منشی، بہ مشاہرہ چالیس روپے ماہوار، فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہو گئے۔ دیگر منشیوں کی طرح میر امّن کا قیام بھی فورٹ ولیم کالج کے اندر ہاسٹل میں رہا، جہاں اہل خانہ کو ساتھ رکھنا ممکن نہ تھا، اس لیے انھیں عظیم آباد سے فرخ آباد منتقل کر دیا۔ میر امّن دیگر منشیوں کی طرح ہر روز ناشتے کے بعد دوپہر دن تک تدریس کا کام کرتے۔ کبھی کبھار بطور ٹیوٹر انھیں شام کے وقت یہی کام انگریز زیرِ تربیت افسران کے کمروں میں جا کر بھی کرنا پڑتا۔ اُن افسران میں سے ایک ایم۔ رومر بھی تھے۔ گارسیں دتاسی کے مطابق میر امّن کے اِس شاگردِ خاص کی تحویل میں میر امّن کے ہاتھ کی تحریر کردہ بہت سی منظومات محفوظ تھیں۔ ڈنکن فاربس کے مطابق ''باغ و بہار'' کا ایک خطی نسخہ بھی ایم۔ رومر کی تحویل میں رہا۔ چارلس ڈوئلے اور کپتان ٹامس ولیمز کے مطابق منشیوں کو ایک اردلی بھی مُیسّر ہوتا تھا جو گھر آنے جانے کے وقت اُن کی قلم دوات اور دیگر سامان اٹھائے رہنے کے علاوہ اُن پر چھتری تانے رہتا تھا۔ یقیناً یہ سہولت میر امّن کو بھی حاصل رہی ہوگی۔

میر امّن کا بطور مُنشی اور ڈورین (DORIAN)، فورٹ ولیم کالج میں محض پانچ برس قیام رہا۔ ۲۴ فروری ۱۸۰۴ء میں میر امّن کے مُحسن، گلکرسٹ مُستعفی ہو کر برطانیہ واپس چلے گئے تو میر امّن نے بھی فورٹ ولیم کالج میں نباہ اپنا نہ دیکھا۔ اب مُتبادل ملازمت کے لیے اُن کی نظر مدرسہ فخریہ و دار الترجمہ حیدر آباد، دکن پر جمی ہوئی تھی۔ میر امّن کے فورٹ ولیم کالج سے بددل ہونے کا باعث حکومتِ بنگال کی انجینئرنگ کور کا کپتان جیمز مؤئٹ تھا، جس نے گلکرسٹ پر خُرد بُرد کے الزامات لگائے اور گلکرسٹ کے مُستعفی ہونے کا سبب بنا۔ یاد رہے کہ یہی جیمز مؤئٹ ہے جس کے نام ''باغ و بہار'' معنون کی گئی تھی۔ گلکرسٹ کے مستعفی ہو جانے کے بعد ۱۶ ستمبر ۱۸۰۵ء میں کپتان جیمز مؤئٹ نے بطور پروفیسر شعبہ ہندوستانی کا چارج سنبھالا۔ ایک طرف تو گلکرسٹ کے قریبی حلقے کے لوگوں کے لیے یہ تبدیلی ناگوارِ خاطر تھی اور دوسری طرف کمپنی کے اربابِ اختیار فورٹ ولیم کالج کو بند کر کے وہی کام ہیلی بری کالج، برٹ فرڈ برطانیہ سے لینا چاہتے تھے۔ نتیجے کے طور پر ۴ جون ۱۸۰۶ء کو صدر شعبہ ہندوستانی پروفیسر کپتان جیمز مؤئٹ کی شکایت پر کہ میر امّن نے ایک طالب علم کو پڑھانے سے انکار کیا تو کالج کونسل کے سامنے پیش کیے گئے۔ میر امّن نے الزام کو تسلیم کرتے ہوئے پیرانہ سالی اور جسمانی معذوری کا عذر پیش کیا، لہٰذا یہ طے پایا کہ ماہ جون ۱۸۰۶ء کی تنخواہ

(۸۰ روپے ماہانہ) کے علاوہ چار ماہ کی اضافی تنخواہ (تین سو بیس روپے) دے کر اُنھیں سبک دوش کر دیا جائے۔ فورٹ ولیم کالج سے بطور ڈورن (DORIAN) یا سیکنڈ مُنشی، سبک دوش ہو کر میر امّن، مدرسہ فخریہ حیدر آباد دکن سے وابستہ ہو گئے۔ میر امّن کے شاعر بیٹے میر یار علی جان صاحب کی ولادت (۱۹۔۱۸۱۸ء) فرخ آباد کی ثابت ہے، جب کہ اُن کا بچپن لکھنوء میں گزرا۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر امّن نے اپنے اہل وعیال کو عظیم آباد (پٹنہ) سے فرخ آباد (فتح گڑھ) اور فرخ آباد سے لکھنؤ منتقل کیا۔ ''باغ و بہار'' کے دیباچہ از میر امّن سے معلوم ہوتا ہے کہ گھر میں چھوٹے بڑے دس افراد تھے۔ بڑوں میں خود میر امّن اور ان کی بیگم کو شمار کریں تو بچوں کی تعداد آٹھ بنتی ہے۔ اور اگر ایک سے زاید بیگمات تھیں تو میر امّن کے بچوں کی تعداد گھٹ بھی سکتی ہے۔ البتہ یہ طے ہے کہ کنبہ بڑا تھا۔ اُن کے شاعر بیٹے جان صاحب کے چند اشعار سے یہ تاثر ملتا ہے کہ میر امّن کثیر الازواج تھے۔ جان صاحب کی ولادت ۱۹۔۱۸۱۸ء سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ ''ستۂ شمسیہ'' کے دیباچہ از نواب محمد فخر الدین شمس الامراء ۳۷۔۱۸۳۶ء میں میر امّن کے نام ''میر امان علی دہلوی'' کے ساتھ مرحوم نہیں لکھا گیا۔

قلمی آثار: (مطبوعہ)

۱۔ ''باغ و بہار'' (داستان) بازتخلیق: ''قصۂ چہار درویش'' (فارسی) از مرزا محمد ربیع انجب، بہ توسط: ''نوطرزِ مُرصّع'' از محمد حسین عطا خاں تحسین، مطبوعہ: کلکتہ: ہندوستانی چھاپا خانہ، طبع اوّل: ۱۸۰۴ء، طبع دوم: ۱۸۰۵ء، طبع سوم زیر نگرانی کپتان روبک: ۱۹ مارچ ۱۸۱۳ء

۲۔ ''گنجِ خُوبی'' مُلا حسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف ''اخلاقِ مُحسنی'' کا چالیس ابواب میں آزاد ترجمہ، مطبوعہ: کلکتہ طبع اوّل: ۵۔۱۸۰۴ء (عتیق صدیقی کا یہ کہنا غلط ہے کہ ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء سے قبل فورٹ ولیم کالج کی طرف سے یہ کتاب شائع ہو چکی تھی۔ گارسیں دتاسی کے بیان کے مطابق یہ کتاب ۱۸۰۴ء میں زیرِ طبع تھی)

۳۔ ''اصول علم حساب ہندی زبان میں'' مطبوعہ: حیدر آباد (دکن): سنگی چھاپہ خانہ شمس الامراء، طبع اوّل: ۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۳۶ء

۴۔ ''رسالہ کسورات اعشاریہ'' مطبوعہ: حیدر آباد (دکن): سنگی چھاپہ خانہ شمس الامراء، طبع اوّل: ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء

۵۔ ''رسالہ علم آب'' از ریوری رنٹ چارلس کا انگریزی سے ترجمہ، مطبوعہ: حیدر آباد (دکن): سنگی چھاپہ خانہ

شمس الامراء، طبع اوّل: ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۸ء

۶۔ ''رسالہ علم ہوا'' از ریوری رنٹ چارلس کا انگریزی سے ترجمہ، مطبوعہ: حیدر آباد (دکن): سنگی چھاپہ خانہ شمس الامراء، طبع اوّل: ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۹ء

۷۔ ''رسالہ علم مناظر'' از ریوری رنٹ چارلس کا انگریزی سے ترجمہ، مطبوعہ: حیدر آباد (دکن): سنگی چھاپہ خانہ شمس الامراء، طبع اوّل: ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۹ء

۸۔ ''رسالہ علم برقک'' از ریوری رنٹ چارلس کا انگریزی سے ترجمہ، مطبوعہ: حیدر آباد (دکن): سنگی چھاپہ خانہ، طبع اوّل: ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۹ء

۹۔ ''رسالہ علم جرِثقیل'' از ریوری رنٹ چارلس کا انگریزی سے ترجمہ، مطبوعہ: حیدر آباد (دکن): سنگی چھاپہ خانہ، طبع اوّل: ۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۴۰ء

۱۰۔ ''رسالہ علم ہیئت'' از ریوری رنٹ چارلس کا انگریزی سے ترجمہ، مطبوعہ: حیدر آباد (دکن): سنگی چھاپہ خانہ، طبع اوّل: ۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۴۰ء

۱۱۔ ''رسالہ سوالات و جوابات بابت علم آب، علم ہوا، علم مناظر، علم برقک، علم جرثقیل و علم ہیئت'' از ریوری رنٹ چارلس کا انگریزی سے ترجمہ، مشمولہ ''ستۂ شمسیہ'' (تکمیل: ۳۷۔۱۸۳۶ء) مطبوعہ: حیدر آباد دکن: سنگی چھاپہ خانہ شمس الامراء، طبع اوّل: ۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۴۰ء۔

نوٹ: واضح رہے کہ نمبر شمار: ۵ تا ۱۱ کی کتب کو ''ستۂ شمسیہ'' کے عنوان سے شمس الامراء نواب محمد فخر الدین خاں نے اپنے دیباچہ کے ساتھ ذاتی سنگی چھاپہ خانہ، حیدر آباد (دکن) سے پہلی بار ۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۴۰ء میں طبع کروایا۔ دوسری اور تیسری بار یہ کتاب اُسی چھاپہ خانے سے ۱۲۶۶ھ مطابق ۵۰۔۱۸۴۹ء میں طبع ہوئی۔ چوتھا ایڈیشن مطبع اسلامیہ، مدراس سے ۱۲۷۲ھ مطابق ۵۶۔۱۸۵۵ء میں نکلا۔ چھٹا، ساتواں ایڈیشن منشی امیر احمد کے مطبع سے ۱۳۱۶ھ مطابق ۹۹۔۱۸۹۸ء میں نکلا۔ نمبر شمار: ۵ تا ۱۱ کے تراجم میر امان علی امن، غلام محی الدین متین حیدر آبادی، انگریز مترجم مسٹر جونس اور فرانسیسی مترجم موسیو تنڈرس کی مشترکہ کاوش ہیں۔

قلمی آثار: (غیر مطبوعہ)

(1) گارسیں دتاسی کے مطابق میر امّن نے ایک ''دیوان'' بھی یادگار چھوڑا اور ان کی بہت سی منظومات

ایم۔ رومر کے پاس محفوظ تھیں، جن کا تا حال سراغ نہیں ملا۔ لیکن یہ طے ہے کہ وہ شاعر تھے اور اسی حوالے سے ۳۷۔۱۸۳۶ء میں ڈاکٹر ایس ڈبلیو فیلن نے انہیں انٹرویو کرتے ہوئے پوچھا تھا کہ ''آپ کس شاعر سے اصلاح لیتے ہیں؟'' (بہ حوالہ: ''تاریخ اردو ادب'' از رام بابو سکسینہ)

اعزازات :

(۱) فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کی جانب سے ۱۴ جون ۱۸۰۲ء کو ''چار درویش'' کے مسودے پر میر امّن کو ۵۰۰ روپے نقد انعام سے نوازا گیا۔ میر امّن، فورٹ ولیم کالج کے پہلے مُنشی ہیں جنھیں یہ اعزاز مِلا۔

(۲) میر امّن کی زندگی میں ہی ''باغ و بہار'' کو ''ہائی پروفیشنسی'' اور ''ڈگری آف آنرز'' کے امتحانات کی نصابی کتاب کا درجہ مِلا۔

(۳) ۳۱ مئی ۱۸۴۴ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کورٹ آف ڈائریکٹرز نے جنرل آرڈر مُجریہ ۹ جنوری ۱۸۳۷ء کی رُو سے جُونیئر انگریز افسران کے علاوہ ملٹری کے تمام افسران کے لیے ہندوستانی زبان (اردو) میں امتحان پاس کرنا ضروری قرار دیتے ہوئے تمام اُمیدواران کے لیے نصابی کتاب کی سطح پر ''باغ و بہار'' کا ترجمہ اور کتاب خوانی کو لازمی قرار دیا۔

(۴) ''باغ و بہار'' اردو کی پہلی کتاب ہے جس کے تراجم ارمنی، لاطینی، پرتگالی، فارسی، فرانسیسی اور انگریزی میں، میر امّن کی زندگی میں ہی ہو گئے تھے۔ بعد ازآں چینی، جاپانی، رُوسی اور چیک زبانوں میں بھی تراجم سامنے آئے۔

(۵) ۱۸۴۹ء میں ''باغ و بہار'' کلکتہ یونیورسٹی کی شاملِ نصاب کتاب تھی اور کتاب کا متن پروفیسر ڈنکن فاربس کا مرتّب کردہ۔ بعد ازآں ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن و پرنسپل کلکتہ یونیورسٹی کی درخواست پر ڈنکن فاربس نے ''باغ و بہار'' (۱۸۷۳) کے متن میں قطع بُرید کی اور فحش حصّوں کو کتاب سے نکال باہر کیا۔

(۶) ''باغ و بہار'' مطبوعہ: ہندوستانی پریس، کلکتہ، طبع اوّل: ۱۸۰۴ء، فورٹ ولیم کالج ہی کے لیے کپتان روبک کی زیرِ نگرانی شائع ہونے والی ''باغ و بہار'' (۱۸۰۵ء) اور ایڈیشن بابت: ۱۹ مارچ ۱۸۱۳ء (تعداد ایک سو) کے بعد برطانیہ اور فرانس کے علاوہ کلکتہ ہی سے ''باغ و بہار'' کے مُتعدد ایڈیشن ۱۸۲۲ء،

۱۸۲۴ء، ۱۸۳۳، ۱۸۳۶، ۱۸۳۹، ۱۸۴۲، ۱۸۴۳، ۱۸۴۵ء، ۱۸۵۱_۵۲، ۱۸۶۲ اور ۱۸۶۳ء میں نکلے، مدراس سے ۱۸۳۲ء اور کانپور سے ۱۸۳۴ء، ۱۸۵۴ء، ۱۸۵۵ء میں شائع ہوئی۔ نیز دہلی اور میرٹھ سے یہ کتاب کئی بار شائع ہوئی۔ یُوں ہندوستان کے کسی بھی مصنف کی کتاب کو اتنی مُختصر مدّت میں اتنے بڑے پیمانے پر اِشاعت کا اِعزاز نصیب نہیں ہُوا۔

(۷) ولیم ہنٹر کی ''ہندوستانی ڈکشنری'' میں لفظوں کے خیال کے سلسلے میں جن ۴۲ کتب سے استفادہ کیا گیا، اُن میں ''باغ و بہار'' سرفہرست تھی۔

(۸) ڈاکٹر ایس۔ ڈبلیو فیلن کی "ENLISH-HINDUSTANI DICTIONARY"، ''اُردو آموز'' اور ''ہندی اردو روزمرہ'' (غیر مطبوعہ) میں جن کتب سے استفادہ کیا گیا اُن میں ''باغ و بہار'' اور ''گنجِ خوبی'' سرفہرست تھیں۔

(۹) ۱۸۵۳ء میں ''باغ و بہار'' السنہ مشرقیہ کالج پیرس (فرانس) کی شاملِ نصاب کتاب تھی۔ ڈاکٹر ثریا حسین کے مطابق ۱۸۷۸ء میں اسی نصابی ضرورت کے تحت گارسیں دتاسی نے ''باغ و بہار'' کا فرانسیسی ترجمہ شائع کروایا۔

(۱۰) ۱۸۶۰ء میں السنہ مشرقیہ کالج پیرس (فرانس) میں ''باغ و بہار'' کے فارسی اور لاطینی تراجم شاملِ نصاب تھے۔ فارسی ترجمہ ڈنکن فاربس کا تھا اور لاطینی ترجمہ: پی۔ ایس روزاریو کا

(۱۱) ۱۹۶۳ء میں ژاںماریک (JAN MAREK) نے چیک زبان میں ''باغ و بہار'' کا ترجمہ کیا۔

O

نقل عرضی کی،

جو مدرسے کے مُختار کار صاحبوں کے حُضور میں دی گئی : *

صاحبانِ والاشان، نجیبوں کے قدردانوں کو خُدا سلامت رکھے۔

اِس بے وطن نے حُکم اشتہار کا سُن کر، چار درویش کے قصّے کو ہزار جِدّ و کد سے اُردوے مُعلّا کی زبان میں باغ و بہار بنایا۔ فضل اِلٰہی سے سب صاحبوں کے سَیر کرنے کے باعِث سرسبز ہُوا۔ اب اُمیدوار ہُوں کہ اِس کا پھل مجھے بھی ملے تو میرا غُنچہ ءِ دِل مانند گُل کے کھِلے۔ بقول حکیم فِردوسی کے کہ ''شاہ نامے'' میں کہا ہے:

بسے رنج بُردم دریں سال سی — عَجم زندہ کردم بہ ایں پارسی

سو اُردو کی آراستہ کر زُبان — کیا میں نے بنگالا، ہندوستاں

خاوِند! آپ قدردان ہیں، حاجت عرض کرنے کی نہیں۔ اِلٰہی! تارا اِقبال کا چمکتا رہے۔

عرضی میر امّن دِلّی والے کی

---

* ''باغ و بہار'' اشاعتِ اوّل: ۱۸۰۴ء کا آغاز اِسی عرضی سے ہوتا ہے۔ ہمارے مآخذی نُسخے: ''نُسخہء فیض اللہ'' میں یہ عرضی موجود نہیں۔ اِس عرضی کا پس منظر یہ ہے کہ کالج کونسل، فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کی تجویز بابت: ۲ نومبر ۱۸۰۱ء کے مطابق مُشتہر کیا گیا کہ: ''دیسی زبانوں میں ادبی کتابوں کی تصنیف و تالیف کی ہمت افزائی کے خیال سے تبحر دیسی لوگوں کو انعامات دیے جائیں گے۔''

جون ۱۸۰۲ء میں جب میر امّن نے ''باغ و بہار'' کی روایت اوّل: ''چار درویش'' (تکمیل: ۲۴ نومبر ۱۸۰۰ء تا اپریل ۱۸۰۱ء) پر کالج کونسل ہی کے حُکم پر مبنی۔ جون ۱۸۰۲ء میں نظرِ ثانی کا کام مکمل کر لیا تو ۱۴ جون تک کی کسی تاریخ میں صدر شعبہ ہندوستانی جان گلکرسٹ کی مُشاورت کے ساتھ یہ عرضی تحریر کی گئی۔ جان گلکرسٹ نے اِس عرضی کو ''باغ و بہار'' کے مسودے کے ہمراہ ۱۴ جون ۱۸۰۲ء کو کالج کونسل کے سامنے رکھا۔ یوں کالج کونسل نے اُسی روز میر امّن کو پانچ سو روپے انعام دینا منظور کرتے ہوئے یہ نوٹ لکھا: ''فاضل دیسی میر امّن، جو کالج سے وابستہ ہیں، اُن کو چار درویش کے ہندوستانی ترجمے کے لیے، جسے ہندوستانی پروفیسر نے آج ہی پیش کیا ہے، پانچ سو روپے بطور انعام دیے جائیں گے۔'' (پروسیڈنگز آف دی کالج آف فورٹ ولیم)

میر امّن کو انعام مِلا تو ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کو تاری چرن متر، مولوی امانت اللہ، سدل مصر پنڈت، للّو لال جی کوی، مرزا کاظم علی جواں اور میر بہادر علی حسینی نارنولی نے بھی اس درمیانی مدّت میں تیار کردہ مسودات، جان گلکرسٹ کی معرفت برائے حصولِ انعام، کالج کونسل کو بھجوائے۔ جان گلکرسٹ نے میر بہادر علی حسینی نارنولی کے فراہم کردہ مسودے کے ہمراہ بھجوائی گئی سفارشی چٹھی میں لکھا تھا کہ اگر حسینی کو انعام نہ دیا جائے تو کم از کم ان کی تنخواہ ۸۰ روپے ماہوار سے بڑھا کر ۱۰۰ روپے ماہانہ کر دی جائے۔ دوسرے لفظوں میں گلکرسٹ نے ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء میں حُسینی کے چیف منشی بننے کی راہ ہموار کی تھی۔ گلکرسٹ کی اِس چٹھی کے جواب میں کالج کونسل نے لکھا تھا کہ: ''کونسل کا یہ ارادہ کبھی نہ تھا کہ جو دیسی علماء کالج سے مقررہ تنخواہ پاتے ہیں، اُنھیں بھی انعام دیا جائے یا غیر مکمل یا مذکورہ کتب کے لیے پہلے سے ہی انعام کا اعلان کر دیا جائے۔ کونسل، محنتی اور قابل اشخاص کو جنھیں کالج سے اچھی تنخواہ نہ مل رہی ہو، کبھی کبھی خاص مواقع پر انعام دینے کے لیے تیار ہے۔'' (پروسیڈنگز آف دی کالج آف فورٹ ولیم)
کالج کونسل کے اِس جواب کی آخری سطر میں واضح طور پر میر امّن کی حوصلہ افزائی کا پہلو نکلتا ہے۔

O

میرامّن دِلّی والے

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

سُبحان اللہ ! کیا صانع ہے کہ جس نے ایک مُٹھی خاک سے کیا کیا صُورتیں اور مٹّی کی مُورتیں پیدا کیں۔ باوجود دو رنگ کے ایک گورا،[۱] ایک کالا اور یہی ناک، کان، ہاتھ، پاؤں سب کو دیے ہیں۔ تِس پر رنگ برنگ کی شکلیں جُدی جُدی بنائیں کہ ایک کی سج دھج سے دوسرے کا ڈیل ڈول مِلتا نہیں۔ کروڑوں خلقت میں جس کو چاہیے پہچان لیجیے۔ آسمان اُس کے دریائے وحدت کا ایک بُلبلا ہے اور زمین پانی کا بتاشا۔ لیکن یہ تماشا ہے کہ سمندر ہزاروں لہریں مارتا ہے پر اُس کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ جس کی یہ قُدرت اور سکت ہو، اُس کی حمد و ثنا میں زبان انسان کی گویا گونگی ہے۔ کہے تو کیا کہے! بہتر یُوں ہے کہ جس بات میں دَم نہ مار سکے، چُپکا ہو رہے۔

عرش سے لے فرش تک جس کا کہ یہ سامان ہے
حمد گر اُس کا لکھا چاہوں تو کیا اِمکان ہے [۲]

جب پیَمبر نے کہا ہو، میں نے پہچانا نہیں
پھر جو کوی دعویٰ کرے اِس کا، بڑا نادان ہے
رات دن یہ مہر و مہ پھرتے ہیں صنعت دیکھتے
پر ہریک واحد کی صُورت دیدہء حیران ہے [۳]

جس کا ثانی اور مُقابل ہے نہ ہوے گا کبھو
ایسے یکتا کو خُدائی سب طرح شایان ہے

لیکن اِتنا جانتا ہوں خالق و رازق ہے وہ (۴)

ہر طرح سے مُجھ پر اُس کا لُطف اور احسان ہے

اور درود اُس کے دوست پر، جس کی خاطر زمین اور آسمان کو پیدا کیا اور درجہ رِسالت کا دیا۔

جسمِ پاکِ مُصطفیٰ ، اللہ کا اِک نُور ہے

اِس لیئے پرچھائیں اُس قد کی نہ تھی مشہور ہے

حوصلہ میرا کہاں اِتنا جو نعت اُس کی کہوں

پر سخن گویوں کا یہ بھی قاعدہ دستور ہے

اور اُس کی آل پر صلوٰۃ وسلام، جو ہیں بارہ اِمام:

حمدِ حق اور نعتِ احمد کو یہاں کر اِنصرام

اب میں آغاز اُس کو کرتا ہوں جو ہے منظور کام

یا الٰہی! واسطے اپنے نبی کی آل کے

کر یہ میری گفتگو مقبولِ طبعِ خاص و عام (۵)

مُنشا اِس تالیف کا یہ ہے کہ سنہ ایک ہزار دو سو پندرہ برس ہجری اور اٹھارہ سے ایک سال عیسوی، مطابق ایک ہزار دو سو سات سنہ فصلی کے۔ عہد میں اشرف الاشراف مارکویس ولزلی گورنر جنرل لارڈ مارنگٹن صاحب کے، جن کی تعریف میں عقل حیران اور فہم سرگرداں ہے۔ جتنے وَصف سرداروں کو چاہئیں، اُن کی ذات میں خُدا نے جمع کیئے ہیں۔ غرض قسمت کی خُوبی اِس ملک کی تھی جو ایسا حاکم تشریف لایا، جس کے قدم کے فیض سے ایک عالَم نے آرام پایا۔ مجال نہیں کہ کوئی کِسو پر زبردستی کر سکے۔ شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں۔ سارے غریب و غُربا دعا دیتے ہیں اور جیتے ہیں؛ چرچا عِلم کا پھیلا۔ صاحبانِ ذی شان کو شوق ہُوا کہ اُردو کی زبان سے واقف ہو کر ہندوستانیوں سے گُفت وشنُود کریں اور مُلکی کام کو بہ آگاہی تمام انجام دیں۔ اِس واسطے کتنی کتابیں اِسی سال، بمُوجب فرمائش کے تالیف ہوئیں۔

جو صاحِب، دانا اور ہندوستان کی زبان بولنے والے ہیں؛ اُن کی خِدمت میں گزارش کرتا ہوں کہ یہ قصّہ چار درویش کا، اِبتدا میں اُمیر خُسرو دہلوی نے اِس تقریب سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیا زری زربخش، جو اُن کے پیر تھے اور درگاہ اُن کی (۶) دِلّی میں قلعے سے تین کوس، لال دروازے کے باہر، مٹیا دروازے سے آگے،

لال بنگلے کے پاس ہے، اُن کی طبیعت ماندی ہوئی۔ تب مُرشد کا دِل بہلانے کے واسطے امیر خسرو یہ قصہ ہمیشہ کہتے اور بیمارداری میں حاضر رہتے۔ اللہ نے چند روز میں شِفا دی۔ تب انھوں نے غُسلِ صحت کے دن یہ دُعا دی کہ جو کوئی اِس قصّے کو سُنے گا، خُدا کے فضل سے تن درست رہے گا۔ جب سے یہ قصہ فارسی میں مُروّج ہُوا۔

اب خداوندِ نعمت، صاحبِ مُروّت، نجیبوں کے قدردان جان گلکرسٹ صاحب نے کہ ہمیشہ اقبال اُن کا زیادہ رہے، جب تلک گنگا جمنا بہے؛(۷) لطف سے فرمایا کہ اِس قصّے کو ٹھیٹھ(۸) ہندوستانی گفتگو میں، جو اُردو کے لوگ ہندو، مسلمان، عورت، مرد، لڑکے بالے خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں، ترجمہ کرو۔ مُوافق حُکمِ حضور کے، مَیں نے بھی اُسی محاورے سے لکھنا شروع کیا، جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔

پہلے اپنا احوال، یہ عاصی گُنہگار، میر امّن دِلّی والا بیان کرتا ہے کہ میرے بزرگ، ہمایوں بادشاہ کے عہد سے ہر ایک بادشاہ کی رکاب میں پُشت بہ پُشت جانفشانی بجالاتے رہے اور وے بھی، پرورش کی نظر سے قدردانی جتنی چاہیئے فرماتے رہے۔ جاگیر و مَنصب اور خِدمات کی عنایت(۹) سے سرفراز کرکر مالا مال اور نہال کر دیا اور ''خانہ زاد موروثی'' اور ''منصب دار قدیمی''، زبانِ مُبارک سے فرمایا؛ چنانچہ یہ لقب، پادشاہی دفتر میں داخل ہُوا۔ جب ایسے گھر کی، کہ سارے گھر اُس گھر کے سبب آباد تھے؛ یہ نوبت پہنچی ظاہر ہے،(۱۰) عیاں راچہ بیاں؛ تب سُورج مل جاٹ نے، جاگیر کو ضبط کرلیا اور احمد شاہ دُرّانی نے گھر بار تاراج کیا۔ ایسی ایسی تباہی کھا کر ویسے شہر سے کہ وطن اور جنم بھُوم میرا ہے اور آنول نال وہیں گڑا ہے؛ جلاوطن ہُوا۔ اور ایسا جہاز کہ جس کا ناخُدا بادشاہ تھا؛ غارت ہُوا۔(۱۱) میں بے کسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ ڈُوبتے کو تنکے کا آسرا بہت ہے۔ کِتنے برس بَلدۂ عظیم میں دم لیا۔ کچھ بَنی، کچھ بگڑی۔ آخر وہاں سے بھی پانوں اُکھڑے، روزگار نے موافقت نہ کی۔ عیال و اَطفال کو چھوڑ کر تنِ تنہا کشتی پر سوار ہو، اَشرف البلاد کلکتے میں آب ودانے کے زور سے آ پہنچا۔ چندے بے کاری گذری۔ اِتفاقاً نواب دِلاور جنگ نے بُلوا کر اپنے چھوٹے بھائی، میر محمد کاظم خاں کی اتالیقی کے واسطے مُقرر کیا۔ قریب دو سال کے وہاں رہنا ہُوا، لیکن نِباہ اپنا نہ دیکھا۔ تب مُنشی میر بہادر علی جی کے وسیلے سے حضور تک جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہٗ کے رسائی ہوئی۔ بارے طالع کی مدد سے ایسے جواں مَرد کا دامن ہاتھ لگا ہے، چاہیئے کہ دن کچھ بھلے آویں۔ نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا(۱۲) کھا کر، پانوں پھیلا کر سو رہتا ہوں؛ اور گھر میں دس آدمی، چھوٹے بڑے، پرورش پا کر دُعا اُس قدردان کو کرتے ہیں؛ خُدا قبول کرے۔

حقیقت اُردو کی زبان کی، بزرگوں کے مُنھ سے یُوں سُنی ہے کہ دِلّی شہر، ہندوؤں(۱۳) کے نزدیک

چَوجُگی ہے۔ اُنھیں کے راجا پرَجا، قدیم سے رہتے تھے (۱۴) اور اپنی بھاکھا بولتے تھے۔ ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہُوا۔ سُلطان محمود غزنوی آیا، پھر غوری اور لودی پادشاہ ہوئے۔ اِس آمدورَفت کے باعِث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی۔ آخر اَمیر تیمور نے، جن کے گھرانے میں اب تلک نام نہاد سلطنت کا چلا جاتا ہے، (۱۵) ہندوستان کو لیا۔ اُن کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہُوا۔ اِس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا۔ پھر ہمایوں بادشاہ، پٹھانوں کے ہاتھ سے حیران ہو کر ولایت گئے۔ آخر وہاں سے آن کر پس ماندوں پٹھانوں کو گوشمالی دی۔ کوئی مُفسد باقی نہ رہا کہ فتنہ فساد برپا کرے۔ جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے، تَب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم، قدردانی اور فیض رسانی اِس خاندانِ لاثانی کی سُن کر حضور میں آکر جمع ہوئے، لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جُدی جُدی تھی۔ اِکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال جواب کرتے؛ ایک زبان اُردو کی مُقرر ہُوئی۔

جب حضرت شاہجہاں صاحب قِران نے قلعۂ مُبارک اور جامع مسجد اور شہر پناہ تعمیر کروایا اور تختِ طاؤس میں جواہر جڑوایا اور دَل بادل سا خیمہ چوبوں پر اِستادکر، (۱۶) طنابوں سے کھنچوایا اور نواب علی مرداں خاں، نہر کو لے کر آیا؛ تب پادشاہ نے خوش ہو کر جشن فرمایا اور شہر کو اپنا دارالخلافت بنایا۔ تب سے ''شاہجہاں آباد'' مشہور ہُوا۔ اگر چہ دِلّی جُدی ہے۔ وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے؛ اور وہاں کے بازار کو ''اُردوئے مُعلا'' خِطاب دیا۔

اَمیر تیمور کے عہد سے محمد شاہ کی پادشاہت، بلکہ احمد شاہ اور عالمگیر ثانی کے وقت تک (۱۷) پیڑھی بہ پیڑھی۔ سلطنت یکساں چلی آئی۔ نِدان زبان اردو کی مَنجتے مَنجتے ایسی مَنجی کہ کِسو شہر کی بولی اُس سے ٹکر نہیں کھاتی۔ لیکن قدردان مُنصف چاہیئے جو تجویز کرے۔ سو اَب خُدا نے بعد مُدّت کے جان گلکرسٹ صاحب سادانا، نکتہ رس پیدا کیا کہ جنھوں نے اپنے گیان اور اُکت سے، اور تلاش و محنت سے قاعدوں کی کتابیں تصنیف کیں۔ اِس سبب سے ہِندوستان کی زبان کا مُلکوں میں رِواج ہُوا اور نئے سِر سے رونق زیادہ ہوئی۔ نہیں تو اپنی دستار و گفتار و رفتار کو کوئی بُرا نہیں جانتا۔ اگر ایک گنوار سے پُوچھیئے تو شہر والے کو نام رکھتا ہے، اور اپنے تئیں سب سے بہتر سمجھتا ہے۔ خیر، عاقلاں خود میدانند۔

جب احمد شاہ ابدالی، کابُل سے آیا اور شہر کو لُٹوایا؛ شاہ عالم پُورب کی طرف تھے۔ کوئی وارِث اور مالِک مُلک کا نہ رہا۔ شہر بے سِر ہو گیا ہے، پادشاہ کے اِقبال سے شہر کی رونق تھی۔ ایکبارگی تباہی پڑی۔ رئیس وہاں کے، میں کہیں تم کہیں ہو کر جہاں جس کے سینگ سمائے، وہاں نکل گئے۔ جس مُلک میں پہنچے وہاں کے آدمیوں کی ساتھ سنگت سے بات چیت میں فرق آیا۔ اور بہت ایسے ہیں کہ دس پانچ برس کِسو سبب سے دِلّی میں گئے اور رہے، وہ

بھی کہاں تلک بول سکیں گے۔ کہیں نہ کہیں چُوک ہی جائیں گے۔ اور جو شخص سب آفتیں سَہہ کر دِلّی کا رَوڑا ہو کر رہا۔ اور دس پانچ پُشتیں اُسی شہر میں گذریں۔ اور اُس نے دربار اُمراؤں کے اور میلے ٹھیلے، عُرس، چھڑیاں، سیر تماشا اور کُوچہ گردی اُس شہر کی مُدّت تلک کی ہوگی اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہوگا، اُس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے۔ یہ عاجز بھی ہر ایک شہر کی سیر کرتا اور تماشا دیکھتا، یہاں تلک پُہنچا ہے۔

O

شُروع قصّے کا

اب آغاز قصّے کا کرتا ہوں۔ ذرا کان دھر کر سُنو اور مُنصِفی کرو۔ سَیر میں چار درویش کی یُوں لکھا ہے اور کہنے والے نے کہا ہے کہ آگے رُوم کے ملک میں کوئی شہنشاہ تھا، کہ نوشیرواں کی سی عدالت اور حاتم کی سی سخاوت اُس کی ذات میں تھی۔ نام اُس کا آزاد بخت اور شہر قُسطنطنیہ، جس کو اِستنبول کہتے ہیں (۱۸)، اُس کا پایۂ تخت (۱۹) تھا۔ اُس کے وقت میں رَعیت آباد، خزانہ معمور، لشکر مُرفّہ، غریب غُربا آسُودہ۔ ایسے چَین سے گُذران کرتے اور خوشی سے رہتے کہ ہر ایک کے گھر میں دِن عید، اور رات شب برات تھی۔ اور جتنے چور چکار، جیب کترے، صُبح خیزے، اُٹھائی گیرے دغاباز تھے، سب کو نیست و نابُود کر کر نام و نشان اُن کا اپنے ملک بھر میں نہ رکھا تھا۔ ساری رات دروازے گھروں کے بند نہ ہوتے اور دوکانیں بازار کی کھلی رہتیں۔ راہی، مُسافر، جنگل میدان میں سونا اُچھالتے چلے جاتے۔ کوئی نہ پُوچھتا کہ تمھارے مُنہ میں کَے دانت ہیں اور کہاں جاتے ہو۔

اُس پادشاہ کے عمل میں ہزاروں شہر تھے، اور کئی سُلطان نعل بندی دیتے۔ ایسی بڑی سلطنت پر ایک ساعت اپنے دل کو خدا کی یاد اور بندگی سے غافل نہ کرتا۔ آرام دنیا کا جو چاہیئے سب موجود تھا، لیکن فرزند کہ زِندگانی کا پھَل ہے، اُس کی قِسمت کے باغ میں نہ تھا (۲۰)۔ اِس خاطر اکثر فِکر مند رہتا اور پانچوں وقت کی نماز کے بعد اپنے کریم سے کہتا کہ اے اللہ! مجھ عاجز کو تُو نے اپنی عنایت سے سب کچھ دیا، لیکن ایک اِس اندھیرے گھر کا دِیا نہ دِیا۔ یہی اَرمان جی میں باقی ہے کہ میرا نام لیوا اور پانی دِیوا کوئی نہیں اور تیرے خزانۂ غیب میں سب کچھ موجود ہے۔ ایک بیٹا، جیتا جاگتا مجھے دے تو میرا نام اور اِس سلطنت کا نشان قایم رہے۔ (۲۱) اِسی اُمید میں پادشاہ (۲۲) کی عمر چالیس برس کی ہوگئی۔ ایک دن شِیش محل میں نماز ادا کر کر وظیفہ پڑھ رہے تھے، ایکبارگی آئینے کی طرف خیال جو کرتے ہیں تو ایک سفید بال مُوچھوں میں نظر آیا، کہ مانند تارِ مُقیش کے چمک رہا ہے۔ بادشاہ دیکھ کر آبدیدہ ہوئے اور ٹھنڈھی (۲۳) سانس بھری۔ پھر دل میں اپنے سوچ کیا کہ افسوس! تُو نے اِتنی عمر ناحق برباد دی اور اِس دُنیا کی حرص میں ایک عالَم کو زیر و زبر کیا۔ اِتنا ملک جو لیا، اب تیرے کِس کام آوے گا؟ آخر یہ سارا مال

اَسباب، کوئی دُوسرا اُڑاوے گا۔ تُجھے تو پیغام موت کا آ چکا۔ اگر کوئی دن جیئے بھی تو بدن کی طاقت کم ہوگی۔ اِس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میری تقدیر میں نہیں لکھا کہ وارث چھتر اور تخت کا پیدا ہو۔ آخر ایک روز مرنا ہے اور سب کچھ چھوڑ جانا ہے۔ اِس سے یہی بہتر ہے کہ میں ہی اِسے چھوڑ دُوں اور باقی زندگی اپنے خالق کی یاد میں کاٹوں۔

یہ بات اپنے دل میں ٹھہرا کر پائیں باغ میں جا کر، سب مُجرائیوں کو جواب دے کر فرمایا کہ کوئی آج سے میرے پاس نہ آوے۔ سب دیوانِ عام میں آیا جایا کریں اور اپنے کام میں مُستعد رہیں۔ یہ کہہ کر آپ ایک مکان میں جا بیٹھے اور مُصلا بچھا کر عبادت میں مشغول ہُوئے۔ سوائے رونے اور آہ بھرنے کے کچھ کام نہ تھا۔ اِسی طرح بادشاہ آزاد بخت کو کئی دن گذرے۔ شام کو روزہ کھولنے کے وقت، ایک چُھہارا[۲۴] اور تین گُھونٹ پانی پیتے اور تمام دن رات جائے نماز،[۲۵] پر پڑے رہتے[۲۶]۔ اِس بات کا باہر چرچا پھیلا۔ رفتہ رفتہ تمام ملک میں خبر گئی کہ بادشاہ نے بادشاہت سے ہاتھ کھینچ کر گوشہ نشینی اختیار کی۔ چاروں طرف سے غنیموں اور مُفسِدوں نے سر اُٹھایا اور قدم اپنی حد سے بڑھایا۔ جس نے چاہا مُلک دَبا لیا اور سرانجام سرکشی کا کیا۔ جہاں کہیں حاکم تھے، اُن کے حُکم میں خللِ عظیم واقع ہُوا۔ ہر ایک صُوبے سے عرضی بدعملی کی حضور میں پہُنچی۔ درباری، اُمرا جتنے تھے، جمع ہُوئے اور صَلاح مَصلحت کرنے لگے۔ آخر یہ تجویز ٹھہری کہ نواب وزیر، عاقل اور دانا ہے اور بادشاہ کا مُقرب اور مُعتمد ہے۔ اور درجے میں بھی سب سے بڑا ہے، اُس کی خِدمت میں چلیں؛ دیکھیں وہ کیا مُناسب جان کر کہتا ہے[۲۷]۔ سب عُمدہ، امیر، وزیر کے پاس آئے اور کہا[۲۸]: ''بادشاہ کی یہ صُورت اور ملک کی وہ حقیقت۔ اگر چندے اور تغافُل ہو[۲۹] تو اِس محنت کا مُلک لیا ہُوا مُفت میں جاتا رہے گا۔ پھر ہاتھ آنا بہت مُشکل ہے۔'' وزیر، پُرانا، قدیم نمک حلال اور عقل مند، نام بھی خِرد مند؛ اِسم بامُسمّیٰ تھا، بولا: ''اگرچہ پادشاہ[۳۰] نے حضور میں آنے کو منع کیا ہے۔ لیکن تُم چلو، میں بھی چلتا ہُوں۔ خُدا کرے پادشاہ کی مرضی آوے جو رُوبرُو بُلاوے۔'' یہ کہہ کر سب کو اپنے ساتھ دیوانِ عام تلک لا[۳۱]، اُن کو وہاں چھوڑ کر آپ دیوانِ خاص میں آیا اور بادشاہ کی خدمت میں محلی کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ یہ پیر غُلام حاضر ہے۔ کئی دنوں سے جمالِ جہاں آرا نہیں دیکھا۔ اُمیدوار ہوں کہ ایک نظر دیکھ کر قدم بوسی کروں تو خاطر جمع ہو۔[۳۲] یہ عرض وزیر کی بادشاہ نے سُنی۔ از بسکہ قدامت اور خیر خواہی اور تدبیر اور جاں نثاری اُس کی جانتے تھے اور اکثر اُس کی بات مانتے تھے، بعد تامل کے فرمایا: ''خِرد مند کو بُلا لو''۔ بارے جب پروانگی ہوئی، وزیر حضور میں آیا۔ آداب بجا لایا اور دست بستہ کھڑا رہا۔ دیکھا تو پادشاہ[۳۳] کی عجب صُورت بن رہی ہے، کہ زار زار[۳۴] رونے اور دُبلاپے سے آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں اور چہرہ زرد ہو گیا ہے۔[۳۵] خِرد مند

کو تاب نہ رہی۔ بے اختیار دوڑ کر قدموں پر جا گرا۔ پادشاہ نے ہاتھ سے سر اُس کا اٹھایا اور فرمایا: ''لو، مُجھے دیکھا۔ خاطر جمع ہوئی؟ اب جاؤ۔ زیادہ مجھے نہ ستاؤ۔ تُم سلطنت کرو۔'' (۳۶) خِردمنْد سُن کر ڈاڑھ (۳۷) مار کر رو دیا (۳۸) اور عرض کی: ''غُلام کو آپ کے تصدق اور سلامتی سے ہمیشہ بادشاہت میّسر ہے۔ لیکن، جہاں پناہ کی یک بہ یک اِس طرح کی گوشہ گیری سے تمام ملک میں تہلکہ پڑ گیا ہے اور انجام اِس کا اچّھا نہیں۔ یہ کیا خیال مزاجِ مبارک میں آیا؟ اگر اِس خانہ زادِ مَوروثی کو بھی محرمِ اِس راز کا کیجیے (۳۹) تو بہتر ہے۔ جو کچھ عقلِ ناقص میں آوے، اِلتماس کرے۔ غُلاموں کو جو یے (۴۰) سرفرازیاں بخشی ہیں، اِسی دن کے واسطے کہ بادشاہ (۴۱) عیش و آرام کریں اور نمک پرْوَرد ے، تدبیر میں ملک کی رہیں۔ خُدانخواستہ، جب فِکر، مزاجِ عالی کے لاحق ہوئی۔ تو بندہ ہائے بادشاہی (۴۲) کِس دن کام آویں گے؟'' (۴۳) پادشاہ نے کہا: ''سچ کہتا ہے پر جو فِکر میرے جی کے اندر ہے، سو تدبیر سے باہر ہے۔ (۴۴)

سُن اے خِردمنْد، میری ساری عمر اسی مُلک گیری کے دردِ سر میں کٹی۔ اب یہ سِن و سال ہُوا، آگے مَوت باقی ہے۔ سو اُس کا بھی پیغام آیا، کہ سیاہ بال سفید ہو چلے۔ وہ مثَل ہے: ساری رات سوئے، اب صبح کو بھی نہ جاگیں؟ اب تلک ایک بیٹا پیدا نہ ہُوا، جو میری خاطر جمع ہوتی۔ اِس لیے دل سخت اُداس ہُوا اور میں سب کچھ چھوڑ بیٹھا۔ جِس کا جی چاہے مُلک لے یا مال (۴۵)، مجھے کچھ کام نہیں۔ بلکہ کوئی دن میں یہ ارادہ رکھتا ہُوں کہ سب چھوڑ چھاڑ کر جنگل اور پہاڑوں میں نکل جاؤں اور مُنہ اپنا کِسو کو نہ دکھاؤں۔ اِسی طرح یہ چند روز کی زندگی بسر کروں۔ اگر کوئی مکان خوش آیا تو وہاں بیٹھ کر بندگی اپنے معبود کی بجالاؤں گا، شاید عاقبت بخیر ہو۔ اور دنیا کو تو خُوب دیکھا، کچھ مزہ نہ پایا۔'' اِتنی بات بول کر اور ایک آہ بھر کر بادشاہ چُپ ہُوئے۔ (۴۶) خِردمنْد اُن کے باپ کا وزیر تھا۔ جب یے شہزادے تھے، تب سے محبت رکھتا تھا۔ علاوہ، دانا اور نیک اندیش تھا۔ کہنے لگا: ''خُدا کی جناب سے نااُمید ہونا ہرگز مناسب نہیں۔ جس نے ہیژدہ ہزار عالَم کو ایک حُکم میں پیدا کیا۔ تمھیں اولاد دینی اُس کے نزدیک کیا بڑی بات ہے؟ قِبلۂ عالم اِس تصورِ باطِل کو دل سے دُور کرو، نہیں تو تمام عالَم درہم برَہم ہو جاوے گا۔ اور یہ سلطنت کِس کِس محنت اور مُشقت سے تمھارے بزرگوں نے اور تم نے پیدا کی ہے؟ ایک ذرے (۴۷) میں ہاتھ سے نکل جائے گی اور بے خبری سے ملک ویران ہو جائے گا (۴۸)، خدانہ خواستہ بدنامی حاصل ہوگی۔ اِس پر بھی بازپُرس روزِ قیامت کے ہُوا چاہے کہ تُجھے بادشاہ بنا کر، اپنے بندوں کو تیرے حوالے کیا تھا؛ تُو ہماری رحمت سے مایوس ہُوا اور رَعیت کو حیران، پریشان کیا۔ اِس سوال کا کیا جواب دو گے؟ پس عبادت بھی اُس روز کام نہ آوے گی۔ اِس واسطے کہ آدمی کا دل خُدا کا گھر ہے اور بادشاہ فقط عدل کے واسطے پُوچھے جائیں گے۔ غُلام کی بے اَدبی مُعاف ہو۔ گھر

سے نکل جانا اور جنگل جنگل پھرنا، کام جوگیوں اور فقیروں کا ہے، نہ کہ بادشاہوں کا۔ تم اپنے جوگا کام کرو۔ خُدا کی یاد اور بندگی؛ جنگل، پہاڑ پر موقوف نہیں۔ آپ نے یہ بیت سُنی ہوگی :

خُدا اِس پاس ، یہ ڈُھونڈھے جنگل میں
ڈھنڈھورا شہر میں ، لڑکا بغل میں

اگر مُنصفی فرمایئے اور اِس فِدوی کی عرض قبول کیجیے تو بہتر یُوں ہے کہ جہاں پناہ، ہر دم اور ہر ساعت، دھیان اپنا خدا کی طرف لگا کر دُعا مانگا کریں۔ اُس کی درگاہ سے کوئی محرُوم نہیں رہا۔ دن کو بندوبَست مُلک کا اور اِنصاف عدالت، غریب غُرباء کی فرمادیں تو بندے خدا کے، دامنِ دولت کے سائے میں اَمن وامان، خوش گذران رہیں۔ اور رات کو عبادت کیجیے اور درُود پیمبر کی روح پاک کو نیاز کر کر، درویش، گوشہ نشین مُتوکلوں سے مدد لیجیے۔ اور روز راتب، یتیم، اَسیر، عیال داروں، مُحتاجوں اور رانڈ بیواؤں کو کر دیجیے۔ ایسے اچھے کاموں اور نیک نیتّوں کی برکت سے، خُدا چاہے تو اُمیدِ قوی ہے کہ تمھارے دل کے مقصد اور مطلب سب پُورے ہوں اور جس واسطے مزاج عالی مُکدر رہور ہا ہے وہ آرزو بَرآوے اور خوشی، خاطر شریف کو ہو جاوے۔ پَروردگار کی عنایت پر نظر رکھیے کہ وہ ایک دم میں، جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔" بارے، خِردمند وزیر کی ایسی ایسی عرض معروض کرنے سے آزاد بخت کے دل کو ڈھارس بندھی۔ فرمایا: "اچّھا، تُو جو کہتا ہے، بھلا۔ یہ بھی کر دیکھیں۔ آگے، جو اللہ کی مرضی ہے، سو ہوگا۔" (۴۹) جب پادشاہ (۵۰) کے دل کو تسلی ہُوئی، تب وزیر سے پُوچھا کہ اور سب امیر و دبیر کیا کرتے ہیں اور کِس طرح ہیں؟ اُس نے عرض کی کہ سب ارکانِ دولت، قبلہء عالم کے (۵۱) جان و مال کو دعا کرتے ہیں۔ آپ کی فکر سے سب حیران و پریشان ہو رہے ہیں۔ جمالِ مبارک اپنا دکھایئے تو سب کی خاطر جمع ہووے۔ چنانچہ اِس وقت دیوانِ عام میں حاضر ہیں۔ یہ سُن کے پادشاہ نے حُکم کیا: "انشاء اللہ تعالیٰ، کل دربار کروں گا۔ سب کو کہہ دو حاضر رہیں۔" خِردمند یہ وعدہ سُن کر خوش ہُوا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر دُعا دی کہ جب تلک یہ زمین و آسمان برپا ہیں، تمھارا تاج و تخت قایم رہے۔ اور حضور سے رُخصت ہو کر، خوشی خوشی باہر نکلا اور یہ خوش خبری اُمراؤں سے کہی۔ سب امیر ہنسی خوشی گھر کو گئے۔ سارے شہر میں اَنند ہو گئی۔ رعیّت پَرجا مگن ہوئے (۵۲) کہ کل پادشاہ، بارعام (۵۳) کرے گا۔ صبح کو سب خانہ زاد اعلیٰ اَدنیٰ (۵۴) اور ارکانِ دولت چھوٹے بڑے، اپنے اپنے پائے اور مرتبے پر آ کر کھڑے ہوئے۔ اور مُنتظر جلوہء پادشاہی (۵۵) کے تھے۔

جب پہر دِن چڑھا، ایکبارگی پردہ اُٹھا اور پادشاہ نے برآمد ہو کر تختِ مُبارک پر جلُوس فرمایا، نَوبت خانے میں شادیانے بجنے لگے۔ سبھوں نے نذریں مبارکبادی کی گذرانیں اور مُجرے گاہ میں تسلیمات و کورنشات

بجالائے۔ مُوافق قدر و منزلت کے، ہر ایک کو سرفرازی ہوئی۔ سب کے دل کو خوشی اور چین ہُوا۔ جب دو پہر ہوئی، برخاست ہو کر، اندرونِ محل داخل ہُوئے۔ خاصہ، نوشِ جان فرما کر، خواب گاہ میں آرام کیا۔ (۵۶) اُس دن سے پادشاہ نے یہی مُقرر کیا کہ ہمیشہ صُبح کو دربار کرنا اور تیسرے پہر کتاب کا شُغل یا وِردوظیفہ پڑھنا اور خُدا کی درگاہ میں توبہ استغفار کر کر اپنے مطلب کی دُعا مانگنی۔ ایک روز کتاب میں بھی لکھا دیکھا کہ اگر کسی (۵۷) شخص کو غم یا فکر ایسی لاحق ہو کہ اُس کا علاج تدبیر سے نہ ہو سکے، تو چاہیئے کہ تقدیر کے حوالے کرے اور آپ گورستان کی طرف رجوع کر کے (۵۸) دَرُود طفیل پیغمبر کی رُوح کے، اُن کو بخشے اور اپنے تئیں نیست و نابُود سمجھ کر دل کو اِس غفلتِ دُنیاوی (۵۹) سے ہُشیار رکھے اور عبرت سے رَووے؛ اور خدا کی قدرت کو دیکھے کہ مجھ سے آگے کیسے کیسے صاحبِ مُلک و خزانہ اِس زمین پر پیدا ہوئے لیکن آسمان نے سب کو اپنے (۶۰) گردش میں لا کر خاک میں مِلا دیا۔ یہ کہاوت ہے :

چلتی چکّی دیکھ کر ، دِیا کبیرا رَو
دو پاٹن کے بیچ آ ، ثابت گیا نہ کو

اب جو دیکھیئے سِوائے ایک مٹّی کے ڈھیر کے، اُن کا کچھ نشان باقی نہیں رہا اور سب دولتِ دنیا، گھر بار، آل اولاد، آشنا دوست، نوکر چاکر، ہاتھی گھوڑے چھوڑ کر اکیلے پڑے ہیں۔ یہ سب اِن کے کچھ کام نہ آیا بلکہ اب کوئی نام بھی نہیں جانتا کہ یے کون تھے اور قبر کے اندر کا احوال معلوم نہیں کہ کیڑے مکوڑے، چیونٹے سانپ اُن کو کھا گئے، یا اُن پر کیا بیتی اور خدا سے کیسی بنی۔ یے باتیں اپنے دل میں سوچ کر ساری دنیا کو بیکھنے کا کھیل جانے، تب اُس کے دل کا غُنچہ ہمیشہ شگُفتہ رہے گا؛ کِسو (۶۱) حالت میں پژمُردہ نہ ہوگا (۶۲)۔ یہ نصیحت جب کتاب میں مُطالعہ (۶۳) کی، بادشاہ کو خرد مند روزیر کا کہنا یاد آیا اور دونوں کو مُطابق پایا۔ یہ شوق ہُوا کہ اِس پر عمل کروں؛ لیکن سوار ہو کر اور بھیڑ بھاڑ لے کر پادشاہوں کی طرح سے جانا اور پھرنا مناسب نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ لباس بدل کر رات کو اکیلے مقبروں میں یا کسی مَردِ خُدا، گوشہ نشین کی خدمت میں جایا کروں اور شب بیدار رہُوں۔ شاید اُن مردوں کے وسیلے سے دُنیا کی مُراد اور عاقبت کی نجات مُیسّر ہو۔ (۶۴) یہ بات دل میں مقرر کر کر ایک روز رات کو موٹے جُھوٹے کپڑے پہن کر کچھ روپے اشرفی لے کر، چپکے؛ قلعے سے باہر نکلے اور میدان کی راہ لی۔ جاتے جاتے ایک گورستان میں پہنچے۔ نہایت صدقِ دل سے درُود پڑھ رہے تھے۔ اور اُس وقت بادِ تُند چل رہی تھی، بلکہ آندھی کہا چاہیئے۔ ایک بارگی پادشاہ کو دُور سے ایک شُعلہ سا نظر آیا کہ مانندِ صُبح کے تارے کے روشن ہے۔ دِل میں اپنے خیال کیا کہ اِس آندھی اور اندھیرے میں یہ روشنی خالی حِکمت سے نہیں۔ یا یہ طلسم ہے کہ اگر پھٹکری اور گندھک کو چراغ میں بتّی کے آس

پاس پھونک دیجیے تو کیسے (۶۵) ہی ہَوا چلے، چراغ گُل نہ ہوگا۔ یا کِسو ولی کا چراغ ہے کہ جلتا ہے۔ جو کچھ ہو سو ہو، چل کر دیکھا چاہیئے۔ شاید اِس شمع کے نُور سے میرے بھی گھر کا چراغ روشن ہو اور دل کی مُراد ملے (۶۶)۔ یہ نیّت کر کے اُس طرف کو چلے۔ جب نزدیک پہنچے، دیکھا تو چار فقیر بے نوا، کفنیاں گلے میں ڈالے اور سر زانو پر دھرے، عالمِ بے ہوشی میں خاموش بیٹھے ہیں۔ اور اُن کا یہ عالم ہے جیسے کوئی مُسافر اپنے ملک اور قوم سے بچھڑ کر، بے کسی اور مُفلسی کے رنج و غم میں گرفتار ہو کر حیران رہ جاتا ہے، اِسی طرح سے یے چاروں نقشِ دیوار ہو رہے ہیں اور ایک چراغ، پتھر پر دَھرا ٹمٹما رہا ہے۔ ہرگز ہَوا اُس کو نہیں لگتی، گویا فانوس اُس کی (۶۷) آسمان بنا ہے کہ بے خطر جلتا ہے۔

آزاد بخت کو دیکھتے ہی یقین آیا کہ مُقرر تیری آرزو اِن مردانِ خُدا کے قدم کی برکت سے بر آوے گی اور تیری اُمید کا سُوکھا درخت اِن کی توجہ سے ہرا ہو کر پھلے گا۔ اِن کی خدمت میں چل کر اپنا احوال کہہ اور مجلس کا شریک ہو۔ شاید تجھ پر رحم کھا کر دعا کریں، جو بے نیاز کے یہاں قبول ہو۔ یہ اِرادہ کر کر چاہا کہ قدم آگے دھرے، وُونہیں (۶۸) عقل نے سمجھایا کہ اے بے وقوف جلدی نہ کر، ذرا دیکھ لے (۶۹)۔ تجھے کیا معلوم ہے کہ یہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں، اور کِدھر جاتے ہیں؟ کیا جانیں یے دَیو ہیں یا غولِ بیابانی ہیں کہ آدمی کی صُورت بن کر باہم مِل بیٹھے ہیں؟ بہر صُورت، جلدی کرنا اور اِن کے درمیان جا کر مُخل ہونا خُوب نہیں۔ ابھی ایک گوشے میں چُھپ کر حقیقت اِن درویشوں کی جانا (۷۰) چاہیئے۔ آخر پادشاہ (۷۱) نے یہی کیا کہ ایک کونے میں، اُس مکان کی چُپکا جا بیٹھا کہ کِسو کو اُس کے آنے کی خبر نہ ہُوئی۔ (۷۲) اپنا دھیان اُن کی طرف لگایا کہ دیکھیے آپس میں کیا بات چیت کرتے ہیں (۷۳)۔ اتفاقاً ایک فقیر کو چھینک آئی۔ شُکر خدا کا کیا۔ وو (۷۴) تینوں قلندر اُس کی آواز سے چونک پڑے۔ چراغ کو اُکسایا۔ بھیپ تو روشن تھا۔ اپنے اپنے بستروں پر حُقّے بھر کر پینے لگے۔ ایک، اُن آزادوں میں سے بولا: ''اے یارانِ ہمدرد و رفیقانِ جہاں گرد! ہم چاروں (۷۵) صُورتیں آسمان کی گردش سے اور لیل و نہار کے انقلاب سے در بدر، خاک بسر ایک مُدّت پھریں۔ الحمد للہ (۷۶)، طالع کی مدد اور قسمت کی یاوری سے آج اِس مقام پر باہم ملاقات ہُوئی اور کل کا احوال کچھ معلوم نہیں کہ کیا پیش آوے۔ ایک سمت رہیں یا جدا جدا ہو جاویں۔ رات بڑی پہاڑ ہوتی ہے، ابھی سے پَڑ رہنا خُوب نہیں (۷۷)۔ اِس سے یہ بہتر ہے کہ اپنی اپنی سرگذشت، جو اِس دنیا میں جس پر بیتی ہو، بشرطیکہ جُھوٹھ اِس میں کوڑی بھر نہ ہو، بیان کرے۔ تو باتوں میں رات کٹ جائے (۷۸) جب تھوڑی شب باقی رہے، تب (۷۹) لوٹ پوٹ رہیں گے۔'' سبھوں نے کہا: ''یا ہادی، جو کچھ اِرشاد ہوتا ہے، ہم نے قبول کیا۔ پہلے آپ ہی اپنا احوال، (۸۰) جو دیکھا ہے، شروع کیجیے تو ہم مُستفید ہوں۔'' (۸۱)

سَیر پہلے دَرویش کی

پہلا درویش دوزانو ہو بیٹھا اور اپنی سَیر کا قصّہ اِس طرح سے کہنے لگا: ''یا معبُودالله! ذرا اِدھر مُتوجہ ہو اور ماجرا اِس بے سَر و پا کا سُنو:

یہ سرگذشت میری ذرا کان دَھر سُنو
مُجھ کو فلک نے کر دیا زیروزَبر سُنو
جو کچھ کہ پیش آئی ہے شدّت بھرے (۸۲) تئیں
اُس کا بیان کرتا ہُوں تم سَر بَسر سُنو

اے یاران! میری پیدائش اور وطن بزرگوں کا مُلکِ یَمن ہے۔ والد اِس عاجز کا ملک التجار، خواجہ احمد نام، بڑا سَوداگر تھا۔ اُس وقت میں کوئی مہاجَن یا بیپاری اُن کے برابر نہ تھا۔ اکثر شہروں میں کوٹھیاں اور گماشتے خرید فروخت (۸۳) کے واسطے مُقرر تھے اور لاکھوں روپے نقد اور جنس مُلک مُلک کی، گھر میں موجود تھی۔ اُن کے یہاں دولڑکے پیدا ہوئے۔ ایک تو یہی فقیر، جو کفنی سیلی پہنے ہُوئے مُرشدوں کی حضوری میں حاضر اور بولتا ہے۔ دوسری ایک بہن جس کو قبلہ گاہ نے اپنے جیتے جی اور شہر کے (۳۹) سوداگر بچّے سے شادی کر دی تھی، وہ اپنی سسرال میں رہتی تھی (۸۴)۔ غرض جس کے گھر میں اِتنی دولت اور ایک لڑکا ہو، اُس کے لاڈ پیار کا کیا ٹھکانہ ہے! مُجھ فقیر نے بڑے چاؤ چوز سے ماباپ کے سائے میں پرورش پائی۔ اور پڑھنا لکھنا، سپاہ گری کا کسب و فن، سوداگری کا بہی کھاتہ، روزنامہ سیکھنے لگا۔ چودہ برس تک نہایت خوشی اور بے فکری میں گذری۔ کچھ دنیا کا اندیشہ دل میں نہ آیا۔ یک بہ یک ایک ہی سال میں والدین قضائے الٰہی سے مر گیے۔ (۸۵) عجب طرح کا غم ہُوا، جس کا بیان نہیں کر سکتا۔ ایک بارگی یتیم ہو گیا۔ کوئی سر پر بُوڑھا بڑا نہ رہا۔ اِس مصیبتِ ناگہانی سے رات دن رویا کرتا۔ کھانا پینا سب چھوٹ گیا۔ (۸۶) چالیس دن جُوں تُوں کر کٹے۔ چہلم میں اپنے بیگانے، چھوٹے بڑے جمع ہُوئے۔ جب فاتحہ سے فراغت ہوئی، سب نے فقیر کو باپ کی پگڑی بندھوائی اور سمجھایا: ''دُنیا میں سب کے ماباپ مرتے آئے ہیں اور اپنے تئیں بھی ایک روز مرنا ہے۔ پس صبر کرو، اپنے گھر کو دیکھو۔ اب باپ کی جگہ تُم سردار ہُوئے۔ اپنے کاروبار، لین دین سے ہُشیار

رہو۔'' تسلی دے کر وداع ہوئے۔ گماشتے، کاروباری، نوکر چاکر جتنے تھے؛ آن کر حاضر ہوئے۔ نذریں دیں اور بولے: ''کوٹھے (۸۷) نقد و جنس کے، اپنی نظرِ مُبارک سے دیکھ لیجیے''۔ ایکبارگی جو اُس دولتِ بے انتہا پر نگاہ پڑی، آنکھیں کُھل گئیں۔ دیوان خانے کی تیاری کو حُکم کیا۔ فرّاشوں نے فرش فروش بچھا کر چھت، پردے، چلونیں تکلف کی لگا دیں۔ اور اچھے اچھے خِدمت گار، دیدارُو نوکر رکھے۔ سرکار سے زَرق بَرق کی پوشاکیں بنوا دیں۔ فقیر مسند پر تکیہ لگا کر بیٹھا۔ ویسے ہی؛ آدمی، غُنڈے پھانکوے، مُفت بر، کھانے پینے والے، جُھوٹھے خوشامدی آ کر آشنا ہوئے اور مصاحب بنے۔ اُن سے آٹھ پہر صُحبت رہنے لگی۔ ہر کہیں کی باتیں اور زٹلیں، واہی تباہی اِدھر اُدھر کی کرتے اور کہتے: ''اِس جوانی کے عالَم میں کیتکی کی شراب یا گُلِ گُلاب کھنچوائیے؛ نازنین معشوقوں کو بُلوا کر اُن کے ساتھ پیجیے اور عیش لیجیے۔''

غرض آدمی کا شیطان آدمی ہے۔ ہر دم کے کہنے سُننے سے اپنا بھی مزاج بہک گیا۔ شراب، ناچ اور جُوئے کا چرچا شروع ہُوا۔ پھر تو یہ نوبت پہنچی کہ سوداگری بُھول کر، تماش بینی کا اور دینے لینے کا سَودا ہُوا۔ اپنے نوکر اور رفیقوں نے جب یہ غفلت دیکھی، جو جس کے ہاتھ پڑا الگ کیا۔ گویا لُوٹ مچا دی۔ کچھ خبر نہ تھی، کتنا روپیا خرچ ہوتا ہے۔ کہاں سے آیا (۸۸) اور کیدھر جاتا ہے؟ مالِ مُفت دلِ بے رحم۔ اِس وَرخرچی کے آگے اگر گنجِ قارون کا ہوتا، تو بھی وفا نہ کرتا۔ کئی برس کے عرصے میں ایک بارگی یہ حالت ہوئی کہ فقط ٹوپی اور لنگوٹی باقی رہی۔ دوست آشنا، (۸۹) جو دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے اور چمچا بھر خون اپنا ہر بات میں زبان سے نِثار کرتے تھے، کافور ہو گئے (۹۰)۔ بلکہ راہ باٹ میں اگر کہیں بھینٹ مُلاقات ہو جاتی تو آنکھیں چُرا کر مُنہ پھیر لیتے۔ اور نوکر چاکر، خدمت گار، بہلیے، ڈھلیت، خاص بردار، شاگرد پیشہ، سب چُھوڑ کر کنارے لگے۔ کوئی بات کا پُوچھنے والا نہ رہا، جو کہے: یہ کیا تمھارا حال ہُوا؟ سوائے غم اور افسوس کے کوئی رفیق نہ ٹھہرا۔ اب دمڑی کی ٹھڈیاں مُیَسّر نہیں، جو چَبا کر پانی پیوں۔ دو تین فاقے کڑاکے کھینچے، تاب بُھوکھ کی نہ لا سکا۔ لاچار بے حیائی کا بُرقعہ مُنہ پر ڈال کر یہ قصد کیا کہ بہن کے پاس چلیے۔ لیکن یہ شرم دل میں آتی تھی کہ قبلہ گاہ کی وفات کے بعد نہ بہن سے کچھ سلوک کیا، نہ خالی خط لکھا۔ بلکہ اُس نے دو ایک خط خطوط ماتم پُرسی اور اِشتیاق کے جو لکھے، اُن کا جواب (۹۱) اُس خوابِ خرگوش میں نہ بھیجا۔ اِس شرمندگی سے جی تو نہ چاہتا تھا، پر سوائے اُس گھر کے اور کوئی ٹھکانا نظر میں نہ ٹھہرا۔ جُوں تُوں، پاپیادہ، خالی ہاتھ، گرتا پڑتا ہزار محنت سے وے (۹۲) کئی منزلیں کاٹ کر ہمشیر کے شہر میں جا کر اُس کے مکان پر پہنچا۔ وہ ماجائی، میرا یہ حال دیکھ کر، بَلائیں لے اور گلے مل کر بہت روئی۔ تیل ماش اور کالے ٹکے مُجھ پر سے صدقے کیے۔ کہنے لگی: ''اگرچہ مُلاقات

سے دل بہت خوش ہُوا، لیکن بھیا، تیری یہ کیا صُورت بنی؟'' اُس کا جواب میں کچھ نہ دے سکا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا کر چُپکا ہو رہا۔ بہن نے جلدی، خاصی پوشاک سِلوا کر حمام میں بھیجا۔ نہا دھو کر وو کپڑے پہنے۔ ایک مکان اپنے پاس بہت اچّھا، تکلف کا میرے رہنے کو مُقرر کیا۔ صُبح کو شربت اور لوَزیات، حلوہ سوہن، پستہ مغزی ناشتے کو؛ تیسرے پہر میوے خشک وتر، پَھل پَھلاری؛ اور رات دن دونوں وقت پلاوَ، نان، قلیے، کباب تُحفہ تُحفہ؛ مزے دار منگوا کر اپنے رُوبرُو کھلا کر جاتی، سب طرح خاطر داری کرتی۔ میں نے وِیسی تصدیع کے بعد جو یہ آرام پایا، خدا کی درگاہ میں ہزار شُکر بجالایا(۹۳)۔ کئی مہینے اِس فراغت سے گذرے کہ پانْوں (۹۴) اُس خلوت سے باہر نہ رکھا۔

ایک دن وہ بہن، جو بجائے والدہ کے میری خاطر رکھتی تھی، (۹۵) کہنے لگی: ''اے بیرن ! تُو میری آنکھوں کی پُتلی اور ماباپ کی موئی مِٹّی کی نشانی ہے۔ تیرے آئے (۹۶) سے میرا کلیجا ٹھنڈا(۹۷) ہوا۔ جب تجھے دیکھتی ہُوں، باغ باغ ہوتی ہُوں۔ تُو نے مُجھے نِہال کیا، لیکن مَردوں کو خُدا نے کمانے کے لیے بنایا ہے، گھر میں بیٹھے رہنا اُن کو لازم نہیں۔ جو مَرد نِکھٹو ہو کر گھر سیتا ہے، اُس کو دنیا کے لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں۔ خصُوص اِس شہر کے آدمی، چھوٹے بڑے بے سبب تمھارے رہنے پر کہیں گے، اپنے باپ کی دولتِ دنیا کھو کھا کر بہنوئی کے ٹکڑوں پر آ پڑا۔ یہ نہایت بے غیرتی اور میری تمھاری ہنسائی اور ماباپ کے نام کو سبب لاج لگنے کا ہے۔ نہیں تو میں اپنے چمڑی کی جُوتیاں بنا کر تُجھے پہناؤں اور کلیجے میں ڈال رکھوں۔ اب یہ صلاح ہے کہ سفر کا قصد کرو۔ خُدا چاہے تو دن پھریں اور اِس حیرانی اور مُفلسی کے بدلے خاطر جَمعی اور خوشی حاصل ہو۔''(۹۸) یہ بات سُن کر مجھے بھی غیرت آئی۔ اُس کی نصیحت پسند کی۔ جواب دیا: ''اچّھا اب تم ما کی جگہ ہو، جو کہو سو کروں۔'' یہ میری مرضی پا کر گھر میں جا کے پچاس توڑے اشرفی کے اصیل اور لونڈیوں کے ہاتھوں میں لِوا کر میرے آگے لا رکھے اور بولی: ''ایک قافلہ سَوداگروں کا دِمشق کو جاتا ہے۔ تم اِن روپیوں (۹۹) سے جنس تجارت کی خرید کرو۔ ایک تاجر ایماندار کے حوالے کر کے، دَست آویز پکّی لِکھوا لو اور آپ بھی قصد دِمشق کا کرو۔ وہاں جب خیریت سے جا پہنچو، اپنا مال مع مُنافع، سمجھ بُوجھ لیجو یا آپ بیچو۔'' میں وہ نقد لے کر بازار میں گیا۔ اَسباب سَوداگری کا خرید کر کر، ایک بڑے سوداگر کے سپرد کیا۔ نوِشت خواند سے خاطر جمع کر لی۔ وہ تاجر دریا کی راہ سے جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہُوا۔ فقیر نے خشکی کی راہ چلنے کی تیاری کی۔ جب رُخصت ہونے لگا، بہن نے ایک سرے پاوَ بھاری اور ایک گھوڑا جڑاوَ ساز سے تواضُع کیا۔ اور مِٹھائی، پکوان ایک خاصدان میں بھر کر ہَرنے سے لٹکا دیا اور چھاگل پانی کی شکار بند میں بندھوا دی۔ اِمام

ضامن کا روپیا میرے بازو پر باندھا۔ دہی کا ٹیکا ماتھے پر لگا کر آنسو پی کر بولی: ''سِدھارو! تمھیں خُدا کو سَونپا۔ پیٹھ دکھائے جاتے ہو، اِسی طرح جلد اپنا مُنہہ دِکھائیو۔'' مَیں نے فاتحہ خیر (۱۰۰) پڑھ کر کہا: ''تمھارا بھی اللہ حافظ ہے۔ میں نے قبول کیا۔'' وہاں سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہُوا اور خدا کے توکل پر بھروسا کر کے دو منزل کی ایک منزل کرتا ہُوا دمشق کے پاس جا پہنچا۔

غرض جب شہر کے دروازے پر گیا، بہت رات جا چکی تھی۔ دَربان اور نگاہ بانوں نے دروازہ بند کیا تھا۔ میں نے بہت مِنت کی:

''مسافر ہُوں، دُور سے دھاوا مارے آتا ہوں۔ اگر کِواڑ کھول دو، شہر میں جا کر دانے گھاس کا آرام پاؤں۔'' اندر سے گُھرک کر بولے: ''اِس وقت دروازہ کھولنے کا حُکم نہیں۔ کیوں اِتنی رات گئے تم آئے؟'' جب میں نے جواب صاف اُن سے سُنا، شہر پناہ کی دیوار کے تلے گھوڑے پر سے اُتر، زِین پوش بچھا کر بیٹھا۔ جاگنے کی خاطر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ جس وقت آدھی رات اِدھر اور آدھی رات اُدھر ہوئی، سُنسان ہو گیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک صندوق قلعے کی دیوار پر سے نیچے چلا آتا ہے۔ یہ دیکھ کر میں اَچنبھے میں ہُوا کہ یہ کیا طِلِسم ہے؟ شاید خدا نے میری حیرانی و سرگردانی پر رحم کھا کر خزانہ غیب سے عنایت کیا۔ جب وہ صندوق زمین پر ٹھہرا، ڈرتے ڈرتے میں پاس گیا۔ دیکھا تو کاٹھ کا صندوق ہے۔ لالچ سے اُسے کھولا۔ ایک معشوق، خُوب صُورت، کامنی سی عورت، جس کے دیکھنے سے ہوش جاتا رہے؛ گھایل، لہو میں تربتر آنکھیں بند کیے کُلبلاتی ہے (۱۰۱)۔ آہستہ آہستہ ہونٹھ ہلتے ہیں اور یہ آواز مُنہہ سے نکلتی ہے: ''اے کم بخت بے وفا! اے ظالم پُر جفا! بدلا اِس بھلائی اور محبت کا یہی تھا، جو تُو نے کیا؟ بھلا ایک زخم اور بھی لگا۔ میں نے اپنا تیرا انصاف، خدا کو سَونپا۔'' یہ کہہ کر اُسی بے ہوشی کے عالَم میں دوپٹے کا آنچل مُنہہ پر لے لیا، میری طرف دھیان نہ کیا۔ فقیر اُس کو دیکھ کر اور یہ بات سُن کر سُن ہُوا۔ جی میں آیا، کِس (۱۰۲) بے حیا ظالم نے کیوں ایسے نازنین صنم کو زخمی کیا؟ کیا اُس کے دل میں آیا؟ اور ہاتھ اِس پر کیوں کر چلایا؟ اِس کے دل میں تو محبت اب تلک باقی ہے، جو اِس جاں کندنی کی حالت میں اُس کو یاد کرتی ہے۔ میں آپ ہی آپ یہ کہہ رہا تھا، آواز اُس کے کان میں گئی۔ ایک مرتبہ کپڑا مُنہہ سے سرکا کر مجھ کو دیکھا۔ جس وقت اُس کی نگاہیں میری نظروں سے لڑیں، مجھے غش آنے لگا (۱۰۳) اور جی سَنسنانے لگا۔ (۱۰۴) بہ زور اپنے تئیں تھانبا۔ جُرأت کر کے پُوچھا: ''سچ کہو، تم کون ہو اور یہ کیا ماجرا ہے؟ اگر بیان کرو تو میرے دل کو تسلی ہو۔'' (۱۰۵) یہ سُن کر اگرچہ طاقت بولنے کی نہ تھی آہستہ سے کہا: ''شکر ہے۔ میری حالت زخموں کے مارے یہ کچھ ہو رہی ہے۔ کیا خاک بولوں؟ کوئی دَم کی

مہمان ہُوں۔ جب میری جان نکل جاوے تو خُدا کے واسطے جواں مردی کر کے مُجھ بد بخت کو اِسی صندوق میں کسی جگہ گاڑ دیجو، تو میں بَھلے بُرے کی زبان سے نجات پاؤں اور تُو داخل ثواب کے ہو۔'' اِتنا بول کر چُپ ہوئی۔[۱۰۶]

رات کو مجھ سے کچھ تدبیر نہ ہو سکی۔ وہ صندوق اپنے پاس اُٹھا لایا اور گھڑیاں گِننے لگا کہ کب اِتنی رات تمام ہو تو فجر کو شہر میں جا کر جو کچھ علاج اِس کا ہو سکے بہ مقدور اپنے کروں۔ وہ تھوڑی سی رات ایسی پہاڑ ہو گئی کہ دل گھبرا گیا۔ بارے خُدا خُدا کر، صُبح جب نزدیک ہوئی، مُرغ بولا؛ آدمیوں کی آواز آنے لگی۔ میں نے فجر کی نماز پڑھ کر صندوق کو خورجی میں کسا۔ جُونہیں دروازہ شہر کا کُھلا، میں شہر میں داخل ہُوا۔ ہر ایک آدمی اور دکاندار سے حویلی کرائے کی تلاش کرنے لگا۔ ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے ایک مکان خوش قطع، نیا، فراغت کا، بھاڑے لے کر جا اُترا۔ پہلے اُس معشوق کو صندوق سے نکال کر رُوئی کے پہلوں پر ملایم بچھونا کر کے ایک گوشے میں لِٹایا اور آدمی اعتباری وہاں چھوڑ کر فقیر، جَرّاح کی تالاش[۱۰۷] میں نکلا۔ ہر ایک سے پُوچھتا پھرتا تھا کہ اِس شہر میں جَرّاح کاریگر کون ہے اور کہاں رہا ہے؟ ایک شخص نے کہا: ''ایک حجّام، جَرّاحی کے کسب اور حکیمی کے فَن میں یکّا[۱۰۸] ہے اور اِس کام میں نِپٹ پکّا ہے۔ اگر مُردے کو اُس پاس لے جاؤ، خدا کے حُکم سے ایسی تدبیر کرے کہ ایک بار وہ بھی جی اٹھے۔ وہ اُس محلے میں رہتا ہے اور عیسیٰ نام ہے۔'' میں یہ مُژدہ سُن کر بے اختیار چلا۔ تالاش[۱۰۹] کرتے کرتے پتے سے اُس کے دروازے پر پہنچا۔ ایک مردِ سفید رِیش کو دہلیز پر بیٹھے دیکھا اور کئی آدمی مرہم کی تیاری کے لیے کچھ پیس پاس رہے تھے۔ فقیر نے مارے خوشامد کے، اَدب سے سلام کیا اور کہا: ''میں تمھارا نام اور خُوبیاں سُن کر آیا ہوں۔ ماجرا یہ ہے کہ میں اپنے ملک سے تجارت کے لیئے چلا۔ قبیلے کو بہ سبب محبت کے ساتھ لیا۔ جب نزدیک اِس شہر کے آیا، تھوڑی سی دُور رہا تھا جو[۱۱۰] شام پڑ گئی۔ اَن دیکھے ملک میں رات کو چلنا مناسب نہ جانا۔ میدان میں ایک درخت کے تلے اُتر پڑا۔ پچھلے پہر ڈاکا آیا، جو کچھ مال اسباب پایا، لُوٹ لیا۔ گہنے کے لالچ سے اُس بی بی کو بھی گھایل کیا۔ مجھ سے کچھ نہ ہو سکا۔ رات جو باقی تھی، جُوں تُوں کر کاٹی۔ فجر ہی شہر میں آن کر ایک مکان کرائے لیا۔ اُن کو وہاں رکھ کر میں تمھارے پاس دوڑا آیا ہُوں۔ خُدا نے تمھیں یہ کمال دیا ہے۔ اِس مسافر پر مہربانی کرو، غریب خانے تشریف لے چلو۔ اُس کو دیکھو۔ اگر اُس کی زندگی ہوئی تو تمھیں بڑا جَس ہوگا اور میں ساری عُمر غلامی کروں گا۔'' عیسیٰ جراح بہت رحم دل اور خدا پرست تھا۔ میری غریبی کی باتوں پر ترس کھا کر میرے ساتھ اُس حویلی تک آیا۔ زخموں کو دیکھتے ہی میری تسلی کی۔ بولا کہ خُدا کے کرم سے اِس بی بی کے زخم چالیس دن میں بَھر آویں گے۔ غُسل شِفا کا کروا دُوں گا۔

غرض اُس مردِ خُدا نے سب زخموں کو نیم کے پانی سے دھو دھا کر صاف کیا۔ جو لائق ٹانکوں کے پائے، اُنھیں سیا۔ باقی گھاؤں پر اپنے کھیسے سے ایک ڈبیا نکال کر کتنوں میں بتی رکھی اور کتنوں پر پھائے چڑھا کر پٹی سے باندھ دیا اور نہایت شفقت سے کہا: ''میں دونوں وقت آیا کروں گا۔ تُو خبردار رہیو، ایسی حرکت نہ کرے جو ٹانکے ٹوٹ جائیں۔ مُرغ کا شوربا بجائے غِذا اِس کے حلق میں چُوائیو اور اکثر عرقِ بید مُشک، گلاب کے ساتھ دیا کیجو جو قُوّت رہے۔'' یہ کہہ کر رُخصت چاہی۔ میں نے بہت مِنّت کی اور ہاتھ جوڑ کر کہا: ''تمھاری تسلّی دینے سے میری بھی زندگی ہوئی۔ نہیں تو سوائے مرنے کے کچھ سُوجھتا نہ تھا۔ خُدا تمھیں سلامت رکھے۔'' عطر پان دے کر رُخصت کیا۔ میں رات دن خِدمت میں اُس پَری کی حاضر رہتا۔ آرام اپنے اُوپر حرام کیا۔ خدا کی درگاہ سے روز روز اُس کے چنگے ہونے کی دعا مانگتا۔

اتفاقاً وہ سوداگر بھی آ پہنچا اور میرا مالِ امانت میرے حوالے کیا۔ میں نے اُسے اَونے پَونے بیچ ڈالا اور دائروَدرمن میں خرچ کرنے لگا۔ وہ مردِ جرّاح ہمیشہ آتا جاتا۔ تھوڑے عرصے میں سب زخم بھر کر انگور کر لائے۔ بعد کئی دن کے غُسلِ شِفا کا کیا۔ عجب طرح کی خوشی حاصل ہُوئی۔ خِلعت اور اشرفیاں، عیسیٰ حجام کے آگے دھریں اور اُس پری کو مُکلف فرش بچھا کر مَسند پر بٹھایا۔ فقیر، غریبوں کو بہت سی خیر خیرات کی۔ اُس دن گویا پادشاہت ہفت اِقلیم کی اِس فقیر کے ہاتھ لگی۔ اور اُس پری کا شِفا پانے سے ایسا رنگ نکھرا کہ مُکھڑا سورج کی مانند چمکنے اور کُندن کی طرح دمکنے لگا۔ نظر کی مجال نہ تھی جو اُس کے جمال پر ٹھہرے۔ فقیر بہ سَر و چشم اُس کے حکم میں حاضر رہتا۔ جو فرماتی سو بجالاتا۔ وہ اپنے حُسن کے غرور اور سرداری کے دماغ میں جو میری طرف کبھو دیکھتی تو فرماتی: ''خبردار! اگر تجھے ہماری خاطر منظور ہے تو ہرگز ہماری بات میں دَم نہ ماریو۔ جو ہم کہیں، سو بلا عُذر کیئے جائیو۔ اپنا کسی بات میں دخل نہ کریو۔ نہیں تو پچھتاوے گا۔'' اُس کی وضع سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ حق میری خدمت گذاری اور فرمانبرداری کا اُسے البتہ منظور ہے۔ فقیر بھی اُس کی بے مرضی ایک کام نہ کرتا۔ اُس کا فرمانا بسر و چشم بجالاتا۔ (۱۱۱) ایک مُدّت اِسی راز و نیاز میں کٹی۔ جو اُس نے فرمایش کی، وُنہیں میں نے لا کر حاضر کی۔ اِس فقیر پاس جو کچھ جنس اور نقد اصل و نفع (۱۱۲) کا تھا، سب صرف ہُوا۔ اُس بیگانے مُلک میں کون اعتبار کرے، جو قرض وام سے کام چلے؟ آخر تکلیف روز مَرّے کے خرچ کی ہونے لگی۔ اِس سے دل بہت گھبرایا۔ فکر سے دُبلا ہوتا چلا۔ چہرے کا رنگ کلجھواں ہوگیا۔ لیکن کِس سے کہوں؟ جو کچھ دل پر گذرے سو گذرے۔ قہرِ درویش بر جانِ درویش۔ ایک دن اُس پری نے اپنے شعور سے دریافت کر کے کہا: ''اے فُلانے! تیری خدمتوں کا حق ہمارے جی میں نقش کالحجر ہے، پر اُس کا عوض

بالفعل ہم سے نہیں ہوسکتا۔ اگر واسطے خرچ ضروری کے، کچھ درکار ہو تو اپنے دل میں اندیشہ نہ کر۔ ایک ٹکڑا کاغذ اور دوات قلم حاضر کر (۱۱۳)۔ میں نے تب معلوم کیا، کسی ملک کی بادشاہ زادی ہے، جو اِس دل و دماغ سے گفتگو کرتی ہے۔ فی الفور قلمدان آگے رکھ دیا۔ اُس نازنین نے ایک شُقّہ دستخطِ خاص سے لکھ کر میرے حوالے کیا اور کہا: ''قلعہ (۱۱۴) کے پاس تر پولیا ہے۔ وہاں اُس کوچے میں ایک حویلی بڑی سی ہے۔ اُس مکان کے مالک کا نام سیدی بہار ہے۔ تُو جا کر اِس رقعے کو اُس تلک پہنچا دے۔'' (۱۱۵) فقیر موافق فرمانے اُس کے، اُسی نام اور نشان (۱۱۶) پر منزلِ مقصود تک جا پہنچا۔ دربان کی زبانی کیفیت خط کی کہلا بھیجی۔ وُونہیں (۱۱۷) سُنتے ہی ایک حبشی جوان، خوبصورت؛ ایک پھینٹا طرحدار بجے ہُوئے باہر نکل آیا۔ اگرچہ رنگ سانولا تھا پر گویا تمام نمک بھرا ہُوا۔ میرے ہاتھ سے خط لے لیا۔ نہ بولا نہ کچھ پُوچھا۔ اُنھیں قدموں پھر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں گیارہ کشتیاں سربہ مُہر، زَربفت کے تَورہ پوش پڑے ہُوئے، غلاموں کے سر پر دَھرے باہر آیا۔ کہا: ''اِس جوان کے ساتھ جا کر چوکوشے پہنچا دو۔ میں بھی سلام کر، رخصت ہُوا، (۱۱۸) اپنے مکان میں لایا۔ آدمیوں کو دروازے کے باہر سے رُخصت کیا۔ وہ کشتیاں امانت حضور میں اُس پَری کے گذرانیاں۔ دیکھ کر فرمایا: ''یہ گیارہ بدرے اشرفیوں کے لے اور خرچ میں لا۔ خُدا رزّاق ہے۔'' فقیر اُس نقد کو لے کر ضروریات میں خرچ کرنے لگا۔ اگرچہ خاطر جمع ہُوئی، پر دل میں یہ خلش رہی، یا الٰہی! یہ کیا صُورت ہے؟ بغیر پُوچھے گچھے اِتنا مال نا آشنا صُورت اجنبی نے ایک پُرزے کاغذ پر میرے حوالے کیا۔ اگر اُس پری سے یہ بھید پُوچھوں تو اُس نے پہلے ہی منع کر رکھا تھا۔ مارے ڈر کے دم نہیں مار سکتا تھا۔

بعد آٹھ دن کے وہ معشوقہ مجھ سے مخاطب ہوئی کہ حق تعالیٰ نے، آدمی کو اِنسانیت کا جامہ عنایت کیا ہے کہ نہ پھٹے نہ مَیلا ہو۔ اگرچہ پُرانے کپڑے سے اُس کی آدمیت میں فرق نہیں آتا پر ظاہر میں خلق اللہ کی نظروں میں اعتبار نہیں پاتا۔ دو توڑے اشرفی کے ساتھ لے کر چوک کے چوراہے پر یُوسف سوداگر کی دُکان میں جا اور کچھ رقم جواہر کے بیش قیمت اور دو خلعتیں زرق برق کی مول لے آ۔'' فقیر وُونہیں سوار ہو کر اُس کی دُکان پر گیا۔ دیکھا تو ایک جوانِ شکیل، زعفرانی جوڑا پہنے گدی پر بیٹھا ہے اور اُس کا یہ عالم ہے کہ ایک عالَم دیکھنے کے لیے دوکان سے بازار تک کھڑا ہے۔ فقیر کمال شوق سے نزدیک جا کر سلام علیک کر کر بیٹھا، اور جو جو چیز مطلوب تھی، طلب کی۔ میری بات چیت اُس شہر کے باشندوں کی سی نہ تھی۔ اُس جوان نے گرم جوشی سے کہا: ''جو صاحب کو چاہیئے سب موجود ہے، لیکن یہ فرمایئے کِس ملک سے آنا ہُوا؟ اور اِس اجنبی شہر میں رہنے کا کیا باعث ہے؟ اگر اِس حقیقت سے مُطلع کیجیئے تو مہربانی سے بعید نہیں۔'' میرے تئیں اپنا احوال ظاہر کرنا منظور نہ تھا۔ کچھ بات بنا کر اور جواہر

پوشاک لے کر، اور قیمت اُس کی دے کر رُخصت چاہی۔ اُس جوان نے رُوکھے پھیکے ہو کر کہا: اے صاحب! اگر تم کو ایسی ہی نا آشنائی کرنی تھی تو پہلے دوستی اتنی گرمی سے کرنی کیا ضرور تھی؟ بھلے آدمیوں میں صاحب سلامت کا پاس بڑا ہوتا ہے۔" یہ بات اِس مزے اور انداز سے کہی، بے اختیار دل کو بھائی اور بے مُروّت ہو کر وہاں سے اُٹھنا اِنسانیت کے مُناسب نہ جانا۔ اُس کی خاطر پھر بیٹھا اور بولا: "تمھارا فرمانا سر آنکھوں پر۔ میں حاضر ہوں۔"

اتنے کہنے سے بہت خوش ہُوا۔ ہنس کر کہنے لگا: "اگر آج کے دن غریب خانے میں (۱۱۹) کرم کیجیے تو تمھاری بدولت مجلس خوشی کی جما کر دو چار گھڑی دل بہلاویں اور کچھ کھانے پینے کا شُغل باہم بیٹھ کر کریں۔" فقیر نے اُس پری کو کبھو اکیلا نہ چھوڑا تھا۔ اُس کی تنہائی یاد کر کر چند در چند عذر کیے، پر اُس جوان نے ہرگز نہ مانا۔ (۱۲۰)

آخر وعدہ اُن چیزوں کو پہنچا کر میرے پھر آنے کا لے کر اور قسم کھلا کر رخصت دی۔ میں دُکان سے اُٹھ کر جواہر اور خِلعتیں اُس پَری کی خدمت میں لایا۔ اُس نے قیمت جواہر کی اور حقیقت جوہری کی پُوچھی۔ میں نے سارا احوال، مَول تول کا اور مہمانی کے بجِد ہونے کا کہہ سُنایا۔ فرمانے لگی: "آدمی کو اپنا قول و قرار (۱۲۱) پُورا کرنا واجب ہے۔ ہمیں خدا کی نِگہ بانی میں چھوڑ کر اپنے وعدے کو وفا کر۔ ضیافت قبول کرنی سُنت رسول اللہ کی ہے۔" (۱۲۲) تب میں نے کہا: "میرا دل چاہتا نہیں کہ تمھیں اکیلا چھوڑ کر جاؤں، اور حُکم یُوں ہوتا ہے۔ لاچار جاتا ہُوں۔ جب تلک آؤں گا، دل یہیں لگا رہے گا۔" یہ کہہ کر پھر اُس جوہری کی دکان پر گیا۔ وہ مونڈھے پر بیٹھا میرا انتظار کھینچ رہا تھا۔ دیکھتے ہی بولا: "آؤ مہربان۔ بڑی راہ دکھائی۔" وہیں اُٹھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور چلا۔ جاتے جاتے ایک باغ میں لے گیا۔ وہ بڑی بہار کا باغ تھا۔ حوض اور نہروں میں فوّارے چھوٹتے تھے۔ میوے طرح بہ طرح کے پھل رہے تھے۔ ہر ایک درخت، مارے بوجھ کے جُھوم رہا تھا۔ رنگ برنگ کے جانور اُن پر بیٹھے چہچہے کر رہے تھے اور ہر مکانِ عالیشان میں فرش سُتھرا بچھا تھا۔ وہاں لبِ نہر، ایک بنگلے میں جا کر بیٹھا۔ ایک دم کے بعد آپ اُٹھ کر چلا گیا۔ پھر دُوسری پوشاکِ معقول پہن کر آیا۔ میں نے دیکھ کر کہا: "سُبحان اللہ! چشمِ بد دُور۔" سُن کر مُسکرایا اور بولا: "مُناسب یہ ہے کہ صاحب بھی اپنا لباس بدل ڈالیں۔" (۱۲۳) اُس کی خاطر میں نے بھی دوسرے کپڑے پہنے۔ اُس جوان نے بڑی ٹیپ ٹاپ سے تیاری ضیافت کی، کی اور سامان خوشی کا جیسا چاہیے موجود کیا اور فقیر سے صُحبت بہت گرم کر، مزے کی باتیں کرنے لگا۔ اِتنے میں ساقی، صراحی و پیالہ بِلّور کا لے کر حاضر ہُوا، اور گزک کئی قسم کی لا رکھی۔ نمکدان چُن دیے، دَور شراب کا شروع ہُوا۔ جب دو چار جام کی نوبت پُہنچی، چار لڑکے اَمرد، صاحبِ جمال، زُلفیں کھولے ہوئے مجلس میں آئے، گانے بجانے لگے۔ یہ عالَم ہُوا، اور ایسا سماں بندھا، (۱۲۴)

اگر تان سین اُس گھڑی ہوتا تو اپنی تان بُھول جاتا اور بیجُو باورا، سُن کر باولا ہو جاتا۔ اِس مزے میں ایکبارگی وہ جوان آنسو بھر لایا۔ دو چار قطرے بے اختیار نکل پڑے اور فقیر سے بولا: ''اب ہمارے تمھارے دوستی جانی ہُوئی۔ پس دل کا بھید دوستوں سے چُھپانا کِسو مذہب میں درست نہیں۔ ایک بات بے تکلف آشنائی کے بھروسے کہتا ہوں۔ اگر حُکم کرو تو اپنی معشوقہ کو بُلوا کر اِس مجلس میں تسلی اپنے دل کی کروں۔ اُس کی جدائی سے جی نہیں لگتا۔'' یہ بات ایسے اشتیاق سے کہی کہ بغیر دیکھے بھالے، فقیر کا دل بھی مُشتاق ہُوا۔ میں نے کہا: ''مجھے تمھاری خوشی درکار ہے۔ اِس سے کیا بہتر؟ دیر نہ کیجیے، سچ ہے معشوق بِن کچھ اچھا نہیں لگتا۔'' اُس جوان نے چلون کی طرف اِشارت کی۔ ڈُنہیں ایک عورت کالی کلوٹی، بھُتنی سی، جس کے دیکھنے سے انسان بے اَجل مرجاوے، جوان کے پاس آن بیٹھی۔ فقیر، اُس کے دیکھنے سے ڈر گیا۔ دل میں کہا، یہی بَلا محبوبہ ایسے جوان پَری زاد کی ہے، جس کی اتنی تعریف اور اِشتیاق ظاہر کیا! میں لاحول پڑھ کر چُپ ہو رہا۔ اُسی عالم میں تین دن رات، مجلس، شراب اور راگ رنگ کی جمی رہی۔ چوتھی شب کو غلبہ نشے اور نیند کا ہُوا۔ میں خوابِ غفلت میں بے اختیار سو گیا۔ جب صبح ہوئی، اُس جوان نے جگایا۔ کئی پیالے خُمار شکنی کے پِلا کر اپنی معشوقہ سے کہا: ''اب زیادہ تکلیف مہمان کو دینی خُوب نہیں۔''(۱۲۵) دونوں ہاتھ پکڑ کر اُٹھے۔ میں نے رُخصت مانگی، خوشی بخوشی اجازت دی۔ تب میں نے جلد اپنے قدیمی کپڑے پہن لیئے، اپنے گھر کی راہ لی اور اُس پری کی خدمت میں جا حاضر ہُوا۔ مگر ایسا اتفاق کبھُو نہ ہوا تھا کہ اُسے تنہا چھوڑ کر شب باش کہیں ہُوا ہُوں۔ اِس تین دن کی غیر حاضری سے نہایت خَجِل ہو کر عذر کیا اور قِصّہ ضیافت کا اور اُس کے نہ رخصت کرنے کا سارا عرض کیا۔ وہ ایک دانا زمانے کی تھی، تبسّم کر کے بولی: ''کیا مُضایقہ، اگر ایک دوست کی خاطر رہنا ہُوا؟ ہم نے معاف کیا۔ تیری کیا تقصیر ہے؟ جب آدمی کِسو کے گھر جاتا ہے، تب اُس کی مرضی سے پھر آتا ہے۔ لیکن یہ مُفت کی مہمانیاں کھا پی کر چُپکے ہو رہو گے یا اِس کا بدلا بھی اُتارو گے؟ اب یہ لازم ہے کہ جا کر اُس سوداگر بچّے کو اپنے ساتھ لے آؤ اور اُسے دو چند ضیافت کرو۔ اور اسباب کا کچھ اندیشہ نہیں۔ خُدا کے کرم سے ایک دم میں سب لوازمہ تیار ہو جاوے گا اور بخوبی مجلس ضیافت کی رونق پاوے گی۔''(۱۲۶) فقیر مُوافق حُکم کے، جوہری پاس گیا اور کہا: ''تمھارا فرمانا، میں تو سر آنکھوں سے بجا لایا۔ اب تُم بھی مہربانی کی راہ سے میری عرض قبول کرو۔'' اُس نے کہا: ''جان و دل سے حاضر ہوں''۔ تب میں نے کہا: ''اگر اِس بندے کے گھر تشریف لے چلو، عَین غریب نوازی ہے۔'' اُس جوان نے بہت عذر اور حیلے کیئے، پر میں نے پِنڈ نہ چھوڑا، جب تلک وہ راضی ہُوا۔ (۱۲۷) ساتھ ہی ساتھ اُس کو اپنے مکان پر لے چلا۔ لیکن راہ میں یہی فکر کرتا آتا تھا کہ اگر آج اپنے تئیں مقدُور ہوتا

تو ایسی تواضع کرتا کہ یہ بھی خوش ہوتا۔ اَب میں اِسے لیئے جاتا ہوں، دیکھیئے کیا اتفاق ہوتا ہے۔ اِسی حیص بیص میں گھر کے نزدیک پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دروازے پر دُھوم دھام ہو رہی ہے۔ گلیارے میں جھاڑو دے کر چھڑکاؤ کیا ہے۔ یساول اور عصّے بردار کھڑے ہیں۔ میں حیران ہُوا، لیکن اپنا گھر جان کر قدم اندر رکھا۔ دیکھا تو تمام حویلی میں فرشِ مُکلف لائق ہر مکان کے، جا بجا بچھا ہے اور مَسندیں لگی ہیں۔ پاندان، گلاب پاش، عطر دان، پیکدان، چنگیریں (۱۲۸)، نرگس دان قرینے سے دَھرے ہیں۔ طاقوں پر رنگترے، کنولے، نارنگیاں اور گلابیاں رنگ برنگ کی چُنی ہیں۔ ایک طرف رنگ آمیز ابرک کی ٹٹیوں میں چراغاں کی بہار ہے۔ ایک طرف جھاڑ اور سَرو، کنول کے روشن ہیں۔ اور تمام دالان اور شہ نشینوں میں طلائی شمع دانوں پر کافوری شمعیں چڑھی ہیں اور جڑاؤ فانوسیں اُوپر دھری ہیں۔ سب آدمی اپنے اپنے عُہدوں پر مُستعد ہیں۔ باورچی خانے میں دیگیں کھٹکھنا رہی ہیں۔ آبدار خانے کی ویسی ہی تیاری ہے۔ کوری کوری ٹھلیاں رُوپے کی گھڑونچیوں پر صافیوں سے بندھیں اور کٹوروں سے ڈھکیں رکھی ہیں۔ آگے چوکی پر ڈونگے، کٹورے بمعہ تھالی، سر پوش دھرے، برف کے آبخورے لگ رہے ہیں اور شورے کی صُراحیاں ہل رہی ہیں۔ (۱۲۹)

غرض سب اسباب بادشاہانہ موجود ہے اور کنچنیاں، بھانڈ، بھگتیئے، کلاونت، قوال اچھی پوشاک پہنے، ساز کے سُر ملائے حاضر ہیں (۱۳۰)۔ فقیر نے اُس جوان کو لے جا کر مسند پر بٹھایا اور دل میں حیران تھا کہ یا الٰہی! اتنے عرصے میں یہ سب تیاری کیوں کر ہُوئی؟ ہر طرف دیکھتا پھرتا تھا لیکن اُس پری کا نشان کہیں نہ پایا۔ اِسی جُستجو میں ایک مرتبہ باورچی خانے کی طرف جا نکلا۔ دیکھتا ہوں تو وہ نازنین ایک مکان میں، گلے میں کُرتی، پاؤں میں تہ پوشی، سر پر سفید رُومالی اوڑھے ہُوئے، سادی خُوزادی، بن گہنے پاتے بنی ہوئی۔ بیت:

نہیں محتاج زیور کا جسے خُوبی خدا نے دی
کہ جیسے خوشنما لگتا ہے دیکھو چاند بن گہنے

خبر گیری میں ضیافت کی لگ رہی ہے اور تاکید ہر ایک کھانے کی کر رہی ہے کہ خبردار بامزہ ہو اور آب و نمک، بُو باس درُست رہے۔ اِس محنت سے، وہ گُلاب سا بدن، سارا پسینے پسینے ہو رہا ہے۔ میں پاس جا کر تصدّق ہُوا اور اِس شعور و لیاقت کو سراہ کر دعائیں دینے لگا۔ یہ خُوشامد سُن کر تیوری چڑھا کر بولی: ''آدمی سے ایسے ایسے کام ہوتے ہیں کہ فرشتے کی مجال نہیں۔ میں نے ایسا کیا کِیا ہے جو تُو اِتنا حیران ہو رہا ہے؟ بس بہت باتیں بنانیں مجھے خوش نہیں آتیں۔ بھلا کہہ تو، یہ کون آدمیت ہے کہ مہمان کو اکیلا بٹھا کر اِدھر اُدھر پڑے پھرے؟ وہ اپنے جی

میں کیا کہتا ہوگا؟ جَلد جَا، مجلس میں بیٹھ کر مہمان کی خاطر داری کر اور اُس کی معشوقہ کو بھی بُلوا کر اُس کے پاس دِکھلا۔'' فقیر وُونہیں اُس جوان کے پاس گیا اور گرم جوشی کرنے لگا۔ اِتنے میں دو غُلام، صاحبِ جمال، صراحی اور جام جڑاؤ ہاتھ میں لیئے رُوبرُو آئے، شراب پلانے لگے۔ اِس میں، میں نے اُس جوان سے کہا: ''میں سب طرح مخلص اور خادِم ہوں۔ بہتر یہ[۱۳۱] ہے کہ وہ صاحبِ جمال کہ جِس کی طرف دِل صاحب کا مایل ہے، تشریف لاوے تو بڑی بات ہے۔ اگر فرماؤ تو آدمی بُلانے کی خاطر جاوے۔'' یہ سُنتے ہی خوش ہو کر بولا: ''بہت اچھا۔ اِس وقت تُم نے میرے دل کی بات کہی۔'' میں نے ایک خُوجے کو بھیجا۔ جب آدھی رات گئی، وہ چُڑیل خاصے چُوڈول پر سوار ہو کر بلائے ناگہانی سی آپہُنچی۔

فقیر نے لاچار، خاطر سے مہمان کی، اِستقبال کر کر نہایت تپاک سے برابر اُس جوان کے لا بِٹھایا۔ جوان اُس کے دیکھتے ہی ایسا خوش ہُوا جیسے دنیا کی نعمت ملی۔ وہ کُٹنی بھی اُس جوان پری زاد کے گلے لپٹ گئی۔ سَچ مُچ یہ تماشا ہُوا جیسے چودھویں رات کے چاند کو گہن لگتا ہے۔ جتنے مجلس میں آدمی تھے، اپنی اپنی انگلیاں دانتوں میں دابنے لگے کہ کیا کوئی بَلا اِس جوان پر مُسلط ہوئی؟ سب کی نگاہ اُسی طرف تھی۔ تماشا مجلس کا بُھول کر اُس کا تماشا دیکھنے لگے۔[۱۳۲]

ایک شخص کِنارے سے بولا: ''یارو! عشق اور عقل میں ضِد ہے۔ جو کچھ عقل میں نہ آوے، یہ کافر عشق کر دکھاوے۔ لیلیٰ کو مجنوں کی آنکھوں سے دیکھو۔'' سبھوں نے کہا: ''آمنا۔ یہی بات ہے۔''[۱۳۳] یہ فقیر بمُوجب حُکم کے، مہمان داری میں حاضر تھا۔ ہر چند جوان ہم پیالہ ہم نِوالہ ہونے کو مجوّز ہوتا تھا، پر میں ہرگز اُس پَری کے خوف کے مارے اپنا دل کھانے پینے یا سیر تماشے کی طرف رجوع نہ کرتا تھا اور عذر مہمانداری کا کر کے اُس کے شامل نہ ہوتا۔ اِسی کیفیت سے تین شبانہ روز گذر رہے۔ چوتھی رات وہ جوان نہایت جوشش سے مجھے بُلا کر کہنے لگا: ''اب ہم بھی رخصت ہوں گے۔ تمھاری خاطر اپنا سب کاروبار چھوڑ چھاڑ کر تین دن سے تمھاری خدمت میں حاضر ہیں۔ تم بھی تو ہمارے پاس ایک دم بیٹھ کر ہمارا دل خوش کرو۔'' میں نے اپنے جی میں خیال کیا، اگر اِس وقت کہنا اِس کا نہیں مانتا تو آزُردہ ہوگا۔ پس نئے دوست اور مہمان کی خاطر رکھنی ضرور ہے۔ تب یہ کہا: ''صاحب کا حُکم بجالانا منظور، کہ الامر فوق الادب۔'' سُنتے ہی اِس کو، جوان نے پیالہ تواضع کیا اور میں نے پی لیا۔ پھر تو ایسا پَیہم دَور چلا کہ تھوڑی دیر میں سب آدمی مجلس کے کیفی ہو کر بے خبر ہو گئے اور میں بھی بے ہوش ہو گیا۔[۱۳۴] جب صبح ہوئی اور آفتاب دو نیزے بُلند ہُوا، تب میری آنکھ کُھلی تو دیکھا میں نے، نہ وہ تیاری ہے، نہ وہ مجلس، نہ وہ پری؛

فقط خالی حویلی پڑی ہے۔ مگر ایک کونے میں کمل لپیٹا ہُوا دَھرا ہے۔ (۱۳۵) جو اُس کو کھول کر دیکھا تو وہ خوان اور اُس کی رنڈی دونوں سر کٹے پڑے ہیں۔ یہ حالت دیکھتے ہی حواس جاتے رہے۔ عقل کچھ کام نہیں کرتی کہ یہ کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ (۱۳۶) حیرانی سے ہر طرف تک رہا تھا۔ اِتنے میں ایک خواجہ سرا، جسے ضیافت کے کام کاج میں دیکھا تھا؛ نظر پڑا۔ (۱۳۷) فقیر کو اُس کے دیکھنے سے کچھ تسلی ہُوئی۔ احوال اِس واردات کا پوچھا۔ اُس نے جواب دیا: ''تجھے اِس بات کے تحقیق کرنے سے کیا حاصل، جو تُو پُوچھتا ہے؟'' میں نے بھی اپنے دل میں غور کی کہ سچ تو کہتا ہے۔ پھر ایک ذرہ تامل کر کے میں بولا: ''خیر نہ کہو۔ بھلا یہ تو بتاؤ، وہ معشوقہ کِس مکان میں ہے؟'' تب اُس نے کہا: ''البتہ جو میں جانتا ہوں سو کہہ دوں گا۔ لیکن تجھ سا آدمی عقل مند، بے مرضی حضور کے، دو دن کی دوستی پر بے مُحابا بے تکلف ہو کر صُحبت مے نُوشی کی باہم گرم کرے۔ یہ کیا معنی (۱۳۸) رکھتا ہے؟''

فقیر اپنی حرکت اور اُس کی نصیحت سے بہت نادِم ہُوا۔ سِوائے اس بات کے زبان سے کچھ نہ نکلا: ''فی الحقیقت اب تو تقصیر ہُوئی، معاف کیجیے۔'' بارے مُحلی نے مہربان ہو کر اُس پری کے مکان کا نشان بتایا اور مجھے رُخصت کیا۔ آپ اُن دونوں زخمیوں کے گاڑنے دابنے کی فکر میں رہا۔ میں تُہمت سے اُس فساد کی الگ ہُوا اور اِشتیاق میں اُس پری کے ملنے کے لیے گھبرایا ہُوا، گرتا پڑتا، ڈُھونڈھتا، شام کے وقت اُس کوچے میں اُسی پتے پر جا پہنچا اور نزدیک دروازے کیا یک گوشے میں ساری رات تلپھتے کٹی۔ کِسو کی آمد و رفت کی آہٹ نہ ملی اور کوئی احوال پُرساں میرا نہ ہُوا۔ اُسی بے کسی کی حالت میں صُبح ہو گئی۔ جب سُورج نکلا، اُس مکان کے بالا خانے کی ایک کھڑکی سے وہ ماہ رُو میری طرف دیکھنے لگی۔ اُس وقت عالَم خُوشی کا جو مُجھ پر گُورا، دل ہی جانتا ہے۔ شُکر خدا کا کیا۔

اِتنے میں ایک خوجے نے میرے پاس آ کر کہا: ''اُس مسجد میں تُو جا کر بیٹھ، شاید تیرا مطلب اُس جگہ بر آوے اور اپنے دِل کی مُراد پاوے۔'' فقیر فرمانے سے اُس کے، وہاں سے اُٹھ کر اُسی مسجد میں جا رہا۔ لیکن آنکھیں دروازے کی طرف لگ رہی تھیں کہ دیکھیے پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ تمام دن، جیسے روزہ دار شام ہونے کا انتظار کھینچتا ہے، میں نے بھی وہ روز ویسی ہی بے قراری میں کاٹا۔ بارے جس تِس طرح سے شام ہوئی، اور دن پہاڑ سا چھاتی پر سے ٹلا، ایکبارگی وہی خواجہ سرا، جن نے اُس پری کے مکان کا پتا دیا تھا، مسجد میں آیا۔ (۱۳۹)

بعد فراغت نمازِ مغرب کے، میرے پاس آ کر اُس شفیق نے کہ سب راز و نیاز کا محرم تھا، نہایت تسلی

دے کر ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے ساتھ لے چلا (۱۴۰)۔ رفتہ رفتہ ایک باغیچے میں مجھے بیٹھا کر کہا: "یہاں رہو، جب تک (۱۴۱) تمھاری آرزو بَر آوے۔" اور آپ رخصت ہو کر، شاید میری حقیقت حضور میں کہنے گیا۔ میں اُس باغ کے پھولوں کی بہار اور چاندنی کا عالَم اور حوض؛ نہروں میں فوّارے، ساون بھادوں کے اُچھلنے کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ لیکن جب پھولوں کو دیکھتا، تب اُس گُل بدن کا خیال آتا۔ جب چاند پر نظر پڑتی تب اُس مہ رُو کا مُکھڑا یاد کرتا۔ یہ سب بہار اُس کے بغیر میری آنکھوں میں خار تھی۔ (۱۴۲) بارے، خدا نے اُس کے دِل کو مہربان کیا۔ ایک دَم کے بعد وہ پری، دروازہ (۱۴۳) سے جیسے چودھویں رات کا چاند، بناؤ کیئے، گلے میں پشواز بادلے کی، سَنجاف کی، موتیوں کا دردامن ٹِکا ہُوا اور سر پر اَوڑھنی جس میں آنچل پلّو، لہر، گوکھرُو لگا ہُوا۔ سر سے پاؤں تک موتیوں میں جڑی روِش پر آ کر کھڑی ہوئی۔ اُس کے آنے سے تر وتازگی نئے سر سے، اُس باغ کو اور اِس فقیر کے دل کو ہو گئی۔ ایک دم اِدھر اُدھر سیر کر کر شہ نشین مُعرّق (۱۴۴) مسند پر تکیہ لگا کر بیٹھی۔ میں دوڑ کر پروانے کی طرح، جیسے شمع کے گرد پھرتا ہے؛ تصدّق ہُوا اور غلام کی مانند دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہُوا۔ (۱۴۵) اِس میں وہ خوجہ، میری خاطر بہ طورِ سفارش کے، عرض کرنے لگا۔ میں نے اُس مُحلی سے کہا: "بندہ گُنہ گار، تقصیروار ہے۔ جو کچھ سزا میرے لایق ٹھہرے، سو ہو۔" وہ پری از بسکہ ناخوش تھی، بد دماغی سے بولی کہ اب اِس کے حق میں یہی بھلا ہے کہ سو توڑے اشرفی کے لیوے۔ اپنا اسباب درست کر کے وطن کو سِدھارے۔ (۱۴۶) میں یہ بات سُنتے ہی کاٹھ ہو گیا اور سُوکھ گیا کہ اگر کوئی میرے بدن کو کاٹے تو ایک بُوند لہو کی نہ نکلے، اور تمام دنیا آنکھوں کے آگے اندھیری لگنے لگی اور ایک آہ نامُرادی کی بے اختیار جگر سے نکلی۔ آنسو بھی ٹپکنے لگے۔ سِوائے خدا کے اُس وقت کِسو کی توقع نہ رہی۔ مایوسِ محض ہو کر اِتنا بولا: "بھلا ٹک اپنے دل میں غور فرمائیے۔ اگر مجھ کم نصیب کو دنیا کا لالچ ہوتا تو اپنا جان و مال حضور میں نہ کھوتا۔ کیا ایک بارگی حقِ خدمت گذاری اور جان نثاری کا عالَم سے اُٹھ گیا؟ جو مُجھ (۱۴۷) کم بخت پر اتنی بے مہری فرمائی۔ خیر اب میرے تئیں بھی زندگی سے کچھ کام نہیں۔ معشوقوں کی بے وفائی سے بیچارے عاشقِ نیم جان کا نباہ نہیں ہوتا۔"

یہ سُن کر تیکھی ہو، تیوری چڑھا کر خفگی سے بولی: "چہ خُوش! آپ ہمارے عاشق ہیں؟ مینڈکی کو بھی زُکام ہُوا؟ اے بے وقوف! اپنے حوصلے سے زیادہ باتیں بنانیں خیالِ خام ہے۔ چھوٹا مُنہہ بڑی بات، بس چُپ رہ۔ یہ نکمّی بات چیت مَت کر۔ اگر کسی اور نے یہ حرکتِ بے معنی کی ہوتی، پروردگار کی سَوں، اُس کی بوٹیاں کٹوا، چیلوں کو بانٹتی۔ پر کیا کروں؟ تیری خدمت یاد آتی ہے۔ اب اِسی میں بھلائی ہے کہ اپنی راہ لے۔ تیری قسمت کا دانا پانی ہماری سرکار میں یہیں تلک تھا۔" پھر میں نے روتے بسورتے کہا: "اگر میری تقدیر میں یہی لکھا ہے کہ اپنے دل کے

مقصد کو نہ پہنچوں اور جنگل پہاڑ میں سر ٹکراتا پھروں تو لاچار ہوں۔" اِس بات سے بھی دِق ہو کہنے لگی: "میرے تئیں یہ مُصاحب ہندے، چوچلے اور رمز کی باتیں پسند نہیں آتیں۔ اِس اشارے کی گفتگو کے جو لایق ہو، اُس سے جا کر کر۔" پھر اُسی خفگی کے عالم میں اُٹھ کر اپنے دولت خانے کو چلی۔ میں نے بہتیرا سر پٹکا، مُتوجہ نہ ہُوئی۔ لاچار میں بھی اُس مکان سے اُداس اور نا اُمید ہو کر نکلا۔

غرض چالیس دن تک یہی نوبت رہی۔ جب شہر کی کُوچہ گردی سے اُکتاتا، جنگل میں نکل جاتا۔ جب وہاں سے گھبراتا، پھر شہر کی گلیوں میں دِیوانہ سا آتا۔ نہ دن کو کھاتا، نہ رات کو سوجاتا۔ (۱۴۸) جیسے دھوبی کا کُتّا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ زندگی انسان کی کھانے پینے سے ہے۔ آدمی اناج کا کیڑا ہے۔ طاقت بدن میں مُطلق نہ رہی۔ اپاہج ہو کر اُسی مسجد کی دیوار کے تلے جا پڑا کہ ایک روز وہی (۱۴۹) خواجہ سرا جُمعہ کی نماز پڑھنے آیا۔ میرے پاس سے ہو کر چلا۔ میں یہ شعر آہستہ، ناطاقتی سے پڑھ رہا تھا:

اِس دردِ دل سے مَوت ہو یا دل کو تاب ہو
قسمت میں جو لکھا ہو، الٰہی شتاب ہو

اگرچہ ظاہر میں صُورت میری بالکل تبدیل ہو گئی تھی، چہرے کی یہ شکل بنی تھی کہ جن نے مجھے پہلے دیکھا تھا، وہ بھی نہ پہچان سکتا کہ یہ وہی آدمی ہے، لیکن وہ مُحلی آواز درد کی سُن کر متوجہ ہُوا۔ میرے تئیں بغور دیکھ کر افسوس کیا اور شفقت سے مخاطب ہُوا کہ آخر یہ حالت اپنی پہنچائی۔ میں نے کہا: "اب تو جو ہُوا سو ہُوا۔ مال سے بھی حاضر تھا، جان بھی تصدّق کی۔ اُس کی خوشی یوں ہی ہوئی تو کیا کروں؟" (۱۵۰)

یہ سُن کر ایک خدمت گار میرے پاس چھوڑ کر مسجد میں گیا۔ نماز اور خُطبے سے فراغت کر کر جب باہر نکلا، فقیر کو ایک میانے میں ڈال کر، اپنے ساتھ خدمت میں، اُس پری بے پروا کی لے جا کر، چِق کے باہر بیٹھایا۔ (۱۵۱) اگرچہ میری رَوِش کچھ باقی نہ رہی تھی، پر مُدّت تلک شب و روز اُس پری کے پاس اتفاق رہنے کا ہُوا تھا۔ جان بُوجھ کر بے گانی ہو کر خوجے سے پُوچھنے لگی: "یہ کون ہے؟" اُس مردِ آدمی نے کہا: "یہ وہی کم بخت بدنصیب ہے، جو حضور کی خفگی اور عتاب میں پڑا تھا۔ اُسی سبب سے اِس کی یہ صورت بنی ہے۔ عشق کی آگ سے جَلا جاتا ہے۔ ہر چند آنسوؤں کے پانی سے بُجھاتا ہے، پر وہ دُونی بھڑکتی ہے، کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ علاوہ اپنی تقصیر کی خجالت سے مُوا جاتا ہے۔ (۱۵۲) پَری نے ٹھٹھولی سے فرمایا: "کیوں جُھوٹ بَکتا ہے؟ بہت دن ہُوئے اُس کی خبر وطن پہنچنے کی مجھے خبرداروں نے دی ہے۔ واللہ اعلم، یہ کون ہے اور تُو کس کا ذکر کرتا ہے!" اُس دم خواجہ سرا نے ہاتھ جوڑ کر التماس

کیا: ''اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔'' فرمایا: ''کہہ، تیری جان تجھے بخشی۔'' خوجا بولا: ''آپ کی ذات قدر دان ہے۔ واسطے خُدا کے چلون کو درمیان سے اُٹھوا کر پہچانیئے اور اِس کی بے کسی کی حالت پر رحم کیجیئے۔ ناحق شناسی خُوب نہیں۔ اب اِس کے احوال پر جو کچھ ترس کھایئے بجا ہے، اور جائے ثواب ہے۔ آگے حدِ ادب، جو مزاجِ مبارک میں آوے سو ہی بہتر ہے۔''

اِتنے کہنے پر مُسکرا کر فرمایا: ''بھلا۔ کوئی ہو، اِسے دارالشِفا میں رکھو۔ جب بَھلا چنگا ہوگا، تب اِس کے احوال کی پُرسش کی جائے گی۔'' خوجے نے کہا: ''اگر اپنے دستِ خاص سے گُلاب اس پر چھڑکیئے اور زبان سے کچھ فرمایئے تو اِس کو اپنے جینے کا بھروسا بندھے۔ نا اُمیدی بُری چیز ہے۔ دنیا بہ اُمید قایم ہے۔'' اِس پر بھی اُس پری نے کچھ نہ کہا۔ یہ سوال جواب سُن کر میں بھی اپنے جی سے اُکتا رہا تھا۔ بِدھڑک بول اٹھا کہ اب اِس طور کی زندگی کو دل نہیں چاہتا۔ پاؤں تو گور میں لٹکا چُکا ہوں۔ ایک روز مرنا ہے اور عِلاج میرا بادشاہ زادی کے ہاتھ میں ہے۔ کریں یا نہ کریں، وہ(۱۵۳) جانیں۔''(۱۵۴) بارے مُقلِّبُ القلوب نے اُس سنگدل کے دل کو نرم کیا۔ مہربان ہو کر فرمایا: ''جلد پادشاہی(۱۵۵) حکیموں کو حاضر کرو۔'' وُہیں طبیب آ کر جمع ہوئے۔ نبض، قارورہ دیکھ کر بہت غور کی۔ آخرش تشخیص میں ٹھہرا کہ یہ شخص کہیں عاشق ہُوا ہے۔ سِوائے وصلِ معشوق کے اِس کا کچھ علاج نہیں۔ جس وقت وہ ملے، یہ صحت پاوے۔ جب حکیموں کی بھی زبانی یہی مرض میرا ثابت ہُوا، حکم کیا: ''اِس جوان کو گرمابے میں لے جاؤ۔ نہلا کر، خاصی پوشاک پہنا کر حضور میں لے آؤ۔'' وُنہیں مُجھے باہر لے گئے۔ حمام کروا، اچھے کپڑے پہنا، خدمت میں پری کی حاضر کیا۔ تب وہ نازنین تپاک سے بولی: ''تُو نے مجھے بیٹھے بٹھائے ناحق بدنام اور رُسوا کیا۔ اب اور کیا کِیا چاہتا ہے؟ جو تیرے دل میں ہے صاف صاف بیان کر۔''

یا فُقرا! اُس وقت یہ عالَم ہُوا کہ شادی مرگ ہو جاؤں۔ خوشی کے مارے ایسا پھُولا کہ جامے میں نہ سماتا تھا اور صُورت شکل بدل گئی۔ شُکر خدا کا کیا اور اُس سے کہا: ''اِس دم ساری حکیمی آپ پر ختم ہوئی کہ مجھ سے مُردے کو ایک بات میں زندہ کیا۔ دیکھو تو اُس وقت سے اِس وقت تک میرے احوال میں کیا فرق ہو گیا۔'' یہ کہہ کر تین بار گِرد پھرا اور سامنے آ کر کھڑا ہُوا اور کہا: ''حضور سے یُوں حُکم ہوتا ہے کہ جو تیرے جی میں ہو سو کہہ۔ بندے کو ہفت اِقلیم کی سلطنت سے زیادہ یہ ہے کہ غریب نوازی کر کر اِس عاجز کو قبول کیجیے اور اپنی قدم بوسی سے سرفرازی دیجیئے۔'' ایک لحظہ تو سُن کر غوطے میں گئی، پھر کن انکھیوں سے دیکھ کر کہا: ''بیٹھو، تُم نے خدمت اور وفاداری ایسی ہی کی ہے، جو کچھ کہو، سو پھبتی ہے(۱۵۶) اور اپنے بھی دل پر نقش ہے۔ خیر، ہم نے قبول کیا۔''

اُسی دن، اچھی ساعت، سُبھ لگن میں چپکے چپکے قاضی نے نِکاح پڑھ دیا۔ بعد اتنی محنت اور آفت کے خدا نے یہ دن دکھایا کہ میں نے اپنے دل کا مُدعا پایا، لیکن جیسی دل میں آرزو اُس پری سے ہم بستر ہونے کی تھی، ویسی ہی جی میں بے کلی اُس وارداتِ عجیب کے معلوم کرنے کی تھی کہ آج تک میں نے کچھ نہ سمجھا کہ یہ پَری کون ہے؟ اور وہ حبشی ساتُولا سجیلا، جس نے ایک پُرزے کاغذ پر اِتنی اشرفیوں کے بدرے میرے حوالے کیئے، کون تھا؟ (۱۵۷) اور تیاری ضیافت کی پادشاہوں (۱۵۸) کے لائق، ایک پہر میں کیوں کر ہُوئی؟ اور وے دونوں بے گناہ اُس مجلس میں کس لیئے مارے گئے؟ اور سبب خفگی اور بے مُروّتی کا، باوجود خدمت گُزاری اور ناز برداری کے؛ مُجھ پر کیا ہُوا؟ اور پھر ایک بارگی اِس عاجز کو یُوں سَر بُلند کیا؟ غرض اِسی واسطے بعد رسم رسوماتِ عقد کے آٹھ دن تلک باوصف اُس اشتیاق کے قصد مُباشرت کا نہ کیا۔ رات کو ساتھ سوتا۔ دِن کو یُونہیں اُٹھ کھڑا ہوتا۔

ایک دن غُسل کرنے کے لیئے میں نے خواص کو کہا کہ تھوڑا پانی گرم کر دے تو نہاؤں۔ ملکہ مُسکرا کر بولی: ''کِس برتے پر تتا پانی؟'' میں خاموش ہو رہا، لیکن وہ پَری میری حرکت سے حیران ہوئی، بلکہ چہرے پر آثار خفگی کے نمود ہُوئے۔ یہاں تلک کہ ایک روز بولی: ''تم بھی عجب آدمی ہو۔ یا اِتنے گرم یا ایسے ٹھنڈ ے۔ (۱۵۹) اِس کو کیا کہتے ہیں؟ اگر تم میں قُوّت نہ تھی تو کیوں ایسی کچی ہوس پکائی؟'' اُس وقت میں نے بھی بے دھڑک ہو کر کہا: ''اے جانی! مُنصفی شرط ہے۔ آدمی کو چاہیئے کہ اِنصاف سے نہ چُوکے۔'' بولی: ''اب کیا انصاف رہ گیا ہے؟ جو کچھ ہونا تھا سو ہو چُکا۔'' فقیر نے کہا: ''واقعی بڑی آرزو اور مُراد میری یہی تھی، سو مُجھے ملی۔ لیکن دِل میرا ذُبدہے میں ہے۔ اور دو دِلے آدمی کی، خاطر پریشان رہتی ہے۔ اُس سے کچھ ہو نہیں سکتا۔ اِنسانیت سے خارج ہو جاتا ہے۔ میں نے اپنے دل میں یہ قول کیا تھا کہ بعد اِس نکاح کے، کہ عین دل کی شادی ہے؛ بعضی بعضی باتیں، جو خیال میں نہیں آتیں اور نہیں کُھلتیں؛ حُضور میں پُوچھوں گا کہ زبانِ مُبارک سے اُس کا بیان سُنوں تو جی کو تسکین ہو۔'' (۱۶۰) اُس پری نے چیں بہ چیں ہو کر کہا: ''کیا خُوب! ابھی سے بُھول گئے۔ یاد کرو، بارہا ہم نے کہا کہ (۱۶۱) ہمارے کام میں ہرگز دخل نہ کیجیو اور کسی بات کے مُتعرض نہ ہوجیو۔ (۱۶۲) خِلافِ معمول یہ بے ادبی کرنی کیا لازم ہے؟'' فقیر نے ہنس کر کہا: ''جیسی اور بے اَدبیاں مُعاف کرنے کا حُکم ہے۔ ایک یہ بھی سہی''۔ وہ پری نظریں بدل کر، تیہے میں آ کر آگ کا بگولا بن گئی اور بولی: ''اب تُو بہت سر چڑھا! جا اپنا کام کر۔ اِن باتوں سے تُجھے کیا فایدہ ہو گا؟'' میں نے کہا: ''دُنیا میں اپنے بدن کی شرم سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن ایک، دُوسرے کا واقِف کار ہوتا ہے۔ پس جب ایسی چیز دل پر روا رکھی تو اَور کون سا بھید چُھپانے کے لایق ہے؟''

میری اِس رمز کو وہ پری، وقوف سے دریافت کر کر کہنے لگی: ''یہ بات سچ ہے، پر جی میں یہ سوچ آتا ہے کہ اگر مجھ نگوڑی کا راز فاش ہو تو بڑی قیامت مچے۔'' میں بولا: ''یہ کیا مذکور ہے؟ بندے کی طرف سے یہ خیال دل میں نہ لاؤ اور خوشی سے ساری کیفیت جو بیتی ہے، فرماؤ۔ ہرگز ہرگز (۱۶۳) میں دِل سے زبان تک نہ لاوٗں گا۔ کِسو کے کان پڑنا، کیا امکان ہے؟'' جب اُس نے دیکھا کہ اب سِوائے کہنے کے، اِس عزیز سے چھٹکارا نہیں، لاچار ہو کر بولی: ''اِن باتوں کے کہنے میں بہت سی خرابیاں ہیں۔ تُو خواہ نخواہ درپے ہُوا۔ خیر، تیری خاطر عزیز ہے۔ اِس لیئے اپنی سرگذشت بیان کرتی ہُوں۔ تُجھے بھی اِس کا پوشیدہ رکھنا ضرور ہے۔ خبر شرط۔''

غرض بہت سی تاکید کر کر کہنے لگی: ''کہ میں بد بخت، مُلک دمشق کے سُلطان کی بیٹی ہوں اور وہ سلاطینوں سے بڑا پادشاہ (۱۶۴) ہے۔ سِوائے میرے، کوئی لڑکا بالا اُس کے یہاں نہیں ہُوا۔ جس دن سے میں پیدا ہوئی، ماباپ کے سائے میں ناز و نعمت اور خوشی خُرمی سے پلی۔ جب ہوش آیا، تب اپنے دل کو خُوب صُورتوں اور نازنینوں کے ساتھ لگایا۔ چنانچہ سُتھری سُتھری پری زاد ہمجولی، اُمرازادیاں (۱۶۵) مصاحبت میں، اور اچّھی (۱۶۶) قبول صُورت ہم عُمر خواصیں، سہیلیاں خدمت میں رہتی تھیں۔ تماشا، ناچ اور راگ رنگ کا ہمیشہ دیکھا کرتی۔ دُنیا کے بھلے بُرے سے کچھ سروکار نہ تھا۔ اپنی بےفکری کے عالَم کو دیکھ کر سِوائے خدا کے شُکر کے، کُچھ مُنہہ سے نہ نکلتا تھا۔

اتفاقاً طبیعت خُود بخُود ایسی بے مزہ ہوئی کہ نہ مُصاحبت کِسو کی بھاوے، نہ مَجلس خوشی کی خوش آوے۔ سَودائی سا مزاج ہو گیا۔ دِل اُداس اور حیران۔ نہ کِسو کی صُورت اچّھی لگے، نہ بات کہنے سُننے کو جی چاہے۔ میری یہ حالت دیکھ کر دائی، دَدا، چھو چھو، انگا سب کی سب مُتفکر ہوئیں اور قدم پر گرنے لگیں۔ یہی خواجہ سرا، نمک حلال، قدیم سے میرا محرم اور ہمراز ہے۔ اِسّے کوئی بات مخفی نہیں۔ میری وحشت دیکھ کر بولا: ''اگر بادشاہ زادی تھوڑا سا شربت ورق الخیال کا نوشِ جاں فرماویں تو اغلب ہے کہ طبیعت بحال ہو جاوے اور فرحت مزاج میں آوے۔'' اُس کے اِس طرح کے کہنے سے مجھے بھی شوق ہُوا۔ تب میں نے فرمایا: ''جلد حاضر کر۔'' محلی باہر گیا۔ ایک صُراحی اُسی شربت کی تکلف سے بنا کر، برف میں لگا کر لڑکے کے ہاتھ لِوا کر آیا۔ میں نے پیا، اور جو کُچھ اُس کا فائدہ بیان کیا تھا، ویسا ہی دیکھا۔ اُس وقت، اُس خدمت کے انعام میں ایک بھاری خِلعت خوجے کو عنایت کی اور حُکم کیا کہ ایک صُراحی ہمیشہ بلا ناغہ اِسی وقت حاضر کیا کر۔ (۱۶۷) اُس دن سے یہ مُقرر رہا کہ خواجہ سرا، صُراحی اُسی چھوکرے کے ہاتھ لِوا لاوے اور بندی پی جاوے۔ جب اُس کا نشہ طلوع ہوتا تو اُس کی لہر میں اُس لڑکے سے ٹھٹھا مزاخ کر کر دل بہلاتی تھی۔ وہ بھی جب ڈھیٹھ ہُوا، تب اچّھی اچّھی، میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا اور اچنبھے کی نقلیں

لانے، بلکہ آہ اُوہی بھی بھرنے اور سسکیاں لینے۔ صُورت تو اُس کی طرح دار، لایق دیکھنے کے تھی، بے اختیار جی چاہنے لگا۔ میں دِل کے شوق سے اور اٹھکھیلیوں کے ذوق سے، ہر روز اِنعام بخشش دینے لگی۔ پر وہ کمبخت ویسے کپڑوں سے، جیسے ہمیشہ پہنے رہتا تھا، حضور میں آتا۔ بلکہ وہ لباس بھی مَیلا کُچیلا ہو جاتا۔(۱۶۸) (۱۶۹)

ایک دن پُوچھا: ''تجھے سرکار سے اِتنا کچھ ملا، پر تُو نے اپنی صورت ویسی کی ویسی ہی پریشان بنا رکھی؛ کیا سبب ہے۔ وے روپے کہاں خرچ کیئے، یا جمع کر رکھے؟''(۱۷۰) لڑکے نے یے خاطرداری کی باتیں جو سُنیں، اور مجھے اپنا احوال پُرسا پایا؛ آنسوں ڈُبڈُبا کر(۱۷۱) کہنے لگا: ''جو کچھ آپ نے اِس غلام کو عنایت کیا، سب اُستاد نے لے لیا۔ مجھے ایک پیسہ نہیں دیا۔ کہاں سے دوسرے کپڑے بناؤں جو پہن کر حضور میں آؤں؟ اِس میں میری تقصیر نہیں۔ میں لاچار ہوں۔'' اِس غریبی کے کہنے پر اُس کے ترس آیا۔ وُونہیں خواجہ سرا کو فرمایا کہ آج سے اِس لڑکے کو اپنی صُحبت میں تربیت کر اور اچھا لباس تیار کروا کر پہنا اور لونڈوں میں بے فائدہ کھیلنے کُودنے نہ دے۔ بلکہ اپنی خوشی یہ ہے کہ آداب لایق حضور کی خدمت کے، سیکھے اور حاضر رہے۔ خواجہ سرا مُوافق فرمانے کے بجالایا اور میری مرضی جو اُدھر دیکھی، نہایت اُس کی خبر گیری کرنے لگا۔ تھوڑے دنوں میں فراغت اور خوش خوری کے سبب سے اُس کا رنگ روغن کچھ کا کچھ ہو گیا اور کینچلی سی ڈال دی۔ میں اپنے دل کو ہر چند سنبھالتی، پر اُس کافر کی صورت جی میں ایسی کُھب گئی تھی، یہی جی چاہتا تھا کہ مارے پیار کے اُسے کلیجے میں ڈال رکھوں اور اپنی آنکھوں سے ایک پَل جُدا نہ کروں۔ آخر اُس کو مصاحبت میں داخل کیا اور خِلعتیں طرح بہ طرح کی، اور جواہر رنگ برنگ کے پہنا کر دیکھا کرتی۔ بارے اُس کے نزدیک رہنے سے آنکھوں کو سُکھ، کلیجے کو ٹھنڈھک(۱۷۲) ہوئی۔ ہر دم اُس کی خاطرداری کرتی۔ آخر کو میری یہ حالت پہنچی کہ اگر ایک دم کچھ ضروری کام کو میرے سامنھے سے جاتا، تو چَین نہ آتا۔

بعد کئی برس کے وہ بالغ ہُوا۔ مَسیں بھیگنے لگیں، چَھب تختی درست ہُوئی۔ تب اُس کا چرچا باہر درباریوں میں ہونے لگا۔ دربان اور رَدَّنے،(۱۷۳) میوڑے، باریدار اور یساول، چوبدار اُس کو محل کے اندر آنے جانے سے منع کرنے لگے۔ آخر اُس کا آنا مَوقُوف ہُوا۔ مجھے تو اُس بغیر کَل نہ پڑتی تھی۔ ایک دَم پہاڑ تھا۔ جب یہ احوال نا اُمیدی کا سُنا، ایسی بدحواس ہو گئی، گویا مُجھ پر قیامت ٹُوٹی اور یہ حالت ہوئی کہ نہ کچھ کہہ سکتی ہوں، نہ اُس بِن رہ سکتی ہُوں۔ کچھ بس نہیں چل سکتا۔ الٰہی کیا کروں! عجب طرح کا قلَق ہُوا۔ مارے بے قراری کے، اُسی مَحلی کو، جو میرا بھیدُ وتھا، بُلا کر کہا کہ مجھے غور اور پرداخت اُس لڑکے کی منظور ہے۔(۱۷۴) بالفعل صلاحِ وقت یہ ہے کہ ہزار اشرفی پُونجی دے کر چوک کے چوراہے میں دکان جوہری کی کروا دو تو تجارت کر کے اُس کے نفع سے اپنی گذران

فراغت سے کیا کرے، اور میرے محل کے قریب ایک حویلی اچھے نقشے کی رہنے کے لیے بنوادو۔ لونڈی، غُلام، نوکر چاکر جو ضرور رہوں، مول لے کر اور دَرماہا مُقرر کر کر اُس پاس (۱۷۵) رکھوادو کہ کسو طرح بے آرام نہ ہو۔ خواجہ سرا نے اُس کی بُود و باش کی اور جوہری پنے اور تجارت کی سب تیاری کر دی۔ تھوڑے عرصے میں اُس کی دکان ایسی چمکی اور نمود ہُوئی کہ جو خلعتیں فاخرہ اور جواہرِ بیش قیمت، سرکار میں بادشاہ کی اور امیروں کی، درکار و مطلوب ہوتے، اُسی کے یہاں بہم پُہنچتے۔ آہستہ آہستہ یہ دُکان جمی کہ جو تحفہ ہر ایک ملک کا چاہیے، وہیں ملے۔ سب جُوہریوں کا روزگار اُس کے آگے مَندا ہو گیا۔ (۱۷۶)

غرض اُس شہر میں کوئی برابری اُس کی نہ کر سکتا، بلکہ کسی ملک میں ویسا کوئی نہ تھا۔ (۱۷۷) اِسی کاروبار میں اُس نے تو لاکھوں روپے کمائے، پر جدائی اُس کی روز بروز نقصان میرے تن بدن کا کرنے لگی۔ کوئی تدبیر نہ بن آئی کہ اُس کو دیکھ کر اپنے دل کی تسلّی کروں۔ بِداں، صلاح کی خاطر، اُسی واقِف کار مَحلی کو بُلایا اور کہا: ''کوئی ایسی صُورت بن نہیں آتی کہ ذرا اُس کی صُورت، میں دیکھوں اور اپنی جان کو صبر دُوں۔ مگر یہ طرح ہے کہ ایک سُرنگ اُس کی حویلی سے گھدوا کر محل میں مِلا دو۔'' حُکم کرتے ہی کئی دِنوں میں ایسی نقب تیار ہُوئی کہ جب سَہی سانجھ ہوتی، چپکے ہی وہ خواجہ سرا اُس جوان کو اُسی راہ سے لے آتا۔ تمام شب، شراب، کباب، عیش و عشرت میں کٹتی۔ میں اُس کے ملنے سے آرام پاتی۔ وہ میرے دیکھنے سے خُوش ہوتا۔ (۱۷۸)

جب فجر کا تارا نِکلتا اور مؤذن اذان دیتا مَحلی اُسی راہ سے اُس جوان کو اُس کے گھر پہنچا دیتا۔ اِن باتوں سے سوائے اُس خوجے کے اور دو دائیوں کے، جنھوں نے مجھے دُودھ پلایا اور پالا تھا، چوتھا آدمی کوئی واقِف نہ تھا۔ (۱۷۹)

ایک مُدّت اِس طرح سے گذری۔ ایک روز کا یہ ذکر ہے، مُوافق معمول کے، خوجہ (۱۸۰) جو اُس کو بُلانے گیا، دیکھے تو وہ جوان، فکرمند سا چُپکا بیٹھا ہے۔ مَحلی نے پُوچھا: ''آج خیر ہے، کیوں ایسے دلگیر ہو رہے ہو؟ چلو حضور میں، یاد فرمایا ہے۔'' اُس نے ہرگز کچھ جواب نہ دیا۔ زبان نہ ہلائی۔ خواجہ سرا اپنا سا مُنہ لے کر اکیلا پھر آیا، احوال اُس کا عرض کیا۔ (۱۸۱) میرے تئیں، شیطان جو خراب کرے، اِس پر بھی محبت اُس کی دل سے نہ بُھولی۔ اگر یہ جانتی کہ عشق اور چاہ ایسے نمک حرام، بے وفا کی، آخر کو بدنام اور رُسوا کرے گی اور ننگ و ناموس سب ٹھکانے لگے گا: تو اُسی دم اُس کام سے باز آتی اور توبہ کرتی، پھر اُس کا نام نہ لیتی؛ نہ اپنا دل اُس بے حیا کو دیتی۔ پر ہونا تو یُوں تھا۔ اِس لیئے حرکتِ بے جا اُس کی خاطر میں نہ لائی اور اُس کے نہ آنے کو معشوقوں کا چوچلا اور ناز سمجھا۔ اُس کا

نتیجہ یہ دیکھا کہ اِس سرگذشت سے بغیر دیکھے بھالے تُو بھی واقف ہُوا۔ نہیں تو میں کہاں اور تُو کہاں؟ خیر جو ہُوا سو ہُوا۔ (۱۸۲) اِس خرد ماغی پر اُس گدھے کی خیال نہ کر، دوبارہ خوجے کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ اگر تُو اِس وقت نہیں آوے گا، تو میں، کِسو نہ کِسو ڈھب سے وہیں آتی ہوں۔ لیکن میرے آنے میں بڑی قباحت ہے۔ اگر یہ راز فاش ہو (۱۸۳) تو تیرے حق میں بہت بُرا ہے۔ ایسا کام نہ کر جس میں سوائے رُسوائی کے اور کچھ پھل نہ ملے۔ بہتر یہی ہے جلد چلا آ۔ نہیں تو مجھے پُہنچا جان۔

جب یہ سَندیسا گیا اور اِشتیاق میرا بیٹ دیکھا، بھونڈی سی صُورت بنائے ہوئے، ناز نخرے سے آیا۔"

جب میرے پاس بیٹھا، تب میں نے اُس سے پُوچھا کہ آج رُکاوٹ اور خَفگی کا کیا باعث ہے؟ اِتنی شوخی اور گستاخی تُو نے کبھو نہ کی تھی، ہمیشہ بلا عذر حاضر ہوتا تھا۔ تب اُس نے کہا کہ میں گُمنام، غریب، حضور کی توجہ سے اور دامنِ دولت کے باعث اِس مقدور کو پہنچا۔ بہت آرام سے زندگی کٹتی ہے، آپ کے جان و مال کو دُعا کرتا ہوں۔ یہ تقصیر بادشاہ زادی کے معاف کرنے کے بھروسے، اِس گنہ گار سے سرزد ہوئی۔ اُمیدوار، عفو کا ہُوں۔ میں تو جان و دل سے اُسے چاہتی تھی۔ اُس کے بناوٹ کی باتوں کو مان لیا اور شرارت پر نظر نہ کی بلکہ پھر دِلداری سے پُوچھا: "کیا تُجھ کو ایسی مُشکل کٹھن پیش آئی جو ایسا مُتفکر ہو رہا ہے؟ اُس کو عرض کر۔ اُس کی بھی تدبیر ہو جائے گی۔"

غرض اُس نے اپنی خاکساری کی راہ سے یہی کہا کہ مُجھ کو سب مُشکل ہے، اور آپ کے رُوبرُو سب آسان ہے۔ آخر اُس کے فحوائے کلام اور بَت کہاوٗ سے یہ کُھلا کہ ایک باغ، نہایت سرسبز اور عمارت عالی، حوض، تالاب، کُوئے پُختہ (۱۸۴) سمیت، غلام کی حویلی کے نزدیک ناف شہر میں بِکاوٗ ہے اور اُس باغ کے ساتھ ایک لونڈی بھی گائن، کہ علمِ مُوسیقی میں خُوب سلیقہ رکھتی ہے لیکن یے دونوں باہم بکتے ہیں۔ نہ اکیلا باغ، جیسے اُونٹ کے گلے میں بلّی۔ جو کوئی وہ باغ لیوے، اُس کنیز کی بھی قیمت دیوے۔ اور تماشہ یہ ہے، باغ کا مول لاکھ روپے اور اُس باندی کا بہا پانچ لاکھ۔ فِدوی سے اِتنے روپے بالفعل سرانجام نہیں ہوسکتے۔ میں نے اُس کا دل، بہت بے اختیار شوق میں اُن کی خریداری کے پایا کہ اِسی واسطے دل حیران اور خاطر پریشان تھا۔ باوجودیکہ رُوبرُو میرے پاس بیٹھا تھا، تب بھی اُس کا چہرہ ملین اور جی اُداس تھا۔ مجھے تو خاطر داری اُس کی، ہر گھڑی اور ہر پل منظور تھی۔ اُسی وقت خواجہ سرا کو حُکم کیا کہ کل صُبح کو قیمت اُس باغ کی لونڈی سمیت چُکا کر قبالہ باغ کا اور خط کنیزک کا لِکھوا کر اِس شخص کے حوالے کرو اور مالِک کو زرِ قیمت خزانۂ عامرہ سے دِلوا دو۔ اِس پروانگی کے سُنتے ہی آداب بجا لایا اور مُنہہ پر رَونہت آئی۔ ساری رات اُسی قاعدے سے، جیسے ہمیشہ گذرتی تھی، ہنسی خوشی سے کٹی۔ فجر ہوتے

ہی وہ رُخصت ہُوا۔ خوجے نے مُوافق فرمانے کے، اُس باغ کو اور لونڈی کو خرید کر دیا۔ پھر وہ جوان رات کو مُوافق معمول کے آیا جایا کرتا۔

ایک روز بہار کے موسم میں کہ مکان بھی دلچسپ تھا؛ بدلی گھمنڈ رہی تھی، پھُونہیاں (۱۸۵) پڑ رہیں تھیں، بجلی بھی کوندھ رہی تھی اور ہَوا نرم نرم بہتی تھی۔ غرض عجب کیفیت اُس دم تھی۔ دُونہیں (۱۸۶) رنگ برنگ کے حُباب اور گُلابیاں طاقوں پر چُنی ہُوئیں نظر پڑیں، دل للچایا کہ ایک گھونٹ لوں۔ جب دو تین پیالوں کی نوبت پہنچی، دُونہیں خیال اُس باغ نوخرید کا گذرا۔ کمال شوق ہُوا کہ ایک دَم اِس عالَم میں وہاں کی سیر کیا چاہیئے۔ کم بختی جو آوے، اُونٹ چڑھے کُتا کاٹے۔ اچھی طرح بیٹھے بٹھائے ایک دائی کو ساتھ لے کر سُرنگ کی راہ سے اُس جوان کے مکان میں گئی۔ وہاں سے باغ کی طرف چلی۔ دیکھا تو ٹھیک اُس باغ کی بہار، بہشت کی برابری کر رہی ہے۔ قطرے مینہہ کے درختوں کے سر سبز پتوں پر جو پڑے ہیں، گویا زمرد کی پٹریوں پر موتی جڑے ہیں، اور سُرخی پھُولوں کی اُس اَبر میں ایسی بَھلی لگتی ہے، جیسے شام کو شفق پھُولے ہے اور نہریں لباب، مانند فرش آئینے کے نظر آتی ہیں اور مَوجیں لہراتی ہیں۔

غرض اُس باغ میں ہر طرف سیر کرتی پھرتی تھی کہ دن ہو چُکا، سیاہی شام کی نمود ہوئی۔ اِتنے میں وہ جوان ایک رَوِش پر نظر آیا اور مجھے دیکھ کر بہت اَدب اور گرم جوشی سے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ پر دُھر کر بارہ دری کی طرف لے چلا۔ جب وہاں میں گئی تو وہاں کے عالَم نے سارے باغ کی کیفیت کو دل سے بھُلا دیا۔ یہ روشنی کا ٹھاٹھ تھا۔ جا بجا قُمقمے، سَرو چراغاں، کنول اور فانوسِ خیال؛ شمع مجلس، حیران اور فانوسیں روشن تھیں کہ شبِ برات باوجود چاندنی اور چراغاں کے اُس کے آگے اندھیری لگتی۔ ایک طرف آتشبازی: پھُل جھڑی، انار، داؤدی، پھُچپا، مَرواریہ، مہتابی، ہَوائی، چرخی، ہتھ پھُول، جاہی جُوہی، پٹاخے، ستارے چھُٹتے تھے۔

اِس عرصے میں بادل پھَٹ گیا اور چاند نکل آیا، بعینہ جیسے نافرمانی جوڑا پہنے ہوئے کوئی معشوق نظر آجاتا ہے۔ بڑی کیفیت ہوئی۔ چاندنی چھٹکتے ہی جوان نے کہا: ''اب چل کر باغ کے بالا خانے پر بیٹھیے۔'' میں ایسی احمق ہوگئی تھی کہ جو وہ نگوڑا کہتا، سو میں مان لیتی۔ اَب یہ ناچ نچایا کہ مجھ کو اُوپر لے گیا۔ (۱۸۷) وہ کوٹھا ایسا بُلند تھا کہ تمام شہر کے مکان اور بازار کے چراغاں، گویا اُس کے پائیں باغ تھے۔ (۱۸۸)

میں اُس جوان کے گلے میں ہاتھ ڈالے (۱۸۹) ہوئے خوشی کے عالم میں بیٹھی تھی۔ اِتنے میں ایک رنڈی نہایت بھونڈی سی، صُورت نہ شکل، چُولھے میں سے نکل، شراب کا شیشہ ہاتھ میں لیئے ہُوئے آ پہنچی۔ مجھے اُس

وقت اُس کا آنا نپٹ بُرا لگا اور اُس کی صُورت دیکھنے سے دل میں ہَول اُٹھی۔ تب میں نے گھبرا کر جوان سے پُوچھا: ''یہ تحفۂ علّت کون ہے؟ تُو نے کہاں سے پیدا کی؟'' وہ جوان ہاتھ باندھ کر کہنے لگا: ''یہ وہی لونڈی ہے جو اِس باغ کے ساتھ حضور کی عنایت سے خرید ہُوئی۔''

میں نے معلوم کیا کہ اُس احمق نے بڑی خواہش سے اِس کو لیا ہے، شاید اِس کا دل اِس پر مائل ہے، اِسی خاطر سے پیچ تاب کھا کر میں چپکی ہو رہی، لیکن دِل اُسی وقت سے مُکدّر رہُوا اور ناخوشی مزاج پر چھا گئی۔ تس پر قیامت اُس ایسے تیسے نے یہ کی، کہ ساقی اُسی چھنال کو بنایا۔ اُس وقت میں اپنا لہو پیتی تھی اور جیسے طوطی کو کوئی کوّے کے ساتھ ایک پنجرے میں بند کرتا ہے، نہ جانے کی فرصت پاتی تھی، اور نہ بیٹھنے کو جی چاہتا تھا۔

قِصّہ مُختصر، وہ شراب بوند کی بُوند تھی، جس کے پینے سے آدمی حیوان ہو جاوے۔ دو چار جام پے دَر پے اُسی تیز آب کے جوان کو دیئے اور آدھا پیالہ جوان کی منت سے میں نے بھی زہر مار کیا۔ آخر وہ چھلشت، بے حیا بھی بدمست ہو کر اُس مردود سے بے ہودہ ادائیں کرنے لگی، اور وہ چھلّا بھی نشے میں بے لحاظ ہو چلا اور نامعقول حرکتیں کرنے لگا۔ مجھے یہ غیرت آئی، اگر اِس وقت زمین پھاٹے تو میں سما جاؤں۔ لیکن اُس کی دوستی کے باعث میں بلبلی اِس پر بھی چُپ ہو رہی، پر وہ تو اصل کا پاجی تھا۔ میرے اِس درگزر کرنے کو نہ سمجھا، نشے کی لہر میں اور بھی دو پیالے چڑھا گیا کہ رہتا سہتا ہوش جو تھا، وہ بھی گُم ہُوا، اور میری طرف سے مُطلق دھڑکا جی سے اُٹھا دیا۔ بے شرمی سے شہوت کے غلبے میں میرے رُوبرو اُس بے حیا نے اُس ہِنڈوڑ سے صُحبت کی۔ اور وہ پچھل پائی بھی اُس حالت میں نیچے پڑی ہوئی نخرے تِلّے کرنے لگی، اور دونوں میں چُوما چاٹی ہونے لگی۔ نہ اس بے وفا میں وفا، نہ اُس بے حیا میں حیا۔ جیسی رُوح ویسے فرشتے۔ (۱۹۰) میری اُس وقت یہ حالت تھی جیسی اوسر چُوکی ڈومنی گادے تال بے تال۔ اپنے اُوپر لعنت کرتی تھی کہ کیوں تُو یہاں آئی، جس کی یہ سزا پائی؟ آخر کہاں تک سہوں۔ میرے سر سے پاؤں تک آگ لگ گئی اور انگاروں پر لوٹنے لگی۔ اِس غصے اور طیش میں یہ کہاوت، بیل نہ کودا کودے گون، یہ تماشا دیکھے کون، کہتی ہوئی وہاں سے اُٹھی (۱۹۱) وہ شرابی، اپنی خرابی دل میں سوچا کہ اگر پادشاہ زادی اِس وقت ناخوش ہُوئی تو کل میرا کیا حال ہوگا اور صبح کو کیا قیمت مچے گی؟ اب بنے تو اِس کا کام تمام کر ڈالوں (۱۹۲)۔ یہ ارادہ اُس غیبانی کی صلاح سے جی میں ٹھہرا کر گلے میں پٹکا ڈال میرے پاؤں آ کر پڑا، اور پگڑی سر سے اُتار کر منت وزاری کرنے لگا۔ میرا دل تو اُس پر لٹو ہو ہی رہا تھا، جیدھر لیئے پھرتا تھا، پھرتی تھی اور چکّی کی طرح میں اُس کے اختیار میں تھی۔ (۱۹۳) جو کہتا تھا، سو کرتی تھی۔ جُوں تُوں مُجھے پُھسلا پنڈ ھلا کر (۱۹۴) پھر ڈھلایا اور اُسی شراب دو آتشہ کے دو چار

پیالے بھر بھر کر آپ بھی پیئے اور مجھے بھی دیئے۔ ایک تو غُصّے کے مارے جل بُھن کر کباب ہو رہی تھی، دوسرے ایسی شراب پی، جلد بے ہوش ہوگئی۔ کچھ حواس باقی نہ رہے۔ تب اُس بے رحم، نمک حرام، کٹّر سنگ دِل نے تلوار سے مجھے گھایل کیا، بلکہ اپنی دانست میں مار چُکا۔ اُس دم میری آنکھ کھُلی تو مُنہہ سے یہی نکلا: ''خیر، جیسا ہم نے کیا، ویسا پایا۔ لیکن تُو، اپنے تئیں میرے اِس خُونِ ناحق سے بچائیو۔

مُبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر

مرے لہو کو تو دامن سے دھو، ہُوا سو ہُوا (۱۹۵)

کسی سے یہ بھید ظاہر نہ کیجو، اور ہم نے تو تجھ سے جان تک بھی درگذر نہ کی۔'' پھر اُس کو خُدا کے حوالے کر کر میرا جی ڈوب گیا۔ مجھے اپنی سُدھ بُدھ کچھ نہ رہی۔ شاید اُس قصائی نے مجھے مُردہ خیال کر، اُس صندوق میں ڈال کر قلعے کی دیوار کے تلے لٹکا دیا۔ سو تُو نے دیکھا، میں، کسو کا بُرا نہ چاہتی تھی۔ لیکن یہ خرابیاں قسمت میں لکھی تھی :

اِن آنکھوں کے سبب یہ کُچھ دیکھا مِٹتی نہیں کرم کی ریکھا

اگر خُوب صُورتوں کے دیکھنے کا دل میں شوق نہ ہوتا تو وہ بد بخت میرے گلے کا طوق نہ ہوتا۔ اللہ نے یہ کام کیا کہ تجھ کو وہاں پہنچا دیا، اور سبب میری زندگی کا کیا۔ اب حیا جی میں آتی ہے کہ یہ رُسوائیاں کھینچ کر اپنے تئیں جیتا نہ رکھوں یا، کسو کو مُنہہ نہ دکھاؤں۔ پر کیا کروں، مرنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں نہیں۔ خُدا نے مار کر پھر جلایا۔ آگے دیکھیئے کہ کیا قسمت میں بدا ہے۔ ظاہر میں تو تیری دَوڑ دھُوپ اور خدمت کام آئی، جو ویسے زخموں سے شِفا پائی۔ تُو نے جان و مال سے میری خاطر کی اور جو کچھ اپنی بساط تھی، حاضر کی۔ اُن دنوں تجھے بے خرچ اور دو دِلا دیکھ کر وہ رُقعہ سیدی بہار کو، جو میرا خزانچی ہے، لکھا۔ (۱۹۶) اُس میں یہی مضمون تھا کہ میں خیر و عافیت سے اب فُلانے مکان میں ہوں۔ مجھ بد طالع کی خبر والدہ شریفہ کی خدمت میں پہنچائیو۔ اُس نے تیرے ساتھ دو کشتیاں نقد کی، (۱۹۷) خرچ کی خاطر بھیج دیں اور جب تجھے خلعت اور جواہر کے خرید کرنے کو یوسف سوداگر بچے کی دکان پر بھیجا، (۱۹۸) مجھے یہ بھروسا تھا کہ وہ کم حوصلہ ہر ایک سے جلد آشنا ہو بیٹھتا ہے۔ (۱۹۹) تجھے بھی اجنبی جان کر اغلب ہے کہ دوستی کرنے کے لیئے اِترا کر دعوت اور ضیافت کرے گا۔ سو میرا منصوبہ ٹھیک بیٹھا۔ جو کچھ میرے دل میں خیال آیا تھا اُس نے ویسا ہی کیا۔ تُو جب اُس سے قول قرار پھر آنے کا کر کر میرے پاس آیا اور مہمانی کی حقیقت اور اس کا بجد ہونا مجھ سے کہا، میں دِل میں خوش ہوئی کہ جب تُو اُس کے گھر میں جا کر کھاوے پیوے گا، تب اگر تُو بھی اُس کو

مہمانی کی خاطر بلاوے گا، وہ دَوڑا چلا آوے گا۔ اِس لیئے تجھے جلد رخصت کیا۔ (۲۰۰)

تین دن کے پیچھے جب تُو وہاں سے فراغت کر کے آیا اور میرے رُوبرو عذرِ غیر حاضری کا شرمندگی سے لایا، میں نے تیری تشفّی کے لیئے فرمایا: ''کچھ مضایقہ نہیں۔ جب اس نے رضا دی، تب تُو آیا۔ لیکن بے شرمی خوب نہیں کہ دوسرے کا احسان اپنے سر پر رکھیئے اور اُس کا بدلا نہ کیجیئے۔ اب تُو بھی جا کر اُس کی اِستدعا کر اور اپنے ساتھ ہی ساتھ لے آ۔ (۲۰۱) جب تُو، اُس کے گھر گیا، تب میں نے دیکھا کہ یہاں کچھ اسباب مہمان داری کا تیار نہیں۔ اگر وہ آ جاوے تو کیا کروں؟ لیکن یہ فرصت پائی کہ اِس ملک میں، قدیم سے پادشاہوں کا یہ معمول ہے کہ آٹھ مہینے کاروبارِ ملکی اور مالی کے واسطے ملک گیری میں باہر رہتے ہیں اور چار مہینے موسمِ برسات کے قلعۂ مبارک میں جلوس فرماتے ہیں۔ اُن دِنوں دو چار مہینے سے پادشاہ یعنی (۲۰۲) ولی نعمت مجھ بد بخت کے بندوبست کی خاطر ملک میں تشریف لے گئے تھے۔ جب تک تُو اُس جوان کو ساتھ لے کر آوے، سیدی بہار نے میرا احوال خدمت میں پادشاہ بیگم کی، کہ والدہ مجھ ناپاک کی ہیں، عرض کیا۔ (۲۰۳) پھر میں اپنی تقصیر اور گناہ سے خجل ہو کر اُن کے رُوبرُو جا کر کھڑی ہوئی اور جو سرگذشت تھی، سب بیان کی۔ ہر چند اُنھوں نے میرے غائب ہونے کی کیفیت دُور اندیشی اور مہرِ مادری سے چُھپا رکھی تھی کہ خدا جانے اِس کا انجام کیا ہو، ابھی یہ رُسوائی ظاہر کرنی خوب نہیں۔ میرے بدلے میرے عیبوں کو اپنے پیٹ میں رکھ چھوڑا تھا، لیکن میری تلاش میں تھیں۔ جب مجھے اِس حالت میں دیکھا اور سب ماجرا سُنا، آنسو بھر لائیں اور فرمایا: ''اے کم بخت ناشُدنی! تُو نے جان بُوجھ کر نام و نشان پادشاہت کا سارا کھویا۔ ہزار افسوس! اور اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھویا۔ کاشکے تیرے عِوض میں پتّھر جنتی تو صبر آتا۔ اب بھی توبہ کر۔ جو قسمت میں تھا، سو ہُوا، اب آگے کیا کرے گی؟ جیوے گی یا مرے گی؟'' میں نے نہایت شرمندگی سے کہا: ''مُجھ بے حیا کے نصیبوں میں یہی لکھا تھا جو اِس بدنامی اور خرابی میں ایسی ایسی آفتوں سے بچ کر جیتی رہوں۔ اِس سے مرنا ہی بھلا تھا۔ اگر چہ کلنک کا ٹیکہ میرے ماتھے پر لگا، پر ایسا کام نہیں کیا جس میں ماباپ کے نام کو عیب لگے۔ (۲۰۴) اب یہ بڑا دکھ ہے کہ وے دونوں بے حیا، میرے ہاتھ سے بچ جاویں اور آپس میں رنگ رلیاں مناویں، اور میں اُن کے ہاتھوں سے یہ کچھ دُکھ دیکھوں۔ حَیف ہے کہ مُجھ سے کچھ نہ ہو سکے۔ یہ اُمیدوار ہوں کہ خانساماں کو پروانگی ہو تو اسباب ضیافت کا بخوبی تمام، اِس کم بخت کے مکان میں تیار کرے، تو میں دعوت کے بہانے سے اُن دونوں بدبختوں کو بُلوا کر اُن کے عملوں کی سزا دُوں اور اپنا عِوض لُوں۔ جس طرح اُس نے مجھے پر ہاتھ چھوڑا اور گھایل کیا، میں بھی دونوں کو پُرزے پُرزے کروں، تب میرا کلیجا ٹھنڈا ہو، نہیں تو اِس غصّے کی آگ میں پھک رہی ہوں؛

آخر جل بَل، بُھو بھل ہو جاؤں گی۔

یہ سُن کر اُمّا نے مامتا کے درد سے مہربان ہو کر میری عیب پوشی کی اور سارا لوازمہ ضیافت کا اُسی خواجہ سرا کے ساتھ، جو میرا مَحرم ہے، کر دیا۔ (۲۰۵) سب اپنے اپنے کارخانے میں آ کر حاضر ہوئے۔ شام کے وقت تُو اُس مُوئے کو لے کر آیا۔ مجھے اُس قحبہ باندی کا بھی آنا منظور تھا۔ چنانچہ پھر تجھ کو تقید کر کر، اُسے بھی بُلوایا۔ جب وہ بھی آئی اور مجلس جمی، شراب پی پی کر سب بدمست اور بے ہوش ہوئے اور اُن کے ساتھ تُو بھی کیفی ہو کر مُردا سا پڑا؛ میں نے قِلماقنی کو حُکم کیا کہ اُن دونوں کا سر تلوار سے کاٹ ڈال۔ اُس نے دونہیں، ایک دم میں شمشیر نکال (۲۰۶) دونوں کے سر کاٹ، بدل لال کر دیئے۔ اور تجھ پر غصّے کا یہ باعث تھا کہ میں نے اجازت ضیافت کی دی تھی، نہ دو دن کی دوستی پر اعتماد کر کے شریک مے خوری کا ہو۔ البتہ یہ تیری حماقت اپنے تئیں پسند نہ آئی۔ اِس واسطے کہ جب تُو پی پا کر بے ہوش ہُوا، تب توقُع رفاقت کی تُجھ سے کیا رہی؟ پر تیری خدمت کے حق ایسے میری گردن پر ہیں کہ جو تُجھ سے ایسی حرکت ہوتی ہے تو معاف کرتی ہوں۔

لے میں نے اپنی حقیقت اِبتداء سے انتہا تک کہہ سُنائی۔ اب بھی دل میں کچھ اور ہَوس باقی ہے؟ جیسے میں نے تیری خاطر کر کے تیرے کہنے کو سب طرح قبول کیا، تُو بھی میرا فرمانا اُسی صُورت سے عمل میں لا۔ صلاحِ وقت یہ ہے کہ اب اِس شہر میں رہنا میرے اور تیرے حق میں بھلا نہیں۔ آگے تُو مختار ہے۔"

یا معبود اللہ! شہزادی اِتنا فرما کر چُپ رہی۔ فقیر تو دل و جان سے اُس کے حُکم کو سب چیز پر مُقدّم جانتا تھا اور اُس کی محبت کے جال میں پھنسا تھا، بولا: "مرضی مُبارک میں آوے سو بہتر ہے۔ یہ فِدوی بے عُذر بجا لاوے گا۔" جب شاہ زادی نے میرے تئیں فرماں بردار، خدمت گار اپنا پُورا سمجھا، فرمایا: "دو گھوڑے چالاک اور جاں باز، کہ چلنے میں ہوا سے باتیں کریں، پادشاہ کے خاص اصطبل سے منگوا کر تیار رکھ۔" (۲۰۷) میں نے ویسے ہی پری زاد، چار گُردے کے گھوڑے چُن کر زین بندھوا کر منگوائے۔ جب تھوڑی سی رات باقی رہی، پادشاہ زادی مردانہ لباس پہن اور پانچوں ہتھیار باندھ کر ایک گھوڑے پر سوار ہوئی اور دوسرے مَرکب پر میں مُسلّح ہو کر چڑھ بیٹھا اور ایک طرف کی راہ لی۔

جب شب تمام ہُوئی اور پَرچھا ہونے لگا، تب ایک پوکھر کے کنارے پہنچے۔ اُتر کر مُنھ ہاتھ دھوئے، جلدی جلدی کچھ ناشتہ کر کے پھر سوار ہو کر چلے۔ کبھو ملکہ کچھ کچھ باتیں کرتی، اور یوں کہتی کہ ہم نے تیری خاطر شرم حیا، ملک مال، ماباپ سب چھوڑا، ایسا نہ ہو کہ تُو بھی اُس ظالم بے وفا کی طرح سلوک کرے۔ کدھو میں کچھ احوال اِدھر

اُدھر کا، راہ کٹنے کے لیئے کہتا اور اُس کا بھی جواب دیتا کہ پادشاہ زادی! (۲۰۸) سب آدمی ایک سے نہیں ہوتے ہیں۔ پاجی کے نُطفے میں کچھ خلل ہوگا جو اُس سے ایسی حرکت واقع ہوئی۔ اور میں نے تو جان و مال تم پر تصدق کیا اور تُم نے مجھے ہر طرح سرفرازی بخشی، اب میں بندہ بغیر داموں کا ہُوں۔ میرے چمڑے کی اگر جُوتیاں بنوا کر پہنو تو میں آہ نہ کروں۔ ایسی ایسی باتیں باہم ہوتی تھیں اور رات دن چلنے سے کام تھا۔ کبھو جو ماندگی کے سبب کہیں اُترتے تو جنگل کے چرند، پرند شکار کر کے نمک دان سے لُون نکال، چقمک سے آگ جھاڑ، بھون بھان کر کھا لیتے اور گھوڑوں کو چھوڑ دیتے۔ وے اپنے مُنہہ سے گھاس پات چر چگ کر اپنا پیٹ بھر لیتے۔

ایک روز ایسے کفِ دست میدان میں جا نکلے کہ جہاں بستی کا نام نہ تھا اور آدمی کی صُورت نظر نہ آتی تھی۔ اِس پر بھی پادشاہ زادی کی رفاقت کے سبب سے دن عید اور رات شب بَرات معلوم ہوتی تھی۔ جاتے جاتے اچنپت ایک دریا کہ جس کے دیکھنے سے کلیجا پانی ہو، راہ میں مِلا۔ (۲۰۹) کنارے پر کھڑے ہو کر جو دیکھا تو جہاں تک نگاہ نے کام کیا، پانی ہی تھا، کچھ عقل بڑا نہ پایا۔ یا الہیٰ! اب اِس سمندر سے کیوں کر پار اُتریں! ایک دَم اِسی سوچ میں کھڑے رہے۔ آخر یہ دل میں لہر آئی کہ ملکہ کو یہیں بٹھا کر میں تلاش ناؤ نواڑے کی جاؤں۔ جب تلک اسباب گزارے کا ہاتھ آوے، تب تلک وہ نازنین بھی آرام پاوے۔ تب میں نے کہا: ''اے ملکہ اگر حُکم ہو تو گھاٹ باٹ اِس دریا کا دیکھوں۔'' فرمانے لگی: ''میں بہت تھک گئی ہوں اور بھُوکھی پیاسی ہو رہی ہُوں۔ میں ذرا دَم لے لوں، جب تیئں تُو پار چلنے کی تدبیر کر۔'' (۲۱۰) اُس جگہ ایک درخت پیپل کا تھا، بڑا اچھتر باندھے ہُوئے کہ اگر ہزار سوار آوے تو دُھوپ اور مینہہ میں اُس کے تلے آرام پاوے۔ وہاں اُس کو بٹھا کر میں چلا اور چاروں طرف دیکھتا تھا کہ کہیں بھی زمین پر یا دریا میں نشان انسان کا پاؤں۔ بُہتیرا سر مارا، پر کہیں نہ پایا۔ آخر مایوس ہو کر وہاں سے پھر آیا تو اُس پَری کو پیڑ کے نیچے نہ پایا۔ اُس وقت کی حالت کیا کہوں کہ سُرت جاتی رہی؛ دیوانہ باولا ہو گیا۔ کبھو درخت پر چڑھ جاتا اور ڈال ڈال پات پات پھرتا۔ کبھو ہاتھ پاؤں چھوڑ کر زمین میں گرتا، اور اُس درخت کی جڑ کے آس پاس تصدق ہوتا۔ کدھو چنگھاڑ مار کر اپنی بے بسی پر روتا اور کبھو پچھم سے پُورب کو دَوڑا جاتا۔ کدھو اُتر سے دکھن کو پھر آتا۔ غرض بُہتیری خاک چھانی لیکن اُس گوہر نایاب کی نشانی نہ پائی۔ جب میرا کچھ بس نہ چلا، تب روتا اور خاک بسر پر اُڑاتا ہُوا، تلاش ہر کہیں کرنے لگا۔ (۲۱۱) دل میں یہ خیال آیا کہ شاید کوئی جن اُس پَری کو اُٹھا کر لے گیا اور مجھے یہ داغ دے گیا، یا اس کے مُلک سے کوئی اُس کے پیچھے لگا چلا آتا تھا، (۲۱۲) اُس وقت اکیلا پا کر منا مُنّوکر پھر شام کی طرف لے اُبھرا۔ ایسے خیالوں میں گھبرا کر کپڑے وپڑے پھینک پھانک دیئے۔ ننگا منگا فقیر بن کر

شام کے ملک میں صبح سے شام تک ڈھونڈھتا پھرتا اور رات کو کہیں پڑ رہتا۔ سارا جہاں رَونْد مارا، پر اپنی بادشاہ زادی کا نام و نشان کسی سے نہ سُنا اور نہ سبب غایب ہونے کا معلوم ہُوا۔ تب دل میں یہ آیا کہ جب اُس جان کا تُو نے کچھ پتا نہ پایا تو اَب جینا بھی حَیف ہے۔ کسی جنگل میں ایک پہاڑ نظر آیا، تب اُس پر چڑھ گیا اور یہ ارادہ کیا کہ اپنے تئیں گرا دُوں۔ ایک دم میں سر مُنہہ پتھروں سے ٹکراتے ٹکراتے پھُوٹ جاوے گا تو ایسی مُصیبت سے جی چھُوٹ جاوے گا۔ یہ دل میں کہہ کر چاہتا ہوں کہ اپنے تئیں گراؤں، بلکہ پاؤں بھی اُٹھ چکے تھے کہ کسو نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اتنے میں ہوش آ گیا۔ دیکھتا ہوں تو ایک سوار، سبز پوش مُنہہ پر نقاب ڈالے مجھے فرماتا ہے کہ کیوں تُو اپنے مرنے کا قصد کرتا ہے؟ خدا کے فضل سے نا اُمید ہونا کُفر ہے۔ جب تلک سانس ہے، تب تلک آس ہے۔ اب تھوڑے دنوں میں رُوم کے ملک میں تین درویش تُجھ سار کے ایسی ہی مصیبت میں پھنسے ہُوئے اور ایسے ہی تماشے دیکھے ہوئے تُجھ سے ملاقات کریں گے اور وہاں کے پادشاہ کا آزاد بخت نام ہے، اُس کو بھی ایک بڑی مشکل درپیش ہے۔ جب وہ بھی تم چاروں فقیروں کے ساتھ ملے گا تو ہر ایک کے دل کا مطلب اور مراد جو ہے بہ خوبی حاصل ہوگی۔

میں نے رکاب پکڑ کر بوسہ دیا اور کہا: ''اے خُدا کے ولی! تمھارے اتنے ہی فرمانے سے میرے دلِ پُر اضطرار کو تسلّی ہوئی، لیکن خدا کے واسطے یہ فرمایئے کہ آپ کون ہیں اور اِس شریف کیا ہے؟'' تب انھوں نے فرمایا کہ مرتضیٰ علی میرا نام ہے اور میرا یہی کام ہے کہ جس کو جو مشکل کٹھن پیش آوے تو میں اُس کو آسان کر دوں۔'' اِتنا فرما کر نظروں سے پوشیدہ ہو گئے۔ بارے اِس فقیر نے اپنے مَولا مُشکل کُشا کی بشارت سے خاطر جمع کر، قصد قسطنطنیہ کا کیا۔ راہ میں جو کچھ مُصیبتیں قسمت میں لکھی تھیں، کھینچتا ہُوا اُس بادشاہ زادی کی ملاقات کے بھروسے خدا کے فضل سے یہاں تک آ پہنچا اور اپنی خوش نصیبی سے تمھاری خدمت میں مُشرّف ہُوا۔ ہمارے تمھارے آپس میں ملاقات تو ہوئی، باہم صُحبت اور بات چیت میسّر آئی۔ اب چاہیئے کہ بادشاہ آزاد بخت سے بھی رُوشناس اور جان پہچان ہو۔ (۲۱۳)

بعد اُس کے مقرر ہم پانچوں اپنے مقصدِ دلی کو پہنچیں گے۔ تم بھی دُعا مانگو اور آمین کہو۔ یا ہادی! اِس حیران سرگرداں کی سرگذشت یہ تھی، جو حضوری میں درویشوں کی کہہ سُنائی۔ اب آگے دیکھیئے کہ کب یہ محنت اور غم ہمارا پادشاہ زادی کے ملنے سے خوش و خرّمی سے بدل ہو (۲۱۴)۔'' آزاد بخت ایک کونے میں چھُپا ہُوا چُپکا، دھیان لگائے، پہلے درویش کا ماجرا سُن کر خوش ہُوا۔ پھر دوسرے درویش کی حقیقت کو سُننے لگا۔

○

سَیر دُوسرے دَرویش کی

جب دُوسرے دَرویش کے کہنے کی نوبت پُہنچی، وہ چارزانو ہو بیٹھا، اور بولا:

اے یارو ! اِس فقیر کا ٹک ماجرا سُنو
میں اِبتدا سے کہتا ہوں تا انتہا سُنو
جس کا علاج کر نہیں سکتا کوئی حکیم
ہے گا ہمارا درد نپٹ لادوا سُنو

اے دلق پوشو! یہ عاجز پادشاہ زادہ، فارس کے مُلک کا ہے۔ ہر فن کے آدمی وہاں پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ اصفہان، نصف جہاں مشہور ہے ہفت اِقلیم میں، اُس اِقلیم کے برابر کوئی ولایت نہیں کہ وہاں کا سِتارہ آفتاب ہے اور وہ ساتوں کواکِب میں نیّرِ اعظم ہے۔ آب و ہوا وہاں کی خُوش اور لوگ روشن طبع اور صاحبِ سلیقہ ہوتے ہیں۔ میرے قبلہ گاہ نے، جو پادشاہ اُس ملک کے تھے، لڑکپن سے قاعدے اور قانونِ سلطنت کی تربیت کرنے کے واسطے بڑے بڑے دانا اُستاد، ہر ایک علم اور کسب کے چُن کر میری اتالیقی کے لیئے مقرر کیئے تھے؛ تو تعلیم کامل ہر نوع کی، پا کر قابل ہُوں (۲۱۵)۔ خدا کے فضل سے چودہ برس کے سِن و سال میں سب عِلم سے ماہر ہُوا۔ گفتگو معقول، نِشَست و برخاست پسندیدہ، اور جو کچھ پادشاہوں کو لائق اور درکار ہے، سب حاصل کیا اور یہی شوق شب و روز تھا کہ قابلوں کی صُحبت میں قصّے ہر ایک ملک کے اور احوال اُولوالعزم پادشاہوں اور نام آوروں کا سُنا کروں۔

ایک روز ایک مصاحب دانا نے کہ خُوب تواریخ داں اور جہاں دِیدہ تھا، مذکور کیا کہ اگر چہ آدمی کی زندگی کا کچھ بھروسا نہیں، لیکن اکثر وصف ایسے ہیں کہ اُن کے سبب سے انسان کا نام قیامت تک زبانوں پر بخوبی چلا جائے گا۔ میں نے کہا: ''اگر تھوڑا سا احوال اِس کا مُفصّل بیان کرو تو میں بھی سُنوں اور اُس پر عمل کروں۔ تب وہ شخص حاتم طائی کا ماجرا اِس طرح سے کہنے لگا کہ (۲۱۶) حاتم کے وقت میں ایک پادشاہ عرب کا، نوفل نام تھا۔ اُس کو

حاتم کے ساتھ بہ سبب نام آوری کے، دشمنی کمال ہوئی۔ بہت سالشکر، فوج جمع کر کرلڑائی کی خاطر چڑھ آیا۔ حاتم تو خُدا ترس اور نیک مرد تھا، یہ سمجھا کہ اگر میں بھی جنگ کی تیاری کروں تو خدا کے بندے مارے جائیں گے اور بڑی خُوں ریزی ہوگی، اُس کا عذاب میرے نام لکھا جائے گا۔ یہ بات سوچ کر تنِ تنہا اپنی جان لے کر ایک پہاڑ کی کھوہ میں جا چھپا۔ (۲۱۷)

جب حاتم کے غایب ہونے کی خبر نوفل کو معلوم ہُوئی، سب اسباب اور گھر بار حاتم کا قُرق کیا اور مُنادی کروادی، جو کوئی ڈھونڈ ڈھانڈ کر پکڑ لاوے، پانسو اشرفی پادشاہ کی سرکار سے انعام پاوے۔ یہ سُن کر سب کو لالچ آیا اور جُستجو حاتم کی کرنے لگی۔

ایک روز ایک بُوڑھا اور اُس کی بُڑھیا، دو تین بچے چھوٹے چھوٹے ساتھ لیئے ہوئے لکڑیاں توڑنے کے واسطے اُس غار کے پاس، جہاں حاتم پوشیدہ تھا، پہنچے اور لکڑیاں اُس جنگل سے چُننے لگے۔ بُڑھیا بولی کہ اگر ہمارے دن کچھ بھلے آتے تو حاتم کو کہیں ہم دیکھ پاتے اور اس کو پکڑ کر نوفل کے پاس لے جاتے تو وہ پانچ سو اشرفی دیتا۔ ہم آرام سے کھاتے، اِس دُکھ دھندھے (۲۱۸) سے چُھوٹ جاتے۔ بُوڑھے نے کہا: ''کیا ٹرٹر کرتی ہے؟ ہمارے طالع میں یہی لکھا ہے کہ روز لکڑیاں توڑیں اور سر پر دھر کر بازار میں بیچیں، تب روٹی میسّر آوے یا ایک روز جنگل سے باگھ لے جاوے۔ (۲۱۹) لے اپنا کام کر، ہمارے ہاتھ حاتم کاہے کو آوے گا اور پادشاہ اِتنے روپے دِلاوے گا؟'' (۲۲۰) عورت نے ٹھنڈھی (۲۲۱) سانس بھری اور چُپکی ہو رہی۔

یہ دونوں کی باتیں حاتم نے سُنیں، مردی اور مروّت سے بعید جانا کہ اپنے تیئں چھپایئے اور جان کو بچایئے اور ان دونوں بے چاروں کو مطلب تک نہ پہنچایئے۔ (۲۲۲) سچ ہے، اگر آدمی میں رحم نہیں تو وہ انسان نہیں، اور جس کے جی میں درد نہیں وہ قصائی ہے۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں (۲۲۳)

غرض حاتم کی جواں مردی نے نہ قبول کیا کہ اپنے کانوں سے سُن کر چُپکا ہو رہے۔ وونہیں باہر نکل آیا اور اُس بوڑھے سے کہا کہ اے عزیز! حاتم میں ہی ہوں۔ میرے تیئں نوفل کے پاس لے چل۔ وہ مجھے دیکھے گا اور جو کچھ روپے دینے کا قرار کیا ہے، تُجھے دیوے گا۔ پیر مَرد نے کہا: ''سچ ہے کہ اِس صورت میں بھلائی اور بہبودی میری البتہ ہے، لیکن وہ کیا جانیئے تجھ سے کیا سلوک کرے؟ اگر مار ڈالے تو میں کیا کروں۔ یہ مجھ سے ہرگز نہ ہو سکے

گا کہ تجھ (۲۲۴) سے انسان کو اپنی طمع کی خاطر دشمن کے حوالے کروں۔ وہ مال کے دن کھاؤں گا، اور کب تک جیوں گا! آخر مر جاؤں گا، تب خُدا کو کیا جواب دُوں گا؟''

حاتم نے بُہتیری مِنت کی کہ مجھے لے چل۔ میں اپنی خوشی سے کہتا ہوں اور ہمیشہ اِسی آرزو میں رہتا ہوں کہ میرا جان و مال کِسو کے کام آوے تو بہتر ہے۔ لیکن وہ بُوڑھا کِسو طرح راضی نہ ہُوا کہ حاتم کو لے جاوے اور انعام پاوے۔ آخر لاچار ہو کر حاتم نے کہا: ''اگر تُو مجھے یوں نہیں لے جاتا تو میں آپ سے آپ بادشاہ پاس جا کر کہتا ہوں کہ اِس بُوڑھے نے مجھے جنگل میں ایک پہاڑ کی کھوہ میں چُھپا رکھا تھا۔ وہ بوڑھا ہنسا اور بولا: ''بھلائی کے بدلے بُرائی ملے، تو یا نصیب!'' اِس رَدّ بدل کے سوال جواب میں آدمی اور بھی آن پہنچے۔ بھیڑ لگ گئی۔ اُنھوں نے معلوم کیا کہ حاتم یہی ہے۔ تُرت پکڑ لیا اور حاتم کو لے چلے۔ وہ بُوڑھا بھی افسوس کرتا ہُوا پیچھے پیچھے ساتھ ہو لیا۔ جب نوفل کے رُوبرُو لے گئے، اُس نے پُوچھا کہ اِس کو کون پکڑ لایا؟ ایک بدذات سنگ دل بولا کہ ایسا کام سوائے ہمارے کون کر سکتا ہے؟ یہ فتح ہمارے نام ہے۔ ہم نے عرش پر جھنڈا گاڑا ہے۔ ایک اور لن ترانی والا ڈینگ مارنے لگا کہ میں کئی دن سے دَوڑ دُھوپ کر جنگل سے پکڑ لایا ہوں، میری محنت پر نظر کیجیے اور جو قرار ہے، سو دیجیے۔'' اِسی طرح اشرفیوں کے لالچ سے ہر کوئی کہتا تھا کہ یہ کام مُجھ سے ہُوا۔ وہ بُوڑھا چُپکا ایک کونے میں لگا ہُوا سب کی شیخیاں سُن رہا تھا اور حاتم کی خاطر کھڑا روتا تھا (۲۲۵)۔ جب اپنی اپنی دِلاوری اور مردانگی سب کہہ چکے، تب حاتم نے بادشاہ سے کہا: ''اگر سچ بات پُوچھو تو یہ ہے کہ وہ بُوڑھا جو الگ سب سے کھڑا ہے، مُجھ کو لایا ہے۔ اگر قیافہ پہچان جانتے ہو تو دریافت کر لو اور میرے پکڑنے کی خاطر جو قبول کیا ہے پُورا کرو کہ سارے ڈِیل میں زبان حلال ہے۔ مَرد کو چاہیے جو کہے سو کرے۔ نہیں تو جیبھ حیوان کو بھی خُدا نے دی ہے۔ پھر حیوان اور انسان میں کیا تفاوت ہے؟'' نوفل نے اُس لکڑہارے بُوڑھے کو پاس بُلا کر پُوچھا کہ سچ کہہ، اصل کیا ہے؟ حاتم کو کون پکڑ لایا؟ اُس بچارے نے سر سے پاؤں تک جو گُزرا تھا راست کہہ سُنایا اور کہا: ''حاتم میری خاطر آپ سے آپ چلا آیا ہے۔'' نوفل یہ ہمت حاتم کی سُن کر متعجب ہُوا کہ بَل بے تیری سخاوت! اپنی جان کا بھی خطرہ نہ کیا۔ جتنے جھوٹھ دعوے حاتم کے پکڑ لانے کے کرتے تھے، حکم ہُوا کہ اُن کی مُنڈیاں کس کر پان سو اشرفی کے بدلے پان پان سے جُوتیاں اُن کے سر پر لگاؤ کہ اُن کی جان بھی نکل پڑے (۲۲۶)۔ دُونہیں تڑاتڑ پَیزاریں پڑنے لگیں کہ ایک دَم میں سر اُن کے گنجے ہو گئے۔ سچ ہے، جُھوٹھ بولنا ایسا ہی گناہ ہے کہ کوئی گناہ اُس کو نہیں پہنچتا۔ خُدا سب کو اِس بَلا سے محفوظ رکھے اور جُھوٹھ بولنے کا چسکا نہ دے۔ بہت آدمی جُھوٹھ مُوٹھ بکے جاتے ہیں، لیکن آزمائش کے وقت سزا

پاتے ہیں۔

غرض اُن سب کو مُوافق اُن کے انعام دے کر، نوفل نے اپنے دل میں خیال کیا کہ حاتم سے شخص سے، کہ ایک عالَم کو اُس سے فیض پہنچتا ہے اور محتاجوں کی خاطر جان اپنی دریغ نہیں کرتا، اور خدا کی راہ میں سرتاپا حاضر ہے، دُشمنی رکھنی اور اس کا مُدعی ہونا مرد آدمیت اور جواں مَردی سے بعید ہے۔ وُونہیں حاتم کا ہاتھ بڑی دوستی اور گرم جوشی سے پکڑ لیا اور کہا: ''کیوں نہ ہو جب ایسے ہو، تب ایسے ہو''۔ تواضع تعظیم کر کر پاس بیٹھلایا(۲۲۷) اور حاتم کا ملک و اِملاک اور مال واسباب جو کچھ ضبط کیا تھا، وُونہیں چھوڑ دیا۔ نئے سر سے سرداری، قبیلہ طے کی اُسے دی اور اُس بُوڑھے کو پانچ سو اشرفیاں اپنے خزانے سے دِلوادیں۔ وُہ دُعا دیتا ہُوا چلا گیا۔

جب یہ ماجرا حاتم کا میں نے تمام سُنا، جی میں غیرت آئی اور یہ خیال گُزرا کہ حاتم اپنی قوم کا فقط رئیس تھا، جن نے ایک سخاوت باعث یہ نام پیدا کیا کہ آج تلک مشہور ہے۔ میں خُدا کے حکم سے پادشاہ تمام ایران کا ہوں، اگر اِس نعمت سے محروم رہوں تو بڑا افسوس ہے۔ فی الواقع دنیا میں کوئی کام، بڑا دادودہش سے نہیں۔ اِس واسطے کہ آدمی جو کچھ دُنیا میں دیتا ہے، اُس کا عِوض عاقبت میں لیتا ہے۔ اگر کوئی ایک دانہ بوتا ہے تو اُس سے کِتنا کچھ پَیدا ہوتا ہے! یہ بات دل میں ٹھہرا کر میرِ عمارت کو بُلوا کر حُکم کیا کہ ایک مکان عالی شان، جس کے چالیس دروازے بُلند اور بہت کُشادہ ہوں، باہر شہر کے جلد بنواؤ۔ تھوڑے عرصے میں ویسی(۲۲۸) عمارت وسیع، جیسا دِل میں چاہتا تھا، بن کر تیار ہُوئی اور اُس مکان میں ہر روز وقتِ فجر سے شام تک مُحتاجوں اور بے کسوں کے تئیں رُوپے اشرفیاں دیتا اور جو کوئی جس چیز کا سوال کرتا، میں اُسے مالا مال کرتا۔

غرض چالیسوں دروازے سے حاجت مَند آتے اور جو چاہتے سو لے جاتے۔ ایک روز کا یہ ذکر ہے کہ ایک فقیر سامنھے کے دروازے سے آیا اور سوال کیا۔ میں نے اسے ایک اشرفی دی۔ پھر وہی دوسرے دروازے سے ہو کر آیا، دو اشرفیاں مانگیں۔ میں نے پہچان کر درگذر کی، اور دیں اِسی طرح اُن نے ہر ایک دروازے سے آنا اور ایک ایک اشرفی بڑھانا شروع کیا اور میں بھی جان بُوجھ کر اَن جان ہُوا، اور اُس کے سوال کے موافق دِیا کیا۔ آخر چالیسویں دروازے کی راہ سے آ کر چالیس اشرفیاں مانگیں۔ وہ بھی میں نے دِلوادیں۔ اِتنا کچھ لے کر وہ درویش پھر پہلے دروازے سے گُھس آیا اور سوال کیا۔ مجھے بہت بُرا معلوم ہُوا۔ میں نے کہا: ''سُن اے لالچی! تُو کیسا فقیر ہے کہ ہرگز فقر کے تینوں حرفوں سے بھی واقف نہیں؟ فقیر کا عمل اُن پر چاہیئے۔ فقیر بولا: ''بھلا داتا تمھیں بتاؤ۔'' میں نے کہا: ''ف'' سے فاقہ، ''ق'' سے قناعت، ''ر'' سے ریاضت نکلتی ہے جس میں یے باتیں نہ ہوں، وہ

فقیر نہیں۔ اِتنا جو تُجھے مِلا ہے، اُس کو کھا پی کر پھر آئیو اور جو مانگے گا، لے جائیو۔ یہ خیرات، احتیاج رفع کرنے کے واسطے ہے، نہ جمع کرنے کے لیئے۔ اے حریص! چالیس دروازوں سے تُو نے ایک اشرفی سے چالیس اشرفیوں تک لیں، اُس کا حِساب تو کر کہ ریوڑی کے پھیر کی طرح کتنی اشرفیاں ہُوئیں اور اُس پر بھی تُجھے حرص پھر پہلے دروازے سے لے آئی۔ اِتنا مال جمع کر کر کیا کرے گا؟ فقیر کو چاہیئے کہ ایک روز کی فِکر کرے، دوسرے دن پھر نئی روزی، رزاق دینے والا موجود ہے۔ اَب حیا و شرم پکڑ اور صبر و قناعت کو کام فرما۔ یہ کیسی فقیری ہے جو تُجھے مُرشد نے بتائی ہے؟''(۲۲۹) یہ میری بات سن کر خفا اور بد دماغ ہُوا اور جتنا مجھ سے لے کر جمع کیا تھا، سب زمین میں ڈال دیا اور بولا: ''بس بابا اِتنے گرم مَت ہو۔ اپنی کائنات لے کر رکھ چھوڑو، پھر سخاوت کا نام نہ لیجو؛ سَخی ہونا بہت مشکل ہے۔ تم سخاوت کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتے۔ اُس منزل کو کب پہنچو گے؟ ابھی دِلّی دُور ہے۔ سَخی کے بھی تین حرف ہیں۔ پہلے اُن پر عمل کرو، تب سَخی کہلاؤ۔'' تب تو میں ڈرا اور کہا: ''بھلا داتا! اِس کے معنے مجھے سمجھاؤ۔'' کہنے لگا: ''س'' سے سمائی اور ''خ'' سے خوفِ الٰہی اور ''ی'' سے یاد رکھنا اپنی پیدائش اور مرنے کو۔ جب تلک اِتنا نہ ہولے، تو سخاوت کا نام نہ لے۔ اور سَخی کا یہ درجہ ہے کہ اگر بدکار ہو، تو بھی دوست خُدا کا ہے۔ اِس فقیر نے بہت ملکوں کی سیر کی ہے، لیکن سِوائے بصرے کی پادشاہ زادی کے کوئی سَخی دیکھنے میں نہ آیا۔ سخاوت کا جامہ خدا نے اُس عورت پر قطع کیا ہے؛ اور سب نام چاہتے ہیں، پر ویسا کام نہیں کرتے۔'' یہ سُن کر میں نے بہت مِنت کی اور قسمیں دیں کہ میری تقصیر معاف کرو اور جو چاہیئے سو لو۔ میرا دیا ہرگز نہ لیا اور یہ بات کہتا ہوا چلا: ''اب اگر اپنی ساری پادشاہت مجھے دے، تو اُس پر بھی نہ تُھوکوں اور نہ دَھر ماروں۔'' وہ تو چلا گیا پر بصرے کی بادشاہ زادی کی یہ تعریف سُننے سے دِل بے کل ہُوا۔ کسی طرح کل نہ تھی۔ اب یہ آرزو ہوئی کہ کِسو صُورت سے بصرے چل کر اُس کو دیکھا چاہیئے۔

اِس عرصے میں پادشاہ نے وفات پائی اور تخت پر مَیں بیٹھا۔ سلطنت ملی، پر وہ خیال نہ گیا۔ وزیر اور امیروں سے، جو پائے تخت سلطنت کے اور ارکان مملکت کے تھے، مَشورت کی کہ سفر بصرے کا کیا چاہتا ہوں۔ تم اپنے کام میں مُستعد رہو۔ اگر زندگی ہے تو سفر کی عمر کوتاہ ہوتی ہے، جلد پھر آتا ہوں۔ کوئی میرے جانے پر راضی نہ ہُوا۔ لاچار دِل تو اُداس ہو رہا تھا، ایک دن بغیر سب کے کہے سُنے، چپکے سے وزیرِ با تدبیر کو بُلا کر مُختار اور وکیل مُطلق اپنا کیا اور سلطنت کا مدار المہام بنایا؛ پھر میں نے گیروا بَستر پہن، فقیری بھیس کر، اکیلے راہ بصرے کی لی۔ تھوڑے دِنوں میں اُس کی سرحد میں جا پہنچا۔ تب سے یہ تماشا دیکھنے لگا کہ جہاں رات کو جا کر مقام کرتا، نوکر چاکر اُسی ملکہ کے استقبال کر کر ایک مکانِ معقول میں اُتارتے، اور جتنا لوازمہ ضیافت کا ہوتا ہے، بخوبی موجود کرتے اور خدمت

میں دست بستہ تمام رات حاضر رہتے۔ دُوسرے دن، دُوسری منزل میں یہی صُورت پیش آتی۔ اِس آرام سے مہینوں کی راہ طے کی۔ آخر بصرے میں داخل ہُوا۔ وُونہیں ایک جوانِ شکیل، خُوش لباس، نیک خُو، صاحبِ مُروّت کہ دانائی اُس کے قیافے سے ظاہر تھی؛ میرے پاس آیا اور نپٹ شیریں زبانی سے کہنے لگا کہ میں فقیروں کا خادم ہوں۔ ہمیشہ اِسی تلاش میں رہتا ہوں کہ جو کوئی مُسافر، فقیر یا دُنیا دار اِس شہر میں آوے، میرے گھر میں قدم رنجہ فرماوے۔ (۲۳۰) سِوائے ایک مکان کے، یہاں اور بدیسی کے رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ آپ تشریف لے چلیئے اور اُس مقام کو زینت بخشیئے اور مجھے سرفراز کیجیئے۔

فقیر نے پُوچھا: ''صاحب کا اسمِ شریف کیا ہے؟'' بولا: ''اِس گُم نام کا نام بیدار بخت کہتے ہیں۔'' اُس کی خوبی اور تملّق دیکھ کر یہ عاجز اُس کے ساتھ چلا اور اُس کے مکان میں گیا۔ دیکھا تو ایک عمارتِ عالی، لوازمِ شاہانہ سے تیار ہے۔ ایک دالان میں اُس نے لے جا کر بٹھایا اور گرم پانی منگوا کر ہاتھ پاٹوں دُھلوائے اور دسترخوان بچھوا کر مجھ تنِ تنہا کے رُوبرو بکاول نے ایک تورے کا تورا چُن دیا۔ چار مشقاب، ایک میں یخنی پُلاؤ، دوسری میں قورما پُلاؤ، تیسری میں متنجن پلاؤ، اور چوتھی میں کوکو پلاؤ اور ایک قاب زردے کی، اور کئی طرح کے قلیے: دو پیازہ نرگسی، بادامی، روغنِ جوش اور روٹیاں کئی قسم کی: باقر خانی، تنکی شیرمال، گاؤ دیدہ، گاؤ زبان، نانِ نعمت، پراٹھے اور کباب کوفتے کے، تکّے کے، مرغ کے۔ خاگینہ، ملغوبہ، شب دیگ، دَم پُخت، حلیم، ہریسا، سموسے وَرقی، قبولی، فرنی، شیر برنج، مَلائی، حلوہ، فالودہ، پَن بَھتا، تَمِش، آب شُورہ، ساقِ عروس، لَوزیات، مُربّہ، اَچار دَان، دہی کی قُلفیاں۔ یہ نعمتیں دیکھ کر رُوح بھر گئی۔ جب ایک ایک نوالہ ہر ایک سے لیا پیٹ بھی بھر گیا؛ تب ہاتھ کھانے سے کھینچا۔ وہ شخص مُتوَرِّ ہُوا کہ صاحِب نے کیا کھایا! کھانا تو سب امانت دَھرا ہے۔ بے تکلّف، اور نوش جان فرمایئے۔ میں نے کہا: ''کھانے میں شرم کیا ہے، خدا تمھارا خانہ آباد رکھے؛ جو کچھ میرے پیٹ میں سمایا سو میں نے کھایا اور ذائقے کی اِس کے کیا تعریف کروں کہ اب تک زبان چاٹتا ہوں اور جوڈ کار آتی ہے سو مُعطّر، لو اب مزید کرو۔ (۲۳۱) جب دسترخوان اُٹھا، زیر انداز، کاشانی مخمل کا مُقیشی بچھا کر چلپچی، آفتابہ طِلائی لا کر بیسن دان میں سے خُوشبو، بیسن (۲۳۲) دے کر گرم پانی سے میرے ہاتھ دُھلائے۔ پھر پان دان جڑاؤ میں، گلوریاں سونے کے پکھروٹوں میں بندھی ہوئیں اور چوگھروں میں کھلوریاں (۲۳۳)، چکنی سُپاریاں اور لونگ، اِلاچیاں رُوپے (۲۳۴) وَرقوں میں مڑھی ہُوئیں لا کر رکھیں۔ جب میں پانی پینے کو مانگتا، تب صُراحی برف میں لگی ہوئی آب دار لے آتا۔ (۲۳۵)

جب شام ہُوئی، فانوسوں میں کافُوری شمعیں روشن ہُوئیں۔ وہ عزیز بیٹھا ہُوا باتیں کرتا رہا۔ جب پہر

رات گئی، بولا: اَب اِس چَھپر کھٹ میں کہ جس کے آگے دَلداپیش گیر کھڑا ہے، آرام کیجیے۔ (۲۳۶) فقیر نے کہا: ''اے صاحب! فقیروں (۲۳۷) کو ایک بوریا یا مرگ چھالا بستر کے لیئے بہت ہے۔ یہ خُدا نے تم دنیاداروں کے واسطے بنایا ہے۔'' کہنے لگا: ''یہ سب اسباب درویشوں کی خاطر ہے۔ کچھ میرا مال نہیں۔'' اُس کے بَجد ہونے سے اُن بچھونوں پر، کہ پھولوں کی سیج سے بھی نرم تھے، جا کر لیٹا (۲۳۸)۔ دونوں پٹّیوں کی طرف گُل دان اور چنگیریں پھولوں کی، چُنی ہوئیں اور عود سوز اور لخلخے روشن تھے، جیدھر کی کروٹ لیتا، دماغ مُعطّر ہو جاتا۔ اِس عالَم میں سو رہا۔ (۲۳۹)

جب صبح ہوئی، ناشتے کو بھی بادام، پستے، انگور، انجیر، ناشپاتی، انار، کشمش، چُھہارے اور مَیوے کا شربت لا حاضر کیا۔

اِسی طور سے تین دن رات رہا۔ چوتھے روز میں نے رخصت مانگی۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا: ''شاید اِس گُنہ گار سے صاحب کی خدمت گاری میں کچھ قصور ہُوا کہ جس کے باعث مزاج تمھارا مکدّر ہُوا۔'' میں نے حیران ہو کر کہا: ''برائے خُدا یہ کیا مذکور ہے؟ لیکن مہمانی کی شرط تین دن تلک ہے، سو میں رہا۔ زیادہ رہنا خُوب نہیں اور علاوہ یہ فقیر، واسطے سیر کے نکلا ہے۔ اگر ایک ہی جگہ رہ جاوے تو مُناسب نہیں، اِس لیئے اجازت چاہتا ہے۔ نہیں تو تمھاری خُوبیاں ایسی نہیں کہ جُدا ہونے کو جی چاہے''۔ تب وہ بولا: ''جیسی مرضی، لیکن ایک ساعت توقف کیجیے کہ پادشاہ زادی کے حضُور جا کر عرض کروں اور تم جو جایا چاہتے ہو تو جو کچھ اسباب، اَوڑھنے بچھانے کا، اور کھانے کے باسن رُوپے سونے کے اور جڑاؤ کے اِس مہمان خانے میں ہیں، یہ سب تمھارا مال ہے؛ اِس کے ساتھ لے جانے کی خاطر جو فرماؤ تدبیر کی جائے''۔ میں نے کہا: ''لاحول پڑھو، ہم فقیر نہ ہُوئے، بھاٹ ہُوئے! اگر یہی حرص دل میں ہوتی تو فقیر کاہے کو ہوتے، دُنیاداری کیا بُری تھی۔'' (۲۴۰)

اُس عزیز نے کہا: ''اگر یہ احوال ملکہ سُنے تو خُدا جانے مجھے اِس خدمت سے تغیر کر کر کیا سلوک کرے، اگر تمھیں ایسی ہی بے پروائی ہے تو اِن سب کو ایک کوٹھری میں امانت بند کر کر، دروازے کو سر بہ مُہر کر دو۔ پھر جو چاہو سو کیجو۔''

میں نہ قبول کرتا تھا اور وہ بھی نہ مانتا تھا۔ لاچار یہی صلاح ٹھہری کہ سب اسباب کو بند کر کر قُفل کر دیا اور منتظر رُخصت کا ہُوا۔ اِتنے میں ایک خواجہ سرا مُعتبر، سر پر سرپیچ اور گوش پیچ اور کمر میں بندی باندھے، ایک عصا سونے کا جڑاؤ، ہاتھ میں اور ساتھ اُس کے کئی خدمت گار، معقول عُہدے لیئے ہُوئے، اِس شان و شوکت سے

میرے نزدیک آیا۔ ایسی ایسی مہربانگی اور ملایمت سے گفتگو کرنے لگا کہ جس کا بیان نہیں کر سکتا۔ پھر بولا: ''اے میاں، اگر توجہ اور کرم کر کر اِس مُشتاق کے غریب خانے کو اپنے قدم کی برکت سے رَونق بخشو تو بندہ نوازی اور غریب پروری سے بعید نہیں۔ شاید شہزادی سُنے کہ کوئی مسافر یہاں آیا تھا، اُس کی تواضع مدارات کِسو نے نہ کی؛ وہ یُوں ہی چلا گیا۔ اِس واسطے وَاللہُ اَعلَم مجھ پر کیا آفت لاوے اور کیسی قیامت اُٹھاوے، بلکہ حرف زندگی پر ہے۔'' میں نے اِن باتوں کو نہ مانا۔ تب خواہ نخواہ مِنّتیں کر کے میرے تئیں اور ایک حویلی میں کہ پہلے مکان سے بہتر تھی، لے گیا۔ (۲۳۱) اُس نے (۲۳۲) پہلے میزبان کے مانند تین دن رات دونوں وقت ویسے ہی کھانے، اور صبح اور تیسرے پہر شربت، اور تفنّن کی خاطر میوے کِھلائے اور باسن نُقرئی و طلائی فرش و فروش اور اسباب، جو کچھ وہاں تھا، مُجھ سے کہنے لگا کہ اِن سب کے تم مالِک مختار ہو، جو چاہو سو کرو۔ میں یے باتیں سُن کر حیران ہُوا اور چاہا کہ کسی نہ کسی طرح یہاں سے رخصت ہو کر بھاگوں۔ میرے بُشرے کو دیکھ کر مَحلّی بولا: ''اے خدا کے بَندے! جو تیرا مطلب یا آرزو ہو، سو مجھ سے کہہ، تو حضور میں ملکہ کے جا کر عرض کروں۔'' میں نے کہا: ''میں فقیری کے لِباس میں دنیا کا مال کیا مانگوں کہ تم بغیر مانگے دیتے ہو اور میں انکار کرتا ہوں''۔ تب وہ کہنے لگا کہ حِرص دنیا کی کسی کے جی سے نہیں گئی۔ چنانچہ کِسو کب نے یہ کبت کہا ہے:

نکھ بن کٹا دیکھے ، سیس بھاری جٹا دیکھے
جوگی کن پھٹا دیکھے ، چھار لائے تن میں
مَؤنی اَن بول دیکھے ، سیوڑا سِر مُھول دیکھے
کرت کلول دیکھے ، بَن کھنڈی بَن میں
بیر دیکھے ، سُور دیکھے ، سب گُنی اور کُوڑھ دیکھے
مایا کے پُور دیکھے ، بُھول رہے دَھن میں
آد اَنت سُکھی دیکھے ، جنم ہی کے دُکھی دیکھے
پَر وَے نہ دیکھے ، جن کے لوبھ ناہیہ مَن میں

میں نے سُن کر جواب دیا کہ یہ سچ ہے، پر میں کچھ نہیں چاہتا۔ اگر فرماؤ تو ایک رُقعہ سربہ مُہر اپنے مطلب کا لکھ کر دوں، جو حضُور ملکہ کے پہنچا دو تو بڑی مہربانی ہے۔ گویا تمام دنیا کا مال مجھ کو دیا۔ بولا: ''بسر و چشم، کیا مضایقہ۔'' میں نے ایک رُقعہ لکھا، پہلے شُکر خدا کا، پھر احوال کہ یہ بندہ خدا کا کئی روز سے اِس شہر میں وارد ہے اُور

سرکار سے سب طرح کی خبر گیری ہوتی ہے۔ جیسی خُوبیاں اور نیک نامیاں ملکہ کی سُن کر اشتیاق دیکھنے کا ہوا تھا، اُس سے چار چند پایا۔ اب حضور کے ارکانِ دولت یوں کہتے ہیں کہ جو مطلب اور تمنا تیری ہو، سو ظاہر کر۔ اِس واسطے بے حجابانہ جو دِل کی آرزو ہے، سَو عرض کرتا ہوں کہ میں دنیا کے کمال کا محتاج نہیں۔ اپنے ملک کا میں بھی بادشاہ ہُوں۔ فقط یہاں تلک آنا اور محنت اٹھانا آپ کے اِشتیاق کے سبب سے ہُوا، جو تنِ تنہا اِس صورت سے آ پہنچا ہُوں۔ اَب اُمید ہے کہ حضُور کی توجہ سے یہ خاک نشین مطلبِ دل کو پُہنچے، تو لایق ہے، آگے جو مرضی مُبارک۔ لیکن اگر یہ اِلتماس خاکسار کا قبول نہ ہوگا تو اِسی طرح خاک چھانتا پھرے گا اور اِس جانِ بے قرار کو آپ کے عشق میں نِثار کرے گا۔ مجنوں اور فرہاد کی مانند جنگل میں یا پہاڑ پر مر رہے گا۔''(۲۴۳)

یہی مُدّعا لکھ کر اُس خوجے کو دیا۔ اُس نے پادشاہ زادی تلک پہنچایا، بعد ایک دَم کے پھر آیا اور میرے تئیں بُلایا اور اپنے ساتھ محل کی ڈیوڑھی پر لے گیا۔ وہاں جا کر دیکھا تو ایک بُوڑھی سی عورت، صاحبِ لیاقت، سُنہری کرسی پر گہنا پاتا پہنے ہُوئے بیٹھی ہے اور کئی خوجے خِدمت گار تکلّف کے لباس پہنے ہوئے ہاتھ باندھے سامنے کھڑے ہیں۔ میں اُسے مُختارِ کار جان کر اور دیرینہ سمجھ کر دست بسر ہُوا۔ اُس ماما نے بہت مہربانی سے سلام کیا اور حکم کیا کہ آؤ بیٹھو خُوب ہُوا۔ تم آئے تمھیں نے ملکہ کے اِشتیاق کا رقعہ لکھا تھا؟ میں شرم کھا کر چُپ ہو رہا اور سر نیچا کر کے بیٹھا۔

ایک ساعت کے بعد بولی کہ اے جوان! بادشاہ زادی نے سلام کہا ہے اور فرمایا ہے کہ مجھ کو خاوند کرنے سے عیب نہیں۔ تم نے میری درخواست کی، لیکن اپنی پادشاہت کا بیان کرنا اور اِس فقیری میں اپنے تئیں پادشاہ سمجھنا اور اُس کا غرُور کرنا نپٹ بے جا ہے۔ اِس واسطے کہ سب آدمی آپس میں فی الحقیقت ایک ہیں، لیکن فضیلت دینِ اِسلام کی البتہ ہے۔ اور میں بھی ایک مُدّت سے شادی کرنے کی آرزومند ہوں، اور جیسے تم دولتِ دنیا سے بے پروا ہو، میرے تئیں بھی حق تعالیٰ نے اِتنا مال دیا ہے کہ جس کا کچھ حساب نہیں۔ پر ایک شرط ہے کہ پہلے مَہر ادا کر لو، اور مَہر شاہ زادی کا ایک بات ہے، جو تُم سے ہو سکے۔''(۲۴۴)

میں نے کہا: ''میں سب طرح حاضر ہوں۔ جان و مال سے دریغ نہیں کرنے کا۔ وہ بات کیا ہے؟ کہو تو میں سُنوں۔'' تب اُس نے کہا: ''آج کے دن رہ جاؤ، کل تمھیں کہہ دوں گی۔'' میں نے خُوشی سے قبول کیا اور رخصت ہو کر باہر آیا۔

دن تو گُزرا، جب شام ہوئی، مجھے ایک خواجہ سرا محل میں بُلا کر لے گیا۔ جا کر دیکھا تو اکابر، عالِم اور

فاضل صاحبِ شرع، حاضر ہیں۔ میں بھی اُسی جلسے میں جا کر بیٹھا کہ اِتنے میں دسترخوان بچھایا گیا اور کھانے اَقسام اَقسام کے شیریں اور نمکین چُنے گئے۔ وے سب کھانے لگے اور مجھے بھی تواضع کر کر شریک کیا۔ جب کھانے سے فراغت ہوئی، ایک دائی اندر سے آئی اور بولی کہ بہروز کہاں ہے؟ اُسے بُلاؤ۔ یساولوں نے دُو نہیں حاضر کیا۔ اُس کی صُورت بہت مرد آدمی کی سی، اور بہت سی کُنجیاں رُوپے، سونے کی کمر میں لٹکیں ہوئیں۔ (۲۴۵) سلامُ علیک کر کر میرے پاس آ کر بیٹھا۔ وہی دائی کہنے لگی کہ "اے بہروز! (۲۴۶) تُو نے جو کچھ دیکھا ہے، مُفصّل اُس کا بیان کر۔" بہروز نے یہ داستان کہنی شروع کی اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا: "اے عزیز! ہماری پادشاہ زادی کی سرکار میں ہزاروں غُلام ہیں کہ سوداگری کے کام میں مُتعین ہیں۔ اُن میں سے ایک میں بھی ادنا خانہ زاد ہُوں۔ ہر ایک ملک کی طرف لاکھوں روپے کا اَسباب اور جنس دے کر رُخصت فرماتی ہیں، جب وہ وہاں سے پھر آتا ہے تب اُس سے اُس دیس کا احوال اپنے حضور میں پوچھتی ہیں اور سُنتی ہیں۔ ایک بار یہ اتفاق ہُوا کہ یہ کم ترین تجارت کی خاطر چلا اور شہرِ نیم روز میں پہنچا۔ وہاں کے باشندوں کو دیکھا تو سب کا لباس سیاہ ہے اور ہر دم نالہ و آہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن پر کچھ بڑی مُصیبت پڑی ہے۔ اُس کا سبب جس سے میں پُوچھتا کوئی جواب نہ دیتا۔ (۲۴۷)

اسی حیرت میں کئی روز گزرے۔ ایک دن جُونہیں صبح ہوئی، تمام آدمی چھوٹے بڑے، لڑکے بُوڑھے، غریب غنی شہر کے باہر چلے۔ ایک میدان میں جا کر جمع ہُوئے اور اُس ملک کا پادشاہ بھی سب امیروں کو ساتھ لے کر سوار ہُوا اور وہاں گیا۔ تب سب برابر قطار باندھ کر کھڑے ہُوئے۔

میں بھی اُن کے درمیان کھڑا تماشا دیکھتا تھا۔ پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وے سب، کسو کا انتظار کھینچ رہے ہیں۔ ایک گھڑی کے عرصے میں دُور سے ایک جوان پَری زاد، صاحبِ جمال، پندرہ سولہ برس کا سن و سال، غُل اور شور کرتا ہُوا اور کف مُنہہ سے جاری، زرد بَیل کی سواری، ایک ہاتھ میں کچھ لیئے مُقابل خلقُ اللہ کے آیا اور اپنے بَیل پر سے اُترا۔ ایک ہاتھ میں ناتھ اور ایک ہاتھ میں ننگی تلوار لے کر دو زانو بیٹھا۔ ایک غُلام گُل اندام، پری چہرہ اُس کے ہمراہ تھا۔ (۲۴۸) اُس کو اُس جوان نے وہ چیز جو ہاتھ میں تھی، دی۔ وہ یتیم، لے کر، ایک سرے سے ہر ایک کو دیکھا تا جاتا تھا (۲۴۹) لیکن یہ حالت تھی کہ جو کوئی دیکھتا تھا، بے اختیار ڈاڑھ مار کر روتا تھا۔ اُسی طرح سب کو دکھاتا اور رُلاتا ہُوا، سب کے سامنے سے ہو کر اپنے خاوند کے پاس پھر گیا۔

اُس کے جاتے ہی وہ جَوان اُٹھا اور غلام کا سر شمشیر سے کاٹ کر اور سوار ہو کر جیدھر سے آیا تھا، اُدھر کو چلا۔ سب کھڑے دیکھا کیئے۔ جب نظروں سے غایب ہُوا، لوگ شہر کی طرف پھرے۔

میں ہر ایک سے اِس ماجرے کی حقیقت پُوچھتا تھا، بلکہ روپیوں کا لالچ دیتا اور خُوشامد، منت کرتا کہ مجھے ذرا بتا دو کہ یہ جوان کون ہے؟ اور اِس نے یہ کیا حرکت کی اور کہاں سے آیا اور کہاں گیا؟ ہرگز کسی نے نہ بتلایا اور نہ کچھ میرے خیال میں آیا۔ یہ تعجب دیکھ کر جب میں یہاں آیا اور ملکہ کے رُو برو اظہار کیا تب سے، پادشاہ زادی بھی حیران ہو رہی ہے اور اُس کے تحقیق کرنے کی خاطر دو دلی ہو رہی ہے۔ لہٰذا امر اپنا یہی مقرر کیا ہے، جو شخص اُس عجوبے کی کماحقہٗ خبر لاوے، اُس کو پسند فرماوے اور وہی مالک سارے مال، ملک کا اور ملکہ کا ہووے۔

یہ ماجرا تُم نے سب سُنا۔ اپنے دِل میں غور کرو۔ اگر تُم اُس جوان کی خبر لا سکو تو قصد مُلکِ نیم روز کا کرو اور جلد روانہ ہو۔ نہیں تو انکار کر کرا پنے گھر کی راہ لو''۔ میں نے جواب دیا کہ اگر خدا چاہے تو جلد اُس کا احوال سر سے پانو تک دریافت کر کر پادشاہ زادی کے پاس آ پہنچتا ہُوں اور کامیاب ہوتا ہوں اور جو میری قِسمت بد ہے، تو اِس کا کچھ علاج نہیں۔ لیکن ملکہ اِس کا قول قرار کریں کہ اپنے کہنے سے نہ پھریں، اور بالفعل ایک اندیشہ مشکل، میرے دل میں خلش کر رہا ہے، اگر ملکہ غریب نوازی اور مُسافر پروری سے حضور میں بُلا ویں اور پردے کے باہر بیٹھلا ویں (۲۵۰) اور میرا اِلتماس اپنے کانوں سُنیں اور اُس کا جواب اپنی زبان سے فرماویں تو میری خاطر جمع ہو اور مجھ سے سب کچھ ہو سکے۔ یہ میرے مطلب کی بات اُس ماما نے رُوبرُو اُس پری پیکر کے عرض کی۔ بارے قدر دانی کی راہ سے حکم کیا کہ اُنھیں بُلا لو۔ دائی، پھر باہر آئی اور مجھے اپنے ساتھ جس محل میں پادشاہ زادی تھی، لے گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ دو رَویہ صف باندھے، دست بستہ سہیلیاں اور خواصیں اور اُردا بیگنیاں، قِلماقنیاں، تُرکنیاں، حبشنیاں، اُزبکنیاں، کشمیرنیاں جواہر میں جڑی عُہدے لیے کھڑی ہیں۔ اِندر کا اکھاڑا کہوں یا پَریوں کا اُتارا! بے اِختیار ایک آہ بے خُودی سے زبان تک آئی اور کلیجہ تھلکنے لگا۔ پر بہ زور اپنے تئیں تھانبا۔ اُن کو دیکھتا بھالتا اور سَیر کرتا ہُوا آگے چلا، لیکن پانوں سو سو مَن کے ہوگئے۔ جس کو دیکھوں، پھر یہ نہ جی چاہے کہ آگے جاؤں۔ ایک طرف چلوَن پڑی تھی اور مونڈھا جڑاؤ بچھوا رہا تھا، اور ایک چوکی بھی صندل کی بچھی تھی۔ دائی نے مُجھے بیٹھنے کی اِشارت کی۔ میں مونڈھے پر بیٹھ گیا اور وہ چوکی پر۔ کہنے لگی: ''لو اَب جو کہنا ہے، سو جی بھر کر کہو۔'' (۲۵۱)

میں نے ملکہ کی خُوبیوں کی اور عدل و انصاف، داد و دہش کی پہلے تعریف کی، پھر کہنے لگا: ''جب سے میں اِس مُلک کی سرحد میں آیا، ہر ایک منزل میں یہی دیکھا کہ جا بجا مُسافر خانے اور عمارتیں عالی بنی ہوئی ہیں اور آدمی ہر ایک عُہدے کے تعینات ہیں کہ خبر گیری مُسافروں اور مُحتاجوں کی کرتے ہیں۔ مجھے بھی تین تین دن ہر ایک مقام میں گُزرے۔ چَوتھے رَوز جب رخصت ہونے لگا تب بھی کسو نے خوشی سے نہ کہا کہ جاؤ اور جتنا اسباب اُس مکان

میں تھا، شطرنجی، چاندنی، قالینیں، سیتل پاٹی، منگل کوٹی، دیوار گیری، چھت پردے، چلونیں، سائبان، نَم گیرے، چھپر کھٹ مع غلاف، اَدَوچہ، توشک، بالا پوش، سیج بند، چادر، تکیے، تکیئی، گُل تکیے، مَسند، گاؤ تکیے، دیگ، دیگچے، پتیلے، طباق، رکابی، بادیے، تشتری، چمچے، بکاوَلی، کف گیر، طعام بخش، سر پوش، سینی، خوان پوش، تورہ پوش، آب خورے، بُھرے، صُراحی، لگن، پان دان، چوگھرے، چنگیر، گُلاب پاش، عُود سوز، آفتابہ، چلمچی سب میرے حوالے کیئے کہ یہ تمھارا مال ہے۔ چاہو اب لے جاؤ، نہیں تو ایک کوٹھری میں بند کر کر اپنی مُہر کرو۔ جب تمھاری خوشی ہوگی، پھرتے ہُوئے لیئے جائیو۔ میں نے یُوں نہیں کیا۔ پر یہ حیرت ہے کہ جب مجھ سے فقیرِ تنِ تنہا سے (۲۵۲) یہ سلوک ہُوا۔ تو ایسے غریب ہزاروں تمھارے ملکوں میں آتے جاتے ہوں گے۔ پس اگر ہر ایک سے یہی مہمان داری کا طور رہتا ہوگا تو مُبلغ بے حساب خرچ ہوتے ہوں گے۔ پس اِتنی دولت کہ جس کا یہ صرف ہے، کہاں سے آئی اور کیسی ہے؟ اگر گنجِ قارون ہو، تو بھی وفا نہ کرے۔ اور ظاہر میں اگر ملکہ کی سلطنت پر نگاہ کیجیئے تو اُس کی آمد فقط باورچی خانے کے خرچ کو بھی کفایت نہ کرتی ہوگی، اور خرچوں کا تو کیا ذکر ہے۔ اگر اِس کا بیان ملکہ کی زبان سے سُنوں تو خاطر جمع ہو، قصد ملکِ نیمروز کا کروں اور جُوں تُوں وہاں جا پہنچوں پھر سب احوال دریافت کر کے، ملکہ کی خدمت میں بہ شرطِ زندگی بارِ دگر حاضر ہو (۲۵۳)، اپنے دل کی مُراد پاؤں۔''

یہ سُن کر ملکہ نے اپنی زبان سے کہا کہ اے جوان! اگر تجھے آرزو کمال ہے کہ یہ ماہیت دریافت کرے، تو آج کے دن بھی مقام کر۔ شام کو تجھے حضور میں طلب کر کر، جو کچھ احوال اِس دولتِ بے زوال کا ہے، بے کم و کاست کہا جائے گا۔ میں یہ تسلّی پا کر اپنی استقامت کے مکان پر آ کر منتظر تھا کہ کب شام ہو جو میرا مطلب تمام ہو۔ اِتنے میں خواجہ سرا کئی چوگوشے تورہ پوش پڑے، بھوئیوں کے سر پر دھرے، آ کر موجود ہُوا اور بولا کہ حضور سے اُلشِ خاص عنایت ہُوا ہے، اِس کو تناول کرو۔ جس وقت میرے سامنے کھولے، بُو باس سے دماغ مُعطّر ہُوا اور رُوح بھر گئی۔ جتنا کھا سکا کھالیا، باقی ان سبھوں کو اُٹھا دیا اور شکرِ نعمت کہہ بھیجا۔ (۲۵۴)

بارے جب آفتاب تمام دن کا مسافر تھکا ہُوا، گرتا پڑتا اپنے محل میں داخل ہُوا اور ماہتاب دیوان خانے میں اپنے مصاحبوں کو ساتھ لے کر نکل بیٹھا، اُس وقت دائی آئی اور مجھ سے کہنے لگی کہ چلو پادشاہ زادی نے یاد فرمایا ہے۔ میں اُس کے ہمراہ ہولیا۔ خلوتِ خاص میں لے گئی۔ روشنی کا یہ عالم تھا کہ شبِ قدر کو وہاں قدر نہ تھی اور پادشاہی فرش پر مسندِ مُغرق بچھی، مُرصّع کا تکیہ لگا ہُوا اور اس پر ایک شمیانہ موتیوں کی جھالر کا، جڑاؤ اِستادوں پر کھڑا ہُوا۔ اور سامنے مسند کے جواہر کے درخت پھول پات لگے ہوئے، گویا عَین مَین قدرتی ہیں، سونے کی کیاریوں میں جمے ہوئے۔

اور دونوں طرف دستِ راست اور دستِ چپ شاگرد پیشے اور مُجرائی دست بستہ، باادب آنکھیں نیچی کیئے ہُوئے حاضر تھے اور طوائف اور گائنیں سازوں کے سُر بنائے مُنتظر۔ یہ سماں اور یہ تیاری کرّ و فر کی دیکھ کر عقل ٹھکانے نہ رہی۔ دائی سے پُوچھا کہ دن کو وہ زیبائش اور رات کو یہ آرائش (۲۵۵) دن عید اور رات شب برات کہا چاہیئے، بلکہ دنیا میں پادشاہِ ہفت اِقلیم کو یہ عیش میسّر نہ ہوگا۔ ہمیشہ یہی صُورت رہتی ہے؟ دائی کہنے لگی کہ ہماری ملکہ کا جتنا کارخانہ تم نے دیکھا، یہ سب اِسی دستور سے جاری ہے۔ اِس میں ہرگز خلل نہیں، بلکہ افزوں ہے۔ تم یہاں بیٹھو۔ ملکہ دُوسرے مکان میں تشریف رکھتی ہیں، جا کر خبر کروں۔

دائی یہ کہہ کر گئی اور اُنھی پاٹوں پھر آئی کہ چلو حضور میں۔ یہ مُجرد اُس مکان میں جاتے ہی ہَھچک رہ گیا۔ نہ معلوم ہُوا کہ دروازہ کہاں اور دیوار کیدھر ہے، اِس واسطے کہ حلبی آیئنے قدِ آدم، چاروں طرف لگے اور اُن کی پَردازوں میں ہیرے اور موتی جڑے ہُوئے تھے۔ ایک کا عکس ایک میں نظر آتا تو یے معلوم ہوتا کہ جواہر کا سارا مکان ہے۔ ایک طرف پردہ پڑا تھا، اُس کے پیچھے ملکہ بیٹھی تھی۔ وہ دائی پردے سے لگ کر بیٹھی اور مجھے بھی بیٹھنے کو کہا۔ تب دائی، ملکہ کے فرمانے سے اِس طور بیان کرنے لگی کہ سُن، اے جوانِ دانا! سُلطان اِس اِقلیم کا بڑا پادشاہ تھا۔ اُس کے گھر میں سات بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ایک روز پادشاہ نے جشن فرمایا۔ یے ساتوں لڑکیاں سولہ سِنگار، بارہ اَبھرن، بال بال گَج مَوتی پرو کر پادشاہ کے حضور کھڑی تھیں۔ سُلطان کے کچھ جی میں آیا تو بیٹیوں کی طرف دیکھ کر فرمایا: ''اگر تمھارا باپ بادشاہ نہ ہوتا اور کسی غریب کے گھر تم پیدا ہوتیں، تو تمھیں پادشاہ زادی اور ملکہ کون کہتا؟ خُدا کا شکر کرو کہ شہزادیاں کہلاتی ہو، تمھاری یہ ساری خُوبی میرے دَم سے ہے۔'' چھ لڑکیاں ایک زبان ہو کر بولیں کہ جہاں پناہ جو فرماتے ہیں بجا ہے، اور آپ ہی کی سلامتی سے ہماری بھلائی ہے۔ لیکن یہ ملکہ جہاں سب بہنوں سے چھوٹی تھیں، پر عقل و شعور میں اُس عمر میں بھی گویا سب سے بڑی تھیں، چپکی کھڑی رہیں۔ اِس گفتگو میں بہنوں کی شریک نہ ہوئیں۔ اِس واسطے کہ یہ کلمہ کُفر کا ہے۔ (۲۵۶)

پادشاہ نے نظرِ غضب سے اُن کی طرف دیکھا اور کہا: ''کیوں بی بی! تُم کچھ نہ بولیں۔ اِس کا کیا باعث ہے؟'' تب ملکہ نے دونوں ہاتھ اپنے رُومال سے باندھ کر عرض کی کہ اگر جان کی امان پاؤں اور تقصیر مُعاف ہو تو یہ لَونڈی اپنے دل کی بات گُزارش کرے۔ (۲۵۷)

حُکم ہُوا کہ کہہ کیا کہتی ہے؟ تب ملکہ نے کہا کہ قِبلۂ عالَم! آپ نے سُنا ہے کہ سچّی بات کڑوی لگتی ہے (۲۵۸)۔ سو اِس وقت میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو کر عرض کرتی ہوں: اور جو کچھ میری قسمت میں لکھنے والے نے لکھا

ہے، اُس کا مِٹانے والا کوئی نہیں۔ کِسو طرح نہیں ٹلنے کا :

خواہ تم پانوں گھسو یا کہ رگھو سَر بسجود

بات پیشانی کی جو کُچھ ہے سو پیش آتی ہے

جس پادشاہ علَی الاطلاق نے آپ کو پادشاہ بنایا، اُنھیں نے مجھے بھی پادشاہ زادی کہوایا۔ اُس کی قُدرت کے کارخانے میں کِسو کا اختیار نہیں چلتا۔ آپ کی ذات ہماری ولی نعمت اور قبلہ و کعبہ ہے۔ حضرت کے قدمِ مُبارک کی خاک کو اگر سُرمہ کروں تو بجا ہے، مگر نصیب ہر ایک کے ہر ایک کے ساتھ ہیں۔ (۲۵۹) پادشاہ یہ سن کر طیش میں آئے، اور یہ جواب دِل پر سخت گراں معلوم ہُوا۔ بیزار ہو کر فرمایا: ''چھوٹا مُنہہ، بڑی بات۔ اَب اِس کی یہی سزا ہے کہ گہنا پاتا جو کچھ اِس کے ہاتھ گلے میں ہے، اُتار لو، اور ایک میانے میں چڑھا کر ایسے جنگل میں کہ جہاں نام و نشان آدمی، آدم زاد کا نہ ہو، پھینک آوَ۔ دیکھیں اِس کے نصیبوں میں کیا لکھا ہے۔''

بمُوجب حُکم پادشاہ کے، اُس آدھی رات میں کہ عین اندھیری تھی؛ ملکہ کو، جو نرے بھونرے میں پلی تھیں اور سوائے اپنے محل کے دُوسری جگہ نہ دیکھی تھی، بھوئی لے جا کر، ایک میدان میں کہ وہاں پرندہ پر نہ مار سکتا (۲۶۰)، انسان کا تو کیا ذکر ہے، چھوڑ کر چلے آئے۔ ملکہ کے دل پر عجب حالت گزرتی تھی کہ ایک دم میں کیا تھا اور کیا ہو گیا؟ پھر اپنے خدا کی جناب میں شُکر کرتیں اور کہتیں: ''تُو ایسا ہی بے نیاز ہے، جو چاہا، سو کیا، اور جو چاہتا ہے، سو کرتا ہے اور جو چاہے گا، سو کرے گا۔ جب تلک نتھنوں میں دم ہے، تُجھ سے نا مید (۲۶۱) نہیں ہوتی۔'' اِسی اندیشے میں آنکھ لگ گئی۔ جس وقت صُبح ہونے لگی، ملکہ کی آنکھ کھل گئی۔ پُکاریں کہ وضو کا پانی لانا۔ پھر ایک بارگی رات کی بات چیت یاد آئی کہ تُو کہاں اور یہ بات کہاں؟ یہ کہہ کر اُٹھ کر تیمّم کیا اور دوگانہ شُکر کا پڑھا۔ اے عزیز! ملکہ کی اِس حالت کے سُننے سے چھاتی پھٹتی ہے۔ اُس بھولے بھالے جی سے پُوچھا چاہیئے کہ کیا کہتا ہوگا۔ غرض اُس میانے میں بیٹھی ہُوئی، خُدا سے لَو لگائے رہی تھیں (۲۶۲) اور یہ کبت اُس دم پڑھتی تھیں:

جب دانت نہ تھے تب دُودھ دیو، جب دانت دیئے کہا اَن نہ دے ہے

جو جل میں تھل میں پنچھی پس کی سُدھ لیت، سو تیری بھی لے ہے

کاہے کو سوچ کرے مَن مُورکھ، سوچ کرے کچھ ہاتھ نہ اَے ہے

جان کو دیت، اَجان کو دیت، جہان کو دیت، سو تُو کو بھی دے ہے

سچ ہے، جب کچھ بن نہیں آتا، تب خُدا ہی یاد آتا ہے؛ نہیں تو اپنی اپنی تدبیر میں ہر ایک لُقمان اور بُو علی

سینا ہے۔ اب خدا کے کارخانے کا تماشا سُنو۔ اسی طرح تین دن رات صاف گُزر گئے کہ ملکہ کے مُنھ میں ایک کھیل بھی اُڑ کر نہ گئی۔ وہ پُھول سا بدن سُوکھ کر کانٹا ہو گیا اور وہ رنگ جو کُندن سا دمکتا تھا، ہلدی سا بن گیا۔ مُنھ میں پھپھڑی بندھ گئی۔ آنکھیں پتھرا گئیں، مگر ایک دَم اٹک رہا تھا کہ وہ آتا جاتا تھا۔ جب تلک سانس، تب تلک آس۔ چوتھے روز صبح کو ایک درویش، خضر کی سی صُورت، نُورانی چہرہ، روشن دل آ کر پَیدا ہُوا۔ ملکہ کو اِس حالت میں دیکھ کر بولا: ''اے بیٹی! اگرچہ تیرا باپ پادشاہ ہے لیکن تیری قسمت میں یہ بھی بدا تھا۔ اب اِس فقیر بوڑھے کو اپنا خادِم سمجھ اور اپنے پیدا کرنے والے کا رات دن دھیان رکھ۔ خدا خُوب کرے گا۔'' اور فقیر کے کچکول میں جو ٹکڑے بھیکھ (۲۶۳) کے موجود تھے، ملکہ کے رُوبرُو رکھے اور پانی کی تلاش میں پھرنے لگا۔ دیکھے، ایک کُوا تو ہے پر ڈول رسّی کہاں، جس سے پانی بھرے؟ تھوڑے پتّے درخت سے توڑ کر دُونا بنایا اور اپنی سیلی کھول کر اُس میں باندھ کر نکالا (۲۶۴) اور ملکہ کو کچھ کھلایا پلایا، بارے ٹک ہوش آیا۔ اُس مردِ خُدا نے بے کس اور بے بس جان کر بہت سی تسلّی دی، خاطر جمع کی اور آپ بھی رونے لگا۔ ملکہ نے جب غم خواری اور دِل داری اُس کی بے حد دیکھی، تب اُن کے بھی مزاج کو اِستقلال ہُوا۔ اُس روز سے اُس پیر مرد نے یہ مُقرر کیا کہ صبح کو بھیکھ (۲۶۵) مانگنے کے لیئے شہر میں نکل جاتا، جو ٹکڑا پارچہ پاتا، ملکہ کے پاس لے آتا اور کھلاتا۔

اِس طور سے تھوڑے روز گزرے۔ ایک دن ملکہ نے تیل سر میں ڈالنے اور کنگھی چوٹی کرنے کا قصد کیا۔ جُونہیں مُباف کھولا، چُٹلے میں سے ایک مَوتی کا دانہ، گول، آب دار نکل پڑا۔ ملکہ نے اُس درویش کو دِیا اور کہا: ''شہر میں سے اِس کو بیچ لاؤ۔'' وہ فقیر اُس گوہر کو بیچ کر اُس کی قیمت پادشاہ زادی کے پاس لے آیا۔ تب ملکہ نے حکم کیا کہ ایک مکان مُوافق گُزران کے، اِس جگہ بنواؤ۔ فقیر نے کہا: ''اے بیٹی! نیو دیوار کی کھود کر تھوڑی سی مٹی جمع کرو، ایک دن مَیں پانی لا کر گارا کر کر گھر کی بنیاد درست کر دوں گا۔'' ملکہ نے اُس کے کہنے سے مٹی کھودنی شروع کی۔ جب ایک گز عمیق گڑھا کھودا گیا، زمین کے نیچے سے ایک دروازہ نمُود ہُوا۔ ملکہ نے اُس در کو صاف کیا۔ ایک بڑا گھر جواہر اور اشرفیوں سے معمُور نظر آیا۔ ملکہ نے پانچ چار لَپ اشرفیوں کی لے کر پھر بند کیا، اور مٹی دے کر اُوپر سے ہموار کر دیا۔ اِتنے میں فقیر آیا، ملکہ نے فرمایا کہ راج اور معمار، کاری گر اور اپنے کام کے اُستاد اور مزدور جلد دست بُلاؤ، جو اِس مکان پر ایک عمارت پادشاہانہ کہ طاقِ کسریٰ کا جُفت ہو، اور قصرِ نُعمان سے سبقت لے جائے اور شہر پناہ اور قلعہ اور باغ اور باؤلی اور ایک مُسافر خانہ کہ لاثانی ہو، جلد تیار کریں۔ لیکن پہلے نقشہ اُن کا ایک کاغذ پر درست کر کے حضور میں لا دیں، جو پسند کیا جائے۔''

فقیر نے ایسے ہی کارکن کارکردہ، ذی ہوش لاکر حاضر کیئے۔ موافق فرمانے کے، تعمیر عمارت کی ہونے لگی۔ اور نوکر چاکر ہر ایک کارخان جات (۲۶۶) کی خاطر چُن چُن کر فہمیدہ اور بادیانت مُلازم ہونے لگے۔ اُس عمارتِ عالی شان کی تیاری کی خبر رفتہ رفتہ پادشاہ ظِلِّ سبحانی کو، جو قبلہ گاہ ملکہ کے تھے، پُہنچی۔ سُن کر بہت متعجب ہوئے اور ہر ایک سے پُوچھا کہ یہ کون شخص ہے جن نے یہ محلات بنانے شروع کیئے ہیں؟ اُس کی کیفیت سے کوئی واقف نہ تھا جو عرض کرے۔ سبھوں نے کانوں پر ہاتھ رکھے کہ کوئی غلام نہیں جانتا کہ اس کا بانی کون ہے۔ تب پادشاہ نے ایک امیر کو بھیجا اور پیغام دیا کہ میں اُن مکانوں کے دیکھنے کو آیا چاہتا ہوں، اور یہ بھی معلوم نہیں کہ تم کہاں کی بادشاہ زادی ہو اور کس خاندان سے ہو؟ یہ سب کیفیت دریافت کرنی اپنے تئیں منظور ہے''۔ جُونہیں ملکہ نے یہ خوش خبری سُنی، دل میں بہت شاد ہو کر عرضی لکھی کہ جہاں پناہ سلامت، حضور کے تشریف لانے کی خبر، طرف غریب خانے کی سُن کر نہایت خوشی حاصل ہوئی اور سبب حُرمت اور عزّت، کمترین کا ہُوا۔ زہے طالع اُس مکان کے! کہ جہاں قدمِ مبارک کا نشان پڑے، اور وہاں کے رہنے والوں پر دامنِ دولت سایہ کرے اور نظرِ توجّہ سے دے دونوں سرفراز ہوویں۔ یہ لونڈی اُمیدوار ہے کہ کل، روزِ پنج شنبہ، روزِ مُبارک ہے اور میرے نزدیک بہتر روزِ نوروز سے ہے۔ آپ کی ذات مُشابہ آفتاب کے ہے۔ تشریف فرما کر اپنے نُور سے اِس ذرّہ ءِ بے مقدار کو قدر و منزلت بخشیئے اور جو کچھ اِس عاجزہ سے میسّر ہو سکے، نوش جان فرمائیے۔ یہ غریب نوازی اور مُسافر پروری ہے۔ (۲۶۷) زیادہ حدِ ادب۔ اور اُس عُمدہ کو بھی کچھ تواضع کر کر رخصت کیا۔

پادشاہ نے عرضی پڑھی اور کہلا بھیجا کہ ہم نے تمھاری دعوت قبول کی، البتہ آویں گے۔'' ملکہ نے نوکروں اور سب کارباریوں کو حکم کیا کہ لوازمہ ضیافت کا ایسے سلیقے سے تیار ہو کہ پادشاہ دیکھ کر اور کھا کر بہت محظوظ ہوں اور اَدنا اعلیٰ جو پادشاہ کی رکاب میں آویں، سب کھا پی کر خُوش ہو کر جاویں۔ ملکہ کے فرمانے اور تاکید کرنے سے سب قسم کے کھانے سلُونے اور میٹھے، اِس ذائقہ کے تیار ہوئے کہ اگر باہمن کی بیٹی کھاتی تو کلمہ پڑھتی۔ جب شام ہُوئی، بادشاہ مُنڈے تخت پر سوار ہو کر ملکہ کے مکان کی طرف تشریف لائے۔ ملکہ اپنی خان خواص (۲۶۸) سہیلیوں کو لے کر استقبال کے واسطے چلیں۔ جُوں پادشاہ کے تخت پر نظر پڑی اِس آداب سے مُجرا شاہانہ کیا کہ یہ قاعدہ دیکھ کر پادشاہ کو اور بھی حیرت نے لیا، اور اُسی انداز سے جلوہ کر کر پادشاہ کو تختِ مُرصّع پر لا بٹھایا۔ ملکہ نے سوا لاکھ روپے کا چبوترہ تیار کروا رکھا تھا اور ایک سو ایک کشتی جواہر اور اشرفی اور پشمینہ اور نُور بافی اور ریشمی اور طلا بافی اور زردوزی کی لگا رکھی تھی۔ اور دو زنجیر فیل اور دس راس اَسپ عراقی اور یمنی، مُرصّع کے ساز سے تیار کر رکھے تھے۔

نذر گزرانے، اور آپ دونوں ہاتھ باندھے رُوبرو کھڑی رہیں۔ پادشاہ نے بہت مہربانی سے فرمایا کہ تم کِس ملک کی شہزادی ہو اور یہاں کِس صُورت سے آنا ہُوا؟

ملکہ نے آداب بجالا کر اِلتماس کیا کہ یہ لونڈی وہی گُنہ گار ہے، جو غضبِ سُلطانی کے باعث اِس جنگل میں پہنچی اور یہ سب تماشے خُدا کے ہیں، جو آپ دیکھتے ہیں۔ یہ سُنتے ہی پادشاہ کے لہو نے جوش مارا۔ اُٹھ کر محبت سے گلے لگالیا اور ہاتھ پکڑ کر اپنے تخت کے پاس کرسی بچھوا کر حُکم بیٹھنے کا کیا، لیکن پادشاہ حیران اور مُتعجب بیٹھے تھے، فرمایا کہ پادشاہ بیگم کو کہو کہ پادشاہ زادیوں کو اپنے ساتھ لے کر جلد آویں۔ جب وے آئیں، ما بہنوں نے پہچانا، اور گلے مل کر رَوئیں اور شُکر کیا۔

ملکہ نے اپنی والدہ اور چھہوں ہمشیروں کے رُوبرو اتنا کچھ نقد اور جواہر رکھا کہ خزانہ تمام عالَم کا اُس کے پاسنگ میں نہ چڑھے۔ پھر پادشاہ نے سب کو ساتھ بیٹھا کر (۲۶۹) خاصہ نوش جان فرمایا۔ جب تلک جہاں پناہ جیتے رہے، اسی طرح گزری۔ کبھو کبھو آپ آتے اور کبھی ملکہ کو بھی اپنے ساتھ محلوں میں لے جاتے۔

جب پادشاہ نے رِحلت فرمائی، سلطنت اُس اِقلیم کی ملکہ کو پہنچی کہ اِن کے سوا دوسرا کوئی لایق اُس کے نہ تھا۔ (۲۷۰) اے عزیز! سرگذشت یہ ہے، جو تُو نے سُنی، پس دولتِ خُداداد کو ہرگز زوال نہیں ہوتا، مگر آدمی کی نیّت درست چاہیئے؛ بلکہ جتنی خرچ کرو، اُس میں اتنی ہی برکت ہوتی ہے۔ خُدا کی قدرت میں تعجب کرنا کسی مذہب میں رَوا نہیں۔ (۲۷۱)

دائی نے یہ بات کہہ کر کہا: ''اب اگر قصد وہاں کے جانے کا اور اُس خبر لانے کا دل میں مقرر رکھتے ہو تو جلد روانہ ہو۔'' میں نے کہا: ''اِسی وقت میں جاتا ہوں اور خُدا چاہے تو جلد پھر آتا ہوں۔'' آخر رُخصت ہو کر اور فضلِ الٰہی پر نظر رکھ کر اُس سمت کو چلا۔

برس دن کے عرصے میں ہرج مرج کھینچتا ہُوا، شہرِ نیمروز میں جا پہنچا۔ جتنے وہاں کے آدمی ہزاری اور بزاری نظر پڑے، سیاہ پوش تھے۔ جیسا احوال سُنا تھا، اپنی آنکھوں سے دیکھا (۲۷۲)

کئی دِنوں کے بعد چاند رات ہوئی۔ پہلی تاریخ، سارے لوگ اُس شہر کے چھوٹے بڑے، لڑکے بالے، اُمرا پادشاہ، عورت مرد ایک میدان میں جمع ہُوئے میں بھی اپنی حالت میں حیران، سرگردان اُس کثرت کے ساتھ اپنے مال ملک سے جُدا، فقیر کی صُورت بنا ہوا کھڑا دیکھتا تھا کہ دیکھیئے پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ اتنے میں ایک جوان گاؤ سوار مُنہہ میں کف بھرے، جوش خروش کرتا ہُوا جنگل میں سے باہر نکلا۔ یہ عاجز جو اتنی محنت کر کے اُس

کے احوال دریافت کرنے کی خاطر گیا تھا، دیکھتے ہی اُسے حواس باختہ ہو کر حیران کھڑا رہ گیا۔ وہ جواں مرد قدیم قاعدے (۲۷۳) پر جو جو کام کرتا تھا، کر کر پھر گیا اور خلقت شہر کی، شہر کی طرف مُتوجہ ہوئی۔ جب مجھے ہوش آیا، تب میں پچھتایا کہ یہ کیا تجھ سے حرکت ہوئی، اب مہینے بھر پھر راہ دیکھنی پڑی۔ لاچار سب کے ساتھ چلا آیا اور اُس مہینے کو ماہِ رمضان کی مانند ایک ایک دِن، گِن گِن کر کاٹا، بارے دوسری چاند رات آئی، مجھے گویا عید ہوئی۔ غُرّے کو پھر پادشاہ، خلقت سمیت ڈُونہیں جا کر اِکٹھے ہوئے۔ تب میں نے دِل میں مُصمّم اِرادہ کیا کہ اَب کی بار جو ہو سو ہو، اپنے تئیں سنبھال کر اِس ماجرائے عجیب کو معلوم کیا چاہیئے۔

ناگاہ جوان بدستورِ زرد بَیل پر زین باندھے سوار کو آ پہنچا، اور اُتر کر دوزانو بیٹھا۔ ایک ہاتھ میں ننگی سَیف اور ایک ہاتھ میں بَیل کی ناتھ پکڑی اور مرتبان غلام کو دیا۔ غلام ہر ایک کو دکھا کر لے گیا۔ آدمی دیکھ کر رونے لگے۔ اُس جوان نے مرتبان پھوڑا، اور غلام کو ایک تلوار ایسی ماری کہ سر جُدا ہو گیا اور آپ سوار ہو کر مُڑا۔ میں اُس کے پیچھے جلد قدم اُٹھا کر چلنے لگا۔ شہر کے آدمیوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا: ''یہ کیا کرتا ہے، کیوں جان بُوجھ کر مرتا ہے؟ اگر ایسا ہی تیرا دَم ناک میں آیا ہے تو بہتیری طرحیں مرنے کی ہیں، مر رہیو۔'' ہر چند میں نے منت کی اور زور بھی کیا کہ کسو صُورت سے اُن کے ہاتھ سے چھوٹوں، چھٹکارا نہ ہُوا۔ دو چار آدمی لپٹ گئے اور پکڑے ہُوئے بستی کی طرف لے آئے۔ عجب طرح کا قلق پھر مہینے بھر گُزرا۔

جب وہ بھی مہینا تمام ہُوا اور سلخ کا دن آیا، صبح کو اُسی صورت سے سارے عالَم کا وہاں اِزدحام ہُوا۔ میں الگ سب سے نماز کے وقت اُٹھ کر آگے ہی جنگل میں، جو عین اُس جوان کی راہ پر تھا، گُھس کر چُھپ رہا کہ یہاں کوئی میرا مزاحم نہ ہوگا۔ وہ شخص اُسی قاعدے سے آیا اور وہی حرکتیں کر کر سوار ہُوا اور چلا۔ میں، اُس کا پیچھا کیا (۲۷۵) اور دوڑتا دُھوپتا ساتھ ہو لیا۔ اُس عزیز نے آہٹ سے معلوم کیا کہ کوئی چلا آتا ہے۔ ایک بارگی، باگ موڑ کر ایک نعرہ مارا اور گھُرکا۔ تلوار کھینچ کر میرے سر پر آ پہنچا۔ چاہتا تھا کہ حملہ کرے، میں نے نہایت ادب سے نہڑ کر سلام کیا اور دونوں ہاتھ باندھ کر کھڑا رہ گیا۔ وہ قاعدہ داں مُتکلّم ہُوا کہ اے فقیر! تُو ناحق مارا گیا ہوتا، پر بچ گیا۔ تیری حیات کچھ باقی ہے۔ جا، کہاں آتا ہے؟ اور جڑاؤ خنجر موتیوں کا اور آویزہ لگا ہُوا کمر سے نکال کر میرے آگے پھینکا اور کہا: ''اِس وقت میرے پاس کچھ نقد موجود نہیں جو تُجھے دُوں۔ اِس کو پادشاہ پاس لے جا، جو تُو مانگے گا، ملے گا۔''(۲۷۶)

ایسی ہَیبت اور ایسا رُعب اُس کا مجھ پر غالب ہُوا کہ نہ بولنے کی قدرت، نہ چلنے کی طاقت۔ مُنہ میں

گھگی بندھ گئی، پانو بھاری ہو گئے۔

اِتنا کہہ کر وہ غازی مَرد، نعرہ بھرتا ہُوا اچلا۔ میں نے دل میں کہا: ہر چہ باداباد، اب رہ جاتا تیرے حق میں بُرا ہے۔ پھر ایسا وقت نہ ملے گا۔ اپنی جان سے ہاتھ دھو کر میں بھی روانہ ہُوا۔ پھر وہ پھرا اور بڑے غصّے سے ڈانٹا، اور مُقرّر ارادہ میرے قتل کا کیا۔ میں نے سر جھکا دیا اور سوگند دی کہ اے رُستم وقت کے! ایسی ہی ایک سَیف مار کہ صاف دو ٹکڑے ہو جاؤں، ایک تسمہ باقی نہ رہے اور اِس حیرانی اور تباہی سے چُھوٹ جاؤں۔ میں نے اپنا خُون معاف کیا۔ وہ بولا کہ اے شیطان کی صُورت! کیوں اپنا خونِ ناحق میری گردن پر چڑھاتا ہے، اور مجھے گُنہ گار بناتا ہے؟ جا اپنی راہ لے، کیا جان بھاری پڑی ہے؟[۲۷۷]

میں نے اُس کا کہنا نہ مانا اور قدم آگے دھرا۔ پھر اُس نے دیدہ و دانستہ آنا کانی دی اور میں پیچھے لگ لیا۔ جاتے جاتے دو کوس وہ جھاڑ جنگل طے کیا۔[۲۷۸]

ایک چار دیواری نظر آئی۔ وہ جوان دروازے پر گیا اور ایک نعرۂ مُہیب مارا۔ دَر، آپ سے آپ کُھل گیا۔[۲۷۹] وہ اندر بیٹھا۔[۲۸۰] میں باہر کا باہر کھڑا رہ گیا۔ الٰہی اب کیا کروں! حیران تھا۔ بارے ایک دم کے بعد غلام آیا اور پیغام لایا کہ چل تجھے رُوبرُو بُلایا ہے۔ شاید تیرے سر پر اَجل کا فرشتہ آیا ہے، کیا تجھے کم بختی لگی تھی! میں نے کہا: ''زَہے نصیب۔'' اور بے دھڑک اُس کے ساتھ اندر باغ کے گیا۔

آخر ایک مکان میں لے گیا جہاں وہ بیٹھا تھا۔ میں نے اُسے دیکھ کر فراشی سلام کیا۔ اُس نے اِشارت بیٹھنے کی کی۔ میں ادَب سے دوزانو بیٹھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ مرد اکیلا، ایک مَسند پر بیٹھا ہے اور ہتھیار زرگری کے آگے دَھرے ہیں اور ایک جھاڑ زمُرّد کا تیار کر چُکا ہے۔ جب اُس کے اُٹھنے کا وقت آیا، جتنے غلام اُس شہ نشن کے گرد پیش حاضر تھے، حُجروں میں چُھپ گئے۔ میں بھی مارے وِسواس کے ایک کوٹھری میں جا گُھسا۔ وہ جوان اُٹھ کر سب مکانوں کی کُنڈیاں چڑھا کر باغ کے کونے کی طرف چلا اور اپنی سواری کے بَیل کو مارنے لگا۔ اُس کے چلانے کی آواز میرے کان میں آئی۔ کلیجا کانپنے لگا، لیکن اِس ماجرے کی دریافت کرنے کی خاطر یہ سب آفتیں سہیں تھیں، ڈرتے ڈرتے دروازہ کھول کر ایک درخت کے تنے کی آڑ میں جا کر کھڑا ہُوا اور دیکھنے لگا۔ جوان نے وہ سَونٹا، جس سے مارتا تھا؛ ہاتھ سے ڈال دیا اور ایک مکان کا قُفل، کُنجی سے کھولا اور اندر گیا۔ پھر وُنہیں باہر نکل کر نرگاؤ کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور مُنہہ چُوما اور دانہ گھاس کِھلا کر اِدھر کو چلا۔ میں دیکھتے ہی جلد دوڑ کر پھر کوٹھری میں جا چُھپا۔

اُس جوان نے زنجیریں سب دروازوں کی کھول دیں۔ سارے غلام باہر نکلے۔ زیر انداز اور سلپچی، آفتابہ لے کر حاضر ہوئے۔ وہ وُضو کر کر، نماز کی خاطر کھڑا ہُوا۔ جب نماز ادا کر چُکا، پُکارا کہ وہ درویش کہاں ہے؟ اپنا نام سُنتے ہی میں دوڑ کر رُوبرُو جا کھڑا ہُوا۔ فرمایا: ''بیٹھ'' میں تسلیم کر کر بیٹھا۔ خاصہ آیا، اُس نے تناول فرمایا، مجھے بھی عنایت کیا۔ میں نے بھی کھایا۔ جب دسترخوان بڑھایا اور ہاتھ دھوئے، غلاموں کو رُخصت دی کہ جا کر سو رہو۔ جب کوئی اُس مکان میں نہ رہا، تب مجھ سے ہم کلام ہُوا اور پُوچھا کہ اے عزیز! تُجھ پر کیا ایسی آفت آئی ہے، جو تُو اپنی مَوت کو ڈُھونڈھتا پھرتا ہے؟ (۲۸۶) میں نے اپنا احوال، آغاز سے انجام تک، جو کچھ گُزرا تھا، تفصیل وار بیان کیا اور کہا: ''آپ کی توجہ سے اُمید ہے کہ اپنی مُراد کو پہنچوں۔''

اُس نے یہ سُنتے ہی ایک ٹھنڈی (۲۸۷) سانس بھری اور بے ہوش ہُوا، اور کہنے لگا: ''بارِ خُدایا، عشق کے درد سے تیرے سوا کون واقف ہے! جس کی نہ پھٹی ہو بوائی، کیا جانے پیر پرائی۔ اِس درد کی قدر، جو دردمند ہو، سو جانے: (۲۸۸)

آفتوں کو عشق کی، عاشق سے پُوچھا چاہیئے
کیا خبر فاسق کو ہے؟ صادِق سے پُوچھا چاہیئے

بعد ایک لمحے کے ہوش میں آ کر ایک آہِ جگر سوز بھری، سارا مکان گونج گیا۔ تب مجھے یقین ہُوا کہ یہ بھی اِسی عشق کی بلا میں گرفتار ہے اور اِسی مرض کا بیمار ہے۔ تب تو میں نے دِل چَلا کر کہا کہ میں تے اپنا احوال سب عرض کیا۔ آپ توجہ فرما کر اپنی سرگذشت سے بندے کو مطلع فرمایئے، تو بہ مقدُور اپنے، پہلے تمھارے واسطے سعی کروں اور دِل کا مطلب کوشش کر کر ہاتھ میں لاؤں۔

القِصہ وہ عاشقِ صادق مجھ کو اپنا ہم راز اور ہم درد جان کر اپنا ماجرا اِس صورت سے بیان کرنے لگا کہ سُن اے عزیز! میں پادشاہ زادۂ جگر سوز اِس اِقلیم نیمروز کا ہوں۔ پادشاہ، یعنے قِبلہ گاہ نے میرے پیدا ہونے کے بعد نجومی اور رمال اور پنڈت جمع کیے اور فرمایا کہ احوال شہزادے کے طالعوں کا دیکھو اور جانچو، اور جنم پتری درست کرو۔ اور جو جو کچھ ہونا ہے، حقیقت پل پل، گھڑی گھڑی اور پہر پہر اور دن دن، مہینے مہینے اور برس برس مُفصّل حضور میں عرض کرو۔ بمُوجب حُکم پادشاہ کے، سب نے مُتفق ہو، اپنے اپنے عِلم کے رُو سے ٹھہراتا (۲۸۱) اور سادھ کر اِلتماس کیا (۲۸۲): ''خُدا کے فضل سے ایسی نیک ساعت اور سُبھ لگن میں شہزادے کا تولّد اور جنم ہُوا ہے کہ چاہیئے سکندر کی سی پادشاہت کرے اور نوشیرواں سا عادِل ہو اور جتنے علم اور ہنر ہیں، اُن میں کامل ہو اور جس کام کی

طرف دل اِس کا مائل ہو، وہ بخوبی حاصل ہو۔ سخاوت وشجاعت میں ایسا نام پیدا کرے کہ حاتم اور رُستم کو لوگ بُھول جاویں، لیکن چَودہ برس تلک سُورج اور چاند کے دیکھنے سے ایک بڑا خطرہ نظر آتا ہے۔ بلکہ یہ وَسواس ہے کہ جنونی اور سودائی ہو کر بہت آدمیوں کا خون کرے (۲۸۳) اور بستی سے گھبراوے، جنگل میں جاوے اور چرند پرند کے ساتھ دل بہلاوے۔ اِس کا تقید رہے کہ رات دن آفتاب ماہتاب کو نہ دیکھے، بلکہ آسمان کی طرف بھی نگاہ نہ کرنے پاوے۔ جو اتنی مُدّت خیر و عافیت سے کٹے تو پھر ساری عمر سُکھ اور چین سے سلطنت کرے۔''

یہ سُن کر پادشاہ نے اِسی لیئے اِس باغ کی بِنا ڈالی، اور مکان مُتعدد، ہر ایک نقشے کے بنوائے۔ میرے تئیں تہ خانے میں پلنے کا حُکم کیا اور اُوپر ایک بُرج نمدے کا تیار کروایا، تو دُھوپ اور چاندنی اس میں سے نہ چَھنے۔ میں، دائی، دودھ پلائی اور انّا، چُھو چُھو اور کئی خواصوں کے ساتھ اِس محافظت سے اِس مکانِ عالی شان میں پرورش پانے لگا، اور ایک استادِ دانا، کار آزمودہ واسطے میری تربیت کے مُتعین کیا تو تعلیم، ہر علم اور ہُنر کی اور مشق، ہفت قلم کے لکھنے (۲۸۴) کرے اور جہاں پناہ ہمیشہ میرے خبر گیراں رہتے۔ دَم بہ دَم کی کیفیت روز مرّہ حضور میں عرض ہوتی۔ میں اُس مکان ہی کو عالَمِ دُنیا جان کر کھلونوں اور رنگ بہ رنگ پُھولوں سے کھیلا کرتا اور تمام جہان کی نعمتیں کھانے کے واسطے موجود رہتیں۔ جو چاہتا سو کھاتا۔ دس برس کی عُمر تک جتنی صنعتیں اور قابلیتیں تھیں، تحصیل کیں۔

ایک روز اُس گُنبد کے نیچے روشن دان سے ایک پُھول اَچنبھے کا نظر پڑا کہ دیکھتے دیکھتے بڑا ہوتا جاتا تھا۔ میں نے چاہا کہ ہاتھ سے پکڑ لُوں۔ جُوں جُوں (۲۸۵) میں ہاتھ لنبا کرتا تھا وہ اُونچا ہوجاتا تھا۔ میں حیران ہو کر اُسے تک رہا تھا۔ وونہیں ایک آواز قہقہے کی میرے کان میں آئی۔ میں نے اُس کے دیکھنے کو گردن اٹھائی، دیکھا تو نمدا چیر کر ایک مُکھڑا چاند کا سا نکل رہا ہے۔ دیکھتے ہی اُس کے، میرے عقل و ہوش بجا نہ رہے۔ پھر اپنے تئیں سنبھال کر دیکھا تو ایک مُرصّع کا تخت پری زادوں کے کاندھے پر مُعلّق کھڑا ہے اور ایک تخت نشین، تاج جواہر کا سر پر، اور خِلعت جَھلابور بدن میں پہنے، ہاتھ میں یاقوت کا پیالہ لیئے اور شراب پیئے ہُوئے بیٹھی ہے۔ وہ تخت، بلندی سے آہستہ آہستہ نیچے اُتر کر اُس بُرج میں آیا۔ تب پری نے مجھے بُلایا اور اپنے نزدیک بٹھایا۔ باتیں پیار کی کرنے لگی اور مُنہہ سے مُنہہ لگا کر ایک جام شراب گُلِ گُلاب (۲۸۹) میرے تئیں پلایا اور کہا: ''آدمی زاد بے وفا ہوتا ہے، لیکن دِل ہمارا تجھے چاہتا ہے۔'' ایک دم میں ایسی ایسی انداز و ناز کی باتیں کیں کہ دل محو ہوگیا اور ایسی خوشی حاصل ہُوئی کہ زِندگانی کا مزا پایا، اور یہ سمجھا کہ آج تُو دنیا میں آیا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ میں تو کیا ہُوں، کِسو نے یہ عالَم نہ دیکھا ہوگا، نہ سُنا ہوگا۔ اُس مزے میں خاطرِ جمع سے ہم دونوں بیٹھے تھے کہ گَھڑیال میں غُل پڑا لگا۔ اب اُس حادثۂ ناگہانی کا ماجرا سُن کہ وُونہیں چار پَری زادنے، آسمان پر سے اُتر کر کچھ اُس معشوقہ (۲۹۰) کے کان میں کہا۔ سُنتے ہی اُس کا چہرہ متغیّر ہو گیا اور مجھ سے بولی کہ اے پیارے! دل تو یہ چاہتا تھا کہ کوئی دَم تیرے ساتھ بیٹھ کر دل بہلاؤں اور اِسی طرح ہمیشہ آؤں یا تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں، پر یہ آسمان، دو شخص کو ایک جگہ آرام سے اور خوشی سے رہنے نہیں دیتا۔ لے، جاناں! تیرا خُدا نگہبان ہے۔ (۲۹۱)

یہ سُن کر میرے حواس جاتے رہے اور طوطے ہاتھ کے اُڑ گئے۔ میں نے کہا کہ اجی اب پھر کب ملاقات ہوگی؟ یہ کیا تم نے غضب کی بات سنائی؟ اگر جلد آؤ گی تو مجھے جیتا پاؤ گی نہیں تو پچھتاؤ گی یا اپنا ٹھکانا اور نام و نشان بتاؤ کہ میں ہی اُس پتے پر ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے اپنے تئیں تمھارے پاس پہنچاؤں۔ یہ سُن کر بولی: ''دُور پار شیطان کے کان بہرے، تمھاری صد و بیست سال کی عمر ہووے۔ اگر زندگی ہے تو پھر ملاقات ہو رہے گی۔ (۲۹۲) میں جِنوں کے بادشاہ کی بیٹی ہوں اور کوہِ قاف میں رہتی ہوں۔'' یہ کہہ کر تخت اُٹھایا اور جس طرح اُترا تھا، وُونہیں بلند ہونے لگا۔

جب تلک سامنے تھا، میری اور اُس کی چار آنکھیں ہو رہی تھیں، جب نظروں سے غائب ہُوا؛ یہ حالت ہو گئی جیسے پری کا سایہ ہوتا ہے۔ عجب طرح کی اُداسی دل پر چھا گئی، عقل و ہوش رُخصت ہُوا۔ دنیا آنکھوں کے تلے اندھیری ہو گئی۔ حیران، پریشان، زار زار رونا اور سر پر خاک اُڑانا، کپڑے پھاڑنا، نہ کھانے کی سُدھ، نہ بھلے بُرے کی بُدھ۔

اِس عشق کی بدولت کیا کیا خرابیاں ہیں
دل میں اُداسیاں ہیں اور اضطرابیاں ہیں

اِس خرابی سے دائی اور مُعلّم خبردار ہوئے۔ ڈرتے ڈرتے پادشاہ کے رُوبرُو گئے اور عرض کی کہ پادشاہ زادۂ عالمیان کا یہ حال ہے۔ معلوم نہیں خُود بخود یہ کیا غضب ٹُوٹا، جو ان کا آرام اور کھانا پینا سب چُھوٹا۔ تب پادشاہ، وزیر، اُمرائے صاحبِ تدبیر اور حکیم حاذق، مُنجّم صادق، مُلّا سیانے، خُوب دَرویش، سالک اور مجذُوب اپنے ساتھ لے کر اُس باغ میں رونق افزا ہُوئے۔ (۲۹۳)

میری بے قراری اور نالہ و زاری دیکھ کر اُن کی بھی حالت اضطراب کی ہو گئی۔ آب دیدہ ہو کر بے اختیار گلے سے لگا لیا اور اس کی تدبیر کی خاطر حُکم کیا۔ حکیموں نے قُوّتِ دل اور خللِ دماغ کے واسطے نُسخے لکھے اور مُلّاؤں

نے نقش و تعویذ پلانے اور پاس رکھنے کو دیئے۔ دُعائیں پڑھ (۲۹۴) کر پھُونکنے لگے اور نجومی بولے کہ ستاروں کی گردش کے سبب یہ صورت پیش آئی ہے۔ اِس کا صدقہ دیجیے۔

غرض ہر کوئی اپنے اپنے علم کی باتیں کہتا تھا پر جو گزرتی تھی، میرا دل ہی سہتا تھا۔ کسو کی سعی اور تدبیر میری تقدیرِ بَد کے کام نہ آئی، دن بہ دن دیوانگی کا زور ہُوا اور میرا بدن بے آب و دانے کم زور ہو چلا۔ رات دِن چلاّنا اور سر پٹکنا ہی باقی رہا۔ اُس حالت میں تین سال گزرے۔ چَوتھے برس ایک سوداگر سیر و سفر کرتا ہُوا آیا اور ہر ایک ملک (۲۹۵) کے تحفے تحائف عجیب و غریب جہاں پناہ کے حضور میں لایا۔ ملازمت حاصل کی۔ پادشاہ نے بہت توجہ فرمائی اور احوال پُرسی اُس کی کر کے پُوچھا کہ تُم نے بہت مُلک دیکھے، کہیں کوئی حکیم کامل بھی نظر پڑا، یا کسو سے مذکور اُس کا سُنا؟ اُس نے اِلتماس کیا کہ قبلۂ عالم! غلام نے بہت سیر کی، لیکن ہندوستان میں دریا کے بیچ ایک پہاڑی ہے، وہاں ایک گُسائیں جٹادھاری نے بڑا منڈھپ مہادیو کا اور سنگت اور باغ بڑی بہار کا بنایا ہے، اُس میں رہتا ہے اور اُس کا یہ قاعدہ ہے کہ برسویں دِن شِیو رات کے رَوز اپنے اَستھان سے نکل کر دریا میں پَیرتا ہے اور خوشی کرتا ہے۔ اشنان کے بعد جب اپنے آسن پر جانے لگتا ہے، تب بیمار اور دردمند دیس دیس اور مُلک مُلک کے، جو دُور دُور سے آتے ہیں، دروازے پر جمع ہوتے ہیں۔ اُن کی بڑی بھیڑ ہوتی ہے۔ (۲۹۶)

وہ مہَنت، جسے اُس زمانے کا افلاطون کہا چاہیئے، قارورہ اور نبض دیکھتا ہُوا اور ہر ایک کو نسخہ لکھ کر دیتا ہُوا چلا جاتا ہے۔ خُدا نے ایسا دستِ شِفا اُس کو دیا ہے کہ دَوا پیتے ہی اثر ہوتا ہے اور وہ مرض بالکل جاتا رہتا ہے۔ یہ ماجرا میں نے بہ چشمِ خُود دیکھا اور خُدا کی قدرت کو یاد کیا کہ ایسے ایسے بندے پیدا کیئے ہیں۔ اگر حکم ہو تو شہزادۂ عالمیان کو اُس (۲۹۷) پاس لے جاویں، اُس کو ایک نظر دیکھاویں۔ اُمید قوی ہے کہ جلد شفائے کامل ہو اور ظاہر میں بھی یہ تدبیر اچھّی ہے کہ ہر ایک مُلک کی ہُوا کھانے سے اور جا بجا کے آب و دانے سے مزاج میں فرحت آتی ہے۔

بادشاہ کو (۲۹۸) بھی اُس کی صلاح پسند آئی اور خُوش ہو کر فرمایا: ''بہت بہتر، شاید اُس کا ہاتھ راس آوے اور میرے فرزند کے دل سے وحشت جاوے۔ ایک امیر مُعتبر، جَہاں دیدہ، کار آزمُودہ کو اور اُس تاجر کو میری رکاب میں تعینات کیا اور اسباب ضروری ساتھ کر دیا۔ نواڑے، بَجرے، مَور پنکھی، پلوار، لچکے، کھیلنے، اُلاق، پٹیلیوں پر مع سرانجام سوار کر کر رخصت کیا۔ منزل منزل چلتے چلتے اُس ٹھکانے پر جا پہنچے۔ نئی ہُوا اور نیا دانہ پانی کھانے پینے سے کچھ مزاج ٹھہرا، لیکن خاموشی کا وہی عالَم تھا اور رونے سے کام۔ دَم بہ دَم یاد اُس پَری کی دِل سے

کھولتی نہ تھی۔ اگر کبھو کھولتا تو یہ بیت پڑھتا:

نہ جانوں کس پری رُو کی نظر ہوئی
ابھی تو تھا بھلا چنگا مرا دل(۲۹۹)

بارے جب دو تین مہینے گُزرے، اُس پہاڑ پر قریب چار ہزار مریض کے جمع ہوئے؛ لیکن سب یہی کہتے تھے کہ اب خُدا چاہے تو گُسائیں اپنے مٹھ سے نکلیں گے اور سب کو اُن کے فرمانے سے شِفائے کُلّی ہوگی۔

القصہ جس دن وہ دن آیا، صبح کو جوگی مانند آفتاب کے نکل آیا اور دریا میں نہایا اور پَیرا، پار جا کر پھر آیا اور بھبھوت بھسم تمام بدن میں لگایا۔ وہ گورا بدن مانند انگارے کے راکھ میں چُھپایا اور ماتھے پر مَلا گیر کا ٹیکا دیا۔ لنگوٹ باندھ کر انگوچھا کاندھے پر ڈالا، بالوں کا جُوڑا باندھا، مُوچھوں پر تاؤ دے کر چڑھواں جُوتا اڑایا۔ اُس کے چہرے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا اُس کے نزدیک کچھ قدر نہیں رکھتی۔ ایک قلم دان جڑاؤ، بغل میں لے کر ایک ایک کی طرف دیکھتا اور نُسخہ دیتا ہُوا میرے نزدیک آ پہنچا۔ جب میری اور اُس کی چار نظریں ہُوئیں، کھڑا رہ کر غور میں گیا اور مجھ سے کہنے لگا: ''ہمارے ساتھ آؤ۔'' میں ہم راہ ہولیا۔

جب سب کی نوبت ہو چکی، میرے تئیں باغ کے اندر لے گیا اور ایک مُقطّع، خُوش نقشے خِلوت خانے میں مجھے فرمایا کہ یہاں تم رہا کرو، اور آپ اپنے اَستھان میں گیا۔ جب ایک چِلّا گُزرا تو میرے پاس آیا اور آگے کی نسبت مجھے خُوش پایا۔ تب مُسکرا کر فرمایا کہ اس باغیچے میں سیر کیا کرو۔ جس مَیوے پر جی چلے، کھایا کرو اور ایک قُلفی چینی کی معجون بھری ہوئی دی کہ اُس میں سے چھ ماشے ہمیشہ بلا ناغہ نہار نوشِ جان فرمایا کرو۔ یہ کہہ کر وہ تو چلا گیا اور میں نے اُس کے کہنے پر عمل کیا۔ ہر روز قُوت بدن میں اور فرحت دِل کو معلوم ہونے لگی لیکن حضرتِ عشق کو کچھ اثر نہ کیا۔ اُس پری کی صُورت نظروں کے آگے پھرتی تھی۔

ایک روز طاق میں ایک جلد کتاب کی نظر آئی۔ اُتار کر دیکھا تو سارے علم دین و دنیا کے اس میں جمع کیئے تھے، گویا دریا کُوزے میں بھر دیا تھا۔ ہر گھڑی اُس کا مطالعہ کیا کرتا۔ علمِ حکمت اور تسخیر میں نہایت قُوّت بہم پہنچائی۔ اِس عرصے میں برس دن گُزر گیا۔ پھر وہی خوشی کا دن آیا۔ جوگی اپنے آسن پر سے اُٹھ کر باہر نکلا۔ میں نے سلام کیا۔ اُن نے قلم دان مجھے دے کر کہا: ''ساتھ چلو۔'' میں بھی ساتھ ہولیا۔ جب دروازے سے باہر نکلا، ایک عالَم دُعا دینے لگا۔ وہ امیر اور سوداگر مجھے ساتھ دیکھ کر گُستائیں کے قدموں میں گرے اور ادائے شُکر کرنے لگے کہ آپ کی توجہ سے بارے اِتنا تو ہُوا۔ وہ اپنی عادت پر دریا کے گھاٹ تک گیا اور اَشنان، پُوجا جس طرح ہر

سال کرتا تھا، کی۔ پھرتی بار بیماروں کو دیکھتا بھالتا چلا آتا تھا۔

اتفاقاً سَودائیوں کے غول میں ایک جوان، خُوب صُورت شکیل کہ ضعف سے کھڑے ہونے کی طاقت اُس میں نہ تھی، (۳۰۰) نظر پڑا۔ مجھے کو کہا کہ اُس کو ساتھ لے آؤ۔ سب کی دارُو درمن کر کے جب خلوت خانے میں گیا، تھوڑی سی کھوپڑی اُس جوان کی تراش کر، چاہا کہ کنکھجورا جو مغز پر بیٹھا تھا، زنبُور سے اُٹھا لیوے۔ میرے خیال میں گُزرا اور بول اُٹھا کہ اگر دست پناہ، آگ میں گرم کر کر اِس کی پیٹھ پر رکھیئے تو خُوب ہے، آپ سے آپ نکل آوے گا اور جو یُوں کھینچیئے گا تو مغز کے گُودے کو نہ چھوڑے گا۔ پھر خوف زندگی کو ہے۔ یہ سُن کر میری طرف دیکھا اور چُپکا اُٹھ، باغ کے کونے میں ایک درخت کو ٹلے کو پکڑ (۳۰۱) جٹا کی لٹ کی گلے میں پھانسی لگا کر رہ گیا۔ میں نے (۳۰۲) پاس جا کر جو دیکھا تو واہ واہ، یہ تو مر گیا! یہ اَچنبھا دیکھ کر نہایت افسوس ہُوا۔ لاچار جی میں آیا، اُسے گاڑ دُوں۔ جُوں درخت سے جدا کرنے لگا، دو کُنجیاں اُس کی لٹوں میں سے گر پڑیں۔ میں نے اُن کو اٹھالیا اور اُس گنجِ خُوبی کو زمین میں دفن کیا۔ وے دونو کُنجیاں لے کر سب قُفلوں میں لگانے لگا۔ اتفاقاً دو حُجروں (۳۰۳) کے تالے اُن تالیوں سے کُھلے۔ دیکھا تو زمین سے چھت تلک جَواہر بھرا ہوا ہے، اور ایک پیٹی مخمل سے مڑھی، سونے کے پتر لگی، قُفل دی ہوئی، ایک طرف دھری ہے۔ اُس کو جو کھولا تو ایک کتاب دیکھی کہ اس میں اِسم اعظم اور حاضرات جن و پری کی اور رُوحوں کی مُلاقات اور تسخیرِ آفتاب کی ترکیب لکھی ہے۔ (۳۰۴)

ایسی دولت کے ہاتھ لگنے سے نہایت خوشی حاصل ہوئی اور اُن پر عمل کرنا شروع کیا۔ دروازہ باغ کا کھول دیا۔ اپنے اُس امیر کو اور ساتھ والوں کو کہا کہ کشتیاں منگوا کر یہ سب جواہر و نقد جنس اور کتابیں بار کر لو، اور ایک نواڑے پر آپ سوار ہو کر وہاں سے بحر کو روانہ کیا۔ آتے آتے جب نزدیک اپنے ملک کے پہنچا، جہاں پناہ کو خبر ہُوئی۔ سوار ہو کر استقبال کیا اور اِشتیاق سے بے قرار ہو کر کلیجے سے لگا لیا۔ میں نے قدم بوسی کر کر کہا کہ اِس خاک سار کو قدیم باغ میں رہنے کا حکم ہو۔ بولے کہ اے برخوردار، وہ مکان میرے نزدیک منحوس ٹھہرا، لہٰذا اُس کی مرّمت اور تیاری موقوف کی۔ اب وہ مکان لایق انسان کے رہنے کے نہیں رہا اور جس محل میں جی چاہے، اُترو۔ بہتر یُوں ہے کہ قلعے میں کوئی جگہہ پسند کر کے میری آنکھوں کے رُوبرُو رہو اور باغ، جیسا چاہو تیار کروا کر سیر و تماشا دیکھا کرو (۳۰۵)۔ میں نے بہت ضِد اور ہٹ کر کر اُس باغ کو نئے سر سے تعمیر کروا دیا اور بہشت کی مانند آراستہ کر داخل ہُوا۔ پھر فراغت سے جِنّوں کی تسخیر کی خاطر چلّے بیٹھا اور ترکِ حیوانات کر کر حاضرات کرنے لگا۔

جب چالیس دن پُورے ہُوئے، تب آدھی رات کو ایک ایسی آندھی آئی کہ بڑی بڑی عمارتیں گر پڑیں اور درخت جڑ پیڑ سے اکھڑ کر کہیں سے کہیں جا پڑے اور پری زادوں کا لشکر نمود ہُوا۔ ایک تخت ہُوا سے اُترا۔ اُس پر ایک شخص شاندار موتیوں کا تاج اور خِلعت پہنے ہوئے بیٹھا تھا۔ میں نے دیکھتے ہی بہت مَودّب ہو کر سلام کیا۔ اُس نے میرا سلام لیا اور کہا: ''اے عزیز! یہ کیا تُو نے ناحق دُند مچایا؟ ہم سے تجھے کیا مُدعا ہے؟'' میں نے اِلتماس کیا کہ یہ عاجز بہت مدّت سے تمہاری بیٹی پر عاشق ہے، اور اسی لیئے کہاں سے کہاں خراب و خستہ ہُوا اور جیتے جی مُوا۔ اَب زندگی سے بہ تنگ آیا ہوں اور اپنی جان پر کھیلا ہوں، جو یہ کام کیا ہے۔ اب آپ کی ذات سے اُمیدوار ہوں کہ مجھ حیران سرگردان کو اپنی توجہ سے سرفراز کرو، اور اُس کے دیدار سے زندگی اور آرام بخشو تو بڑا ثواب ہوگا۔ [۳۰۶] یہ میری آرزو سُن کو بولا کہ آدمی خاکی اور ہم آتشی، ان دونوں میں موافقت آنی مشکل ہے۔ میں نے قسم کھائی کہ ان کے دیکھنے کا میں مشتاق ہوں، اور کچھ مَطلب نہیں۔ پھر اُس تخت نشین نے جواب دیا کہ انسان اپنے قول قرار پر نہیں رہتا۔ غرض کہ وقت پر سب کچھ کہتا ہے، لیکن یاد نہیں رکھتا۔ یہ بات میں تیرے بھلے کے لیے کہہ سُنا تا ہوں کہ اگر تُو نے کبھو قصد کچھ اور کیا تو وہ بھی اور تُو بھی دونوں خراب اور خستہ ہوگے، بلکہ خَوف جان کا ہے۔ میں نے پھر دوبارہ سوگند یاد کی کہ جس میں طرفین کی بُرائی ہووے، ویسا کام ہرگز نہ کروں گا، مگر ایک نظر دیکھتا رہوں گا۔ یے باتیں ہوتیاں تھیں کہ اچِت وہ پری کہ جس کا مذکور تھا، نہایت ٹھسّے سے بناؤ کیئے ہوئے، آپہنچی اور پادشاہ کا تخت وہاں سے چلا گیا۔ تب میں نے بے اختیار اُس پری کو جان کی طرح بغل میں لے لیا [۳۰۷] اور یہ شعر پڑھا:

کماں اَبرو مرے گھر کیوں نہ آوے ۔۔۔ کہ جس کے واسطے کھینچے ہیں چلّے

اُسی خوشی کے عالَم میں باہم اُس باغ میں رہنے لگے۔ مارے ڈر کے کچھ اور خیال نہ کرتا۔ بالائی مزے لیتا اور فقط دیکھا کرتا۔ وہ پری میرے قول قرار کے نِباہنے پر دل میں حیران رہتی اور بعضے وقت کہتی کہ پیارے! تم بھی اپنی بات کے بڑے سچے ہو، لیکن ایک نصیحت، میں دوستی کی راہ سے کرتی ہوں۔ اپنی کتاب سے خبردار رہیو کہ جن کسی نہ کسی دن تمہیں غافل پا کر چُرا لے جائیں گے۔ میں نے کہا: ''اسے میں اپنی جان کے برابر رکھتا ہوں۔''

اتفاقاً ایک روز رات کو شیطان نے ورغلایا۔ شہوت کی حالت میں یہ دل میں آیا کہ جو کچھ ہو سو ہو، کہاں تلک اپنے تئیں تھانبوں؟ اُسے چھاتی سے لگا لیا اور قصد جماع کا کیا۔ وُونہیں ایک آواز آئی: ''یہ کتاب مجھ کو دے کہ اس میں اسمِ اعظم ہے، بے اَدبی نہ کر۔'' اُس مستی کے عالَم میں کچھ ہوش نہ رہا۔ کتاب بغل سے نکال کر بغیر

جانے پہچانے حوالے کردیا اور اپنے کام میں لگا۔ وہ نازنین یہ میری نادانی کی حرکت دیکھ کر بولی کہ ہے ظالم! آخر چُوکا اور نصیحت بھُولا۔

یہ کہہ کر بے ہوشی ہوگئی اور میں نے اُس کے سرہانے ایک دیو دیکھا کہ کتاب لیئے کھڑا ہے۔ چاہا کہ پکڑ کر خُوب ماروں اور کتاب چھین لوں، اتنے میں اُس کے ہاتھ سے کتاب دوسرا لے بھاگا۔ (۳۰۸)

میں نے جو افسُوں یاد کیئے تھے، پڑھنے شروع کیئے۔ وہ جن جو کھڑا تھا بَیل بن گیا، لیکن افسوس کہ پری ذرا بھی ہوش میں نہ آئی اور وہی حالت بے خودی کی رہی۔ تب میرا دل گھبرایا، سارا عیش تلخ ہوگیا۔

اُس روز سے آدمیوں سے نفرت ہوئی۔ اِس باغ کے گوشے میں پڑا رہتا ہوں اور دل کے بہلانے کی خاطر یہ مرتبان زمرّد کا جھاڑ دار بنایا کرتا ہوں، اور ہر مہینے اُس میدان میں اُسی بَیل پر سوار ہوکر جایا کرتا ہوں۔ مرتبان کو توڑ کر غُلام کو مار ڈالتا ہوں، اِس اُمید پر کہ سب میری یہ حالت دیکھیں اور افسوس کھاویں۔ شاید کوئی ایسا خُدا کا بندہ مہربان ہو کہ میرے حق میں دُعا کرے تو میں بھی اپنے مطلب کو پہُنچوں۔ (۳۰۹)

اے رفیق! میرے جنون اور سودا کی یہ حقیقت ہے جو میں نے تجھے کہہ سُنائی۔"

میں سُن کر آب دیدہ ہُوا اور بولا کہ اے شہزادے! تُو نے واقعی عشق کی بڑی محنت اُٹھائی، لیکن قسم خُدا کی کھاتا ہُوں کہ میں اپنے مطلب سے درگزرا۔ اب تیری خاطر جنگل پہاڑ میں پھروں گا اور جو مُجھ سے ہو سکے گا سو کروں گا۔ یہ وعدہ کر کر میں جوان سے رُخصت ہُوا اور پانچ برس تک سَودائی سا ویرانے میں خاک چھانتا پھرا۔ سُراغ نہ ملا۔

آخر اُکتا کر ایک پہاڑ پر چڑھ گیا اور چاہا کہ اپنے تئیں گراؤں کہ ہڈّی پسلی کچھ ثابت نہ رہے۔ وہی ایک (۳۰۹) سوار بُرقعہ پوش آ پہنچا اور بولا کہ اپنی جان مَت کھو، تھوڑے دِنوں کے بعد تُو اپنے مقصد سے کامیاب ہوگا۔" یا سائیں اللہ! تمھارے دیدار تو میسّر ہوئے۔ اب خُدا کے فضل سے اُمیدوار ہوں کہ خوشی اور خُرمی حاصل ہو، اور سب نامراد اپنی مُراد کو پہُنچیں۔

جب دُوسرا درویش بھی اپنی سیر کا قصہ کہہ چکا، رات آخر ہوگئی اور وقت صبح کا شروع ہونے پر آیا۔ بادشاہ آزاد بخت چُپکا اپنے دولت خانے کی طرف روانہ ہُوا۔ محل میں پہُنچ کر نماز ادا کی۔ پھر غُسل خانے میں جا کر خلعتِ فاخرہ پہن کر دیوانِ عام میں تخت پر نکل بیٹھا اور حکم کیا کہ یساول جاوے، چار فقیر فلانے مکان پر وارد ہیں، اُن کو بہ عزت اپنے ساتھ حضور میں لے آوے۔

بمُوجب حُکم کے، چوب دار وہاں گیا۔ دیکھا تو چاروں بے نُوا، جھاڑا جھٹکا پھر ہاتھ مُنہہ دھوکر چاہتے ہیں کہ دِسا کریں اور اپنی اپنی راہ لیں۔ چیلے نے کہا: ''شاہ جی! پادشاہ نے چاروں صُورتوں کو طلب فرمایا ہے۔ میرے ساتھ چلیئے۔'' چاروں درویش آپس میں ایک ایک کو تکنے لگے[۳۱۰] اور چوب دار سے کہا: ''بابا! ہم اپنے دِل کے پادشاہ ہیں۔ ہمیں دنیا کے پادشاہ سے کیا کام ہے؟'' اُس نے کہا: ''مِیاں اللہ! مضایقہ نہیں، اگر چلو تو اچّھا ہے''۔ اِتنے میں چاروں کو یاد آیا کو مَولا مُرتضٰی نے جو فرمایا تھا، سواَب پیش آیا۔ خُوش ہوئے[۳۱۱] اور یساول کے ہمراہ چلے۔ جب قلعے میں پہنچے اور رُوبرو پادشاہ کے گئے، چاروں قلندروں نے دعا دی کہ بابا! تیرا بھلا ہو۔ پادشاہ دیوانِ خاص میں جا بیٹھے اور دو چار خاص امیروں کو بُلایا، اور فرمایا کہ چاروں گُدڑی پوشوں کو بُلاؤ۔ جب وہاں گئے، حکم بیٹھنے کا کِیا۔ احوال پرسی فرمائی کہ تمھارا کہاں سے آنا ہُوا، اور کہاں کا اِرادہ ہے؟ مکانِ مُرشدوں کے کہاں ہیں؟

اُنھوں نے کہا کہ پادشاہ کی عُمر و دولت زیادہ رہے، ہم فقیر ہیں۔ ایک مُدّت سے خانہ بدوش اِسی طرح سیر و سفر کرتے پھرتے ہیں۔[۳۱۲] وہ مَثَل ہے: فقیر کو جہاں شام ہوئی وہیں گھر ہے، اور جو کچھ اِس دنیائے ناپائدار میں دیکھا ہے، کہاں تک بیان کریں۔

آزاد بخت نے بہت تسلّی اور تشفّی کی اور کھانے کو منگوا کر اپنے رُوبرو ناشتا کروایا۔ جب فارغ ہُوئے، پھر فرمایا کہ اپنا ماجرا تمام، بے کم و کاست مُجھ سے کہو۔ جو مُجھ سے تمھاری خدمت ہو سکے گی، قصور نہ کروں گا۔

فقیروں نے جواب دیا کہ ہم پر جو جو کچھ بیتا ہے، نہ ہمیں بیان کرنے کی طاقت ہے، اور نہ پادشاہ کو سُننے سے فرحت ہوگی، اُس کو معاف کیجیے۔ تب پادشاہ نے تبسّم کیا، اور کہا: ''شب کو جہاں تم بستروں پر بیٹھے اپنا[۳۱۳] احوال کہہ رہے تھے، وہاں میں بھی موجود تھا۔ چنانچہ دو درویش کا احوال سُن چکا ہوں۔ اب چاہتا ہوں کہ دونوں جو باقی ہیں، وے بھی کہیں اور چند روز بخاطر جمع میرے پاس رہیں کہ قدم درویشان ردِّ بلا ہے۔'' پادشاہ سے یہ بات سُنتے ہی مارے خوف کے کانپنے لگے اور سر نیچے کر کے چُپ ہو رہے، طاقت گویائی کی نہ رہی۔

آزاد بخت نے جب دیکھا کہ اب اِن میں مارے رُعب کے حواس نہیں رہے، جو کچھ بولیں، فرمایا کہ اِس جہاں میں کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جس پر ایک نہ ایک واردات عجیب نہ ہوئی ہوگی۔ باوجودے کہ میں پادشاہ ہوں، لیکن میں نے بھی ایسا تماشا دیکھا ہے کہ پہلے میں ہی اُس کا بیان کرتا ہوں۔ تُم بہ خاطر جمع سُنو۔ درویشوں نے کہا: ''پادشاہ سلامت، آپ کا الطاف فقیروں کے حال پر ایسا ہی ہے[۳۱۴]۔ ارشاد فرمایئے۔''

آزاد بخت نے اپنا احوال شروع کیا اور کہا :

اے شاہو ! پادشاہ کا اب ماجرا سُنو
جو کچھ کہ میں نے دیکھا ہے اور میں سُنا ، سُنو (۳۱۵)
کہتا ہوں میں فقیروں کی خدمت میں سَر بَسر
احوال میرا خُوب طرح دِل لگا سُنو

میرے قبلہ گاہ نے جب وفائی پائی اور میں اِس تخت پر بیٹھا، عین عالَم شباب کا تھا۔ اور سارا یہ ملک رُوم کا، میرے حُکم میں تھا۔ اتفاقاً ایک سال، کوئی سوداگر، بَدخشاں کے مُلک سے آیا اور اسباب تجارت کا بہت سا لایا۔ خبرداروں نے میرے حضور میں خبر کی کہ ایسا بڑا تاجر آج تک شہر میں نہیں آیا، میں نے اُس کو طلب فرمایا۔ وہ تحفے ہر ایک مُلک کے لایق میری نذر کے، لے کر آیا۔ فی الواقع ہر ایک جنس بے بہا نظر آئی۔ چنانچہ ایک ڈبیہ میں ایک لعل تھا، نہایت خُوش رنگ اور آبدار، قد و قامت درست اور وزن میں پانچ مِثقال کا۔ میں نے باوجود سلطنت کے، ایسا جواہر کبھو نہ دیکھا تھا، اور نہ کِسو سے سُنا تھا، پسند کیا۔ سوداگر کو بہت سا انعام و اکرام دیا اور سَنَد راہ داری کی لکھ دی کہ اِس سے ہماری تمام قلمرو میں کوئی مزاحم محصُول کا نہ ہو اور جہاں جاوے اِس کو آرام سے رکھیں، چوکی پہرے میں حاضر رہیں۔ اِس کا نقصان اپنا نقصان سمجھیں۔ وہ تاجر حضور میں دربار کے وقت حاضر رہتا اور آدابِ سلطنت سے خُوب واقف تھا۔ اور تقریر و خوش گوئی اُس کی لایق سُننے کی تھی اور میں اُس لعل کو ہر روز جواہر خانے سے منگوا کر سرِ دربار دیکھا کرتا۔

ایک روز دیوانِ عام کیئے بیٹھا تھا، اور اُمرا، ارکانِ دولت اپنے اپنے پائے پر کھڑے تھے۔ اور ہر ملک کے پادشاہوں کے اَیلچی، مبارک باد کی خاطر جو آئے تھے، وے بھی سب حاضر تھے۔ اُس وقت میں نے مُوافق معمول کے اُس لعل کو منگوایا، جواہر خانے کا داروغہ لے کر آیا۔ میں ہاتھ میں لے کر تعریف کرنے لگا اور فرنگ کے اَیلچی کو دیا۔ (۳۱۶)

اُن نے دیکھ کر تبسّم کیا اور زمانہ سازی سے صِفت کی۔ اُسی طرح ہاتھوں ہاتھ ہر ایک نے لیا اور دیکھا اور ایک زبان ہو کر بولے کہ قبلہء عالم کے اِقبال کے باعث یہ میسّر ہُوا ہے۔ واللہ، کِسو پادشاہ کے ہاتھ آج تک ایسا رقم بے بہا نہیں لگا۔ اُس وقت میرے قبلہ گاہ کا وزیر کہ مرد دانا تھا اور اِسی خدمت پر سرفراز تھا، وزارت کی چوکی پر کھڑا تھا، آداب بجا لایا، اور التماس کیا کہ کچھ عرض کیا چاہتا ہوں، اگر جان بخشی ہو۔

میں نے حکم کیا کہ کہہ۔ وہ بولا: ''قبلۂ عالم! آپ پادشاہ ہیں اور پادشاہوں سے بہت بعید ہے کہ ایک پتّھر کی اِتنی تعریف کریں۔ اگرچہ رنگ ڈھنگ سَنگ میں لاثانی ہے، لیکن سَنگ ہے۔ اور اِس دَم سب ملکوں کے اَیلچی دربار میں حاضر ہیں۔ جب اپنے اپنے شہر میں جاویں گے، البتہ یہ نقل کریں گے کہ عجب بادشاہ ہے کہ ایک لعل کہیں سے پایا ہے، اُسے ایسا تُحفہ بنایا ہے کہ ہر روز رُوبرو منگاتا ہے اور آپ اُس کی تعریف کر کر سب کو دیکھاتا ہے۔ (۳۱۷) پس جو پادشاہ یا راجا یہ احوال سُنے گا، اپنی مجلس میں ہنسے گا۔ خُداوندا! ایک ادنا سوداگر نیشاپور میں ہے، اُس نے بارہ دانے لعل کے، کہ ہر ایک سات سات مِثقال کا ہے، پٹے میں نصب کر کر، کُتّے کے گلے میں ڈال دیے ہیں۔''

مُجھے سُنتے ہی غصہ چڑھ آیا اور کھسیانے ہو کر فرمایا کہ اِس وزیر کی گردن مارو (۳۱۸)۔ جلّادوں نے وُنہیں اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور چاہا کہ باہر لے جاویں۔

فرنگ کے پادشاہ کا ایلچی (۳۱۹) دست بستہ رُوبرو آ کھڑا ہُوا۔ میں نے پُوچھا کہ تیرا کیا مطلب ہے؟ اُس نے عرض کی: ''اُمیدوار ہُوں کہ تقصیر سے وزیر کی واقف ہُوں۔'' میں نے فرمایا کہ جُھوٹھ بولنے سے اور بڑا گناہ کونسا ہے۔ خصوصاً پادشاہوں کے رُوبرُو؟ اُن نے کہا: ''اِس کا دروغ ثابت نہیں ہُوا۔ شاید جو کچھ کہ عرض کی ہے، سچ ہو۔ ابھی بے گناہ کا قتل درست نہیں (۳۲۰)۔'' اُس کا میں نے یہ جواب دیا کہ ہرگز عقل میں نہیں آتا، ایک تاجر کہ نفع کے واسطے شہر بشہر اور مُلک بہ مُلک خراب ہوتا پھرتا ہے اور کوڑی کوڑی جمع کرتا ہے، بارہ دانے لعل کے، جو وزن میں سات سات مثقال کے ہوں، کُتّے کے پٹے میں لگا دے۔ اُس نے کہا: ''خُدا کی قدرت سے تعجب نہیں، شاید کہ باشد۔ ایسے تُحفے اکثر سوداگروں اور فقیروں کے ہاتھ آتے ہیں، اِس واسطے کہ یہ دونوں ہر ایک ملک میں جاتے ہیں۔ اور جہاں سے جو کچھ پاتے ہیں، لے آتے ہیں۔ صلاحِ دولت یہ ہے کہ اگر وزیر ایسا ہی تقصیروار ہے تو حُکم قید کا ہو۔ اِس لیئے کہ وزیر پادشاہوں کی عقل ہوتے ہیں، اور یہ حرکت سلاطینوں سے بدنُما ہے کہ ایسی بات پر کہ جُھوٹھ سچ اُس کا ابھی ثابت نہیں ہُوا، حکم قتل کا فرمائیں اور اُس کی تمام عُمر کی خدمت اور نمک حلالی بُھول جائیں۔ (۳۲۱)

پادشاہ سلامت! اگلے شہر یاروں نے بندی خانہ اِسی سبب ایجاد کیا ہے کہ پادشاہ یا سردار اگر کسو پر غضب ہوں تو اُسے قید کریں۔ کئی دن میں غُصہ جاتا رہے گا، اور بے تقصیری اُس کی ظاہر ہو گی۔ پادشاہ خونِ ناحق سے محفوظ رہیں گے۔ کل کو، روزِ قیامت میں ماخُوذ نہ ہوئیں گے۔'' (۳۲۲) میں نے جتنا اُس کے قائل کرنے کو چاہا، اُس نے ایسی معقول گفتگو کی کہ مجھے لاجواب کیا۔ تب میں نے کہا کہ خیر، تیرا کہنا پذیرا ہُوا۔ میں خُون سے اِس کے گُزرا، لیکن زِندان میں مُقید رہے گا۔ اگر ایک سال کے عرصے میں اُس کا سُخن راست ہُوا کہ ایسے لعل کتّے کے

گلے میں ہیں تو اُس کی نجات ہوگی، اورنہیں تو بڑے عذاب سے مارا جاوے گا۔ فرمایا کہ وزیر کو بندی خانے (۳۲۳) میں لے جاؤ۔ یہ حکم سُن کر اَیلچی نے زمین خدمت کی چُومی اور تسلیمات کی۔

جب یہ خبر وزیر کے گھر میں گئی، آہ واویلا مچا اور ماتم سرا ہوگیا۔ اُس وزیر کی ایک بیٹی تھی برس چودہ پندرہ کی، نہایت خُوب صُورت اور قابل، نوِشت وخواند میں درُست۔ وزیر اُس کو نپٹ پیار کرتا تھا اور عزیز رکھتا تھا۔ چنانچہ اپنے دیوان خانے کے پچھواڑے ایک رنگ محل اُس کی خاطر بنوا دیا تھا اور لڑکیاں عمدوں کی، اُس کی مصاحبت میں اور خواصیں شکیل، خدمت میں رہتیں۔ اُن سے ہنسی خُوشی کھیلا کُودا کرتی۔ (۳۲۴)

اِتفاقاً جس دن وزیر کو محبُوس خانے میں بھیجا، وہ لڑکی اپنی ہم جولیوں میں بیٹھی تھی اور خوشی سے گُڑیا کا بیاہ رچایا تھا۔ اور ڈھولک، پکھاوج لیئے ہُوے، رَت جگے کی تیاری کر رہی تھی۔ اور کڑاہی چڑھا کر گُلگلے اور رَحم تلتی اور بنا رہی تھی کہ ایک بارگی اُس کی ما روتی پیٹتی، سر کُھلے، پاؤں ننگے، بیٹی کے گھر میں گئی اور دو ہتڑ اُس لڑکی کے سر میں مارے اور کہنے لگی: ''کاش کہ تیرے بدلے خُدا اندھا بیٹا دیتا تو میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوتا اور باپ کا رفیق ہوتا۔'' وزیر زادی نے پُوچھا: ''اندھا بیٹا تمھارے کِس کام آتا، جو کچھ بیٹا کرتا، میں بھی کر سکتی ہُوں''۔ اَمّا نے جواب دیا: ''خاک تیرے سر پر! باپ پر یہ بپتا بیتی ہے کہ پادشاہ کے رُوبرو کچھ ایسی بات کہی کہ بندی خانے میں قید ہُوا''۔ اُس نے پُوچھا: ''وہ کیا بات تھی؟ ذرا میں بھی تو سُنوں۔'' تب وزیر کے قبیلے نے کہا کہ تیرے باپ نے شاید یہ کہا ہے کہ نیشاپور میں کوئی سوداگر ہے (۳۲۵)۔ اُس نے بارہ عدد لعلِ بے بہا، کتّے کے پٹّے میں ٹانکے ہیں۔ پادشاہ کو باور نہ ہُوا۔ اُس نے جُھوٹھا سمجھا اور اسیر کیا۔ اگر آج کے دن بیٹا ہوتا تو ہر طرح سے کوشش کر کر اِس بات کو تحقیق کرتا اور اپنے باپ کا اُپرالا کرتا۔ اور پادشاہ سے عرض معروض کر کے میرے خاوند کو بندی خانے سے مُخلصی دِلواتا۔

وزیر زادی بولی: ''اماں جان! تقدیر سے لڑا نہیں جاتا۔ چاہیئے، انسان بلائے ناگہانی میں صبر کرے اور اُمیدوار فضلِ الٰہی کا رہے۔ وہ کریم ہے، مُشکل کِسو کی اٹکی نہیں رکھتا اور رونا دھونا خُوب نہیں، مُبادا دشمن اور طرح سے پادشاہ کے پاس لگاویں اور لُترے چُغلی کھاویں کہ باعث زیادہ خفگی کا ہو۔ بلکہ جہاں پناہ کے حق میں دُعا کرو، ہم اُس کے خانہ زاد ہیں۔ وہ ہمارا خداوند ہے۔ وہی غضب ہُوا ہے، وہی مہربان ہوگا۔''(۳۲۶) اُس لڑکی نے عقل مندی سے ایسی ایسی طرح ما کو سمجھایا کہ کچھ اس کو صبر وقرار آیا۔ تب اپنے محل میں گئی اور چپکی ہو رہی۔ جب رات ہُوئی، وزیر زادی نے دادا کو بُلایا، اُس کے ہاتھ پاؤں پڑی۔ بہت سی مِنت کی اور رونے لگی اور کہا: ''میں یہ اِرادہ رکھتی ہُوں کہ امّاں جان کا طعنہ مجھ پر نہ رہے، اور میرا باپ مُخلصی پاوے۔ جو تُو میرا رفیق ہو تو میں نیشاپُور کو

چلوں اور اُس تاجر کو، جس کے کُتّے کے گلے میں ایسے لعل ہیں، دیکھ کر جو بن آوے، لے کر آؤں اور اپنے باپ کو چھڑاؤں۔'' پہلے تو اُس مرد نے انکار کیا، آخر بہت کہنے سُننے سے راضی ہُوا۔ تب وزیر زادی نے فرمایا: ''چپکے چپکے اسباب سفر کا درست کر اور جنس تجارت کی لایق نذر پادشاہوں کے خرید کر، اور غلام و نوکر چاکر جتنے ضرور ہوں ساتھ لے، لیکن یہ بات کِسو پر نہ کُھلے۔'' دادا نے قبول کیا اور اُس کی تیاری میں لگا۔ جب سب اسباب مُہیا کیا، اُونٹوں اور خچروں پر بار کر کر روانہ ہُوا، اور وزیر زادی بھی لباسِ مردانہ پہن کر ساتھ جا ملی۔ ہرگز کِسو کو گھر میں خبر نہ ہُوئی۔ جب صُبح ہُوئی، وزیر کے محل میں چرچا ہُوا کہ وزیر زادی غائب ہے، معلوم نہیں کیا ہُوئیں (۳۲۸)۔

آخر بدنامی کے ڈر سے ماں نے بیٹی کے گم ہونا چُھپایا اور وہاں وزیر زادی نے اپنا نام سوداگر بچہ رکھا۔ (۳۲۹) منزل بہ منزل چلتے چلتے نیشا پور میں پہنچی، خُوشی بہ خوشی کارواں سرا میں جا اُتری، اور سب اپنا اسباب اُتارا۔ رات کو رہی۔ فجر کو حمام میں گئی اور پوشاک پاکیزہ، جیسے رُوم کے باشندے پہنتے ہیں پہنی، اور شہر کی سیر کے واسطے نکلی۔ جب آتے آتے چوک میں پہنچی، (۳۳۰) چوراہے پر کھڑی ہوئی۔ ایک طرف دوکان جوہری کی نظر پڑی کہ بہت سے جواہر کا ڈھیر لگ رہا ہے، اور غلام لباسِ فاخرہ پہنے ہوئے دست بستہ کھڑے ہیں۔ اور ایک شخص جو سردار ہے، برس پچاس ایک کی اُس کی عُمر ہے، طالع مندوں کی سی خِلعت اور نیمہ آستین پہنے ہُوئے، اور کئی صاحب باوضع، نزدیک اُس کے کُرسیوں پر بیٹھے ہیں اور آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔

وہ وزیر زادی، جس نے اپنے تئیں سوداگر بچہ مشہور کیا تھا، (۳۳۱) اُسے دیکھ کر متعجب ہُوئی اور دِل میں سمجھ کر خوش ہُوئی کہ خُدا جُھوٹھ نہ کرے، جس سوداگر کا میرے باپ نے پادشاہ سے مذکور کیا ہے، اغلب ہے کہ یہی ہو۔ بار خُدایا! اُس کا احوال مجھ پر ظاہر کر۔

اِتفاقاً ایک طرف جو دیکھا تو ایک دوکان ہے، اُس میں دو پنجرے آہنی لٹکے ہیں اور اُن دونوں میں دو آدمی قید ہیں۔ اُن کی مجنون کی سی صُورت ہو رہی ہے کہ چرم و اُستخوان باقی ہے اور سر کے بال اور ناخن بڑھ گئے ہیں، سر اَوندھائے بیٹھے ہیں اور دو حبشی بد ہیئت مُسلّح دونوں طرف کھڑے ہیں۔ سوداگر بچّے کو اچنبھا آیا۔ لاحول پڑھ کر دوسری طرف جو دیکھا تو ایک دوکان میں قالیچے بچھے ہیں۔ اُن پر ایک چوکی ہاتھی دانت کی، اُس پر گدیلا مخمل کا پڑا ہُوا، ایک کُتا جواہر کا پٹا گلے میں اور سونے کی زنجیر سے بندھا ہُوا بیٹھا ہے۔ اور دو غُلام اَمرد، خُوب صُورت اُس کی خدمت کر رہے ہیں۔ ایک تو مورچھل جڑاؤ دستے کا لیئے جَھلتا ہے اور دُوسرا رُومال تارکشی کا ہاتھ میں لے کر مُنہہ اور پانوں اُس کا پونچھ رہا ہے (۳۳۲)۔ سوداگر بچّے نے خُوب غور کر کر جو دیکھا تو پٹے میں کُتّے کے بارہوں

دانے لعل کے، جیسے سُنے تھے موجود ہیں۔ شُکر خُدا کا کیا اور فِکر میں گیا کہ کِس صُورت سے اُن لعلوں کو پادشاہ پاس لے جاؤں اور دکھا کر اپنے باپ کو چُھڑواؤں! یہ تو اِس حیرانی میں تھا اور تمام خلقت چوک اور رستے کی، اُس کا حُسن و جمال دیکھ کر حیران تھی اور ہکّا بکّا ہو رہی تھی۔ (۳۳۳) سب آدمی آپس میں یہ چرچا کرتے تھے کہ آج تلک اِس صُورت و شبیہہ کا انسان نظر نہیں آیا۔ اُس خواجہ نے بھی دیکھا۔ ایک غُلام کو بھیجا کہ تُو جا کر بہ منت اُس سوداگر بچّے کو میرے پاس بُلا لا۔

وہ غلام آیا اور خواجہ کا پیام لایا کہ اگر مہربانی فرمایئے تو ہمارا خُداوند، صاحب کا مُشتاق ہے، چل کر ملاقات کیجیے۔ سوداگر بچّہ تو یہ چاہتا ہی تھا، (۳۳۴) بولا: ''کیا مضایقہ''۔ جُونہیں خواجہ کے نزدیک آیا اور اُس پر خواجہ کی نظر پڑی، ایک برچھی عشق کی سینے میں گڑی۔ تعظیم کی خاطر سرو قد اُٹھا، لیکن حواس باختہ۔ سوداگر بچّے نے دریافت کیا کہ اَب یہ دام میں آیا۔ آپس میں بغل گیری ہُوئے۔ خواجہ نے سوداگر بچّے کی پیشانی کو بوسہ دیا اور اپنے برابر بٹھایا۔ بہت سا تملّق کر کے پُوچھا کہ اپنے نام و نسب سے مجھے آگاہ کرو۔ کہاں سے آنا ہُوا، اور کہاں کا اِرادہ ہے؟ سوداگر بچّہ بولا کہ اِس کمترین کا وطن رُوم ہے، اور قدیم سے استنبول زاد بوم ہے۔ میرے قبلہ گاہی سوداگر ہیں۔ (۳۳۵) اب بہ سبب پیری کے طاقت سیر و سفر کی نہیں رہی۔ اِس واسطے مجھے رخصت کیا ہے کہ کار بار تجارت کا سیکھوں۔ آج تلک میں نے قدم گھر سے باہر نہ نکالا تھا۔ یہ پہلا ہی سفر درپیش ہُوا۔ دریا کی راہ ہوا و نہ پڑا، خُشکی کی طرف سے قصد کیا۔ لیکن اِس عجم کے ملک میں آپ کے اخلاق اور خُوبیوں کا جو شور ہے، محض صاحب کی ملاقات کی آرزو میں یہاں تک آیا ہوں۔ بارے فضلِ الٰہی سے خدمت شریف میں مُشرف ہُوا اور اُس سے زیادہ پایا۔ تمنا دِل کی بَر آئی، خُدا اسلامت رکھے، اب یہاں سے کُوچ کروں گا(۳۳۶)۔ یہ سُنتے ہی خواجہ کے عقل و ہوش جاتے رہے۔ بولا ''اے فرزند! ایسی بات مجھے نہ سُناؤ۔ کوئی دن غریب خانے میں کرم فرماؤ۔ بھلا یہ تو بتاؤ کہ تمھارا اسباب اور نوکر چاکر کہاں ہیں؟'' سوداگر بچّے نے کہا کہ مُسافر کا گھر سَرا ہے، اُنھیں وہاں چھوڑ کر میں آپ کے پاس آیا ہُوں۔ خواجہ نے کہا کہ بھٹھیار خانے میں رہنا مُناسب نہیں۔ میرا اِس شہر میں اعتبار ہے، اور بڑا نام ہے۔ جلد اُنھیں بُلوا لو۔ میں ایک مکان تمھارے اسباب کے لیئے خالی کر دیتا ہُوں۔ جو کچھ جنس لائے ہو، میں دیکھوں۔ ایسی تدبیر کروں گا کہ یہیں تمھیں بہت سا نفع ملے۔ تم بھی خوش ہوگے اور سفر کے ہرج مرج سے بچو گے اور مجھے بھی چند روز رہنے سے اپنا احسان مند کرو گے۔ سوداگر بچّے نے اُوپری دِل سے عذر کیا، لیکن خواجہ نے پذیرا نہ کیا اور اپنے گماشتے کو فرمایا کہ باربردار جلد بھیجو اور کارواں سرا سے اِن کا اسباب منگوا کر فُلانے مکان میں رکھواؤ۔

سوداگر بچّے نے ایک زنگی غُلام کو اُن کے ساتھ کر دیا کہ سب مال متاع لدوا کر لے آ، اور آپ شام تک خواجہ کے ساتھ بیٹھا رہا۔ جب گذری کا وقت ہو چکا، اور دکان بڑھائی، خواجہ گھر کو چلا۔ تب دونوں غُلاموں میں سے ایک نے کُتّے کو بغل میں لیا، دوسرے نے کُرسی اور قالیچہ اُٹھالیا اور اُن دونوں حبشی غلاموں نے اُن پنجروں (۳۳۷) کو مزدوروں کے سر پر دَھر دیا، اور آپ پانچوں ہتھیار باندھے ساتھ ہُوئے خواجہ، سوداگر بچّے کا ہاتھ، ہاتھ میں لیئے باتیں کرتا ہُوا حویلی میں آیا (۳۳۸) سوداگر بچّے نے دیکھا کہ مکانِ عالی شان، لایق پادشاہوں یا امیروں کے ہے۔ لبِ نہر فرش چاندی کا بچھا ہے اور مسند کے رُوبرُو اسباب عیش کا چُنا ہے۔ کُتّے کی صندلی بھی اُسی جگہ بچھائی اور خواجہ، سوداگر بچّے کو لے کر بیٹھا، بے تکلف تواضع شراب کی کی۔ دونوں پینے لگے۔ جب سرخوش ہُوئے، تب خواجہ نے کھانا مانگا۔ دستر خوان بچھا اور دُنیا کی نعمت چُنی گئی۔ پہلے ایک لنگری میں کھانا لے کر سر پوش طلائی ڈھانپ کر کُتّے کے واسطے لے گئے اور ایک دستر خوان زربفت کا بچھا کر اُس کے آگے دَھر دی۔ کُتّا صندلی سے نیچے اُتر، جتنا چاہا اُتنا کھایا اور سونے کی لگن میں پانی پیا، پھر چوکی پر جا بیٹھا۔ غلاموں نے رُومال سے ہاتھ مُنہہ اُس کا پاک کیا۔ پھر اُس طباق اور لگن کو غلام، پنجروں (۳۳۹) کے نزدیک لے گئے اور خواجہ سے کُنجیاں مانگ کر قُفل قفسوں کے کھولے (۳۴۰)۔ اُن دونوں اِنسانوں کو باہر نکال کر کئی سونٹے مار کر کُتّے کا جُھوٹا اُنھیں کھِلایا اور وُہی پانی پلایا۔ پھر تالے بند کر کرتالیاں خواجہ کے حوالے کیں۔ (۳۴۰)

جب یہ سب ہو چکا، تب خواجہ نے آپ کھانا شروع کیا۔ سوداگر بچّے کو یہ حرکت پسند نہ آئی۔ گھن کھا کر ہاتھ کھانے میں نہ ڈالا۔ ہر چند خواجہ نے منت کی، پر اُس نے انکار ہی کیا۔ تب خواجہ نے سبب اس کا پوچھا کہ تم کیوں نہیں کھاتے؟

سوداگر بچے نے کہا: ''یہ حرکت تمھاری اپنے تیئں بدنُما معلوم ہوئی۔ اس لیئے کہ اِنسان اشرف المخلوقات ہے اور کتا نجس العین ہے۔ پَس خدا کے دو بندوں کو کُتّے کا جُھوٹا کھلانا کس مذہب و ملت میں رَوا ہے؟ فقط یہ غنیمت نہیں جانتے کہ وے تمھاری قید میں ہیں؟ نہیں تو تُم اور وے برابر ہو (۳۴۲)۔ اب میرے تیئں شک آئی کہ تُم مسلمان نہیں۔ کیا جانُوں کون ہو، کہ کُتّے کو پُوجتے ہو۔ مجھے تمھارا کھانا مکروہ ہے۔ جب تلک یہ شُبہ دِل سے دُور نہ ہو۔''

خواجہ نے کہا: ''اے بابا! تُو کہتا ہے، میں یہ سب سمجھتا ہُوں، اور اِسی خاطر بدنام ہُوں کہ اِس شہر کی خلقت نے میرا نام خواجہ سگ پرست رکھا ہے۔ اِسی طرح پُکارتے ہیں اور مشہور کیا ہے، لیکن خدا کی لعنت کافروں

اور مُشرکوں پر ہوجیو۔'' کلمہ پڑھااور سوداگر بچّے کی خاطر جمع کی۔تب سوداگر بچّے نے پُوچھا کہ اگر مسلمان بہ دل ہو، تو اِس کا کیا باعث ہے کہ ایسی حرکت کرکے اپنے تئیں بدنام کیا ہے۔خواجہ نے کہا: ''اے فرزند! نام میرا بدنام ہے اور دُگنا محصول اِس شہر میں بھرتا ہوں، اِسی واسطے یہ بھید، کسو پر ظاہر نہ ہو۔عجب یہ ماجرا ہے کہ جو کوئی سُنے سوائے غم اور غصّے کے اسے کچھ اور حاصل نہ ہو۔تُو بھی مجھے معاف رکھ، کہ نہ مُجھ میں قدرت کہنے کی اور نہ تُجھ میں طاقت سننے کی رہے گی۔'' سوداگر بچّے نے اپنے دل میں غور کی کہ مجھے اپنے کام سے کام ہے، کیا ضرورت ہے جو ناحق میں زیادہ مُجوزہوں۔بولا: ''خیر، اگر لایق کہنے کے نہیں تو نہ کہیئے۔'' کھانے میں ہاتھ ڈالا، اور نوالہ اُٹھا کر کھانے لگا۔ دو مہینے تک اِس ہوشیاری اور عقل مندی سے سوداگر بچّے نے خواجہ کے ساتھ گُزران کی کہ کسو پر ہرگز نہ کھُلا کہ یہ عَورت ہے۔سب یہی جانتے تھے کہ مرد ہے اور خواجہ سے روز بروز ایسی محبت زیادہ ہُوئی کہ ایک دَم اپنی آنکھوں سے جُدا نہ کرتا۔

ایک دن عین مے نوشی کی صُحبت میں سوداگر بچّے نے رونا شروع کیا۔خواجہ نے دیکھتے ہی خاطرداری کی اور رُومال سے آنسو پُونچھنے لگا اور سبب گریہ کا پُوچھا (۳۴۳)۔سوداگر بچّے نے کہا۔''اے قبلہ! کیا کہوں؟ کاشکے تمھاری خدمے میں بندگی پیدا نہ کی ہوتی اور یہ شفقت، جو صاحب میرے حق میں کرتے ہیں، نہ کرتے۔اب دو مُشکلیں میرے پیش آئی ہیں۔نہ تمھاری خدمت سے جُدا ہونے کو جی چاہتا ہے اور نہ رہنے کا اتفاق یہاں ہوسکتا ہے۔اب جانا ضرور ہُوا، لیکن آپ کی جُدائی سے اُمید زندگی کی نظر نہیں آتی۔''

یہ بات سُن کر خواجہ بے اختیار ایسا رونے لگا کہ ہچکی بندھ گئی، اور بولا کہ اے نُورِ چشم! ایسی جلدی اِس اپنے بُوڑھے خادم سے سَیر ہُوئے کہ اِسے دل گیر کیئے جاتے ہو؟ قصدِ روانہ ہونے کا دِل سے دُور کرو۔جب تلک میری زندگی ہے، رہو تمھاری جُدائی سے ایک دَم مَیں جیتا نہ رہوں گا۔بغیر اجَل کے مرجاؤں گا اور اِس مُلک فارس کی آب وہوا بہت خُوب اور مُوافق ہے۔بہتر تو یُوں ہے کہ ایک آدمی مُعتبر بھیج کر اپنے والدین کو معۂ اسباب یہیں بُلوا لو، جو کچھ سواری اور باربرداری درکار ہو، میں موجود کروں؛ جب ماں باپ تمھارے اور گھربار سب آیا، اپنی خوشی سے کاروبار تجارت کا کیا کریو۔میں نے بھی اِس عمر میں زمانے کی بہت سختیاں کھینچیں ہیں اور مُلک مُلک پھرا ہوں۔اَب بوڑھا ہُوا، فرزند نہیں رکھتا۔میں تجھے بہتر اپنے بیٹے سے جانتا ہوں اور اپنا ولیعہد و مختار کرتا ہوں۔ میرے کارخانے سے بھی ہوشیار اور خبردار ہو۔جب تلک جیتا ہوں، ایک ٹکڑا کھانے کو اپنے ہاتھ سے دو۔جب مر جاؤں، گاڑ داب دیجو، اور سب مال متاع میرا لیجو۔ (۳۴۴)تب سوداگر بچّے نے جواب دیا، کہ'' واقعی صاحب نے

زیادہ باپ سے میری غم خواری اور خاطر داری کی کہ مجھے ماباپ بھول گئے۔ لیکن اِس عاصی کے والد نے ایک سال کی رُخصت دی تھی۔ اگر دیر لگاؤں گا تو وے اِس پیری میں روتے روتے مر جائیں گے۔ پس رضامندی پدر کی، خُوشنودی خُدا کی ہے۔ اور اگر وہ مُجھ سے ناراض (۳۴۵) ہوں گے تو میں ڈرتا ہوں کہ شاید دُعائے بد کریں (۳۴۶) کہ دونوں جہاں میں خُدا کی رحمت سے محروم رہوں۔ (۳۴۷)

اب آپ کی یہی شفقت ہے کہ بندے کو حکم کیجیے کہ فرمانا قبلہ گاہ کا بجالاوے اور حقِ پدری سے ادا ہووے۔ اور صاحِب کی توجہ کا ادائے شُکر جب تلک دَم میں دَم ہے، میری گردن پر ہے۔ اگر اپنے مُلک میں بھی جاؤں گا تو ہر دَم دِل و جان سے یاد کیا کروں گا۔ خُدا مُسبب الاسباب ہے۔ شاید پھر کوئی ایسا سبب ہو کہ قدم بوسی حاصل کروں۔''

غرض سوداگر بچّے نے ایسی ایسی باتیں لُون مرچ لگا کر خواجہ کو سُنائیں کہ وہ بچارا لاچار ہو کر ہونٹھ چاٹنے لگا۔ از بسکہ اُس پر شیفتہ اور فریفتہ ہو رہا تھا، کہنے لگا: ''اچھا، اگر تُم نہیں رہتے تو میں ہی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔ میں تُجھ کو اپنی جان کے برابر جانتا ہوں۔ پس جب جان چلی جاوے تو خالی بدن، کس کام آوے؟ اگر تُو اِسی میں رضامند ہے تو چل اور مجھے بھی لے چل۔'' سوداگر بچّے سے یہ کہہ کر اپنی بھی تیاری سفر کی کرنے لگا، اور گماشتوں کو حکم کیا کہ بار برداری کی فکر جلدی کرو۔

جب خواجہ کے چلنے کی خبر مشہور ہوئی، وہاں کے سوداگروں نے سُن کر سب نے تہیہ سفر کا کیا۔ خواجہء سگ پرست نے گنج اور جَواہر بے شمار، (۳۴۸) نوکر اور غُلام اَن گنت، تحفے اور اسبابِ شاہانہ بہت سا ساتھ لیے کر شہر کے باہر تنبُو اور قنات اور بے چوبے اور سَراپردے اور گندلے کھڑے کروا کر اُن میں داخل ہُوا۔ جتنے تجار تھے، اپنی اپنی بساط مُوافق، مال سوداگری کا لے کر ہم راہ ہُوئے؛ برائے خُود ایک لشکر ہو گیا۔

ایک دن ہُوگئی کو پیٹھ دے کر وہاں سے کُوچ کیا۔ ہزاروں اُونٹوں پر شلیتے اسباب کے اور خچروں پر صندوق نقد و جواہر کے لاد کر پانچ سَو غُلام، دشتِ قپچاق اور زَنگ و رَوم کے مُسلّح، صاحب شمشیر، تازی اور تُرکی و عراقی و عربی گھوڑوں پر چڑھ کر چلے۔ سب کے پیچھے خواجہ اور سوداگر بچّہ، خلعتِ فاخرہ پہنے سُکھپال پر سوار اور ایک تخت بغدادی اونٹ پر کسا، اُس پر کُتا مسند پر سویا ہُوا، اور اُن دونوں قیدیوں کے قفس ایک شُتر پر لٹکائے ہُوئے روانہ ہوئے۔ جس منزل میں پہنچتے، سب سوداگر خواجہ کی بارگاہ میں آکر حاضر ہوتے اور دسترخوان پر کھانا کھاتے اور شراب پیتے۔ خواجہ، سوداگر بچّے کے ساتھ ہونے کی خوشی میں شُکر خدا کا کرتا اور کُوچ دَر کُوچ چلا جاتا تھا۔ (۳۴۹)

بارے بخیر و عافیت نزدیک قسطنطنیہ کے آ پہنچے۔ باہر شہر کے مقام کیا۔ سوداگر بچّے نے کہا: ''اے قبلہ! اگر رخصت دیجیئے تو میں جا کر ماباپ کو دیکھوں، اور مکان، صاحب کے واسطے خالی کروں۔ جب مزاج عالی میں آوے شہر میں داخل ہو جیئے۔'' (۳۵۰) خواجہ نے کہا: ''تمھاری خاطر تو میں یہاں آیا۔ اچّھا جلد مل جُل کر میرے پاس آؤ (۳۵۱) اور اپنے نزدیک میرے اُترنے کو مکان دو۔'' سوداگر بچّہ رُخصت ہو کر اپنے گھر میں آیا۔ سب وزیر کے محل کے آدمی حیران ہُوئے کہ یہ مردوا کون گُھس آیا۔ (۳۵۲) سوداگر بچّہ، یعنے بیٹی وزیر کی، اپنی ما کے پاؤں پر جا گری اور روئی اور بولی کہ میں تمھاری جان ہوں۔ سُنتے ہی وزیر کی بیگم گالیاں دینے لگی کہ اے تتری! تُو بڑی شتا ہو نکلی۔ اپنا مُنھ تُو نے کالا کیا اور خاندن کو رُسوا کیا۔ ہم تو تیری جان کو رو پیٹ کر، صبر کر کے تُجھ سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے؛ جا دفع ہو۔ تب وزیرزادی نے سر پر سے پگڑی اُتار کر پھینک دی اور بولی: ''اے امّا جان! میں بُری جگہ نہیں گئی۔ کچھ بدی نہیں کی۔ مگر تمھارے بمُوجب فرمانے کے بابا کو قید سے چُھڑوانے کی خاطر یہ سب فِکر کی۔ (۳۵۳) الحمد للہ! کہ تمھاری دُعا کی برکت سے اور اللہ کے فضل سے پُورا کام کر کے آئی ہوں، کہ نیشاپور سے اُس سوداگر کو بمعہ کُتّے، جس کے گلے میں وہ لعل پڑے ہیں، اپنے ساتھ لائی ہوں؛ اور تمہاری امانت میں بھی خیانت نہیں کی۔ سفر کے لیئے مردانہ بھیس کیا ہے۔ اب ایک روز کا کام باقی ہے۔ وہ کر کر قبلہ گاہ کو پنڈت خانے سے چُھڑاتی ہوں، اور اپنے گھر میں آتی ہوں۔ اگر حکم ہو تو پھر جاؤں اور ایک روز باہر رہ کر خدمت میں آوں۔'' (۳۵۴)

ما نے جب خُوب معلوم کیا کہ میری بیٹی نے مَردوں کا کام کیا اور اپنے تئیں سب طرح سلامت و محفوظ رکھا ہے، خُدا کی درگاہ میں نک گھسنی کی اور خُوش ہو کر بیٹی کو چھاتی سے لگا لیا؛ اور مُنھ چُوما، بلائیں لیں، دعائیں دیں اور رُخصت کیا کہ تُو جو مناسب جان، سو کر۔ میری خاطر جمع ہوئی۔ (۳۵۵)

وزیرزادی پھر سوداگر بچّہ بن کر خواجۂ سگ پرست پاس چلی۔ وہاں خواجہ کو جُدائی اُس کی ازبسکہ شاق ہوئی، بے اختیار ہو کر کُوچ کیا۔ اتفاقاً نزدیک شہر کے اِدھر سے سوداگر بچّہ جاتا تھا اور اُدھر سے خواجہ آتا تھا۔ عین راہ میں ملاقات ہُوئی۔ خواجہ نے دیکھتے ہی کہا: ''بابا! مُجھ بُوڑھے کو اکیلا چھوڑ کر کہاں گیا تھا؟'' سوداگر بچّہ بولا: ''آپ سے اجازت لے کر اپنے گھر گیا تھا۔ آخر مُلازمت کے اِشتیاق نے وہاں رہنے نہ دیا، آ کر حاضر ہُوا۔'' شہر کے دروازے اُوپر (۳۵۶) دریا کے کنارے ایک باغ سایہ دار دیکھ کر خیمہ اِستاد کیا اور وہیں اُترے۔ خواجہ اور سوداگر بچّہ باہم بیٹھ کر شراب و کباب پینے کھانے لگے۔ جب عصر کا وقت ہُوا، سیر تماشے کی خاطر خیمے سے نکل کر صندلیوں پر بیٹھے۔ (۳۵۷)

اتفاقاً ایک قراوُل بادشاہی اُدھر آ نکلا۔ اُن کا لشکر اور نشست برخاست دیکھ کر اچنبھے ہو رہا، اور دل میں کہا، شاید اَیلچی کِسو پادشاہ کا آیا ہے۔ کھڑا تماشا دیکھتا تھا کہ (۳۵۸) خواجہ کے شاطر نے اُس کو آگے بُلایا اور پُوچھا کہ تُو کون ہے؟" اُس نے کہا: "میں بادشاہ کا میرِ شکار ہوں۔ شاطر نے خواجہ سے اُس کا احوال کہا۔ خواجہ نے ایک غلامِ کافری کو کہا کہ جا کر بازدار سے کہہ کہ ہم مُسافر ہیں۔ اگر جی چاہے تو آؤ بیٹھو، قہوہ قلیان حاضر ہے۔ جب میرِ شکار نے نام سوداگر کا سُنا، زیادہ مُتعجب ہُوا اور یتیم کے ساتھ خواجہ کی مجلس میں آیا۔ لوازم (۳۵۹) اور شان و شوکت اور سپاہ و غلام دیکھے۔ خواجہ اور سوداگر بچّے کو سلام کیا اور مرتبہ سگ کا نگاہ کیا۔ ہوش اُس کے جاتے رہے ہکّا بکّا سا ہو گیا۔ خواجہ نے اُسے دُھلا کر قہوے کی ضیافت کی۔ قراوُل نے نام نِشان (۳۶۰) خواجہ کا پُوچھا۔ جب رُخصت مانگی، خواجہ نے کئی تھان اور کئی تحفے اُسے دے کر اجازت دی۔

صبح کو جب پادشاہ کے دربار میں حاضر ہُوا، درباریوں سے خواجہ سوداگر کا ذکر کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ مُجھ کو خبر ہوئی۔ میرِ شکار کو میں نے رُوبرُو طلب کیا اور سوداگر کا احوال پوچھا۔ اُس نے جو کچھ دیکھا تھا، عرض کیا۔ سُننے سے کُتّے کے تجمّل کے اور دو آدمیوں کے پنجرے میں قید ہونے کی مجھ کو خفگی آئی۔ میں نے فرمایا: "وہ مردُود تاجر واجب القتل ہے۔" نسقچیوں کو حُکم کیا کہ جلد جاؤ، اُس بے دِین کا سر کاٹ لاؤ۔ قضا کار وہی اَیلچی فرنگ کا دربار میں حاضر تھا، مُسکرایا۔ مجھے اور بھی غضب زیادہ ہُوا، فرمایا کہ اے بے اَدب! پادشاہوں کے حضور میں بے سبب دانت کھولنے، اَدب سے باہر ہیں۔ بے محل ہنسنے سے رونا بہتر ہے۔ اُس نے اِلتماس کیا: "جہاں پناہ، کئی باتیں خیال میں گذریں، لہٰذا فِدوی مُتبسّم ہُوا۔ پہلے یہ کہ وزیر سچّا ہے، اب قید خانے سے رہائی پاوے گا، دوسرے یہ کہ پادشاہ خونِ ناحق سے اُس وزیر کے بچے۔ تیسرے یہ کہ قبلۂ عالم نے بے سبب اور بے تقصیر اُس سوداگر کو حُکم قتل کا کیا۔ اِن حرکتوں سے تعجب آیا کہ بے تحقیق ایک بے وقوف کے کہنے سے آپ ہر کسو کو حُکم قتل کا کر بیٹھتے ہیں۔ خُدا جانے فی الحقیقت اُس خواجہ کا احوال کیا ہے، اُسے حضور میں طلب کیجیے اور اس کی واردات پُوچھیے اگر تقصیر وار ٹھہرے، تب مُختار ہو۔ جو مرضی میں آوے، اُس سے سلوک کیجیے۔"

جب ایلچی نے اِس طرح سے سمجھایا، مجھے بھی وزیر کا کہنا یاد آیا۔ فرمایا: "جلد سوداگر کو اُس کے بیٹے کے ساتھ اور وہ سگ اور قفس حاضر کرو۔" قُورچی اُس کے بُلانے کو دوڑائے۔ وے ایک دَم میں سب کو حضور میں لے آئے۔ رُوبرُو طلب کیا۔ پہلے خواجہ اور اُس کا پسر آیا۔ دونوں لباسِ فاخرہ پہنے ہوئے۔ سوداگر بچّے کا جمال دیکھنے سے سب ادنا اعلا حیران اور بھچک ہوئے۔ ایک خوانِ طلائی، جواہر سے بھرا ہُوا، کہ ہر ایک رقم کی جُوت (۳۶۱) نے

سارے مکان کو روشن کر دیا؛ سوداگر بچّہ ہاتھ میں لیئے آیا، اور میرے تخت کے آگے نچھاور کیا۔ آداب کورنشات بجالا کر کھڑا ہوا۔ (۳۶۲)

خواجہ نے بھی زمین چُومی اور دُعا کرنے لگا۔ اِس گویائی سے بولتا تھا گویا(۳۶۳) بُلبلِ ہزار داستان ہے۔ میں نے اُس لیاقت کو بہت پسند کیا، لیکن عتاب کے رُو سے کہا: ''اے شیطان! آدمی کی صُورت، تُو نے یہ کیا جال پھیلایا ہے اور اپنی راہ میں کُواں کھودا ہے۔ تیرا کیا دِین ہے؟ اور یہ کون آئین ہے؟ کِس پیغمبر کی اُمّت ہے؟ اگر کافر ہے تو بھی یہ کیسی مَت ہے؟ اور تیرا کیا نام ہے کہ تیرا یہ کام ہے؟'' اُن نے کہا: ''قِبلۂ عالَم کی عُمر و دولت بڑھتی رہے۔ غُلام کا دِین یہ ہے کہ خُدا واحِد ہے۔ اُس کا کوئی شریک نہیں اور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کلمہ پڑھتا ہوں اور اُس کے بعد بارہ اِمام کو پیشوا جانتا ہوں (۳۶۵) اور آئین میرا (۳۶۶) ہے کہ پانچوں وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور روزہ رکھتا ہُوں۔ حج بھی کر آیا ہوں (۳۶۷) اور اپنے مال سے خُمس زکوٰۃ دیتا ہوں، اور مُسلمان کہلاتا ہُوں (۳۶۸)۔ لیکن ظاہر میں یہ سارے عَیب جو مجھ میں بھرے ہیں، جن کے سبب سے آپ ناخوش ہوئے ہیں، اور خلق اللہ (۳۶۹) میں بدنام ہو رہا ہُوں، اِس کا ایک باعث ہے کہ ظاہر نہیں کر سکتا۔ ہر چند ''سگ پرست'' مشہور ہُوں اور مُضاعَف محصول دیتا ہُوں؛ یہ سب قبول کیا ہے، پر دِل کا بھید، کسو سے نہیں کہا۔''

اِس بہانے سے میرا غصّہ زیادہ ہُوا اور کہا: ''مجھے تُو، باتوں میں پُھسلاتا ہے! میں نہیں ماننے کا، جب تلک اِس اپنی گمراہی کی دلیلِ معقول عرض نہ کرے کہ میرے دل نشین ہو۔ تب تُو جان سے بچے گا۔ نہیں تو اُس کے قصاص میں تیرا پیٹ چاک کرواؤں گا، تو سب کو عبرت ہو کہ بار دیگر کوئی دینِ محمدیؐ میں رخنہ نہ کرے۔'' خواجہ نے کہا: ''اے پادشاہ! مجھ کم بخت کے خُون سے درگذر کر اور جتنا مال میرا ہے کہ گنتی اور شُمار سے باہر ہے، سب کو ضبط کر لے اور مجھے اور میرے بیٹے کو اپنے تخت کے تصدّق کر کر چھوڑ دے، اور جاں بخشی کر۔''

میں نے تبسّم کر کے کہا: ''اے بے وقوف! اپنے مال کی طمع مجھے دکھاتا ہے۔ سوائے سچ بولنے کے اب تیری مُخلصی نہیں۔'' یہ سُنتے ہی خواجہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپکنے لگے اور اپنے بیٹے کی طرف دیکھ کر ایک آہ بھری اور بولا: ''میں تو پادشاہ کے رُوبرُو گنہگار ٹھہرا، مارا جاؤں گا۔ اب کیا کروں؟ تجھے کِس کو سونپوں؟'' میں نے ڈانٹا کہ اے مکّار! بس اب عذر بہت کیئے، جو کہنا ہے جلد کہہ۔

تب تو اُس مرد نے قدم بڑھا کر تخت کے پاس آ کر، پائے کو بوسہ دیا اور صِفت وثنا کرنے لگا اور بولا: ''اے شہنشاہ! اگر حُکم قتل کا میرے حق میں نہ ہوتا تو سب سیاستیں سہتا اور اپنا ماجرا نہ کہتا، لیکن جان سب سے عزیز

ہے۔کوئی آپ سے کُوئے میں (۳۷۰) نہیں گرتا۔پس، جان کی محافظت واجب ہے اور ترک واجب کا، خلاف حکم خُدا کے ہے۔خیر، جو مرضی مبارک میں یہی ہے (۳۷۱) تو سرگذشت اِس پیرِ ضعیف کی سُنیئے۔پہلے حکم ہو کہ (۳۷۲) وے دونوں قفس جن میں دو آدمی قید ہیں، حضور میں لا کر رکھیں، میں اپنا احوال کہتا ہوں۔اگر کہیں جُھوٹھ کہوں تو اُن سے پُوچھ کر مجھے قایل کیجیے اور انصاف فرمایئے۔" مجھے یہ بات اُس کی پسند آئی۔پنجروں کو منگوا کر اُن دونوں کو نکلوا کر خواجہ کے پاس کھڑا کیا۔

خواجہ نے کہا:"اے پادشاہ! یہ مرد، جو داہنی طرف ہے، غُلام کا بڑا بھائی ہے، اور جو بائیں کو کھڑا ہے، منجھلا برادر ہے۔میں اِن دونوں سے چھوٹا ہوں۔میرا باپ مُلکِ فارس میں سوداگر تھا۔جب میں چودہ برس کا ہُوا، قبلہ گاہ نے رحلت کی۔جب تجہیز و تکفین سے فراغت ہُوئی، اور پھُول اُٹھا چکے (۳۷۳)، ایک روز اِن دونوں بھائیوں نے مجھے کہا کہ اب باپ کا مال جو کچھ ہے، تقسیم کرلیں۔جس کا دل جو چاہے سو کام کرے۔میں نے سُن کر کہا:"اے بھائیو! یہ کیا بات ہے؟ میں تمھارا غلام ہوں۔بھائی چارے کا دعوےٰ نہیں رکھتا۔ایک باپ مر گیا، تم دونوں میرے پدر کی جگہ میرے سر پر قایم ہو۔ایک نانِ خُشک چاہتا ہوں، جس میں زندگی بسر کروں اور تمھاری خدمت میں حاضر رہوں۔مجھے حصے بخرے سے کیا کام ہے؟ تمھارے آگے کے جُھوٹے سے اپنا پیٹ بھر لُوں گا اور تمھارے پاس رہوں گا۔میں لڑکا ہوں، کچھ پڑھا لکھا بھی نہیں۔مجھ سے کیا ہو سکے گا؟ ابھی تُم مجھے تربیت کرو (۳۷۴)۔" یہ سُن کر جواب دیا کہ تُو چاہتا ہے اپنے ساتھ ہمیں بھی خراب اور محتاج کرے۔" میں چُپکا ایک گوشے میں جا کر رونے لگا۔پھر دل کو سمجھایا کہ بھائی آخر بزرگ ہیں، میری تعلیم کی خاطر چشم نُمائی کرتے ہیں کہ کچھ سیکھے۔اِسی فکر میں سو گیا۔صبح کو ایک پیادہ قاضی کا آیا اور مجھے دارالشّرع میں لے گیا۔وہاں دیکھا تو یہی دونوں بھائی حاضر ہیں۔قاضی نے کہا: "کیوں اپنے باپ کا وِرثہ بانٹ چُونٹ نہیں لیتا؟" میں نے گھر میں جو کہا تھا، وہاں بھی جواب دیا۔(۳۷۵)

بھائیوں نے کہا:"اگر یہ بات اپنے دل سے کہتا ہے تو ہمیں لا دعوےٰ لکھ دے کہ باپ کے مال و اسباب سے مجھے کچھ علاقہ نہیں۔" جب بھی میں نے یہی سمجھا کہ (۳۷۶) یہ دونوں میرے بزرگ ہیں، میری نصیحت کے واسطے کہتے ہیں کہ باپ کا مال لے کر بے جا تصرّف نہ کرے۔بہ مُوجب اُن کی مرضی کے فارغ خطی، بہ مُہر قاضی میں نے لکھ دی۔(۳۷۷) یے راضی ہوئے، میں گھر میں آیا (۳۷۸)۔دوسرے دن مجھ سے کہنے لگے:"اے بھائی! یہ مکان جس میں تُو رہتا ہے، ہمیں درکار ہے۔تُو اپنی بُود و باش کی خاطر اور جگہ لے کر جا رہ۔" تب میں نے دریافت کیا کہ یے باپ کی حَویلی میں بھی رہنے سے خوش نہیں۔لاچار اِرادہ اُٹھ جانے کا کیا۔جہاں پناہ! جب میرا باپ جیتا

تھا تو جس وقت سفر سے آتا، ہر ایک ملک کا تُحفہ بہ طریق سوغات کے لاتا اور مجھے دیتا۔ اِس واسطے کہ چھوٹے بیٹے کو ہر کوئی زیادہ پیار کرتا ہے۔ میں نے ان کو بیچ بیچ (۳۷۹) کر تھوڑی سی اپنی نج کی پُونجی بہم پہنچائی تھی، اُسی سے کچھ خرید فروخت کرتا۔ ایک بار لونڈی، میری خاطر تُرکستان سے میرا باپ لایا اور ایک دفعہ گھوڑے لے کر آیا۔ اُن میں سے ایک بچھیرا نا گند کہ ہونہار تھا، وہ بھی مجھے دِیا۔ میں اپنے پاس سے دانہ گھاس اُس کا کرتا تھا۔

آخر اِن کی بے مُرّوتی دیکھ، بیچ کر ایک حویلی خرید کی (۳۸۰)۔ وہاں جا رہا۔ یہ کُتّا بھی میرے ساتھ چلا آیا۔ واسطے ضروریات کے، اسباب خانہ داری کا جمع کیا اور دو غُلام خدمت کی خاطر مول لیئے اور باقی پُونجی سے ایک دوکان بزازی کی کر کے خدا کی توکل پر بیٹھا۔ (۳۸۱) اپنی قسمت پر راضی تھا۔ اگرچہ بھائیوں نے بدخلقی کی، پر خُدا جو مہربان ہُوا، تین برس کے عرصے میں ایسی دوکان (۳۸۲) جمی کہ میں صاحبِ اعتبار ہُوا۔ سب سرکاروں میں جو تُحفہ چاہتا، میری ہی دُکان سے جاتا۔ اِس میں بہت سے روپے کمائے اور نہایت فراغت سے گُزرنے لگی۔ ہر دَم جنابِ باری میں شُکرانہ کرتا اور آرام سے رہتا۔ یہ کبت اکثر اپنے احوال پڑھتا :

رُوٹھے کیوں نہ راجا ، واتیں کچھو نا ہیں کاجا
ایک تو سے مہاراجا ، اور کون کو سراہیئے
رُوٹھے کیوں نہ بھائی ، واتیں کچھو نہ بسائی
ایک تُو ہی ہے سَہائی ، اور کون پاس جائیئے
رُوٹھے کیوں نہ ہتر ستر آٹھوں جام (۳۸۳)
ایک راوری چرن کے نیہہ کو نبھائیئے (۳۸۴)
سنسار ہے رُوٹھا ، ایک تُو ہے انوٹھا
سب چُومیں گے انگوٹھا ، ایک تو نہ رُوٹھا چاہیے

اِتفاقاً جمعے کے روز میں اپنے گھر بیٹھا تھا کہ ایک غُلام میرا، سودے سلف کو بازار گیا تھا، بعد ایک دَم کے روتا ہُوا آیا۔ میں نے سبب پُوچھا کہ تُجھے کیا ہُوا؟ خفا ہو کر بولا کہ تمھیں کیا کام ہے؟ تُم خوشی مناؤ، لیکن قیامت میں کیا جواب دو گے؟ میں نے کہا: ''اے حبشی! ایسی کیا بَلا تُجھ پر نازل ہوئی؟'' اس نے کہا: ''یہ غضب ہے کہ تمھارے بڑے بھائیوں کی، چوک کے چوراہے میں ایک یہودی نے مُشکیں باندھیں ہیں، اور قُمچیاں مارتا ہے اور ہنستا ہے کہ اگر میرے روپے نہ دو گے تو مارتے مارتے مار ہی ڈالوں گا؛ بھلا مجھے ثواب تو ہو گا۔ پس تمھارے بھائیوں کی یہ نوبت

اور تم بےفکر ہو۔ یہ بات اچھی ہے؟ لوگ کیا کہیں گے؟" (۳۸۵)

یہ بات غُلام سے سُنتے ہی لہو نے جوش کیا۔ ننگے پاٗو بازار کی طرف دَوڑا اور غلاموں کو کہا: "جلد روپے لے کر آوَ۔" جو نہیں وہاں گیا، دیکھا تو جو کچھ غُلام نے کہا تھا، سچ ہے۔ اِن پر مار پڑ رہی ہے۔ حاکم کے پیادوں کو کہا: "واسطے خُدا کے، ذرا رہ جاوَ، میں یہودی سے پُوچھوں کہ ایسی کیا تقصیر کی ہے؛ جس کے بدلے یہ تعزیر کی ہے؟"

یہ کہہ کر میں یہودی کے نزدیک گیا اور کہا: "آج روزِ آدینہ ہے۔ اِن کو کیوں ضربِ شلّاق کر رہا ہے؟"

اُس نے جواب دیا: "اگر حمایت کرتے ہو تو پُوری کرو۔ اِن کے عِوض روپے حوالے کرو۔ نہیں تو اپنے گھر کی راہ لو۔"

میں نے کہا: "کیسے روپے؟ دستاویز نکال، میں روپے گِن دیتا ہوں۔" اُن نے کہا: "تمسّک حاکم کے پاس دے آیا ہُوں۔" اِس میں میرے دونوں غلام دو بدرہ روپے لے کر آئے۔ ہزار روپے میں نے یہودی کو دیئے اور بھائیوں کو چُھڑایا۔ (۳۸۶)

اِن کی یہ صورت ہو رہی تھی کہ بدن سے ننگے، اور بُھوکے پیاسے۔ اپنے ہمراہ گھر میں لایا۔ وُونہیں حمام میں نہلوایا، نئی پوشاک پہنائی۔ کھانا کھلایا۔ ہرگز اِن سے یہ نہ کہا کہ اِتنا مال باپ کا تم نے کیا کیا؟" شاید شرمندہ ہوں۔

اے پادشاہ! یے دونوں موجود ہیں۔ پُوچھیئے کہ سچ کہتا ہوں یا کوئی بات جُھوٹ بھی ہے؟ خیر، جب کئی دن میں مار کی کوفت سے بحال ہُوئے۔ ایک روز میں نے کہا کہ اے بھائیو! اب اِس شہر میں تم بے اعتبار ہو گئے (۳۸۷)۔ بہتر یہ ہے کہ چند روز سفر کرو۔ یہ سُن کر چُپ ہو رہے۔ میں نے معلوم کیا کہ راضی ہیں۔ سفر کی تیاری کرنے لگا۔ پال پرتل، بار برداری اور سواری کی فکر کر کے بیس ہزار روپے کی جنس تجارت کی خرید کی۔ ایک قافلہ سوداگروں کو بُخارے کو جاتا تھا اُن کے ساتھ کر دیا۔

بعد ایک سال کے وہ کارواں پھر آیا، اِن کی خَیر خبر کچھ نہ پائی۔ آخر ایک آشنا سے قسمیں دے کر پُوچھا۔ اُس نے کہا: "جب بُخارے میں گئے، ایک نے جُوئے خانے میں اپنا تمام مال ہار دِیا۔ اَب وہاں جاروب کشی کرتا ہے (۳۸۸) اور پھڑ کو لِیپتا پوتا ہے۔ جواری جو جمع ہوتے ہیں، اُن کی خدمت کرتا ہے۔ وے بہ طریقِ خیرات کے کچھ دیتے ہیں (۳۸۹)۔ وہاں گُر گا بنا پڑا رہتا ہے، اور دُوسرا بُوزہ فروش کے لڑکے پر عاشق ہُوا (۳۹۰)، اپنا مال سارا صرف کیا۔ اب وہ بُوزے خانے کی ٹہل کرتا ہے۔ قافلے کے آدمی اِس لیئے نہیں کہتے کہ تُو شرمندہ ہوگا۔"

یہ احوال اس شخص سے سُن کر میری عجب حالت ہُوئی۔ مارے فکر کے نیند بُھوک جاتی رہی۔ زادِ راہ لے کر قصد بُخارے کا کیا۔ جب وہاں پہنچا، دونوں کو ڈُھونڈھ ڈھانڈھ کر اپنے مکان میں لایا۔ غُسل کروا کر نئی

پوشاک پہنائی اور اِن کی خجالت کے ڈر سے ایک بات مُنھہ پر نہ رکھی۔ پھر مال سوداگری کا اِن کے واسطے خریدا، اور اِرادہ گھر کا کیا۔ جب نزدیک نیشاپور کے آیا، ایک گانْوں میں بہ معۂ مال اسباب اِن کو چھوڑ کر گھر میں آیا؛ اِس لیئے میرے آنے کی کِسی کو خبر نہ ہو۔

بعد دو دِن کے مشہور کیا کہ میرے بھائی سفر سے آئے ہیں، کل اُن کے استقبال کی خاطر جاؤں گا۔ صبح کو چاہا کہ چلوں (۳۹۱)۔ ایک گرہست اُسی موضع کا میرے پاس آیا اور فریاد کرنے لگا۔ میں اُس کی آواز سن کر باہر نِکلا۔ اُسے روتا دیکھ کر پُوچھا کہ کیوں زاری کرتا ہے؟۔ بولا: ''تمھارے بھائیوں کے سبب سے ہمارے گھر لُوٹے گئے۔ کاش کے اُن کو تم وہاں نہ چھوڑ آتے!''

میں نے پُوچھا: ''کیا مصیبت گُزری؟'' بولا کہ رات کو ڈاکا آیا۔ اِن کا مال واسباب لُوٹا اور ہمارا گھر بھی لُوٹ لے گئے۔ میں نے افسوس کیا اور پوچھا کہ اب وے دونوں کہاں ہیں؟ کہا: ''شہر کے باہر ننگے منگے، خراب خستہ بیٹھے ہیں''۔ وُونہیں دو جوڑے کپڑوں کے ساتھ لے کر گیا۔ پہنا کر گھر میں لایا۔ لوگ سُن کر اُن کے دیکھنے کو آتے تھے اور یے مارے شرمندگی کے باہر نہ نکلتے تھے۔

تین مہینے اِسی طرح گزرے۔ تب میں نے اپنے دل میں غور کی کہ کب تلک یے کونے میں دُبکے بیٹھے رہیں گے، بِہٗ تو اِن کو اپنے ساتھ سفر میں لے جاؤں۔ بھائیوں سے کہا: ''اگر فرمایئے تو یہ فِدوی آپ کے ساتھ چلے؟''(۳۹۲) یے خاموش ہو رہے۔ پھر لوازمہ سفر کا اور جنس سوداگری کی تیار کر کے چلا اور اِن کو ساتھ لیا۔

جس وقت مال کی زکوٰۃ دے کر اسباب کشتی پر چڑھایا، اور لنگر اُٹھایا، ناؤ چلی، یہ کُتّا کنارے پر سو رہا تھا۔ جب چونکا اور جہاز کو مانجھ دھار میں دیکھا، حیران ہو کر بھونکا، اور دریا میں کُود پڑا اور پَیرنے لگا۔ میں نے ایک پنسوئی دَوڑا دی۔ بارے سگ کو لے کر کشتی میں پہنچایا۔ (۳۹۳)

ایک مہینا خیر و عافیت سے دریا میں گُزرا۔ کہیں منجھلا بھائی میری لونڈی پر عاشق ہُوا۔ ایک دن بڑے بھائی سے کہنے لگا کہ چھوٹے بھائی کی مِنت اُٹھانے سے بڑی شرمندگی حاصل ہُوئی۔ اِس کا تدارک کیا کریں؟ بڑے نے جواب دیا کہ ایک صلاح دل میں ٹھہرائی ہے۔ اگر بَن آوے تو بڑی بات ہے۔ آخر دونوں نے مصلحت کر کے تجویز کی کہ اِسے مار ڈالیں اور سارے مال اسباب کے قابض، مُتصرّف ہوں۔

ایک دِن، میں جہاز کی کوٹھری (۳۹۴) میں سوتا تھا اور لونڈی پاؤں داب رہی تھی (۳۹۵) کہ منجھلا بھائی آیا اور جلدیؔ سے مجھے جگایا۔ میں ہڑبڑا کر چونکا اور باہر نِکلا۔ یہ کُتّا بھی میرے ساتھ ہو لیا۔ دیکھوں تو بڑا بھائی جہاز

کی باڑ پر ہاتھ ٹیکے نِہوڑا ہُوا، تماشا دریا کا دیکھ رہا ہے اور مجھے پُکارتا ہے۔ میں نے پاس جا کر کہا: ''خیر تو ہے؟'' بولا: ''عجب طرح کا تماشا ہو رہا ہے کہ دریائی آدمی موتی کی سیپیاں اور مُونگے کے درخت ہاتھ میں لیئے ہوئے ناچتے ہیں''۔ اگر اور کوئی ایسی بات خلافِ قیاس کہتا تو میں نہ مانتا۔ بڑے بھائی کے کہنے کو راست جانا۔ دیکھنے کو سر جُھکایا۔ ہر چند نگاہ کی، کچھ نظر نہ آیا اور وہ یہی کہتا رہا: ''اَب دیکھا؟'' لیکن کچھ ہو تو دیکھوں۔ اِس میں مجھے غافل پا کر مُنجھلے نے اچانک پیچھے آ کر ایسا ڈھکیلا(۳۹۶) کہ بے اختیار پانی میں گر پڑا۔ اور وے رونے دھونے لگے کہ دَوڑیو، ہمارا بھائی دَریا میں ڈُوبا۔ اِتنے میں ناؤ بڑھ گئی اور دریا کی لہر مجھے کہیں سے کہیں لے گئی۔ غوطے پر غوطے کھاتا تھا اور موجوں میں چلا جاتا تھا۔ آخر تھک (۳۹۷) گیا۔ خُدا کو یاد کرتا تھا، کچھ بس نہ چلتا تھا۔ ایک بارگی کِسو چیز پر ہاتھ پڑا۔ آنکھ کھول کر دیکھا تو یہی کُتّا ہے۔ شاید جس دَم مجھے دریا میں ڈالا، میرے ساتھ یہ بھی کُودا اور پَیرتا ہُوا میرے ساتھ لِپٹا چلا جاتا تھا۔ میں نے اُس کی دُم پکڑی (۳۹۸)۔ اللہ نے اُس کو میری زندگی کا سبب کیا۔ سات دن اور رات، یہی صُورت گزری۔ آٹھویں دن کنارے جا لگے۔ طاقت مُطلق نہ تھی، لیٹے لیٹے کروٹیں کھا کر جُوں تُوں اپنے تئیں خُشکی میں ڈالا۔ ایک دن بے ہوش پڑا رہا۔ دوسرے دن کتّے کی آواز کان میں گئی، ہوش میں آیا، خُدا کا شکر بجالایا۔ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دُور سے سَوادِ شہر کا نظر آیا، لیکن قُوّت کہاں کہ اِرادہ کروں! لاچار دو قدم چلتا، پھر بیٹھتا۔ اِسی حالت سے شام تک کوس بھر راہ کاٹی۔ بیچ میں ایک پہاڑ ملا۔ رات کو وہاں رہا۔ صبح کو شہر میں داخل ہُوا۔ جب بازار میں گیا، نان بائی اور حلوائیوں کی دوکانیں نظر آئیں (۳۹۹)۔ دل ترسنے لگا۔ نہ پاس پیسا، جو خرید کروں، نہ جی چاہے کہ مُفت مانگوں۔ اِسی طرح اپنے دل کو تسلی دیتا ہُوا، کہ اگلی دوکان (۴۰۰) سے لُوں گا، چلا جاتا تھا۔ آخر طاقت نہ رہی اور پیٹ میں آگ لگی۔ نزدیک تھا کہ رُوح بدن سے نکلے، ناگاہ دو جوان کو دیکھا کہ لباس عجم کا پہنے، اور ہاتھ پکڑے چلے آتے ہیں۔ اِن کو دیکھ کر خُوش ہوا کہ یے اپنے ملک کے انسان ہیں، شاید آشنا صُورت ہَوں، اِن سے اپنا احوال کہوں گا۔ جب نزدیک آئے تو میرے دونوں برادرِ حقیقی تھے۔ دیکھ کر بہت شاد ہُوا۔ شکر خُدا کا کیا کہ خُدا نے آبرو رکھ لی، غیر کے آگے ہاتھ نہ پسارا۔ نزدیک جا کر سلام کیا اور بڑے بھائی کا ہاتھ چُوما۔ اِنھوں نے مجھے دیکھتے ہی غُل وشور کیا۔ مُنجھلے بھائی نے طمانچہ مارا کہ میں لڑکھڑا کر گر پڑا۔ بڑے بھائی کا دامن پکڑا کہ شاید یہ حمایت کرے گا، اِس نے لات ماری۔ (۴۰۲)

غرض دونوں نے مجھے خُوب خُورد خام کیا اور حضرتِ یوسف کے بھائیوں کا سا کام کیا۔ ہر چند میں نے خُدا کے واسطے دیئے اور گھگیایا، ہرگز رحم نہ کھایا۔ ایک خلقت اِکٹھی ہُوئی۔ سب نے پُوچھا، اِس کا کیا گناہ ہے؟ تب

بھائیوں نے کہا: ''یہ حرام زادہ، ہمارے بھائی کا نوکر تھا۔ سو اُس کو دریا میں ڈال دیا اور مال اسباب سب لے لیا۔ ہم مُدّت سے تلاش میں تھے۔ آج اِس صورت سے نظر آیا۔'' اور مجھ سے پُوچھتے تھے کہ اے ظالم! یہ کیا تیرے دل میں آیا کہ ہمارے بھائی کو مار کھپایا! کیا اُن نے (۴۰۳) تیری تقصیر کی تھی۔ اُن نے تجھ سے کیا بُرا سلوک کیا تھا کہ اپنا مُختار بنایا تھا؟'' پھر اِن دونوں نے اپنے گریبان چاک کر ڈالے، اور بے اختیار جُھوٹھ مُوٹھ بھائی کی خاطر روتے تھے، اور لات مُکّی مجھ پر کرتے تھے۔

اِس میں حاکم کے پیادے آئے۔ اِن کو ڈانٹا کہ کیوں مارتے ہو؟ اور میرا ہاتھ پکڑ کر کوتوال کے پاس لے گئے۔ یہ دونوں بھی ساتھ چلے اور حاکم سے بھی یہی کہا اور بطور رِشوت کے کچھ دے کر اپنا انصاف چاہا، اور خُونِ ناحق کا دعویٰ کیا۔ حاکم نے مجھ سے پُوچھا۔ میری یہ حالت تھی کہ مارے بُھوکھ اور مار پیٹ کے، طاقت گویائی کی نہ تھی۔ سر نیچے کیئے کھڑا تھا، کچھ مُنْہ سے جواب نہ نکلا۔ حاکم کو بھی یقین ہُوا کہ یہ مقرر خُونی ہے۔ فرمایا کہ اِسے میدان میں لے جا کر سُولی دو۔ جہاں پناہ! میں نے روپے دے کر اِن کو یہودی کی قید سے چُھڑایا تھا۔ اُس کے عوض اِنھوں نے بھی روپے خرچ کر کے میری جان کا قصد کیا۔ وے دونوں (۴۰۴) حاضر ہیں۔ اِن سے پوچھیئے، میں اِس میں سرِ مُو تفاوت کہتا ہوں؟ (۴۰۵) خیر مجھے لے گئے۔ جب دار کو دیکھا، ہاتھ زندگی سے دھو دیئے، (۴۰۶) سِوائے اِس کُتّے کے، کوئی میرا رونے والا نہ تھا۔ اِس کی یہ حالت تھی کہ آدمی کے پانوں میں لوٹتا اور چلّاتا تھا۔ کوئی لکڑی، کوئی پتھر سے مارتا لیکن یہ اُس جگہ سے نہ سرکتا۔ اور میں رُو بہ قبلہ کھڑا ہو، (۴۰۷) خدا کو کہتا تھا کہ اِس وقت میں تیری ذات کے سوا میرا کوئی نہیں، جو آڑے آوے، اور بے گناہ کو بچاوے۔ اب تُو ہی بچاوے تو بچتا ہوں۔ یہ کہہ کر کلمہ شہادت کا پڑھ کر تیورا کر گر پڑا۔ (۴۰۸)

خُدا کی حکمت سے اُس شہر کے پادشاہ کو قولنج کی بیماری ہوئی۔ اُمراء اور حکیم جمع ہُوئے۔ جو علاج کرتے تھے فائدہ مند نہ ہوتا تھا۔ ایک بزرگ نے کہا کہ سب سے بہتر یہ دَوا ہے کہ مُحتاجوں کو کچھ خیرات کرو اور بندی وانوں کو آزاد کرو۔ دَوا سے دُعا میں بڑا اثر ہے۔ وُونہیں پادشاہی چیلے، پنڈت خانوں کی طرف دوڑے۔

اِتفاقاً، ایک اُس میدان میں آ نکلا۔ اِزدِحام دیکھ کر معلوم کیا کہ کِسو کو سُولی چڑھاتے ہیں۔ یہ سُنتے ہی گھوڑے کو دار کے نزدیک لا کر تلوار سے طنابیں کاٹ دیں۔ حاکم کے پیادوں کو ڈانٹا اور تنبیہہ کی کہ ایسے وقت میں کہ پادشاہ کی یے حالت ہے، تم خُدا کے بندے کو قتل کرتے ہو۔ اور مُجھے چُھڑوا دیا۔ تب یے دونوں بھائی پھر حاکم کے پاس گئے اور میرے قتل کے واسطے کہا۔ شحنہ نے تو رِشوت کھائی تھی، جو یہ کہتے تھے سو کرتا تھا۔ (۴۰۹)

کوتوال نے اُن سے کہا کہ خاطر جمع رکھو۔ اب میں اِسے ایسا قید کرتا ہوں کہ آپ سے آپ مارے بُھوکوں کے بے آب و دانہ مر جاوے، کِسو کو خبر نہ ہووے۔ مجھے پکڑ لائے اور ایک گوشے میں رکھا۔ اُس شہر سے باہر کوس ایک پر، ایک پہاڑ تھا کہ حضرتِ سُلیمان کے وقت میں دیووں نے ایک کُوا تنگ و تاریک اُس میں کھودا تھا۔ اُس کا نام زندانِ سلیمان کہتے تھے۔ جس پر بڑا غضبِ پادشاہی ہوتا، اُسے وہاں محبوس کرتے۔ وہ خود بخود مر جاتا۔ (۴۱۰)

القصہ رات کو چُپکے، یے دونوں بھائی اور کوتوال کے ڈنڈے مجھے اُس پہاڑ پر لے گئے (۴۱۱) اور اُس غار میں ڈال کر اپنی خاطر جمع کر کے پھرے۔ اے پادشاہ! یہ کتا میرے ساتھ چلا گیا۔ جب مجھے کُوے میں گرایا، تب یہ اُس کے مینڈ پر لیٹ رہا۔ میں اندر بے ہوش پڑا تھا۔ ذرا سُرت آئی تو میں اپنے تئیں مُردہ خیال کیا اور اُس مکان کو گور سمجھا۔ اِس میں دو شخصوں کی آواز کان میں پڑی کہ کچھ آپس میں باتیں کرتے ہیں۔ یہی معلوم کیا کہ نکیر منکر ہیں، تُجھ سے سوال کرنے آئے ہیں۔ سرسراہٹ رسّی کی سُنی، جیسے کِسو نے وہاں لٹکائی۔ میں حیرت میں تھا۔ زمین کو ٹٹولتا تو ہڈیاں ہاتھ میں آتیں۔ (۴۱۲)

بعد ایک ساعت کے، آواز چپر چپر مُنہہ چلانے کی (۴۱۳) میرے کان میں آئی؛ جیسے کوئی کچھ کھاتا ہے۔ میں نے پُوچھا کہ اے خُدا کے بندو! تم کون ہو؟ خُدا کے واسطے بتاؤ۔ وے ہنسے اور بولے: ''یہ زندان مہتر سُلیمان کا ہے اور ہم قیدی ہیں۔'' میں نے اُن سے پوچھا: ''کیا میں جیتا ہوں؟'' پھر کھلکھلا کر ہنسے اور کہا کہ اب تلک تو زِندہ ہے، پر اب مرے گا''۔ میں نے کہا: ''تُم کیا کھاتے ہو، (۴۱۴) جو ہو، مجھے بھی تھوڑا سا دو''۔ تب جھنجھلا کر خالی جواب دیا اور کچھ نہ دیا۔ وے کھا پی کر (۴۱۵) سو رہے۔ میں مارے ضُعف و ناتوانی کے، غش میں پڑا روتا تھا اور خُدا کو یاد کرتا تھا۔ قبلہء عالم! سات دن دریا میں اور اِتنے دن بھائیوں کے بُہتان کے سبب، دانہ نہ میسر آیا۔ علاوہ کھانے کے، مار پیٹ کھائی اور ایسے زِندان میں پھنسا کہ صُورت رِہائی کی مُطلق خیال میں بھی نہ آتی تھی۔

آخر جان کندنی کی نوبت پہنچی۔ کبھو دم آتا، کبھو نِکل جاتا تھا۔ لیکن کبھو کبھو آدھی رات کو ایک شخص آتا اور رُومال میں روٹیاں اور پانی کی صُراحی، ڈوری میں باندھ کر لٹکا دیتا اور پُکارتا۔ وے دونوں آدمی جو میرے پاس محبوس تھے، لے لیتے اور کھاتے پیتے۔ اُوپر سے کُتے نے ہمیشہ یہ احوال دیکھتے دیکھتے عقل دوڑائی کہ جس طرح یہ شخص آب و نان کُوے (۴۱۶) میں لٹکا دیتا ہے، تُو بھی ایسی فکر کر کہ کُچھ اُس بے کس کو جو میرا خاوند ہے آذقہ پہنچے تو اُس کا دم بچے۔ یہ خیال کر کے شہر میں گیا۔ نان بائی کی دکان پر میز پر، گردے چُنے ہوئے دَھرے تھے جست مار کر ایک کُلچہ مُنہہ میں لیا، اور بھاگا۔ لوگ پیچھے دوڑے۔ ڈھیلے مارتے تھے لیکن اُس نے نان کو نہ چھوڑا۔ آدمی تھک کر

پھرے۔ شہر کے کُتّے پیچھے لگے۔ اُن سے لڑتا بھڑتا، روٹی کو بچائے اُس چاہ پر آیا، اور نان کو اندر ڈال دیا۔ روزِ روشن تھا۔ میں نے روٹی کو اپنے پاس پڑا دیکھا اور کُتّے کی آواز سُنی۔ کُلچے کو اٹھالیا اور یہ کتّا روٹی پھینک کر پانی کی تلاش میں گیا۔

کسی گاؤں کے کنارے ایک بُڑھیا کی جھوپڑی تھی۔ ٹھلیا اور بَدھنا پانی سے بھرا ہُوا دھرا تھا، اور پیر زن چرخا کاتتی تھی۔ کُتّا کوزے کے نزدیک گیا، چاہا کہ لوٹے کو اُٹھاوے۔ عورت نے ڈانٹا۔ لوٹا اس کے مُنہ سے چھوٹا، گھڑے پر گرا۔ گھڑا پھوٹا، [۴۱۷] باقی باسن لُڑھ گئے، پانی بہہ چلا۔ بُڑھیا لکڑی لے کر مارنے کو اُٹھی۔ یہ سگ، اُس کے دامن میں لپٹ گیا۔ پھر اُس کے پاؤں پر مُنہ ملنے اور [۴۱۸] دُم ہلانے لگا، اور پہاڑ کی طرف دوڑ گیا۔ پھر اُس کے پاس آکر کبھی رسّی اُٹھاتا، کبھو ڈول مُنہ میں پکڑ کر دکھاتا، اور مُنہ اُس کے قدموں پر رگڑتا، اور آنچل چادر کا پکڑ کر کھینچتا۔ خُدا نے اُس عورت کے دل میں رحم دیا کہ ڈول رسّی کو لے کر اس کے ہمراہ چلی۔ یہ اُس کا آنچل پکڑے گھر سے باہر ہو کر آگے آگے ہولیا۔

آخر اُس کو پہاڑ [۴۱۹] ہی پر لے آیا۔ عورت کے جی میں کُتّے کی اُس حرکت سے الہام ہُوا کہ اِس کا میاں، مُقرر اِس غار میں گرفتار ہے۔ شاید اُس کی خاطر پانی چاہتا ہے۔ غرض پیر زن کو لیئے ہُوئے، غار کے مُنہ پر آیا۔ عورت نے لوٹا پانی کا بھر کر رسّی سے لٹکایا۔ میں نے وہ باسَن لے لیا اور نان کا ٹکڑا کھایا۔ دو تین گھونٹ پانی پیا، اِس پیٹ کے کُتّے کو راضی کیا۔ خُدا کا شکر کر کر ایک کنارے بیٹھا اور خُدا کی رحمت کا منتظر تھا کہ دیکھیئے اب کیا ہوتا ہے؟ یہ حیوان، بے زبان اِسی طور سے نان لے آتا اور بُڑھیا کے ہاتھ پانی پلواتا۔ جب بھٹیاروں نے دیکھا کہ کُتّا ہمیشہ روٹی لے جاتا ہے۔ ترس کھا کر مُقرر کیا کہ جب اِسے دیکھتے، ایک گردا اِس کے آگے پھینک دیتے۔ اور اگر وہ عورت پانی نہ لاتی، تو یہ اُس کے باسن پھوڑ ڈالتا۔ لاچار وہ بھی ہر روز ایک صُراحی پانی کی دے جاتی۔ اِس رفیق نے آب و نان سے میری خاطر جمع کی اور آپ زِنداں کے مُنہ پر پڑا رہتا۔ اِس طرح چھہ مہینے گُزرے، لیکن جو آدمی ایسے زِنداں میں رہے کہ دنیا کی ہَوا اُس کو نہ لگے، اُس کا کیا حال ہو؟ ابزا پوست و اُستخوان مُجھ میں باقی رہا۔ زندگی وبال ہُوئی۔ جی میں آوے کہ یاالٰہی! یہ دَم نکل جاوے تو بہتر ہے۔

ایک روز رات کو وے [۴۲۰] دونوں قیدی سوتے تھے، میرا دل اُمنڈ آیا، بے اختیار رونے لگا اور خدا کی درگاہ میں تنگ گھسنی کرنے لگا۔ پچھلے پہر کیا دیکھتا ہوں کہ خُدا کی قدرت سے ایک رسّی غار میں لٹکی، اور آواز سج میں سُنی: ''اے کم بخت، بدنصیب! ڈوری [۴۲۱] کا سرا اپنے ہاتھ میں مضبوط باندھ اور یہاں سے نِکل۔'' میں نے

سُن کر دِل میں خیال کیا کہ آخر بھائی مجھ پر مہربان ہو کر لہو کے جوش سے آپ ہی نکالنے آئے۔ نہایت خُوشی سے اُس طناب کو کمر میں خُوب کسا۔ کسو نے مجھے اُوپر کھینچا۔ رات ایسی اندھیری تھی کہ جِن نے مجھے نِکالا، اُس کو میں نے نہ پہچانا کہ کون ہے۔ جب میں باہر آیا تب اُس نے کہا: ''جلد آ، یہاں کھڑے ہونے کی جگہ نہیں۔'' مجھ میں طاقت تو نہ تھی، پر مارے ڈر کے لُڑھتا پڑتا پہاڑ سے نیچے آیا۔ دیکھوں تو دو گھوڑے، زین بندھے ہوئے کھڑے ہیں۔ اُس شخص نے ایک پر مجھے سوار کیا اور ایک پر آپ چڑھ لیا، اور آگے ہُوا۔ جاتے جاتے دریا کے کنارے پر پہنچا۔ صُبح ہو گئی۔ اُس شہر سے دس بارہ کوس نکل آئے۔ اُس جوان کو دیکھا کہ اُپچی (۴۲۲) بنا ہُوا، زرہ بکتر پہنے، چار آئینہ باندھے، گھوڑے پر پاکھر ڈالے، میری طرف غضب کی نظروں سے گھُور کر اور ہاتھ اپنا دانتوں سے کاٹ کر تلوار میان سے کھینچی اور گھوڑے کو جست کر کے مجھ پر چلائی۔ (۴۲۳) میں نے اپنے تئیں گھوڑے پر سے نیچے گرا دیا اور گھگھیانے لگا کہ میں بے تقصیر ہوں، مجھے کیوں قتل کرتا ہے؟ اے صاحبِ مُروّت! ایسے زِنداں سے میرے تئیں تُو نے نِکالا۔ اَب یہ بے مُروّتی کیا ہے؟ اُس نے کہا: ''سچ کہہ تُو کون ہے؟'' میں نے جواب دیا کہ مسافر ہُوں۔ ناحق کی بلا میں گرفتار ہو گیا تھا۔ تمھارے تصدّق سے بارے جیتا نکلا ہُوں۔ اور بہت باتیں خوشامد کی کیں۔

خُدا نے اُس کے دل میں رحم دیا، شمشیر کو غلاف کیا اور بولا: ''خیر، خدا جو چاہے سو کرے۔ جا تیری جان بخشی کی۔ جلد سوار ہو، یہاں توقف کا مکان نہیں۔'' گھوڑوں کو جلد کیا اور چلے۔ راہ میں افسوس کھاتا اور پچتاتا جاتا تھا۔ (۴۲۴) ظُہر کے وقت تک ایک جزیرہ میں جا پہنچے (۴۲۵)۔ وہاں گھوڑے سے اُترا، مجھے بھی اُتارا۔ زین، خُوگیر مرکبوں کی پیٹھ سے کھولا اور چرنے کو چھوڑ دیا۔ اپنی بھی کمر سے ہتھیار کھول ڈالے اور بیٹھا۔ مُجھ سے بولا: ''اے بد نصیب! اب اپنا احوال کہہ تو معلوم ہو کہ تُو کون ہے''۔ میں نے اپنا نام نشان بتایا اور جو جو کچھ بِپتا بیتی تھی، اُس سے آخر تک کہی۔

اُس جوان نے جب میری سرگذشت سب سُنی، رونے لگا اور مُخاطب ہوا کہ اے جَوان! اب میرا ماجرا سُن۔ میں کنیا، زیرباد کے دیس کے راجا کی ہوں، اور وہ گبرُو، (۴۲۶) جو زندانِ سُلیمان میں قید ہے، اُس کا نام بہرہ مَنْد ہے۔ میرے پتا کے منتری کا بیٹا ہے۔ ایک روز مہاراج نے اگیا دی کہ جتنے راجا اور کُنور ہیں، میدان میں زیر جَھروکھے نکل کر تیر اندازی اور چوگان بازی کریں تو گھُڑ چڑھی اور کسب ہر ایک کا ظاہر ہو۔ میں رانی کے نیڑے میں، جو میری ماتا تھیں، اٹاری پر اَوجھل میں بیٹھی تھی، اور دائیاں اور سہیلیاں حاضر تھیں؛ تماشا دیکھتی تھی۔ یہ دِیوان کا پُوت سب میں سُندر تھا، اور گھوڑے کو کاوے دے کر کسب کر رہا تھا۔ مُجھ کو بھایا اور دِل سے اُس پر رِیجھی۔ مُدّت

تلک یہ بات گُپت رہی۔ (۴۲۷)

آخر جب بہت بیاکُل ہُوئی، تب دائی سے کہا اور ڈھیر سا انعام دیا۔ وہ اُس جوان کو کسو نہ کسو ڈھب سے پوشیدہ میری دِہراہر میں لے آئی۔ تب یہ بھی مجھے چاہنے لگا۔ بہت دن اِس عشق مُشک میں کٹے۔ (۴۲۸)

ایک روز چوکی داروں نے آدھی رات کو ہتھیار باندھے اور محل میں آتے دیکھ کر اُسے پکڑا اور راجہ سے کہا۔ اُسے حُکم قتل کا کیا۔ سب ارکانِ دولت نے کہہ سُن کر جان بخشی کروائی۔ تب فرمایا کہ اِس کو زندانِ سُلیمان میں ڈال دو اور دُوسرا جوان، جو اُس کے ہمراہ اسیر ہے، اُس کا بھگنا ہے، اُس رَین کو وہ بھی اُس کے ساتھ تھا۔ دونوں کو اِس کُوئے میں چھوڑ دیا۔ آج تین برس ہُوئے کہ وے پھنسے ہیں۔ مگر کسو نے نہیں دریافت کیا کہ یہ جوان، راجا کے گھر میں کیوں آیا تھا۔ بھگوان نے میری پَت رکھی۔ اُس کے شُکرانے کے بدلے میں نے اپنے اُوپر لازم کیا(۴۲۹) ہے کہ اَن اور جَل اُس کو پہنچایا کروں۔ جب سے اٹھواڑے میں ایک دن آتی ہوں اور آٹھ دن کا آزُقہ اکٹھا دے جاتی ہوں۔

کل کی رات سپنے میں دیکھا کہ کوئی مانُس کہتا ہے کہ شتابی اُٹھ اور گھوڑا جوڑا اور کمند اور کچھ نقد خرچ کے واسطے لے کر اُس غار پر جا اور اُس بچارے کو وہاں سے نکال۔ یہ سُن کر میں چونک پڑی اور مگن ہو کر مردانہ بھیس کیا، اور ایک صندوقچہ جواہر و اشرفی سے بھر لیا۔ اور یہ گھوڑا اور کپڑا جوڑا لے کر وہاں گئی کہ کمند سے اُسے کھینچوں۔ کرم میں تیرے تھا کہ ویسی قید سے اِس طرح چھُٹکارا پاوے۔ اور میرے اِس کرتب سے مُحرم کوئی نہیں، شاید وہ کوئی دیوتا تھا کہ تیری مُخلصی کی خاطر مجھے بھجوایا۔ خیر، جو میرے بھاگ میں تھا سو ہُوا۔'' یہ کہا کہہ کر پُوری، کچوری، ماس کا سالن انگوچھے سے کھولا۔ پہلے قند نکال، ایک کٹورے میں گھولا اور عرق بید مُشک کا اُس میں ڈال کر مجھے دیا۔ میں نے اُس کے ہاتھ سے لے کر پیا، پھر تھوڑا سا ناشتا کیا۔ بعد ایک ساعت کے میرے تئیں لُنگی بندھوا کر دریا میں لے گئی، قینچی سے میرے سر کے بال کترے، ناخن لیئے، نہلا دُھلا کر کپڑے پہنائے۔ نئے سر سے آدمی بنایا۔ میں دوگانہ شُکرانے کا رُو بہ قبلہ ہو کر پڑھنے لگا۔ وہ نازنین اِس میری حرکت کو دیکھتی رہی۔

جب نماز سے فارغ ہُوا، پُوچھنے لگی کہ یہ تُو نے کیا کام کیا؟ میں نے کہا: ''جس خالق نے ساری خلقت کو پیدا کیا اور تُجھ سی محبوبہ سے میری خدمت کروائی اور تیرے دل کو مجھ پر مہربان کیا اور ویسے زِندان سے خلاص کروایا، اُس کی ذات لاشریک ہے؛ اُس کی میں نے عبادت کی اور بندگی بجالایا اور ادائے شُکر کیا۔'' یہ بات سُن کر کہنے لگی: ''تُم مسلمان ہو؟'' میں نے کہا: ''شُکر الحمدُ للہ''۔ بولی: ''میرا دِل تمھاری باتوں سے خوش ہُوا۔ میرے

تیئں بھی سکھاؤ اور کلمہ پڑھاؤ۔‘‘ میں نے دِل میں کہا: ’’الحمدُ للہ کہ یہ ہمارے دین کی شریک ہوئی۔‘‘(۴۳۰)

غرض میں نے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھا، اور اُس سے پڑھوایا۔ پھر وہاں سے گھوڑوں پر سوار ہو کر ہم دونوں چلے۔ رات کو اُترتے تو وہ ذِکر دین ایمان کا کرتی اور سُنتی اور خُوش ہوتی۔ اسی طرح دو مہینے تلک پیہم شبانہ روز چلتے گئے۔ آخر ایک ولایت میں پہنچے کہ درمیان سرحد مُلکِ زیرباد اور سراندیپ کے تھی، ایک شہر نظر آیا کہ آبادی میں اِستنبول سے بڑا اور آب و ہوا بہت خوش اور موافق۔ بادشاہ اُس شہر کا کسریٰ سے زیادہ عادِل اور رعیّت پرَوَر دیکھ کر دل نپٹ شاد ہُوا۔ ایک حویلی خرید کر بُود باش مقرر کی۔ جب کئی دن میں رنجِ سفر سے آسُودہ ہُوئے، کچھ اسباب ضروری دَرست کر کے اُس بی بی سے موافق شرعِ محمدی کے نِکاح کیا اور رہنے لگا۔ تین سال میں وہاں کے اَکابر و اصاغر سے مِل جُل کر اعتبار بہم پہنچایا اور تجارت کا ٹھاٹھ پھیلایا۔ آخر وہاں کے سب سوداگروں سے سبقت لے گیا۔(۴۳۱) ایک روز وزیرِ اعظم کی خدمت میں سلام کے لیئے چلا۔ ایک میدان میں کثرت خلق اللہ کی دیکھی، کِسو سے پُوچھا کہ کیوں اتنا اِزدِہام (۴۳۲) ہے؟ معلوم ہُوا کہ دو شخصوں کو زِنا اور چوری کرتے پکڑا ہے، اور شاید خون بھی کیا ہے؛ اُن کو سنگسار کرنے کو لائے ہیں۔ مجھے سُنتے ہی اپنا احوال یاد آیا کہ ایک دن مجھے بھی اِسی طرح سُولی چڑھانے لے گئے تھے، خُدا نے بچالیا۔ آیا یہ کون ہیں گے کہ ایسی بلا میں گرفتار ہوئے ہیں؟ معلوم نہیں کہ راست ہے یا میری طرح تُہمت میں گرفتار ہُوئے ہیں۔ بھیڑ کو چیر کر اندر گُھسا۔ دیکھا تو یہی میرے دونوں بھائی ہیں کہ مُشکیں کسے، سر و پا برہنہ، اِن کو لیئے جاتے ہیں۔ اِن کی صُورت دیکھتے ہی خُون نے جوش کیا اور کلیجہ جلا۔ مُحصّلوں کو ایک ایک مُٹھی اشرفیاں دیں اور کہا: ’’ایک ساعت توقّف کرو۔‘‘ اور وہاں سے گھوڑے کو سرپٹ پھینک کر حاکِم کے گھر گیا۔ ایک دانہ یاقوتِ بے بہا کا نذر گُزرانا اور اِن کی شِفاعت کی۔ حاکِم نے کہا: ’’ایک شخص اِن کا مُدّعی ہے اور اِن کے گناہ ثابت ہُوئے ہیں، اور بادشاہ کا حُکم ہو چکا ہے، میں لاچار ہُوں۔‘‘ بارے بہت مِنّت و زاری سے حاکم نے مُدّعی کو بُلوا کر پانچ ہزار روپے پر راضی کیا کہ وہ دعوے خُون کا مُعاف کرے۔ میں نے روپے گِن دیئے اور لا دعویٰ لکھوالیا اور ایسی بلا سے مَخلصی دِلوائی۔ جہاں پناہ! اِن سے پُوچھیئے کہ سچ کہتا ہُوں یا جُھوٹھ بکتا ہُوں۔ وے دونوں بھائی سر نیچے کیئے شرمندہ سے کھڑے تھے۔ خیر، اِن کو چُھڑوا کر گھر میں لایا، حمام کروا کر لباس پہنوایا۔ دیوان خانے میں مکان رہنے کو دیا۔ اِس مرتبے اپنے قبیلے کو اِن کے رُوبرو نہ کیا۔ اِن کی خدمت میں حاضر رہتا اور اِن کے ساتھ کھانا کھاتا۔ سونے کے وقت گھر میں جاتا۔ تین برس تک اِن کی خاطرداری میں گُزری اور اِن سے بھی کوئی حرکتِ بد واقع نہ ہوئی کہ باعث رنجیدگی کا ہووے۔ جو

میں سوار ہو کر کہیں جاتا تو یہ گھر میں رہتے۔

اتفاقاً وہ بی بی نیک بخت، ایک دن حمام کو گئی تھی، جب دیوان خانے میں آئی، کوئی مرد نظر نہ پڑا۔ اُس نے بُرقع اتارا۔ شاید یہ مُنجھلا بھائی لیٹا ہُوا جاگتا تھا۔ دیکھتے ہی عاشق ہُوا، بڑے بھائی سے کہا۔ دونوں نے میرے مار ڈالنے کی باہم صلاح کی۔ میں اِس حرکت سے مُطلق خبر نہ رکھتا تھا دل میں کہتا تھا کہ الحمدُ للہ اِس مرتبے، اب تک اِنھوں نے کچھ ایسی بات نہیں کی، اب اِن کی وضع درست ہُوئی، شاید غیرت کو کام فرمایا۔ (۴۳۳)

ایک روز بعد کھانے کے، بڑے بھائی صاحب آب دیدہ ہُوئے اور اپنے وطن کی تعریف اور ایران کی خُوبیاں بیان کرنے لگے۔ یہ سن کر دوسرے بھی بسورنے لگے۔ میں نے کہا: ''اگر اِرادہ وطن کا ہے، تو بہتر۔ میں تابع مرضی کے ہُوں۔ میری بھی یہی آرزو ہے۔ اب انشاءاللہ تعالیٰ میں بھی آپ کی رکاب میں چلتا ہُوں۔'' اُس بی بی سے دونوں بھائیوں کی اُوداسی کا مذکور کیا اور اپنا اِرادہ بھی کہا۔ وہ عاقِلہ بولی: ''تم جانو، لیکن پھر کچھ دَغا کیا چاہتے ہیں۔ یے تمھاری جان کے دشمن ہیں۔ تُم نے سانپ آستین میں پالے ہیں اور اِن کی دَوستی کا بھروسا رکھتے ہو، جو جی چاہے سو کرو۔ لیکن مُوذیوں سے خبردار رہو۔'' بہر تقدیر تھوڑے عرصہ میں تیاری سفر کی کر کے خیمہ میدان میں اِستاد کیا۔ بڑا قافلہ جمع ہُوا اور میری سرداری اور قافلہ باشی پر راضی ہُوئے۔ اچھی ساعت دیکھ کر روانہ ہُوا، لیکن اِن کی طرف سے اپنی جانب میں ہوشیار رہتا اور سب صُورت سے فرماں بَرداری اور دِلجوئی اِن کی کرتا۔

ایک روز ایک منزل میں مُنجھلے بھائی نے مذکور کیا کہ ایک فرسخ اِس مکان سے ایک چشمہ جاری ہے، مانند سلسبیل کے، اور میدان میں خُود رَو کوسوں تک لالہ و نافرمان اور نرگس و گُلاب پھُولا ہے۔ واقعی عجب مکان سیر کا ہے۔ اگر اپنا اختیار ہوتا تو کل وہاں جا کر تفریح طبیعت کی کرتے اور ماندگی بھی رفع ہوتی۔ میں بولا کہ صاحب مُختار ہیں۔ فرماؤ تو کل کے دن مقام کریں اور وہاں چل کر سیر کرتے پھریں۔ یہ بولے: ''از یں چہ بہتر؟'' (۴۳۴)

میں نے حُکم کیا کہ سارے قافلے میں پُکار دو کہ کل مقام ہے، اور بکاول کو کہا کہ حاضری قِسم بہ قِسم کی تیار کر، کل سیر کو چلیں گے۔ جب صبح ہُوئی اِن دونوں برادروں نے کپڑے پہن، کمر باندھ کر مجھے یاد دلایا کہ جلد ٹھنڈے ٹھنڈے چلیئے اور سیر کیجیئے۔ میں نے سواری مانگی۔ بولے کہ پاپیادہ جو لُطف سیر کا ہوتا ہے، سو سواری میں معلوم۔ نفروں کو کہہ دو، گھوڑے ڈُریا کر لے آویں۔

دونوں غُلاموں نے قلیان اور قہوہ دان لے لیا اور ساتھ ہُوئے، راہ میں تیر اندازی کرتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ جب قافلے سے دُور نکل گئے، ایک غلام کو اِنھوں نے کسی کام کو بھیجا۔ تھوڑی دُور آگے بڑھ کر دُوسرے

کو بھی اُس کے بُلانے کو رخصت کیا۔ کم بختی جو آئی، میرے مُنہہ میں جیسے، کسو نے مُہر دے دی۔ جو دے چاہتے تھے، سو کرتے تھے اور مجھے باتوں میں پرچائے لیئے جاتے تھے۔ مگر یہ کُتا ساتھ رہ گیا۔

بہت دُور نکل گئے۔ نہ چشمہ نظر آیا نہ گُلزار۔ مگر ایک میدانِ پُر خار تھا۔ وہاں مجھے پیشاب لگا۔ میں بَول کرنے کو بیٹھا۔ اپنے پیچھے چمک تلوار کی سی دیکھی۔ مُڑ کر دیکھوں تو مَنجھلے بھائی صاحب نے مجھ پر تلوار ماری کہ سر دو پارہ ہو گیا۔ جب تلک بولوں کہ اے ظالم! مجھے کیوں مارتا ہے، بڑے بھائی نے شانے پر لگائی۔ دونوں زخم کاری لگے۔ تیورا کر گرا۔ تب اِن دونوں بے رحموں نے بہ خاطر جمع میرے تئیں چُور زخمی کیا اور لہولُہان کر دیا۔ یہ کُتا میرا احوال دیکھ کر اِن پر بَھپکا۔ اِس کو بھی گھایل کیا۔ بعد اُس کے اپنے ہاتھوں سے اپنے بدنوں میں زخموں کے نشان کیے اور سَر و پا برہنہ قافلے میں گئے اور ظاہر کیا کہ حرامیؤں نے اُس میدان میں ہمارے بھائی کو شہید کیا اور ہم بھی لڑ بھڑ کر زخمی ہُوئے۔ جلدی کُوچ کرو نہیں تو کارواں پر گر کر سب کو ننگیا لیں گے۔ قافلے کے لوگوں نے بَدّوؤں کا جو سُنا، وُونہیں بدحواس ہُوئے اور گھبرا کر کُوچ کیا اور چل نکلے۔ (۴۳۴) میرے قبیلے نے سلوک اور خُوبیاں اِن کی سُن رکھی تھیں، جو جو مجھ سے دغائیں کی تھیں۔ یہ واردات اِن کاذبوں سے سُن کر جلد خنجر سے اپنے تئیں ہلاک کیا اور جاں بحق تسلیم ہُوئی۔ (۴۳۵)

اے درویشو! اِس خواجہ سگ پرست نے جب اپنی کیفیت اور مُصیبت اِس طرح سے یہاں تلک کہی، سُنتے ہی مجھے بے اختیار رونا آیا۔ وہ سوداگر دیکھ کر کہنے لگا کہ قبلۂ عالم! اگر بے ادبی نہ ہوتی تو برہنہ ہو کر میں اپنا سارا بدن کھول کر دکھاتا۔ تِس پر بھی اپنی راستی پر گریبان مَونڈھے تلک چیر کر دکھایا۔ واقعی چار اُنگل تَن اُس کا بغیر زخم کے ثابت نہ تھا۔ میرے حضور سر سے عمامہ اُتارا۔ کھوپڑی میں ایسا بڑا گڑھا پڑا تھا کہ ایک انار سموچا اُس میں سماوے۔ ارکانِ دولت جتنے حاضر تھے، سب نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، طاقت دیکھنے کی نہ رہی۔

پھر خواجہ بولا کہ پادشاہ سلامت! جب یے بھائی اپنی دانست میں میرا کام تمام کر کے چلے گئے، ایک طرف میں اور ایک طرف یہ سگ، میرے نزدیک زخمی پڑا تھا۔ لہو اِتنا بدن سے گیا کہ مُطلق طاقت اور ہوش کچھ باقی نہ تھا۔ کیا جانُوں دم کہاں اٹک رہا تھا کہ جیتا تھا۔ جس جگہ میں پڑا تھا، ولایت سراندیپ کی سرحد تھی اور ایک شہر بہت آباد اُس کے قریب تھا۔ اُس شہر میں بڑا بُت خانہ تھا۔ اور وہاں کے پادشاہ کی ایک بیٹی تھی، نہایت قبول صورت اور صاحبِ جمال۔ (۴۳۶)

اکثر پادشاہ اور شہزادے اُس کے عشق میں خراب تھے۔ وہاں رسم حجاب کی نہ تھی، اِس سے وہ لڑکی تمام

ہجولیوں کے ساتھ سیر شکار کرتی پھرتی۔ ہم سے نزدیک ایک پادشاہی باغ تھا۔ اُس روز پادشاہ سے اجازت لے کر اُسی باغ میں آئی تھی۔ سیر کی خاطر اُس میدان میں پھرتی پھرتی آنکلی۔ کئی خواصیں بھی ساتھ سوار تھیں۔ جہاں میں پڑا تھا، آئیں۔ میرا کراہنا سُن کر پاس کھڑی ہُوئیں۔ مجھے اُس حالت میں دیکھ کر دوے بھاگیں اور شہزادی سے کہا کہ ایک مَرْدُوا اور ایک کُتّا لہو میں شور بُور پڑا ہے۔ اُن سے یہ سُن کر آپ ملکہ میرے سر پر آئی، افسوس کھا کر کہا: ''دیکھو تو کچھ جان باقی ہے؟'' دو چار دائیوں نے اُتر کر دیکھا اور عرض کی: ''اب تلک تو جیتا ہے۔'' تُرت فرمایا کہ امانت قالیچے پر لٹا کر باغ میں لے چلو۔

وہاں لے جا کر جرّاح سرکار کا بُلا کر میرے اور میرے کُتّے کے علاج کی خاطر بُہت تاکید کی اور اُمیدوار انعام و بخشش کا کیا۔ اُس حجام نے سارا بدن میرا پُونچھ پانچھ کر خاک و خون سے پاک کیا، اور شراب سے دھو دھا کر زخموں کو ٹانکے دے کر مرہم لگایا اور بیدِ مُشک کا عرق پانی کے بدلے میرے حلق میں چُوایا۔ ملکہ آپ میرے سرہانے بیٹھی رہتی اور میری خدمت کرواتی اور تمام دن رات میں دو چار بار کچھ شُوربا یا شربت اپنے ہاتھ سے پلاتی۔

بارے مجھے ہوش آیا تو دیکھا کہ ملکہ نہایت افسوس سے کہتی ہے: ''کِس ظالم خُوں خوار نے تجھ پر یہ سِتم کیا، بڑے بُت سے بھی نہ ڈرا۔'' بعد دس روز کے، عرق اور شربت اور معجونوں کی قُوّت سے میں نے آنکھ کھولی۔ دیکھا تو اِندر کا اکھاڑا میرے آس پاس جمع ہے اور ملکہ سرہانے کھڑی ہے۔ ایک آہ بھری اور چاہا کہ کچھ حرکت کروں، طاقت نہ پائی۔ بادشاہ زادی مہربانی سے بولی کہ اے عجمی! خاطر جمع رکھ۔ کُڑھ مَت۔ اگرچہ کِسو ظالم نے تیرا یہ احوال کیا، لیکن بڑے بُت نے مُجھ کو تُجھ پر مہربان کیا ہے۔ اَب چنگا ہو جاوے گا۔ قسم اُس خُدا کی، جو واحد اور لاشریک ہے، میں اُسے دیکھ کر پھر بے ہوش ہو گیا۔ ملکہ نے بھی دریافت کیا اور گُلاب پاش سے گُلاب اپنے ہاتھ سے چھڑکا۔ بیس دِن کے عرصے میں زخم بھر آئے اور انگور کر لائے۔ بلکہ ہمیشہ رات کو جب سب سو جاتے، میرے پاس آتی اور کھلا پلا جاتی۔

غرض ایک چلّے میں غُسل کیا۔ بادشاہ زادی نہایت خوشِ ہُوئی۔ حجام کو انعام بہت سا دیا اور مجھ کو پوشاک پہنوائی۔ خدا کے فضل سے اور خبر گیری اور سعی سے ملکہ کی، خُوب چاق چَوبند ہُوا۔ اور بدن نہایت تیار ہُوا اور کتا بھی فربہ ہو گیا۔ ہر روز مجھے شراب پلاتی (۳۳۷) اور باتیں سُنتی اور خوش ہوتی۔ میں بھی ایک آدھ نقل یا کہانی اَنُوٹھی کہہ کر اُس کے دِل کو بہلاتا۔

ایک دن پُوچھنے لگی کہ اپنا احوال تو بیان کرو کہ تُم کون ہو اور یہ واردات تُم پر کیوں کر ہُوئی؟ میں نے سارا ماجرا اپنا، اوّل سے آخر تک کہہ سُنایا۔ وہ سُن کر رونے لگی اور بولی کہ اب میں تجھ سے ایسا سلوک کروں گی کہ اپنی ساری مُصیبت بُھول جاوے گا۔ میں نے کہا: ''خُدا تمھیں سلامت رکھے، تُم نے نئے سر سے میری جان بخشی کی ہے۔ اَب میں تمھارا ہو رہا ہوں، واسطے خُدا کے اِسی طرح ہمیشہ مجھ پر اپنی مہربانی کی نظر رکھیو''۔ غرض تمام رات اکیلی میرے پاس بیٹھی رہتی اور صُحبت رکھتی۔ بعضے دِن دائی اُس کی بھی ساتھ رہتی۔ ہر ایک طور کا ذکر مذکور سُنتی اور کہتی۔ جب ملکہ اُٹھ جاتی اور میں تنہا ہوتا، طہارت کر، کونے میں چُھپ کر نماز پڑھ لیتا۔

ایک بار ایسا اِتفاق ہُوا کہ ملکہ اپنے باپ کے پاس گئی تھی، میں خاطر جمع سے وضو کر کے نماز پڑھ رہا تھا کہ اچانک شہزادی، دائی سے بولتی ہوئی آئی کہ دیکھیں عجمی اِس وقت کیا کرتا ہے، سوتا ہے یا جاگتا ہے۔ مجھے مکان پر جو نہ دیکھا، تعجب میں ہُوئی کہ ایں یہ کہاں گیا ہے؟ کِسو سے کوئی لگا تو نہیں لگایا۔ کونا کُھترا دیکھنے لگی اور تلاش کرنے لگی۔ آخر جہاں میں نماز کر رہا تھا، وہاں آ نکلی۔ اُس لڑکی نے کبُھو نماز کاہے کو دیکھی تھی، چپکی کھڑی دیکھا کی۔ جب میں نے (۴۳۸) نماز تمام کر کے دُعا کے لیئے ہاتھ اٹھائے اور سجدے میں گیا۔ بے اختیار کِھلکِھلا کر ہنسی اور بولی: ''کیا یہ آدمی سَودائی ہو گیا۔ یہ کیسی کیسی حرکتیں کر رہا ہے؟'' میں ہنسی (۴۳۹) کی آواز سُن کر دِل میں ڈرا۔ ملکہ آگے آ کر پوچھنے لگی کہ اے عجمی! یہ تُو کیا کرتا تھا؟ میں کچھ جواب نہ دے سکا۔ اِس میں دائی بولی: ''بلا لوں، تیرے صدقے گئی، مجھے یُوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص مسلمان ہے اور لات منات کا دشمن ہے۔ اَن دیکھے خُدا کو پُوجتا ہے۔''

ملکہ نے یہ سُنتے ہی ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ بہت غُصّے ہوئی کہ میں کیا جانتی تھی کہ یہ تُرک ہے اور ہمارے خُداؤں سے منکر ہے۔ تب ہی ہمارے بُت کے غضب میں پڑا تھا۔ میں نے ناحق اِس کی پرورش کی اور اپنے گھر میں رکھا۔ یہ کہتی ہُوئی چلی گئی۔ میں سُنتے ہی بدحواس ہُوا کہ دیکھیئے اب کیا سلوک کرے۔ مارے خوف کے نیند اُچاٹ ہو گئی۔ صبح تک بے اختیار رویا کیا اور آنسوؤں سے مُنہہ دھویا کیا۔

تین دن رات، اِسی خوف و رجا میں روتے گُزرے۔ ہرگز آنکھ نہ جھپکی؛ تیسری شب، ملکہ شراب کے نشے میں مخمُور اور دائی ساتھ لیئے میرے مکان پر آئی، غصّے میں بھری ہُوئی اور تیر کمان ہاتھ میں لیئے، باہر چمن کے کنارے بیٹھی۔ دائی سے پیالا شراب کا مانگا؛ پی کر کہا: ''دیا! وہ عجمی جو ہمارے بڑے بُت کے قہر میں گرفتار ہے، مُوا یا اب تک جیتا ہے؟'' دائی نے کہا: ''بلیا لُوں، کُچھ دَم باقی ہے۔'' بولی کہ اب وہ ہماری نظروں سے گرا، لیکن

کہہ کہ باہر آوے۔ دائی نے مجھے پُکارا، میں دَوڑا۔ دیکھوں تو ملکہ کا چہرہ مارے غصّے کے تمتما رہا ہے اور سُرخ ہو گیا ہے۔ رُوح قالب میں نہ رہی۔ سلام کیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہُوا۔ غضب کی نگاہ سے مجھے دیکھ کر، دائی سے بولی: ''اگر میں، اِس دین کے دشمن کو تیر سے ماروں تو میری خطا بڑا بُت معاف کرے گا یا نہیں؟ یہ مجھ سے بڑا گناہ ہُوا ہے کہ میں نے اِسے اپنے گھر میں رکھ کر خاطر داری کی''۔

دائی نے کہا: ''پادشاہ زادی کی کیا تقصیر ہے کہ کچھ دشمن جان کر نہیں رکھا۔ (۴۴۰) تُم نے اِس پر ترس کھایا۔ تم کو نیکی کے عوض نیکی ملے گی اور یہ اپنی بدی کا ثمرہ بڑے بُت سے پا رہے گا''۔ یہ سن کر کہا: ''دائی! اِسے بیٹھنے کو کہہ''۔ دائی نے مجھے اِشارت کی کہ بیٹھ جا، میں بیٹھ گیا۔ ملکہ نے اور جام شراب کا پیا اور دائی سے کہا کہ اِس کو بھی ایک پیالہ دے تو آسانی سے مارا جاوے۔ دائی نے جام دیا، میں نے بے عُذر پیا اور سلام کیا۔ ہرگز میری طرف نگاہ نہ کی، مگر کن انکھیوں سے، چوری چوری دیکھتی تھی۔ جب مجھے سرُور ہُوا، کچھ شعر پڑھنے لگا۔ اَزاں جُملہ ایک بَیت یہ بھی پڑھی:

قابو میں ہُوں میں تیرے، گو اَب جیا تو پھر کیا
خنجر تلے کِسو نے ٹک دَم لیا تو پھر کیا

سُن کر مُسکرائی اور دائی کی طرف دیکھ کر بولی: ''کیا تُجھے نیند آتی ہے؟'' دائی نے مرضی پا کر کہا کہ ہاں، مجھ پر خواب نے غلبہ کیا ہے۔ وہ تو رخصت ہو کر جہنم واصل ہُوئی۔ بعد ایک دَم کے، ملکہ نے پیالہ مجھ سے مانگا۔ میں جلد بھر کر رُوبرو لے گیا۔ ایک ادا سے میرے ہاتھ سے لے کر پی لیا۔ تب میں قدموں پر گِرا۔ ملکہ نے ہاتھ مُجھ پر جھاڑا اور کہنے لگی: ''اے جاہل! ہمارے بڑے بُت میں کیا بُرائی دیکھی جو غایب خُدا کی پرستش کرنے لگا؟'' (۴۴۱)

میں نے کہا: ''اِنصاف شرط ہے۔ ٹک غور فرمایئے کہ بندگی کے لائق وہ خُدا ہے کہ جس نے ایک قطرے پانی سے تُم سا رکا محبوب پیدا کیا اور یہ حُسن و جمال دیا کہ ایک آن میں ہزاروں انسانوں کے دل کو دیوانہ کر ڈالو۔ بُت کیا چیز ہے کہ کوئی اُس کی پُوجا کرے؟ ایک پتھر کو سنگ تراشوں نے گڑھ کر صُورت بنائی اور دام احمقوں کے واسطے بچھایا۔ جن کو شیطان نے ورغلانا ہے، وے مصنوع کو صانع جانتے ہیں۔ جسے اپنے ہاتھوں سے بناتے ہیں، اُس کے آگے سر جُھکاتے ہیں۔ اور ہم مسلمان ہیں، جس نے ہمیں بنایا ہے، ہم اُسے مانتے ہیں۔ اُن کے واسطے دوزخ، ہمارے لیئے بہشت بنایا ہے۔ اگر پادشاہ زادی، ایمان خُدا پر لاوے، تب اُس کا مزا پاوے اور حق و باطل میں فرق کرے اور اپنے اعتقاد کو غلط سمجھے''۔ بارے ایسی ایسی نصیحتیں سُن کر اُس سنگ دل کا دل مُلائم ہُوا۔ خدا کے

فضل وکرم سے رونے لگی اور بولی: ''اچھا مجھے بھی اپنا دین سکھاؤ۔'' میں نے کلمہ تلقین کیا۔ اُن نے بصدقِ دِل پڑھا اور توبہ استغفار کر کر مُسلمان ہُوئی۔ تب میں اُس کے پانوں پڑا۔ صبح تک کلمہ پڑھتی اور استغفار کرتی رہی۔ پھر کہنے لگی: ''بھلا میں نے تو تمھارا دین قبول کیا، لیکن ماں باپ کافر ہیں۔ اُن کا کیا علاج ہے''۔ میں نے کہا: ''تمھاری بَلا سے جو جیسا کرے گا، ویسا پاوے گا۔'' بولی کہ مجھے چچا کے بیٹے سے منسوب کیا ہے اور وہ بُت پرست ہے۔ کل کو خدانخواستہ بیاہ ہُوا اور وے کافر مجھ سے ملے اور اُس کا نطفہ میرے پیٹ میں ٹھہر جاوے تو بڑی قباحت ہے۔ اِس کی فکر ابھی سے کیا چاہیئے کہ اُس بَلا سے نجات پاؤں۔ میں نے کہا: ''تُم بات تو معقول کہتی ہو۔ جو مزاج میں آوے سو کرو۔'' بولی کہ میں اب یہاں نہ رہوں گی، کہیں نکل جاؤں گی۔

میں نے پُوچھا: ''کِس صُورت سے بھاگنے پاؤ گی اور کہاں جاؤ گی؟'' جواب دیا کہ پہلے تم میرے پاس سے جاؤ۔ مسلمانوں کے ساتھ سَرا میں جا رہو، تو سب آدمی سُنیں اور تم پر گُمان نہ لے جاویں۔ تم وہاں کشتیوں کی تلاش میں رہو، جو جہاز عجم کی طرف چلے، مجھے خبر کیجو۔ میں اِس واسطے دائی کو تمھارے پاس اکثر بھیجا کروں گی۔ جب تم کہلا بھیجو گے، میں نکل کر آؤں گی اور کشتی پر سوار ہو کر چلی جاؤں گی۔ اِن کم بخت بے دینوں کے ہاتھ سے مخلصی پاؤں گی۔

میں نے کہا: ''تمھاری جان و ایمان کے قربان ہُوا۔ دائی کو کیا کرو گی؟'' بولی: ''اِس کی فکر سہل ہے۔ ایک پیالے میں زہر ہلاہل پلا دوں گی۔'' یہی صلاح مقرر ہُوئی۔ جب دِن ہُوا، میں کارواں سرا میں گیا، ایک حُجرہ کرائے لیا اور جا رہا۔ اُس جُدائی میں فقط وصل کی توقع پر جیتا تھا۔ جب دو مہینے میں سوداگر روم و شام و اصفہان کے جمع ہُوئے، ارادہ کُوچ کا، تَری کی راہ سے کیا اور اپنا اسباب جہاز پر چڑھانے لگے۔ ایک جگہ رہنے سے اکثر آشنا صُورت ہو گئے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے: ''کیوں صاحب! تم بھی چلو۔ (۴۴۲) یہاں کُفرستان میں کب تلک رہو گے؟'' میں نے جواب دیا کہ میرے پاس کیا ہے جو اپنے وطن کو جاؤں؟ یہی ایک لونڈی، ایک کُتّا، ایک صندوق بِساط میں رکھتا ہوں۔ اگر تھوڑی سی جگہ بیٹھ رہنے کو دو اور اُس کا نَول مُقرّر کرو تو میری خاطر جمع ہو۔ میں بھی سوار ہُوں۔

سوداگروں نے ایک کوٹھری، میرے تحت میں کر دی۔ میں نے اُس کے نَول کا روپیہ بھر دیا۔ دل جمعی کر کر، کِسو بہانے سے دائی کے گھر گیا اور کہا: ''اے اناّ! تُجھ سے رخصت ہونے آیا ہوں۔ اَب وطن کو جاتا ہوں۔ اگر تیری توجہ سے ایک نظر ملکہ کو دیکھ لُوں تو بڑی بات ہے۔'' بارے، دائی نے قبول کیا۔ میں نے کہا: ''میں رات کو

آؤں گا۔ فلانے مکان پر کھڑا رہوں گا۔'' بولی: ''اچھا۔'' میں کہہ کر سرا میں آیا۔ صندوق اور بچھو نے اُٹھا کر جہاز میں لایا اور ناخدا کو سونپ کر کہا: ''کل فجر کو اپنی کنیز کو لے کر آؤں گا۔'' ناخدا بولا: ''جلد آئیو۔ صبح ہم لنگر اٹھاویں گے۔'' میں نے کہا: ''بہت خوب''۔ جب رات ہوئی، اُسی مکان پر، جہاں دائی سے وعدہ کیا تھا، جا کر کھڑا رہا۔ پہر رات گئے، محل کا دروازہ کھلا اور ملکہ میلے کچیلے کپڑے پہنے، ایک پٹی جواہر کی لیئے باہر نکلی۔ وہ پٹاری میرے حوالے کی اور ساتھ چلی۔ صبح ہوتے، کنارے دریا کے ہم پہنچے۔ ایک لنبوٹ پر سوار ہو کر جہاز میں جا اُترے۔ یہ وفادار کتا بھی ساتھ تھا۔ جب صبح خوب روشن ہوئی، لنگر اُٹھایا اور روانہ ہوئے۔ بہ خاطر جمع چلے جاتے تھے، ایک بندر سے آواز توپوں کی شلک کی آئی۔ سب حیران اور فکر مند ہوئے۔ جہاز کو لنگر کیا اور آپس میں چرچا ہونے لگا کہ کیا شاہِ بندر کچھ دغا کرے گا! توپ چھوڑنے کا کیا سبب ہے؟

اتفاقاً سب سوداگروں کے پاس خوب صورت لونڈیاں تھیں۔ شاہِ بندر کے خوف سے کہ مُبادا چھین لے، سب نے کنیزکوں کو صندوقوں میں بند کیا، میں نے بھی ایسا ہی کیا کہ اپنی شہزادی کو صندوق میں بٹھا کر قُفل کر دیا۔ اِس عرصے میں شاہِ بندر ایک غُراب پر بمعہ نوکر چاکر بیٹھا ہُوا نظر آیا۔ آتے آتے جہاز پر آ چڑھا۔ شاید اُس کے آنے کا یہ سبب تھا کہ پادشاہ کو دائی کے مرنے اور ملکہ کے غایب ہونے کی جب خبر معلوم ہُوئی، مارے غیرت کے اُس کا تو نام نہ لیا، مگر شاہِ بندر کو حکم کیا کہ میں نے سُنا ہے عجمی سوداگروں کی پاس لونڈیاں خوب خوب ہیں، سو میں شہزادی کے واسطے لیا چاہتا ہوں۔ تم اُن کو روک کر جتنی لونڈیاں جہاز میں ہوں، حضور میں حاضر کرو گے۔ اُنھیں دیکھ کر جو پسند آویں گی، اُن کی قیمت دی جائے گی، نہیں تو واپس ہوں گی۔ بہ مُوجب حُکمِ پادشاہ کے، یہ شاہِ بندر اِس لیئے آپ جہاز پر آیا۔ اور میرے نزدیک ایک اور شخص تھا، اُس کے پاس بھی ایک باندی قبول صُورت صندوق میں بند تھی؛ شاہِ بندر اُسی صندوق پر آ کر بیٹھا اور لونڈیوں کو نکلوانے لگا۔ میں نے خدا کا شکر کیا کہ بھلا پادشاہ زادی کا مذکور نہیں۔ غرض جتنی لونڈیاں پائیں، شاہِ بندر کے آدمیوں نے ناؤ پر چڑھائیں اور خود شاہِ بندر جس صندوق پر بیٹھا تھا، اُس کے مالک سے بھی ہنستے ہنستے پُوچھا کہ تیرے پاس بھی تو لونڈی تھی؟ اُس احمق نے کہا: ''آپ کے قدموں کی سوگند، میں نے ہی یہ کام نہیں کیا۔ سبھوں نے تمھارے ڈر سے لونڈیاں صندوق میں چھپائیں ہیں۔'' شاہِ بندر نے یہ بات سن کر سب صندوقوں کا جھاڑ لینا شروع کیا۔ میرا بھی صندوق کھولا اور ملکہ کو نکال کر سب کے ساتھ لے گیا۔ عجب طرح کی مایوسی ہوئی کہ یہ ایسی حرکت پیش آئی کہ تیری جان تو مُفت گئی اور ملکہ سے دیکھیے کیا سلوک کرے۔ (۴۴۳)

اُس کی فکر میں اپنی بھی جان کا ڈر بھول گیا۔ سارے دن رات، خُدا سے دُعا مانگتا رہا۔ جب بڑی فجر ہوئی، سب لونڈیوں کو کشتی پر سوار کر کے پھر لائے۔ سوداگر خوش ہُوئے۔ اپنی اپنی کنیزکیں لیں۔ سب آئیں مگر ایک ملکہ اُن میں نہ تھی۔ میں نے پُوچھا کہ میری لونڈی نہیں آئی۔ اس کا کیا سبب ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا کہ ہم واقف نہیں، شاید پادشاہ نے پسند کی ہوگی۔ سب سوداگر مجھے تسلی اور دلاسا دینے لگے کہ خیر جو ہُوا سو ہُوا، تُو کُڑھ مت۔ اُس کی قیمت ہم سب بہری کر کر تجھے دیں گے۔ میرے حواس باختہ ہوگئے۔ میں نے کہا کہ اب میں عجم نہیں جانے کا۔ کشتی والوں سے کہا: ''یارو! مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ کنارے پر اُتار دیجو۔'' وے راضی ہوئے، میں جہاز سے اُتر کر غُراب میں آبیٹھا۔ یہ کتا بھی میرے ساتھ چلا آیا۔

جب بندر میں پہنچا، ایک صندوقچہ جواہر کا جو ملکہ اپنے ساتھ لائی تھی، اُسے تو رکھ لیا اور سب اسباب شاہِ بندر کے نوکروں کو دیا اور میں جاسوسی میں ہر کہیں پھرنے لگا کہ شاید خبر ملکہ کی پاؤں لیکن ہرگز سُراغ نہ ملا اور نہ اس بات کا پتا پایا۔ ایک رات کو کسو مکر سے پادشاہ کے بھی محل میں گیا اور ڈھونڈھا، کچھ خبر نہ ملی۔ قریب ایک مہینے کے شہر کے کُوچے اور محلّے چھان مارے اور اُس غم سے اپنے تئیں قریب ہلاکت کے پہنچایا اور سَودائی سا پھرنے لگا۔ آخر اپنے دل میں خیال کیا کہ غالب ہے شاہِ بندر کے گھر میں میری پادشاہ زادی ہووے تو ہووے، نہیں تو اور کہیں نہیں۔ شاہِ بندر کی حویلی کے گرد پیش دیکھتا تھا کہ کہیں سے بھی جانے کی راہ پاؤں تو اندر جاؤں۔

ایک بدررَو نظر پڑی کہ مُوافق آدمی کی آمدورفت کے ہے، مگر جالی آہنی اُس کے دہانے پر جڑی ہے۔ یہ قصد کیا کہ اُس بدررَو کی راہ سے چلوں۔ کپڑے بدن سے اُتارے اور اُس نجس کیچڑ میں اُترا۔ ہزار محنت سے اُس جالی کو توڑا اور سَنڈاس کی راہ سے چور، محل میں گیا۔ عورتوں کا سا لباس بنا کر ہر طرف دیکھنے بھالنے لگا۔ ایک مکان سے آواز میرے کان میں پڑی، جیسے کوئی مُناجات کر رہا ہے۔ آگے جا کر دیکھوں تو ملکہ ہے کہ عجب حالت سے روتی ہے اور ناک گھِسنی کر رہی ہے، اور خدا سے دُعا مانگتی ہے کہ صدقے اپنے رسولؐ کے اور اُس کی آلِ پاک کے، مُجھے اِس کُفرستان سے نجات دے اور جس شخص نے مجھے اسلام کی راہ بتائی ہے، اُس سے ایک بار خیریت سے مِلا۔ میں دیکھتے ہی دوڑ کر پانوں پر گر پڑا۔ ملکہ نے مجھے گلے لگا لیا۔ ہم دونوں پر ایک دم بے ہوشی کا عالم ہوگیا۔ جب حواس بجا ہُوئے، میں نے کیفیت ملکہ سے پُوچھی۔ بولی: ''جب شاہِ بندر سب لونڈیوں کو کنارے پر لے گیا، میں خدا سے یہی دعا مانگتی تھی کہ کہیں میرا راز فاش نہ ہو اور میں پہچانی نہ جاؤں، اور تیری جان پر آفت نہ آوے۔ وہ ایسا ستار ہے کہ ہرگز کسو نے نہ دریافت کیا کہ یہ ملکہ ہے۔ شاہِ بندر ہر ایک کو بہ نظرِ خریداری دیکھتا تھا۔ جب میری باری

ہُوئی، مجھے پسند کر کرا اپنے گھر میں چُپکے بھیج دیا، اوروں کو بادشاہ کے حضور میں گزرانا۔

میرے باپ نے جب اُن میں مجھے نہ دیکھا، سب کو رخصت کیا۔ یہ سب پر پنچ میرے واسطے کیا تھا۔ اب یُوں مشہور کیا ہے کہ پادشاہ زادی بہت بیمار ہے۔ اگر میں ظاہر نہ ہوئی تو کوئی دن میں میرے مرنے کی خبر سارے مُلک میں اُڑے گی، تو بدنامی بادشاہ کی نہ ہووے۔ لیکن اب میں اِس عذاب میں ہوں کہ شاہِ بندر مجھ سے اور اِرادہ دِل میں رکھتا ہے اور ہمیشہ ساتھ سونے کو بُلاتا ہے۔ میں راضی نہیں ہوتی۔ از بس کہ چاہتا ہے، اب تک میری رضامندی منظور ہے۔ لہٰذا چُپ ہو رہتا ہے۔ پر حیران ہوں، اِس طرح کہاں تک نبھے گی۔ سو میں نے بھی جی میں یہ ٹھہرالیا ہے (۴۴۴) کہ جب مجھ سے کچھ اور قصد کرے گا تو میں اپنی جان دُوں گی اور مَر رہوں گی۔ لیکن تیرے ملنے سے ایک اور تدبیر دِل میں سُوجھی ہے۔ خدا چاہے تو سوائے اِس فکر کے، دُوسری کوئی طرح مخلصی کی نظر نہیں آتی"۔ میں نے کہا: "فرماؤ تو، کون سی تدبیر ہے؟" کہنے لگی: "اگر تُو سَعی اور محنت کرے تو ہو سکے۔" میں نے کہا: "میں فرمانبردار ہُوں۔ اگر حُکم کرو تو جلتی آگ میں کُود پڑوں۔ اور سیڑھی پاؤں تو تمھاری خاطر آسمان پر چلا جاؤں، جو کچھ فرماؤ سو بجالاؤں۔"

ملکہ نے کہا: "تُو بڑے بُت کے بُت خانے میں جا اور جس جگہ جُوتیاں اُتارتے ہیں، وہاں ایک سیاہ ٹاٹ پڑا رہتا ہے۔ اِس ملک کی رسم ہے کہ جو کوئی مُفلس اور مُحتاج ہو جاتا ہے، اُس جگہ وہ ٹاٹ اُڑھ کر بیٹھتا ہے۔ وہاں کے لوگ جو زیارت کو جاتے ہیں، مُوافق اپنے اپنے مقدُور کے اُسے دیتے ہیں۔ جب دو چار دن میں مال جمع ہو جاتا ہے، پنڈے ایک خِلعت بڑے بُت کی سرکار سے دے کر اُسے رُخصت کرتے ہیں۔ وہ تونگر ہو کر چلا جاتا ہے۔ کوئی نہیں معلوم کرتا کہ یہ کون تھا۔ تُو بھی جا کر اُس پلاس کے نیچے بیٹھ اور ہاتھ مُنہہ اپنا خُوب طرح چُھپا لے، اور کسو سے نہ بول۔ (۴۴۵)

بعد تین دن کے باہمن اور بُت پرست ہر چند تجھے خِلعت دے کر رخصت کریں، تو وہاں سے ہرگز نہ اُٹھ۔ جب نہایت مِنت کریں، تب تُو بولیو کہ مجھے روپیہ پیسا کچھ درکار نہیں، میں مال کا بُھوکا نہیں، میں مظلوم ہُوں، فریاد کو آیا ہوں۔ اگر برہمنوں کی ماتا میری داد دے تو بہتر۔ نہیں تو بڑا بُت میرا اِنصاف کرے گا (۴۴۶) اور اُس ظالم سے یہی بڑا بُت میری فریاد کو پہنچے گا۔ جب تک وہ ماتا (۴۴۷) برہمنوں کی آپ تیرے پاس نہ آوے، بہتیرا کوئی مناوے، تُو راضی نہ ہوجیو۔ آخر لاچار ہو کر وہ خود تیرے نزدیک آوے گی۔ وہ بہت بوڑھی ہے۔ دو سو چالیس برس کی عمر ہے اور چھتیس بیٹے اُس کے جنے ہُوئے، بُت خانے کے سردار ہیں، اور اُس کا بڑے بُت کے پاس بڑا درجا

ہے۔ (۴۴۸) اِس سبب اُس کا اِتنا بڑا حکم ہے کہ جتنے چھوٹے بڑے اِس ملک کے ہیں، اُس کے کہنے کو اپنی سعادت جانتے ہیں۔ جو وہ فرماتی ہے بسر و چشم مانتے ہیں۔ اُس کا دامن پکڑ کر کہیو: ''اے مائی! اگر مُجھ مظلوم مُسافر کا انصاف ظالم سے نہ کرے گی تو میں بڑے بُت کی خدمت میں ٹکریں ماروں گا۔ آخر وہ رحم کھا کر تُجھ سے میری سفارش کرے گا۔ جب وہ برہمنوں کی ماتا تیرا سب احوال پُوچھے تو کہیو کہ میں عجم کا رہنے والا ہُوں۔ بڑے بُت کی زیارت کی خاطر اور تمھاری عدالت سُن کر کالے کوسوں سے یہاں آیا ہوں۔ کئی دنوں آرام سے رہا۔ میری بی بی بھی میرے ساتھ آئی تھی۔ وہ جوان ہے اور صُورت شکل بھی اچھی ہے اور آنکھ ناک سے درست ہے۔ معلوم نہیں کہ شاہِ بندر نے اُسے کیوں کر دیکھا۔ بہ زور مُجھ سے چھین کر اپنے گھر میں ڈال دیا اور ہم مسلمانوں کا یہ قاعدہ ہے کہ جو نامحرم، عورت کو اِن کی دیکھے یا چھین لے تو واجب ہے کہ اُس کو جس طرح ہو مار ڈالیں اور اپنی جُورُو کو لے لیں اور نہیں تو کھانا پینا چھوڑ دیں، کیونکہ جب تلک وہ جیتا رہے، وہ عورت خاوند پر حرام ہے۔ اب یہاں لاچار ہو کر آیا ہوں۔ دیکھیئے تُم کیا انصاف کرتی ہو؟'' جب ملکہ نے مجھے یہ سب سکھا پڑھا دیا، میں رخصت ہو، اُسی تاب دان سے باہر نکلا اور وہ جالی آہنی پھر لگا دی۔

صبح ہوتے، بُت خانے میں گیا اور وہ سیاہ پلاس اُڑھ (۴۴۹) کر بیٹھا۔ تین روز میں اتنا روپیہ اور اشرفی اور کپڑا میرے نزدیک جمع ہُوا کہ انبار لگ گیا۔ چوتھے دن پنڈے بھجن کرتے اور گاتے بجاتے خِلعت لیئے میرے پاس آئے اور رخصت کرنے لگے۔ میں راضی نہ ہُوا اور دُہائی بڑے بُت کی دی کہ میں گدائی نہیں کرنے آیا، بلکہ انصاف کے لیئے بڑے بُت اور برہمنوں کی ماتا کے پاس آیا ہوں۔ جب تلک اپنی داد نہ پاؤں گا، یہاں سے نہ جاؤں گا۔ وے سُن کر اُس پیرِ زال کے رُوبرُو گئے اور میرا احوال بیان کیا۔ بعد اُس کے ایک چُوبے آیا اور میرے تئیں کہنے لگا کہ چل ماتا بُلاتی ہے۔ میں وُونہیں ٹاٹ کالا سر سے پاؤں تک اُڑھے ہُوئے دِھرے میں گیا (۴۵۰)۔ دیکھتا ہوں کہ ایک جڑاؤ سنگھاسن پر جس میں لعل، الماس اور موتی مونگا لگا ہُوا ہے، (۴۵۱) بڑا بُت بیٹھا ہے اور ایک کرسی زرّیں پر فرشِ معقول بچھا ہے۔ اس پر ایک بُڑھیا، سیاہ پوش مسند تکیے لگائے اور دو لڑکے دس بارہ برس کے، ایک داہنے، ایک بائیں، شان و شوکت اور تجمّل سے بیٹھی ہے۔ مُجھے آگے بُلایا۔ میں ادب سے آگے گیا اور تخت کے پائے کو بوسہ دیا۔ پھر اُس کا دامن پکڑ لیا۔ اُس نے میرا احوال پُوچھا۔ میں نے اُسی طرح جس طور سے ملکہ نے تعلیم کر دیا تھا، ظاہر کیا۔ سُن کر بولی کہ کیا مسلمان اپنی اِستریوں کو اوجھل میں رکھتے ہیں؟ میں نے کہا: ''ہاں تمھارے بچّوں کی خیر ہو، یہ ہماری رسمِ قدیم ہے''۔ بولی کہ تیرا اچّھا مذہب ہے۔ میں ابھی حُکم کرتی ہوں کہ شاہِ بندر

بمعۂ تیری جورُو، آن کر حاضر ہوتا ہے۔ اور اُس گیدی کو ایسی سیاست کروں کہ بارِ دیگر ایسی حرکت نہ کرے اور سب کے کان کھڑے ہوں اور ڈریں۔ اپنے لوگوں سے پُوچھنے لگی کہ شاہِ بندر کون ہے؟ اُس کی یہ مجال ہوئی کہ بگانی تریا کو بزور چھین لیتا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ فُلا نا شخص ہے۔ یہ سُن کر دونوں لڑکوں کو، جو پاس (۴۵۲) بیٹھے تھے، فرمایا کہ جلدی اُس مانس کو ساتھ لے کر پادشاہ کے پاس جاؤ اور کہو کہ ماتا فرماتی ہے کہ حُکم بڑے بُت کا یہ ہے کہ شاہِ بندر، آدمیوں پر زور زیادتی کرتا ہے، چنانچہ اِس غریب کی عورت کو چھین لیا ہے۔ اُس کی تقصیر بڑی ثابت ہوئی۔ جلد اُس گمراہ کے مال کا تالیقہ کر کر اِس تُرک کے، کہ ہمارا منظورِ نظر ہے، حوالے کر؛ نہیں تو آج رات کو تُو ستیاناس ہوگا اور ہمارے غضب میں پڑے گا۔ وے دونوں طِفل اُٹھ کر مَنڈل سے باہر آئے اور سوار ہوئے۔ سب پَنڈے، سنکھ بجاتے اور آرتی گاتے، جلو میں ہو لیئے۔

غرض وہاں کے بڑے چھوٹے، (۴۵۳) جہاں اُن لڑکوں کا پانْوں پڑتا تھا، وہاں کی مٹی تبرک جان کر اُٹھا لیتے اور آنکھوں سے لگاتے۔ اِسی طرح پادشاہ کے قلعے تک گئے۔ پادشاہ کو خبر ہُوئی، ننگے پانْوں استقبال کی خاطر نکل آیا اور اُن کو بڑے مان مَہت سے لے جا کر اپنے پاس تخت پر بٹھایا اور پُوچھا: ''آج کیوں کر تشریف فرمانا ہُوا۔'' اُن دونوں برہمن بچّوں نے ماں کی طرف سے جو کچھ سُن آئے تھے کہا اور بڑے بُت کی خفگی سے ڈرایا (۴۵۴)۔ پادشاہ نے سُنتے ہی فرمایا: ''بہت خُوب'' اور اپنے نوکروں کو حُکم کیا کہ مُحصّل جاویں اور شاہِ بندر کو بمعۂ اُس عورت کے جلد حضور میں حاضر کریں، تو میں تقصیر اُس کی تجویز کر کے سزا دُوں۔'' (۴۵۵)

یہ سُن کر میں اپنے دل میں گھبرایا کہ یہ بات تو اچھی نہ ہُوئی۔ اگر شاہِ بندر کے ساتھ ملکہ کو بھی لا دیں تو پردہ فاش ہوگا اور میرا کیا احوال ہوگا؟ دِل میں نہایت خوف زدہ ہو کر خدا کی طرف رجوع کی، لیکن میرے مُنہہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور بدن کانْپنے لگا۔ لڑکوں نے یہ میرا رنگ دیکھ شاید دریافت کیا کہ یہ حکم اِس کی مرضی کے موافق نہ ہُوا۔ وُونہیں خفا و برہم ہو اُٹھے (۴۵۶) اور بادشاہ کو جھڑک کر بولے: ''اے مردک! تُو دیوانہ ہُوا ہے، جو فرماں برداری سے بڑے بُت کی نکلا اور ہمارے بچن کو جُھوٹھ سمجھا، جو دونوں کو بُلوا کر تحقیق کیا چاہتا ہے؟ اب خبردار! تُو غضب میں بڑے بُت کے پڑا۔ ہم نے تُجھے حکم پہنچا دیا۔ اب تو جان اور بڑا بُت جانے۔'' (۴۵۷) اِس کہنے سے پادشاہ کی عجب حالت ہوئی کہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور سر سے پانْوں تلک رعشہ ہو گیا۔ منت کر کے منانے لگا۔ یے دونوں ہرگز نہ بیٹھے، لیکن کھڑے رہے۔ اِس میں جتنے اَمیر اُمرا وہاں حاضر تھے، ایک مُنہہ ہو کر بدگوئی شاہِ بندر کی کرنے لگے کہ وہ ایسا ہی حرام زادہ، بدکار اور پاپی ہے۔ ایسی ایسی حرکتیں کرتا ہے کہ حضور میں پادشاہ کے کیا کیا

عرض کریں؟ جو کچھ برہمنوں کی ماتا نے کہلا بھیجا ہے، درست ہے۔ اِس واسطے کہ حکم بڑے بُت کا ہے۔ یہ دروغ کیوں کر ہوگا؟ پادشاہ نے جب سب کی زبانی ایک ہی بات سُنی، اپنے کہنے سے بہت خَجِل اور نادم ہُوا۔ جلد ایک خلعت پاکیزہ مجھے دی اور حُکم نامہ اپنے ہاتھ سے لکھ، اُس پر دستی مُہر کر کر میرے حوالے کیا اور ایک رُقعہ مادر برہمناں کو لکھا اور جواہر، اشرفیوں کے خوان لڑکوں کے رُوبرُو پیش کش رکھ کر رُخصت کیا۔ میں خوشی بہ خوشی بُت خانے میں آیا اور اُس بُڑھیا کے پاس گیا۔ پادشاہ کا خط جو آیا تھا، اُس کا یہ مضمون تھا: ''القاب کے بعد بندگی و عجز و نیاز (۴۵۸) لکھ کر لکھا تھا کہ مُوافق حکمِ حضور کے، اِس مردِ مُسلمان کو خدمت شاہِ بندر کی مقرر ہوئی اور خلعت دی گئی۔ اب یہ اُس کے قتل کرنے کا مُختار ہے، اور سارا مال اموال اُس کا، اِس تُرک کا ہُوا، جو چاہے سو کرے۔ اُمیدوار ہوں کہ میری تقصیر معاف ہو۔'' برہمنوں کی ماں نے خوش ہو کر فرمایا کہ نوبت خانے میں بُت خانے کی نوبت بجے اور پانچ سو سپاہی برق انداز جو بال باندھی گوڑی ماریں، مُسلّح میرے ہمراہ کر دیئے اور حُکم کیا کہ بندر میں جا کر شاہِ بندر کو دستگیر کر کے اِس مُسلمان کے حوالے کریں۔ جس طرح کے عذاب سے اِس کا جی چاہے اُسے مارے اور خبردار، سوائے اِس عزیز کے، کوئی محل سرا میں داخل نہ ہوئے، اور اُس کے مال و خزانے کو امانت اِس کے سپُرد کریں۔ جب یہ بہ خوشی رخصت کرے، رسید اور صافی نامہ اِس سے لے کر پھر آویں۔ اور ایک سرے پاؤ بُتِ بُزرگ کی سرکار سے میرے تئیں دے کر سوار کروا کر وِداع کیا۔

جب میں بندر میں پہنچا، ایک آدمی نے بڑھ کر شاہِ بندر کو خبر کی۔ وہ حیران سا بیٹھا تھا کہ میں جا پہنچا۔ غُصّہ تو دل میں بھر ہی رہا تھا، دیکھتے ہی شاہِ بندر کو تلوار کھینچ کر ایسی گردن میں لگائی کہ اُس کا سر الگ بُھٹّا سا اُڑ گیا۔ اور وہاں کے گُماشتے، خزانچی، مُشرِف، داروغوں کو پکڑوا کر سب دفتر ضبط کیئے اور میں محل میں داخل ہُوا، ملکہ سے ملاقات کی۔ آپس میں گلے لگ کر رودئے اور شُکر خدا کا کیا۔ میں نے اُس کے، اُس نے میرے، آنسو پونچھے۔ پھر باہر مسند پر بیٹھ کر اہل کاروں کو خلعتیں دیں اور اپنی اپنی خدمتوں پر سب کو بحال کیا۔ نوکر اور غلاموں کو سرفرازی دی۔ وہ لوگ جو منڈپ سے میرے ساتھ متعین ہوئے تھے، ہر ایک کو انعام و بخشش دے کر اُن کے جمعدار، رسالہ دار (۴۵۹) کو جوڑے پہنا کر رُخصت کیا اور جواہر بیش قیمت اور تھان نُوربافی اور شال بافی اور زردوزی اور جنس و تحفے ہر ایک ملک کے، اور نقد بہت سا پادشاہ کی نذر کی خاطر، اور موافق ہر ایک اُمراؤں کے درجہ بہ درجہ اور پنڈ یاین کے لیئے اور سب پنڈوں کے تقسیم کرنے کی خاطر اپنے ساتھ لے کر بعد ایک ہفتے کے میں بُت کدے میں آیا اور اُس ماتا کے آگے بطریق بھینٹ کے رکھا۔ اس نے ایک اور خلعت سرفرازی کی مجھے بخشی اور خطاب دیا۔ پھر بادشا

کے دربار میں جا کر پیش کش گزرانی اور جو جو ظلم و فساد شاہِ بندر نے ایجاد کیا تھا، اُس کے موقوف کرنے کی خاطر عرض کی۔ اِس سبب سے پادشاہ اور امیر، سوداگر سب مجھ سے راضی ہوتے۔ بہت نوازش مجھ پر فرمائی اور خِلعت اور گھوڑا دے کر منصب، جاگیر عنایت کی اور آبرُو، حُرمت بخشی۔

جب پادشاہ کے حضور سے باہر آیا، شاگرد پیشوں کو اور اہلکاروں کو اِتنا کچھ دے کر راضی کیا کہ سب میرا کلمہ پڑھنے لگے۔ غرض میں بہت مُرفہ الحال ہو گیا اور نہایت چین و آرام سے اُس ملک میں ملکہ سے عقد باندھ کر رہنے لگا اور خدا کی بندگی کرنے لگا۔ میرے اِنصاف کے باعث رَعیّت، پرجا سب خوش تھے۔ مہینے میں ایک بار بُت خانے میں اور پادشاہ کے حضور آتا جاتا، پادشاہ روز بروز زیادہ سرفرازی فرماتا۔ (٤٦٠)

آخر مصاحبت میں مجھے داخل کیا۔ میرے بے صلاح کوئی کام نہ کرتا۔ نہایت بے فِکری سے زندگی گُزرنے لگی۔ مگر خدا ہی جانتا ہے، اکثر اندیشہ اِن دونوں بھائیوں کا دل میں آتا کہ وے کہاں ہوں گے اور کِس طرح ہوں گے؟ بعد مُدّت دو برس کے ایک قافلہ سوداگروں کا، مُلک زیر باد سے اُس بندر میں آیا۔ وہ سب قصد عجم کا رکھتے تھے۔ اُنھوں نے یہ چاہا کہ دریا کی راہ سے اپنے ملک کو جاویں۔ وہاں قاعدہ یہ تھا کہ جو کارواں آتا، اُس کا سردار سوغات و تحفہ ہر ایک ملک کا میرے پاس لاتا اور نذر گُزرانتا۔ دُوسرے روز میں اُس کے مکان پر جاتا۔ دَہ یکے، بہ طریق محصُول کے اُس کے مال سے لیتا اور پروانگی کُوچ کی دیتا۔ اِسی طرح وہ سوداگر زیر باد کے بھی میری ملاقات کو آئے اور بے بہا پیش کش لائے۔ دوسرے دن میں اُن کے خیمے میں گیا۔ دیکھا تو دو آدمی پھٹے پرانے کپڑے پہنے گٹھری بُقچی سر پر اُٹھا کر میرے رُوبرو لاتے ہیں۔ بعد مُلاحظہ کرنے کے پھر اُٹھا لے جاتے ہیں اور بڑی محنت سے خدمت کر رہے ہیں (٤٦١)۔ میں نے خُوب تَجّھا کر جو دیکھا تو یہی میرے دونوں بھائی ہیں۔ اُس وقت غیرت اور حمیّت نے نہ چاہا کہ اِن کو اس طرح خِدمت گاری میں دیکھوں۔ جب مَیں اپنے گھر کو چلا، آدمیوں کو کہا کہ اِن دونوں شخصوں کو لیتے آؤ۔ جب اِن کو لائے، پھر لباس اور پوشاک بنوا دی اور اپنے پاس رکھا۔ اِن بد ذاتوں نے پھر میرے مارنے کا منصوبہ کر کر ایک روز آدھی رات میں سب کو غافل پا کر چوروں (٤٦٢) کی طرح میرے سرہانے آ پُہنچے۔ میں نے اپنی جان کے ڈر سے چوکی داروں کو دروازے پر رکھا تھا اور یہ کُتّا وفادار، میری چارپائی کی پٹّی تلے سوتا تھا۔ جُوں اِنھوں نے تلواریں میاں سے کھینچیں، پہلے کُتّے نے بھونک کر اِن پر حملہ کیا۔ اُس کی آواز سے سب جاگ پڑے۔ میں بھی ہل بلا کر چونکا۔ آدمیوں نے اِن کو پکڑا، معلوم ہُوا کہ آپ ہی ہیں۔ سب لَعنتیاں دینے لگے کہ باوجود اِس خاطرداری کے، یہ کیا حرکت اِن سے ظہور میں آئی۔

پادشاہ سلامت! تب تو میں بھی ڈرا۔ مثل مشہور ہے: ایک خطا، دو خطا، تیسری خطا مادَر بہ خطا۔ دِل میں یہی صلاح ٹھہری کہ اب اِن کو مُقیّد کروں، لیکن (۴۶۳) اگر بندی خانے میں رکھوں تو اِن کا کون خبر گیراں رہے گا؟ بھُوکھ پیاس سے مر جائیں گے، یا کوئی اور سَوانگ لائیں گے۔ اِس واسطے قفس میں رکھا ہے کہ ہمیشہ میری نظروں کے تلے رہیں تو میری خاطر جمع رہے۔ مُبادا آنکھوں سے اُوجھل ہو کر کچھ اور مکر کریں۔ اور اِس کُتّے کی عزّت اور حُرمت، اِس کی نمک حلالی اور وفاداری کے سبب ہے۔ سُبحان اللہ! آدمی بے وفا، بدتر، حیوانِ باوفا سے ہے۔ میری یہ سرگزشت تھی جو حضور میں عرض کی، اب خواہ قتل فرمائیے یا جان بخشی کیجیے، حُکم پادشاہ کا ہے''۔

میں نے سُن کر اُس جوانِ باایمان پر آفریں کی اور کہا کہ تیری مُروّت میں کچھ خلل نہیں اور اِن کی بے حیائی اور حرام زادگی (۴۶۴) میں ہرگز قصور نہیں۔ سچ ہے، کُتّے کی دُم کو بارہ برس گاڑو، تو بھی ٹیڑھی رہے۔'' (۴۶۵)

اُس کے بعد میں نے حقیقت اُن بارہوں لعل کی، کہ اُس کُتّے کے پٹّے میں تھے، پُوچھی۔ خواجہ بولا کہ پادشاہ کی صَد و بیست سال کی عمر ہو۔ اُسی بندر میں جہاں میں حاکم تھا، بعد تین چار سال کے ایک روز بالا خانے پر محل کے کہ بلند (۴۶۶)، واسطے سیر اور تماشے دریا وصحرا کے میں بیٹھا تھا اور ہر طرف دیکھتا تھا، ناگاہ ایک طرف جنگل میں کہ وہاں شاہ راہ نہ تھی، دو آدمی کی تصویر سی نظر آئی کہ چلے جاتے ہیں۔ دُوربین لے کر دیکھا تو عجیب ہیئت کے انسان دکھائی دیئے۔ چوب داروں کو اُن کے بُلانے کے واسطے دوڑایا۔ (۴۶۷) جب وہ آئے تو معلوم ہُوا کہ ایک عورت اور ایک مرد ہے۔ رنڈی کو محل سرا میں ملکہ کے پاس بھیج دیا اور مرد کو رُوبرو بلایا۔ دیکھا تو ایک جوان برس بیس بائیس کا، ڈاڑھی مُوچھ آغاز ہے، لیکن دھوپ کی گرمی سے اُس کے چہرے کا رنگ کالے توے کا سا ہو رہا ہے، اور سر کے بال اور ہاتھوں کے ناخون بڑھ کر بَن مانُس کی صُورت بن رہا ہے۔ اور ایک لڑکا برس تین چار ایک کا؛ کاندھے پر، اور دو آستینیں کُرتے کے بھری ہُوئیں، ہیکل کی طرح گلے میں ڈالے۔ عجیب صُورت اور عجیب وضع اس کی دیکھی۔ میں نے نہایت حیران ہو کر پُوچھا: ''اے عزیز! تُو کون ہے اور کِس ملک کا باشندہ ہے اور یہ کیا تیری حالت ہے؟'' وہ جوان بے اختیار رونے لگا۔ اور وہ ہمیانی کھول کر میرے آگے زمین پر رکھی اور بولا: ''الجوع الجوع! واسطے خدا کے کچھ کھانے کو دو۔ مُدّت سے گھاس اور بناس پتّیاں کھاتا چلا آتا ہُوں۔ ایک ذرا قوّت مجھ میں باقی نہیں رہی''۔ دُونہیں نان و کباب اور شراب میں نے منگوا دی۔ وہ کھانے (۴۸۶) لگا۔ اِتنے میں خواجہ سرا محل سے کئی تھیلیاں اُس کے قبیلے کے پاس سے لے آیا (۴۶۹)۔ میں نے اُن سب کو کھلوایا۔ ہر ایک قسم کے جواہر دیکھے کہ ایک ایک دانہ اُن کا خَراج سلطنت کا کہا چاہیئے۔ (۴۷۰)

ایک سے ایک انمول، ڈول میں اور تول میں اور آب داری میں۔ اور اُن کی جُھوٹ پڑنے سے سارا مکان بُوقلموں ہوگیا۔ جب اُس نے ٹکڑا کھایا اور ایک جام دارُو کا پیا اور دَم لیا، حواس بجا ہوئے۔ تب میں نے پُوچھا: ''یہ پتھر تجھے کہاں ہاتھ لگے؟'' جواب دیا کہ میرا وطن ولایت آذربائیجان ہے۔ لڑکپن میں گھر بار ماباپ سے جُدا ہوکر بہت سختیاں کھینچیں اور ایک مُدّت تلک میں زِندہ درگور تھا۔ اور کئی بار ملک المَوت کے پنجے سے بچا ہوں۔

میں نے کہا: ''اے مردِ آدمی، مُفصّل کہہ تو معلوم ہو''۔ تب وہ اپنا احوال بیان کرنے لگا کہ میرا باپ سوداگر پیشہ تھا۔ ہمیشہ سفر ہندوستان و روم وچین وخطا و فرنگ کا کرتا۔ جب میں دس برس کا ہُوا، باپ ہندوستان کو چلا۔ مجھے اپنے ساتھ لے جانے کو چاہا۔ ہر چند والدہ نے اور خالا، ممانی، پُھوپھی نے کہا کہ ابھی یہ لڑکا ہے لائق سفر کے نہیں ہُوا۔ والد نے نہ مانا اور کہا کہ میں بُوڑھا ہُوا، اگر یہ مرے رُوبرُو تربیت نہ ہوگا، تو یہ حسرت قبر میں لے جاؤں گا۔ مرد بچہ ہے، اب نہ سیکھے گا تو کب سیکھے گا؟

یہ کہہ کہ مجھے خواہ نخواہ (۴۷۱) ساتھ لیا اور روانہ ہُوا۔ خیر و عافیت سے راہ کٹی۔ جب ہندوستان میں پہنچے، کچھ جنس وہاں بیچی اور وہاں کی سوغات لے کر زیرباد کے ملک کو گئے۔ یہ بھی سفر بخوبی ہُوا۔ وہاں سے بھی خرید فروخت کر کے جہاز پر سوار ہوئے کہ جلدی وطن میں پہنچیں۔ بعد ایک مہینے کے ایک روز آندھی اور طوفان آیا اور مینہ موسلادھار برسنے لگا۔ سارا زمین و آسمان دُھواں دھار ہوگیا اور پتوار جہاز کی ٹوٹ گئی۔ مُعلّم ناخُدا سر پیٹنے لگے، دس دن تلک ہَوا اور مَوج جیدھر چاہتی تھی، لیئے جاتی تھی۔ گیارہویں روز ایک پہاڑ سے ٹکر کھا کے جہاز پُرزے پُرزے ہوگیا۔ نہ معلوم کہ باپ اور نوکر اور اسباب کہاں گیا۔ (۴۷۲)

میں نے اپنے تئیں ایک تختے پر دیکھا۔ سہ شبانہ روز وہ پڑا (۴۷۳) بے اختیار چلا گیا۔ چوتھے دن کنارے پر جا لگا۔ مجھ میں فقط جان باقی تھی۔ اُس پر سے اُتر کر گھٹنیوں چل کر بارے، کسو نہ کسو طرح زمین پر پہنچا۔ دُور سے کھیت نظر آئے اور بہت سے آدمی وہاں جمع تھے۔ لیکن سب سیاہ فام اور ننگے مادرزاد۔ مُجھ سے کچھ بولے، لیکن میں نے اُن کی زبان مُطلق نہ سمجھی۔ وہ کھیت چنوں کا تھا۔ وہ آدمی، آگ کا الاؤ جلا کر بُوٹوں کے ہولے کرتے تھے اور کھاتے تھے۔ (۴۷۴) اور کئی ایک گھر بھی وہاں نظر آئے۔ (۴۷۵) مجھے بھی اِشارت کرنے لگے کہ تُو بھی کھا۔ میں نے بھی ایک مُٹھی اُکھاڑ کر بُھونے اور پھانکنے لگا۔ تھوڑا سا پانی پی کر ایک گوشے میں سو رہا۔

بعد دیر کے جب جاگا، اُن میں سے ایک شخص میرے نزدیک آیا اور راہ دِکھانے لگا۔ میں نے تھوڑے سے چنے اور اُکھیڑ لیئے اور اُس راہ پر چلا۔ ایک کفِ دست میدان تھا، گویا صحرائے قیامت کا نمونہ کہنا چاہیئے۔ وہاں

بونٹ کھاتا ہُوا چلا جاتا تھا۔ بعد چار دن کے ایک قلعہ نظر آیا۔ جب پاس گیا تو ایک کوٹ دیکھا، بہت بُلند، تمام پتھر کا، اور ہر ایک اَلنگ اُس کی دو کوس کی اور دروازہ ایک سنگ کا تراشا ہُوا۔ ایک قُفل بڑا سا جڑا تھا لیکن وہاں اِنسان کا نِشان نظر نہ پڑا۔ وہیں سے آگے چلا۔ ایک ٹیلا دیکھا کہ اُس کی خاک سُرمے کے رنگ سیاہ تھی۔ جب اُس ٹل کے پار ہُوا تو ایک شہر نظر پڑا، بہت بڑا۔ گرد شہر پناہ اور جابجا بُرج۔ ایک طرف شہر کے دریا تھا، بڑے پاٹ کا۔ جاتے جاتے دروازے پر گیا اور بسم اللہ کہہ کر قدم اندر رکھا۔ ایک شخص کو دیکھا، پوشاک اہلِ فرنگ کی پہنے ہُوئے کُرسی پر بیٹھا ہے۔ جُوں اُن نے مجھے اجنبی مُسافر دیکھا اور میرے مُنہہ سے بسم اللہ سُنی، پُکارا کہ آگے آؤ۔ میں نے جا کر سلام کیا۔ نہایت مہربانی سے سلام کا جواب دیا۔ تُرت میز پر پاؤ روٹی اور مسکہ اور مُرغ کا کباب اور شراب رکھ کر کہا: "پیٹ بھر کر کھوؤ"[۳۷۶]۔ میں نے تھوڑا سا کھایا اور پیا اور بے خبر ہو کر سویا۔ جب رات ہو گئی، تب آنکھ کُھل گئی۔ ہاتھ مُنہہ دھویا۔ پھر مجھے کھانا کِھلایا اور کہا: "اے بیٹا! اپنا احوال کہہ۔" جو کچھ مُجھ پر گُزرا تھا سب کہہ سُنایا۔ تب بولا کہ کیوں آیا؟ میں نے دِق ہو کر کہا: "شاید تُو دیوانہ ہے۔ میں نے بعد مُدّت کی محنت کے اب بستی کی صُورت دیکھی ہے۔ خُدا نے یہاں تلک پہنچایا اور تُو کہتا ہے کیوں آیا۔" کہنے لگا: "اب تُو آرام کر۔ کل جو کہنا ہو گا، کہوں گا۔"

جب صُبح ہُوئی، بولا: "کوٹھری میں پھاوڑا اور چھلنی اور توبڑا ہے، باہر لے آ۔" میں نے دل میں کہا خُدا جانے روٹی کِھلا کر کیا محنت مُجھ سے کروائے گا۔ لاچار وہ سب نکال کر اُس کے رُوبرُو لایا۔ تب اُس نے فرمایا کہ اُس ٹیلے پر جا اور ایک گز کے مُوافق گڑھا کھود۔ وہاں سے جو کچھ نکلے، اِس چھلنی میں چھان۔ جو نہ چَھن کے اُسے توبڑے میں بھر کر میرے پاس لا۔ میں وہ سب چیزیں لے کر وہاں گیا اور اُتنا ہی کھود کر چھان چھون کر توبڑے میں ڈالا۔ دیکھا تو سب جواہر رنگ برنگ کے تھے۔ اُن کی جوت سے آنکھیں چُوندھیا گئیں۔ اُسی طرح تھیلے کو مُونہا مُنہہ بھر کر اُس عزیز کے پاس لے گیا۔ دیکھ کر بولا کہ جو اِس میں بھرا ہے، تُو لے اور یہاں سے جا کہ تیرا رہنا اِس شہر میں خُوب نہیں۔ میں نے جواب دیا کہ صاحب نے اپنی جانب میں بڑی مہربانگی کی کہ اِتنا کچھ کنکر پتھر دیا، لیکن میرے، کِس کام کا؟ جب بُھوکھا ہوں گا تو نہ اِن کو چبا سکوں گا، نہ پیٹ بھرے گا۔ پس اگر اور بھی دو تو میرے، کِس کام آئیں گے؟ وہ مرد ہنسا اور کہنے لگا: "مُجھ کو تُجھ پر افسوس آتا ہے کہ تُو بھی ہماری مانند ملک عجم کا مُتوطن ہے۔ اِس لیئے میں منع کرتا ہُوں، نہیں؛ تُو جان۔ اگر خواہ نخواہ تیرا یہی قصد ہے کہ شہر میں جاؤں تو میری انگوٹھی لیتا جا۔ جب بازار کے چوک میں جاوے تو ایک شخص سفید رِیش وہاں بیٹھا ہو گا اور اُس کی صُورت شکل مُجھ سے بہت مُشابہ ہے، میرا بڑا بھائی ہے، اُس کو یہ چھاپ دیجیو تو تیری خبر گیری کرے گا۔ اور جو کچھ وہ کہے، اُسی کے موافق کام کیجو، نہیں تو

مُفت مارا جائے گا۔ اور میرا حکم یہیں تلک ہے، شہر میں میرا دخل نہیں۔"

میں نے وہ خاتم اُس سے لی اور سلام کر کر رُخصت ہُوا۔ (۴۷۷) شہر میں گیا۔ بہت خاصہ شہر دیکھا۔ کُوچہ بازار صاف اور زن و مرد بے حجاب آپس میں خرید و فروخت کرتے۔ سب خُوش لباس۔ میں سیر کرتا اور تماشا دیکھتا، جب چوک کے چوراہے میں پہنچا، ایسا ازدحام تھا کہ تھالی پھینکیے تو آدمیوں کے سر پر چلی جائے۔ خلقت کا یہ ٹھٹ بندھ رہا تھا کہ آدمی کو راہ چلنا مشکل تھا۔ جب کچھ بھیڑ چھَٹی، میں بھی دھکم دھکا کرتا ہُوا آگے گیا، بارے اُس عزیز کو دیکھا کہ ایک چوکی پر بیٹھا ہے اور ایک جڑاؤ چماق رُوبرو دھرا ہے۔ میں نے جا کر سلام کیا اور وہ مُہر دی۔ نظرِ غضب سے میری طرف دیکھا اور بولا: "کیوں تُو یہاں آیا اور اپنے تئیں بَلا میں ڈالا؟ مگر میرے بے وقوف بھائی نے تُجھے منع نہ کیا تھا؟" (۴۷۸)

میں نے کہا: "اُنھوں نے تو کہا لیکن میں نے نہ مانا" اور تمام کیفیت اپنی ابتدا سے انتہا تک کہہ سُنائی۔ وہ شخص اُٹھا اور مجھے ساتھ لے کر اپنے گھر کی طرف چلا۔ اُس کا مکان پادشاہوں کا سا دیکھنے میں آیا اور بہت سے نوکر چاکر اُس کے تھے۔ جب خلوت میں جا کر بیٹھا، بہ مُلایمت بولا کہ اے فرزند! یہ کیا تُو نے حماقت کی کہ اپنے پاؤں سے گور میں آیا؟ کوئی بھی اِس کم بخت طلسماتی شہر میں آتا ہے! میں نے کہا: "میں اپنا احوال پیشتر کہہ چکا ہوں۔ اب تو قسمت لے آئی لیکن شفقت فرما کر یہاں کے راہ و رسم سے مُطلع کیجیے تو معلوم کروں کہ اِس واسطے تم نے اور تمھارے بھائی نے مجھے منع کیا۔" تب وہ جواں مرد بولا کہ بادشاہ اور تمام رئیس اِس شہر کے راندے ہُوئے ہیں۔ عجب طرح کا اُن کا رویہ اور مذہب ہے۔ یہاں بُت خانے میں ایک بُت ہے کہ شیطان اُس کے پیٹ میں سے نام اور ذات اور دِین ہر کسو کا بیان کرتا ہے۔ پس جو کوئی غریب مُسافر آتا ہے، پادشاہ کو خبر ہوتی ہے۔ اُسے منڈپ میں لے جاتا ہے اور بُت کو سجدہ کرواتا ہے۔ اگر ڈنڈوت کی تو بہتر، نہیں تو بیچارے کو دریا میں ڈُبو دیتا ہے (۴۷۹)۔ اگر وہ چاہے کہ دریا سے نکل کر بھاگے تو آلت اور خُصیے اُس کے لمبے ہو جاتے ہیں، ایسے کہ زمین میں گھسلتے ہیں، مارے بوجھ کے وہ ہرگز چل نہیں سکتا (۴۸۰)۔ ایسا کُچھ طلسم اِس شہر میں بنایا ہے۔ مجھ کو تیری جوانی پر رحم آتا ہے۔ مگر تیری خاطر ایک تدبیر کرتا ہوں کہ بھلا کوئی دن تو تُو جیتا رہے اور اِس عذاب سے بچے"۔ میں نے پُوچھا: "وہ کیا صُورت تجویز کی ہے؟ ارشاد ہو"۔ کہنے لگا: "تجھے کتخدا کروں اور وزیر کی لڑکی تیری خاطر بیاہ لاؤں"۔ میں نے جواب دیا کہ وزیر اپنی بیٹی مجھ سے مُفلِس کو کب دے گا، مگر جب اُن کا دین قبول کروں؛ سو مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ کہنے لگا: "اِس شہر کی یہ رسم ہے کہ جو کوئی اُس بُت کو سجدہ کرے، اگر فقیر ہو اور پادشاہ کی بیٹی کو مانگے تو اُس

کی خوشی کی خاطر حوالے کریں اور اُسے رنجیدہ نہ کریں۔ اور بھی میرا ابھی پادشاہ کے نزدیک اعتبار ہے اور عزیز رکھتا ہے۔ لہٰذا سب ارکان اور اکابر یہاں کے میری قدر کرتے ہیں۔ اور درمیان ایک ہفتے میں، دو دن بُت کدے میں زیارت کو جاتے ہیں اور عبادت بجالاتے ہیں، چنانچہ کل سب جمع ہوویں گے۔ میں تجھے لے جاؤں گا۔''

یہ کہہ کر، کھلا پلا کر سُلا رکھا۔ جب صبح ہُوئی، مجھے ساتھ لے کر بُت خانے کی طرف چلا۔ وہاں جا کر جو دیکھا تو آدمی آتے جاتے ہیں اور پرستش کرتے ہیں۔ پادشاہ اور اُمیر، بُت کے سامنے پنڈتوں کے پاس سر ننگے کیئے ادب سے دوزانو بیٹھے تھے، اور نا کتخدا لڑکیاں اور لڑکے خُوب صُورت، جیسے حُور غلمان، چاروں طرف صف باندھے کھڑے تھے۔ تب وہ عزیز مجھ سے مخاطب ہُوا کہ اب میں جو کہوں سو کر۔ میں نے قبول کیا کہ جو فرماؤ سو بجا لاؤں۔ بولا: ''پہلے پادشاہ کے ہاتھ پاؤں کو بوسہ دے، بعد اُس کے وزیر کا دامن پکڑ''۔ میں نے ویسا ہی کیا۔ پادشاہ نے پُوچھا کہ یہ کون ہے اور کیا کہتا ہے؟'' اُس مرد نے کہا: ''یہ جوان میرے رشتے میں ہے۔ پادشاہ کی قدم بوسی کی آرزو میں دُور سے آتا ہے، اِس توقع پر کہ وزیر اِس کو اپنی غُلامی میں سربلند کرے۔ اگر حُکم بُتِ کلاں کا اور مرضی حضور کی ہووے''۔ پادشاہ نے پُوچھا کہ ہمارا مذہب اور دین و آئین قبول کرے گا تو مُبارک ہے۔ وُونہیں بُت خانے کا نقار خانہ بجنے لگا اور بھاری خِلعت مجھے پہنائی اور ایک رسّی سیاہ میرے گلے میں ڈال کر کھینچتے ہوئے بُت کی سنگھاسن کے آگے لے جا کر سجدہ کروا کر کھڑا کیا [۴۸۱]۔ بُت سے آواز نکلی کہ اے خواجہ زادے! خُوب ہُوا کہ تو ہماری بندگی میں آیا۔ اب ہماری رحمت اور عنایت کا اُمیدوار رہ۔ یہ سُن کر سب خلقت نے سجدہ کیا اور زمین میں لَوٹنے لگے اور پُکارے: ''دھن ہے۔ کیوں نہ ہو، تم ایسے ہی ٹھاکر ہو''۔ جب شام ہوئی، پادشاہ اور وزیر سوار ہو کر وزیر کے محل میں داخل ہُوئے اور وزیر کی بیٹی کو اپنے طور کی ریت رسم کر کے میرے حوالے کیا۔ اور بہت سا دان دہیز دیا اور بہت منت دار ہوئے کہ بموجب حکم بڑے بُت کے، اِسے تمھاری خدمت میں دیا ہے۔ ایک مکان میں ہم دونوں کو رکھا۔ اُس نازنین کو جو میں نے دیکھا تو فی الواقع اُس کا عالم پری کا سا تھا۔ نکھ سکھ سے درست، جو جو خُوبیاں پدمنی کی سُنی جاتی ہیں، سو سب اُس میں موجود تھیں بہ فراغت تمام میں نے صُحبت کی اور حظ اٹھایا صُبح کو غُسل کر کے پادشاہ کے مُجرے میں حاضر ہوا۔ پادشاہ نے خِلعت دامادی کی عنایت کی اور حکم فرمایا کہ ہمیشہ دربار میں حاضر رہا کرے۔ آخر کو بعد چند روز کے پادشاہ کی مصاحبت میں داخل ہوا۔ [۴۸۲] پادشاہ میری صُحبت سے نہایت محظوظ ہوتے اور اکثر خلعت اور انعام عنایت کرتے۔ اگرچہ دُنیا کے مال سے میں غنی تھا، اِس واسطے کہ میرے قبیلے کے پاس اِتنا نقد و جنس اور جواہر تھا کہ جس کی حد و نہایت نہ تھی۔ دو سال تک بہت عیش و آرام سے

گزری۔ اتفاقاً وزیرزادی کو پیٹ رہا۔ جب ستواں ساہُوا اور اَن گِنا مہینا گزر کر پُورے دن ہُوئے، پیریں لگیں۔ دائی جنائی آئی تو مُوا لڑکا پیٹ میں سے نکلا۔ اُس کا وِس بچّا کو چڑھا، وہ بھی مرگئی۔ میں مارے غم کے دیوانہ ہوگیا کہ یہ کیا آفت ٹُوٹی۔ اُس کے سرہانے بیٹھا روتا تھا۔ ایک بارگی رونے کی آواز سارے محل میں بُلند ہوئی اور چاروں طرف سے عورتیں آنے لگیں۔ جو آتی تھی ایک دوہتّڑ میرے سر پر مارتی اور اپنی کُس اور کُون کو ننگا کر کے میرے مُنہہ کے مُقابل کھڑی رہتی اور رونا شروع کرتی۔ اِتنی رنڈیاں اکٹھی ہوئیں کہ میں اُن کے چُوتڑوں میں چُھپ گیا۔ نزدیک تھا کہ جان نکل جاوے۔ (۴۸۳)

اِتنے میں کِسو نے پیچھے سے گریبان میرا کھینچ کر گھسیٹا۔ دیکھوں تو وَہی مردِ عجمی ہے جس نے مجھے بیاہا تھا۔ کہنے لگا کہ احمق تُو کس لیئے روتا ہے؟ میں نے کہا: ''اے ظالم تُو نے کیا بات کہی؟ میری بادشاہت لُٹ گئی، آرام خانہ داری کا گیا گزرا۔ تُو کہتا ہے کیوں غم کرتا ہے!'' تبسّم کر کے بولا کہ اب اپنی موت کی خاطر رو (۴۸۴)۔ میں نے پہلے ہی تجھے کہا تھا کہ شاید اس شہر میں تیری اَجل لے آئی ہے، سوہی ہُوا۔ اب سِوائے مرنے کے تیری رہائی نہیں۔ آخر لوگ مجھے پکڑ کر بُت خانے میں لے گئے۔ دیکھا تو پادشاہ اور اُمرا اور چھتیس فرقہ رعیّت پَر جا وہاں جمع ہیں اور وزیرزادی کا مال اموال سب دَھرا ہے۔ جو چیز جس کا جی چاہتا ہے لیتا ہے اور اُس کی قیمت کے روپے دَھر دیتا ہے۔

غرض سب اسباب کے نقد روپے ہوئے۔ اُن روپیوں کا جواہر خریدا گیا اور ایک صندوقچے میں بند کیا اور ایک صندوق (۴۸۵) میں نان، حلوہ اور گوشت کے کباب اور میوہ خشک وتر اور کھانے کی چیزیں لے کر بھریں اور لاش اُس بی بی کی ایک صندوق میں رکھ کر صندوق آ ذُقے کا ایک اونٹ پر لدوایا، اور مجھے سوار کیا اور صندوقچہ جواہر کا میری بغلی میں دِیا۔ اور سارے باہمن آگے آگے بھجن کرتے اور سنکھ بجاتے چلے اور پیچھے ایک خلقت مُبارک باد کہتی ہوئی ساتھ ہولی۔ اس طور سے اُسی دروازے سے کہ میں پہلے روز آیا تھا، شہر کے باہر نکلا۔ جُونہیں داروغہ کی نگاہ مُجھ پر پڑی، رونے لگا اور بولا کہ اے کم بخت اَجل گرفتہ! میری بات نہ سُنی اور اِس شہر میں جا کر مُفت اپنی جان دی۔ میری تقصیر نہیں، میں نے منع کیا تھا۔ اُن نے یہ بات کہی، لیکن میں تو ہکا بکا ہو رہا تھا۔ نہ زبان یاری دیتی تھی کہ جواب دُوں، نہ اَوسان بجا تھے کہ دیکھیئے انجام میرا کیا ہوتا ہے۔

آخر اُسی قلعہ کے پاس جس کا میں نے پہلے روز دروازہ بند دیکھا تھا، لے گئے اور بہت سے آدمیوں نے مِل کر قُفل کو کھولا۔ تابوت اور صندوق کو اندر لے چلے (۴۸۶)۔ ایک پنڈت میرے نزدیک آیا اور سمجھانے لگا کہ مانس ایک دن جنم پاتا ہے اور ایک روز ناس ہوتا ہے۔ دنیا کا یہی اوگن ہے (۴۸۷)۔ اب یہ تیری اِستری اور

بُوت اور دَھن اور چالیس دن کا اسباب بھوجن کا موجود ہے، اِس کو لے اور یہاں رہ، جب تلک بڑا بُت تجھ پر مہربان ہووے۔ میں نے غُصّے میں چاہا کہ اُس بُت پر اور وہاں کے رہنے والوں پر اور اُس ریت رسم پر لعنت کروں (۴۸۸) اور اُس باہمن کو دَھول چھکّڑ کروں۔ وہی مردِ عجمی اپنی زبان میں مانع ہُوا کہ خبردار، ہرگز دم مت مار۔ اگر کچھ بھی بولا تو اِسی وقت تجھے جلا دیں گے۔ خیر جو تیری قسمت میں تھا سو ہُوا۔ اب خُدا کے کرم سے اُمیدوار رہ۔ شاید اللہ تجھے یہاں سے جیتا نِکالے۔

آخر سب مجھے تنِ تنہا چھوڑ کر اُس حِصار سے باہر نکلے اور دروازہ پھر مُقفّل کر دیا۔ اُس وقت میں اپنی تنہائی اور بے بسی پر بے اختیار رویا اور اُس عورت کی لوتھ پر لاتیں مارنے لگا۔ کہا اے مُردار اگر تُجھے جنتے ہی مرجانا تھا تو بیاہ کاہے کو کیا تھا اور پیٹ سے کیوں ہوئی تھی؟ (۴۸۹) مار مُور کر پھر چُپکا بیٹھا۔ اِس میں دن چڑھا اور دُھوپ گرم ہوئی۔ سر کا بھیجا پکنے لگا اور تعفّن کے مارے رُوح نکلنے لگی۔ جیدھر دیکھتا ہوں، مُردوں کی ہڈّیاں اور صندوق جواہر کے ڈھیر لگے ہیں۔ تب کئی صندوق پُرانے لے کر نیچے اُوپر رکھے کہ دن کو دُھوپ سے اور رات کو اوس سے بچاؤ ہو۔ (۴۹۰) آپ پانی کی تلاش کرنے لگا۔ ایک طرف جھرنا سا دیکھا کہ قلعے کی دیوار میں پتّھر کا تراشا ہُوا گھڑے کے مُنہہ کے موافق ہے۔ بارے کئی دن اُس پانی اور کھانے سے زندگی ہوئی۔

آخر آزُقہ تمام ہُوا۔ میں گھبرایا اور خدا کی جناب میں فریاد کی۔ وہ ایسا کریم ہے کہ دروازہ گوٹ کا کُھلا اور ایک مُردے کو لائے۔ اُس کے ساتھ ایک پیر مرد آیا۔ جب اُسے بھی چھوڑ کر گئے، یہ دِل میں آیا کہ اُس بوڑھے کو مار کر اُس کے کھانے کا صندوق سب کا سب لے لے۔ ایک صندوق کا پایا ہاتھ میں لے کر اُس کے پاس گیا۔ وہ بچارا سر زانو پر دَھرے، حیران بیٹھا تھا۔ میں نے پیچھے سے آ کر اُس کے سر میں ایسا مارا کہ سر پھٹ کر مغز (۴۹۱) نکل پڑا اور فی الفور جان بحق تسلیم ہُوا۔ اُس کا آزُقہ لے کر میں کھانے لگا۔ مُدّت تک (۴۹۲) یہی میرا کام تھا کہ جو زندہ مُردے کے ساتھ آتا، اُسے میں مار ڈالتا اور کھانے کا اسباب لے کر بہ فراغت کھاتا۔ (۴۹۳) بعد کتنی مدّت ایک مرتبہ ایک لڑکی تابُوت کے ہمراہ آئی، نہایت قبول صُورت۔ میرے دل نے نہ چاہا کہ اُسے بھی ماروں۔ اُن نے مجھے دیکھا اور مارے ڈر کے بے ہوش ہوگئی۔ میں اُس کا بھی آزُقہ اُٹھا کر اپنے پاس لے آیا، لیکن اکیلا نہ کھاتا۔ جب اُس عورت نے دیکھا کہ مجھے یہ شخص نہیں ستاتا، دن بہ دن اس کی دحشت کم ہوئی اور رام ہوتی چلی۔ میرے مکان میں آنے جانے لگی۔ ایک روز اُس کا احوال پُوچھا کہ تُو کون ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ میں بادشاہ کے وکیل مطلق کی بیٹی ہوں۔ اپنے چچا کے بیٹے سے منسوب ہوئی تھی۔ شبِ عروسی کے دن اُسے قولنج ہُوا۔ ایسا درد سے تڑپنے لگا

کہ ایک آن کی آن میں مر گیا۔ مُجھے اُس کے تابُوت کے ساتھ لا کر یہاں چھوڑ گئے ہیں۔ تب اُس نے میرا احوال پُوچھا۔ میں نے بھی تمام وکمال بیان کیا اور کہا: ''خدا نے تُجھے میری خاطر یہاں بھیجا ہے''۔ وہ مسکرا کر چُپکی ہو رہی۔

اِسی طرح کئی دن میں آپس میں محبت زیادہ ہو گئی۔ میں نے اُسے ارکانِ مُسلمانی کے سکھا کر کلمہ پڑھایا اور مُتعہ کر کر صُحبت کی۔ وہ بھی حاملہ ہوئی۔ ایک بیٹا پیدا ہُوا۔ قریب تین برس کے اِسی صورت سے گُزری۔ جب لڑکے کا دُودھ بڑھایا، ایک روز بی بی سے کہا کہ یہاں کب تلک رہیں گے اور کِس طرح یہاں سے نکلیں گے؟ وہ بولی: ''خُدا نکالے تو نِکلیں۔ نہیں تو ایک روز یونہیں مر جائیں گے۔'' مجھے اُس کے کہنے پر اور اپنے رہنے پر کمال رِقّت آئی۔ روتے روتے سو گیا۔ ایک شخص کو خواب میں دیکھا کہ کہتا ہے، پرنالے کی راہ سے نِکلنا ہے تو نکل۔ میں مارے خوشی کے چونک پڑا اور جُورو کو کہا کہ لوہے کی میخیں اور کیلیں جو پُرانے صندوقوں میں ہیں، جمع کر کے لے آؤ تو اُس کو کُشادہ کروں۔ غرض میں اُسی مَوری کے مُنھہ پر میخ رکھ کر پتھروں سے ایسا ٹھونکتا کہ تھک جاتا۔ ایک برس کی محنت میں وہ سُوراخ اتنا بڑا ہُوا کہ آدمی نِکل سکے۔ (۴۹۴)

بعد اُس کے مُردوں کی آستینوں میں اچھے اچھے جواہر چُن کر بھرے اور ساتھ لے کر اُسی راہ سے ہم تینوں باہر نکلے۔ خُدا کا شُکر کیا اور بیٹے کو کاندھے پر بٹھالیا۔ ایک مہینا ہُوا ہے کہ سرِ راہ چھوڑ کر مارے ڈر کے جنگل پہاڑوں کی راہ سے چلا آتا ہوں۔ جب گُرسنگی ہوتی ہے، گھاس پات کھاتا ہوں۔ قُوت، بات کہنے کی مجھ میں نہیں۔ یہ میری حقیقت ہے جو تم نے سُنی۔ (۴۹۵) پادشاہ سلامت! میں نے اس کی حالت پر ترس کھایا اور حمام کروا کر اچھا لباس پہنوایا اور اپنا نائب بنایا۔ اور میرے گھر میں ملکہ سے کئی لڑکے پیدا ہوئے، لیکن خُوردسالی (۴۹۶) میں مر مر گئے۔ ایک بیٹا پانچ برس کا ہو کر مُوا۔ اُس کے غم میں ملکہ نے بھی وفات پائی۔ مجھے کمال غم ہُوا اور وہ ملک بغیر اُس کے کاٹنے لگا۔ دل اُداس ہو گیا، اِرادہ عجم کا کیا۔ پادشاہ سے عرض کر کر خدمت شاہِ بندر (۴۹۷) کی، اُس جوان کو دِلوا دی۔ اِس عرصے میں پادشاہ بھی مر گیا۔ میں اِس وفادار کُتّے کو اور سب مال، خزانہ، جواہر ساتھ لے کر نیشاپُور میں آ رہا۔ (۴۹۸) اِس واسطے کہ میرے بھائیوں کے احوال سے کوئی واقف نہ ہووے۔ میں خواجہء سگ پرست مشہور ہُوا اور اِس بدنامی میں دُگنا محصول آج تک پادشاہِ ایران کی سرکار میں بھرتا ہوں۔

اتفاقاً یہ سوداگر بچہ وہاں گیا۔ اِس کے وسیلے سے جہاں پناہ کا قدم بوس کیا۔ میں نے پوچھا: ''کیا یہ تمھارا فرزند نہیں؟'' خواجہ نے جواب دیا: ''قبلہء عالم! یہ میرا بیٹا نہیں۔ آپ ہی کی رعیت ہے لیکن اب میرا مالک اور وارث جو کچھ کہیئے سو یہی ہے۔'' یہ سُن کر سوداگر بچے سے میں نے پُوچھا کہ تُو کِس تاجر کا لڑکا ہے اور تیرے ماں

باپ کہاں رہتے ہیں؟ اُس لڑکے نے زمیں چُومی اور جان کی اَمان مانگی اور بولا کہ یہ لونڈی سرکار کے وزیر کی بیٹی ہے۔ میرا باپ حضور کے عتاب میں بہ سبب اِسی خواجہ کے لعلوں کے پڑا۔ اور حکم یُوں ہوا کہ اگر ایک سال تک اُس کی بات کُرسی نشین نہ ہوگی تو جان سے مارا جائے گا۔ (۴۹۹) میں نے سُن کر یہ بھیس بنایا اور اپنے تئیں نیشاپور پہنچایا۔ خدا نے خواجہ کو بہ معہ کُتے اور لعلوں کے حضور میں حاضر کر دیا۔ آپ نے تمام احوال سُن لیا۔ اُمیدوار ہُوں کہ میرے بُوڑھے باپ کی مخلصی ہو۔

یہ بیان وزیرزادی سے سُن کر خواجہ نے ایک آہ کی اور بے اختیار گر پڑا۔ جب گلاب اُس پر چھڑکا گیا تب ہوش میں آیا اور بولا کہ ہائے کم بختی! اتنی دُور سے یہ رنج ومحنت کھینچ کر میں اِس توقع پر آیا تھا کہ اِس سوداگر بچّے کو مُتبنّیٰ کر کر اپنا فرزند کروں گا اور اپنے مال متاع کا اِس کو ہبہ نامہ لکھ دُوں گا تو میرا نام رہے گا اور سارا عالَم اِسے خواجہ زادہ کہے گا۔ سو میرا خیال خام ہُوا اور بالعکس کام ہُوا۔ اِن نے عورت ہو کر مجھ مردِ پیر کو خراب کیا۔ میں رنڈی کے چرتر میں پڑا۔ اب میری وہ کہاوت ہُوئی: گھر میں رہے، نہ تیرتھ گئے، مُونڈ منڈا فضیحت بھئے۔

القصہ مجھے اُس کی بے قراری اور نالہ وزاری پر رحم آیا۔ خواجہ کو نزدیک بُلایا اور کان میں مُژدہ اُس کے وصل کا سُنایا کہ غمگین مَت ہو، اِسی سے تیری شادی کر دیں گے۔ خُدا چاہے تو اولاد تیری ہوگی اور یہی تیری مالک ہوگی اِس خُوش خبری کے سُننے سے فی الجملہ اُس کو تسلّی ہُوئی۔ تب میں نے کہا کہ وزیرزادی کو محل میں لے جاؤ اور وزیر کو بندی خانے سے لے آؤ۔ اور حمام میں نہلاؤ اور خلعت سرفرازی کی پہناؤ اور جلدی میرے پاس لاؤ۔ جس وقت وزیر آیا، لبِ فرش تک اُس کا استقبال فرمایا اور اپنا بزرگ جان کر گلے لگایا، اور نئے سِر سے قلمدان وزارت کا عنایت فرمایا۔ اور خواجہ کو بھی جاگیر ومنصب دیا اور ساعتِ سعید دیکھ کر وزیرزادی سے نکاح پڑھوا کر منسوب کیا۔ کئی سال میں دو بیٹے اور ایک بیٹی اُس کے گھر میں پیدا ہوئی۔ چنانچہ بڑا بیٹا ملک التجار ہے اور چھوٹا ہماری سرکار کا مُختار ہے (۵۰۰)۔ اے درویشو! میں نے اس لیئے یہ نقل تُمھارے سامنھے کی کہ کل کی رات دو فقیروں کی سرگذشت میں نے سُنی تھی۔ اب تم دونوں بھی جو باقی رہے ہو، یہ سمجھو کہ ہم اُسی مکان میں بیٹھے ہیں، اور مجھے اپنا خادِم اور اِس گھر کو اپنا تکیہ جانو۔ بے وَسواس اپنی اپنی سیر کا احوال کہو اور چندے میرے پاس رہو۔ جب فقیروں نے پادشاہ کی طرف سے بہت خاطر داری دیکھی، کہنے لگے: ”خیر جب تم نے گداؤں سے اُلفت کی تو ہم دونوں بھی اپنا ماجرا بیان کرتے ہیں۔ سُنیئے۔“

○

سَیر تیسرے دَرویش کی

تیسرا دَرویش کوٹ باندھ بیٹھا، اور اپنی سَیر کا بیان اِس طرح سے کرنے لگا:

احوال اِس فقیر کا اے دوستاں سُنو یعنے جو مجھ پہ بیتی ہے وہ داستاں سُنو

جو کچھ کہ شاہِ عشق نے مُجھ سے کیا سلوک تفصیل وار کرتا ہوں اُس کا بیاں سُنو

یہ کمترین پادشاہ زادہ عجم کا ہے۔ میرے ولی نعمت وہاں کے پادشاہ تھے اور سوائے میرے کوئی فرزند نہ رکھتے تھے۔ میں جوانی کے عالَم میں مصاحبوں کے ساتھ چَوپڑ، گنجفہ، شطرنج، تختہ نَرد کھیلا کرتا تھا یا سوار ہو کر سیر و شکار میں مشغول رہتا۔

ایک دن کا یہ ماجرا ہے کہ سواری تیار کروا کر اور سب یار آشناؤں کو لے کر میدان کی طرف نکلا۔ باز؛ بہری، جرہ، باشا؛ سُرخاب اور تیتروں پر اُڑاتا ہُوا دُور نکل گیا۔ عجب طرح کا ایک قطعہ بہار کا نظر آیا کہ جیدھر نگاہ جاتی تھی، کوسَوں تلک سبز اور پھولوں سے لعل زمین نظر آتی تھی۔ یہ سماں دیکھ کر گھوڑوں کی باگیں ڈال دیاں اور قدم قدم سیر کرتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ ناگاہ اُس صحرا میں دیکھا کہ ایک کالا ہرن، اُس پر زربفت کی جھول اور بھنوَر کلی مُرصع کی اور گھونگرُو سونے کے، زردوزی پٹے میں ٹکے ہُوئے، گلے میں پڑے، خاطر جمع سے اُس میدان میں کہ، جہاں اِنسان کا دخل نہیں اور پرندہ پر نہیں مارتا، (۵۰۱) چرتا پھرتا ہے۔ ہمارے گھوڑوں کے سُم کی آواز پا کر چوکنا ہُوا اور سر اُٹھا کر دیکھا اور آہستہ آہستہ چلا۔

مجھے اُس کے دیکھنے سے یہ شوق ہُوا کہ رفیقوں سے کہا کہ تُم یہیں کھڑے رہو، میں اسے جیتا پکڑوں گا۔ خبردار تم قدم آگے نہ بڑھائیو اور میرے پیچھے نہ آئیو۔ اور گھوڑا میری رانوں تلے ایسا پَرند تھا کہ بارہا ہَرنوں کے اُوپر دَوڑا کر اُن کی کرچھالوں کو بُھلا کر ہاتھوں سے پکڑ لیئے تھے، اُس کے عَقب دوڑایا۔ وہ دیکھ کر چھلانگیں بھرنے لگا اور ہَوا ہُوا، اور گھوڑا بھی باد سے باتیں کرتا تھا، لیکن اُس کی گرد کو نہ پُہنچا۔ وہ رَہوار بھی پسینے پسینے ہو گیا اور میری بھی جیب مارے پیاس کے چٹخنے لگی، پر کچھ بَس نہ چلا۔ شام ہونے لگی اور میں کیا جانوں کہاں سے کہاں نکل آیا۔ لاچار

ہو کر اُسے بُھلا وا دیا اور ترکش میں سے تیر نکال کر اور قُربان سے کمان سنبھال کر چلّے میں جوڑ کر کشش کان تلک لا کر، ران کو اُس کی تاک، اللہ اکبر کہہ کر مارا۔ بارے پہلا ہی تیر اُس کے پانْوں میں ترازُو ہُوا۔ تب لنگڑاتا ہُوا پہاڑ کے دامن کی سَمت چلا۔ فقیر بھی گھوڑے پر سے اُتر پڑا اور پا پیادہ اُس کے پیچھے لگا۔ اُس نے کوہ کا اِرادہ کیا اور میں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ کئی اُتار چڑھاؤ کے بعد ایک گُنبذ نظر آیا۔ جب پاس پہنچا ایک باغیچہ اور ایک چشمہ دیکھا۔ وہ ہَرن تو نظروں سے چھلاوا ہو گیا۔ میں نہایت تھکا تھا، ہاتھ پانْوں دھونے لگا۔

ایک بارگی آواز رونے کی، اُس بُرج کے اندر سے میرے کان میں آئی، جیسے کوئی کہتا ہے کہ اے بچّے! جس نے تُجھے تیر مارا، میری آہ کا تیر اُس کے کلیجے میں لگیو۔ وہ اپنی جوانی سے پھل نہ پاوے اور خُدا اُس کو میرا سا دُکھیا بناوے۔ میں یہ سُن کر وہاں گیا۔ دیکھا تو ایک بزرگ، ریش سفید، اچھی پوشاک پہنے ایک مَسند پر بیٹھا ہے، اور ہَرن آگے لیٹا ہے۔ اُس کی جانگ سے تیر کھینچتا ہے اور بَددُعا دیتا ہے۔

میں نے سلام کیا اور ہاتھ جوڑ کہا کہ حضرت سلامت، یہ تقصیر نادانستہ اِس غلام سے ہُوئی۔ میں یہ نہ جانتا تھا خُدا کے واسطے مُعاف کرو۔ بولا کہ بے زبان کو تُو نے ستایا ہے۔ اگر اَن جان تجھ سے یہ حرکت ہوئی، اللہ مُعاف کرے گا۔ میں پاس جا بیٹھا، اور تیر نکالنے میں شریک ہُوا۔ بڑی دِقّت سے تیر کو نکالا اور زخم میں مرہم بھر کر چھوڑ دیا۔ پھر ہاتھ دھو دھا کر اُس پیر مَرد نے کچھ حاضری جو اُس وقت موجود تھی، مجھے کھلائی۔ میں نے کھا پی کر ایک چارپائی پر لمبی تانی۔

ماندگی کے سبب خُوب پیٹ بھر کر سویا۔ اُس نیند میں آواز نوحہ وزاری کی کان میں آئی۔ آنکھیں مَل کر جو دیکھتا ہوں تو اُس مکان میں نہ وہ بوڑھا ہے، نہ کوئی اور ہے۔ اکیلا میں، پلنگ پر لیٹا ہوں اور وہ دالان خالی پڑا ہے۔ چاروں طرف بھیا نک ہو کر دیکھنے لگا۔ ایک کونے میں پردہ پڑا نظر آیا۔ وہاں جا کر اُسے اُٹھایا۔ دیکھا تو ایک تخت بچھا ہے اور اُس پر ایک پَری زاد عورت برس چودہ ایک کی، مہتاب کی صُورت، (٥٠٢) اور زُلفیں دونوں طرف چھُوٹیں ہوئیں، ہنستا چہرہ، فرنگی لباس پہنے ہُوئے، عجب اَدا سے دیکھتی ہے اور بیٹھی ہے اور وہ بزرگ اپنا سر اُس کے پاؤں پر دھرے بے اختیار رو رہا ہے اور ہوش حواس کھو رہا ہے۔ میں اُس پیر مرد کا یہ احوال اور اُس نازنین کا حسن و جمال دیکھ کر مُرجھا گیا اور مُردے کی طرح بے جان ہو کر گر پڑا۔ وہ مرد بزرگ میرا یہ حال دیکھ کر شیشہ گُلاب کا لے آیا اور مجھ پر چھڑکنے لگا۔ جب میں جیتا اُٹھ کر اُس معشوق کے مُقابل جا کر سلام کیا، اُس نے ہرگز نہ ہاتھ اُٹھایا اور نہ ہونٹھ ہلایا۔ میں نے کہا: ''اے گُل بدن اِتنا غرور کرنا اور جواب سلام کا نہ دینا، کس مذہب میں درست ہے؟

کم بولنا ادا ہے ہر چند ، پر نہ اِتنا
مُند جائے چشمِ عاشق تو بھی وہ مُنہہ نہ کھولے

واسطے اُس خدا کے جس نے تجھے بنایا ہے، کچھ تو مُنہہ سے بول۔ ہم بھی اتفاقاً یہاں آ نکلے ہیں، مہمان کی خاطر ضرور ہے۔" میں نے بہتیری باتیں بنائیں، لیکن کچھ کام نہ آئیں۔ وہ چپکی بُت کی طرح بیٹھی سُنا کی۔ تب میں نے بھی آگے بڑھ کر ہاتھ، پانْوں پر چلایا۔ جب پانْوں کو چھیڑا تو سخت معلوم ہُوا (۵۰۳)۔ آخر یہ دریافت کیا کہ پتھر سے اُس لعل کو تراشا ہے، اور آذر نے اُس بت کو بنایا ہے۔ تب اُس پیر مرد، بُت پرست سے پُوچھا کہ میں نے تیرے ہَرن کی ٹانگ میں کھپرا مارا۔ تُو نے اس عشق کی ناوک سے میرا کلیجہ چھید کر وار پار کیا۔ تیری دُعا قبول ہوئی۔ اب اِس کی کیفیت مُفصّل بیان کر کہ یہ طلسم کیوں بنایا ہے اور تُو بستی کو چھوڑ کر جنگل پہاڑ کیوں بَستا ہے؟ تجھ پر جو کچھ بیتا ہے مُجھ سے کہہ۔ (۵۰۴)

جب اُس کا بہت پیچھا کیا، (۵۰۵) تب اُس نے جواب دیا کہ اِس بات نے مجھے تو خراب کیا، کیا تُو بھی سُن کر ہلاک ہُوا چاہتا ہے؟ میں نے کہا: "لو اب بہت مکر چکر کیا، مطلب کی بات کہو، نہیں تو مار ڈالوں گا۔" مجھے نہایت دَر پے دیکھ کر بولا: "اے جوان! حق تعالیٰ ہر ایک انسان کو عشق کی آنچ سے محفوظ رکھے۔ دیکھ تو اِس عشق نے کیا کیا آفتیں برپا کی ہیں۔ عشق ہی کے مارے عورت خاوند کے ساتھ ستی ہوتی ہے اور اپنی جان کھوتی ہے، اور فرہاد و مجنوں کا قصہ سب کو معلوم ہے۔ تُو اُس کے سُننے سے کیا پھل پاوے گا؟ ناحق گھر بار، دولت دنیا چھوڑ کر نکل جاوے گا!" (۵۰۶)

میں نے جواب دِیا": بَس اپنی دوستی تہہ کر رکھو، اِس وقت مجھے اپنا دشمن سمجھو۔ اگر جان عزیز ہے تو صاف کہو"۔ لاچار ہو کر آنسو بھر لایا اور کہنے لگا کہ مجھ خانہ خراب کی یہ حقیقت ہے کہ بندے کا نام نعمان سیّاح ہے۔ میں بڑا سوداگر تھا۔ اِس سِن میں تجارت کے سبب ہفت اقلیم کی سیر کی اور سب پادشاہوں کی خدمت میں رسائی ہوئی۔

ایک بار یہ خیال جی میں آیا کہ چاروں دانگ مُلک تو پھرا لیکن جزیرۂ فرنگ کی طرف نہ گیا اور وہاں کے پادشاہ کو اور رعیّت و سپاہ کو نہ دیکھا اور رسم و راہ (۵۰۷) وہاں کی کچھ نہ دریافت ہوئی۔ ایک دفعہ وہاں بھی چلا چاہیئے۔ رفیقوں اور شفیقوں سے صلاح لے کر اِرادہ مصمّم کیا۔ اور تُحفہ ہدایا جہاں تہاں کا جو، وہاں کے لائق تھا لیا اور ایک قافلہ سوداگروں کا اکٹھا کر کر جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہُوا۔ ہَوا جو مُوافق پائی، کئی مہینوں میں اُس ملک میں جا داخل ہُوا۔ شہر میں ڈیرا کیا۔ عجب شہر دیکھا کہ کوئی شہر اُس شہر کی خُوبی کو نہیں پہنچتا۔ ہر ایک بازار و کوچے میں پختہ

سڑکیں بنی ہوئیں اور چھڑکاؤ کیا ہُوا۔ صفائی ایسی کہ ایک تنکا کہیں پڑا نظر نہ آیا، گُوڑے کا تو کیا ذکر ہے۔ اور عمارتیں رنگ برنگ کی، اور رات کو رستوں میں دو رستہ قدم بقدم روشنی اور شہر کے باہر باغات کہ جن میں عجائب گُل بُوٹے اور میوے نظر آئے کہ شاید سوائے بہشت کے کہیں اور نہ ہوں گے۔ جو وہاں کی تعریف کروں سو بجا ہے۔

غرض سوداگروں کے آنے کا چرچا ہُوا۔ ایک خواجہ سرا مُعتبر سوار ہو کر اور کئی خدمت گار ساتھ لے کر قافلے میں آیا۔ اور بیپاریوں (۵۰۸) سے پُوچھا کہ تمھارا سردار کون سا ہے؟ سبھوں نے میری طرف اِشارت کی۔ وہ مُحلّی میرے مکان میں آیا میں تعظیم بجالایا، باہم سلامُ علیک ہُوئی۔ اُس کو سوزنی پر بٹھایا، تکیے کی تواضع کی۔ بعد اُس کے میں نے پُوچھا کہ صاحب کے تشریف لانے کا کیا باعث ہے؟ فرمایئے۔ جواب دیا کہ شہزادی نے سُنا ہے سوداگر آئے ہیں اور بہت جنس لائے ہیں۔ لہٰذا مُجھ کو حُکم دیا کہ جا کر اُن کو حضور میں لے آؤ۔ پس تم جو کچھ اَسباب لایق پادشاہوں کی سرکار کے ہو، ساتھ لے کر چلو اور سعادت آستانہ بوسی کی حاصل کرو۔ (۵۰۹)

میں نے جواب دیا کہ آج تو ماندگی کے باعث قاصر ہُوں۔ کل جان مال سے حاضر ہُوں گا۔ (۵۱۰) جو کچھ اِس عاجز کے پاس موجود ہے، نذر گذرانوں گا۔ جو پسند آوے، مال سرکار کا ہے"۔ یہ وعدہ کر کر عطر پان دے کر خواجہ سرا (۵۱۱) کو رُخصت کیا اور سب سوداگروں کو اپنے پاس بُلا کر جو جو تُحفہ جس کے پاس تھا، لے لے کر جمع کیا۔ اور جو میرے گھر میں تھا، وہ بھی لیا اور صُبح کے وقت دروازے پر پادشاہی محل کے حاضر ہُوا۔

باری داروں (۵۱۲) نے میری خبر عرض کی۔ حُکم ہُوا کہ حضور میں لاؤ۔ وہی خواجہ سرا نکلا اور میرا ہاتھ ہاتھ میں لے کر دوستی کی راہ سے باتیں کرتا ہُوا لے چلا۔ پہلے خواص پُرے سے ہو کر ایک مکانِ عالی شان میں لے گیا۔ اے عزیز! تُو باور نہ کرے گا، یہ عالم نظر آیا گویا پر کاٹ کر پَریوں کو چھوڑ دیا ہے۔ جس طرف دیکھتا تھا نگاہ گڑ جاتی۔ پاؤں زمین سے اُکھڑے جاتے تھے۔ بہ زور اپنے تئیں سنبھالتا ہُوا رُو بہ رُو پہنچا۔ جُونہیں بادشاہ زادی پر نظر پڑی غش کی نوبت ہُوئی اور ہاتھ پاؤں میں رعشہ ہو گیا۔ بہر صُورت سلام کیا۔ دونوں طرف دستِ راست اور دستِ چپ، صَف بہ صَف نازنینانِ پری چہرہ، دست بستہ کھڑی تھیں (۵۱۳)۔ میں جو کچھ قسم جواہر اور پارچہ پوشاکی اور تُحفہ اپنے ساتھ لے گیا تھا، پیش کیا، جب کئی کشتیاں حضور میں چُنی گئیں، (۵۱۴) از بس کہ سب جنس لائق پسند کے تھی، خوش ہو کر خانساماں کے حوالے ہوئی (۵۱۵) اور فرمایا کہ قیمت اِس کی بموجب فرد کے کل دی جائے گی۔ میں تسلیمات بجالایا اور دل میں خوش ہُوا کہ اس بہانے سے بھلا کل بھی آنا ہو گا۔ جب رخصت ہو کر باہر آیا تو سودائی کی طرح کہتا کچھ تھا اور مُنہہ سے کچھ نکلتا تھا۔ اِسی طرح سرا میں آیا لیکن حواس بجا نہ تھے۔ سب آشنا دوست

پوچھنے لگے کہ تمھاری کیا حالت ہے؟ میں نے کہا: ''اتنی آمد و رفت سے گرمی دماغ میں چڑھ گئی ہے۔''

غرض وہ رات تلملاتے کاٹی، فجر کو پھر جا کر حاضر ہُوا اور اُسی خواجہ سرا کے ساتھ (۵۱۶) پھر محل میں پہنچا۔ وہی عالَم جو کل دیکھا تھا، دیکھا۔ پادشاہ زادی نے مجھے دیکھا اور ہر ایک کو اپنے اپنے کام پر رُخصت کیا۔ جب پر چھا ہُوا، خلوت میں اُٹھ گئیں اور مجھے طلب کیا۔ جب میں وہاں گیا، بیٹھنے کا حکم کیا۔ میں آداب بجالا کر بیٹھا۔ فرمایا کہ یہاں جو تُو آیا اور یہ اسباب لایا، اس میں مُنافع کتنا منظور ہے۔ میں نے عرض کی کہ آپ کے قدم دیکھنے کی بڑی خواہش تھی۔ سو خُدا نے مُیسّر کی، اب میں نے سب کچھ بھر پایا، اور دونوں جہان کی سعادت حاصل ہوئی۔ اور قیمت جو کچھ فہرست میں ہے، نِصف کی خرید ہے اور نِصف نفع ہے۔'' فرمایا: ''نہیں، جو قیمت تُو نے لکھی ہے وہی (۵۱۷) عنایت ہوگی، بلکہ اور بھی انعام دیا جائے گا۔ بہ شرطیکہ ایک کام تجھ سے ہو سکے تو حکم کروں۔''

میں نے کہا کہ غلام کا جان و مال اگر سرکار کے کام آوے تو میں اپنے طالعوں کی خُوبی سمجھوں اور آنکھوں سے کروں۔ یہ سُن کر قلم دان یاد فرمایا۔ ایک شُقّہ لکھا اور موتیوں کے دُلسیان میں رکھ کر ایک رُومال شبنم کا اُوپر لپیٹ کر میرے حوالے کیا اور ایک انگوٹھی، نشان کے واسطے اُنگلی سے اُتار دی اور کہا کہ اُس طرف کو ایک بڑا باغ ہے۔ ''دِل کُشا'' اُس کا نام ہے۔ وہاں تُو جا کر ایک شخص کیخُسرو نام داروغہ ہے، اُس کے ہاتھ میں یہ انگشتری دیجو، اور ہماری طرف سے دُعا کہیو اور اِس رُقعہ کا جواب مانگیو۔ لیکن جلد آئیو۔ اگر کھانا وہاں کھائیو تو پانی یہاں پیجو۔ اِس کام کا انعام تجھے ایسا دُوں گی کہ تُو دیکھے گا۔ میں رُخصت ہُوا اور پُوچھتا پُوچھتا چلا۔ قریب (۵۱۸) دو کوس کے جب گیا، وہ باغ نظر پڑا۔ جب پاس پُہنچا، ایک عزیز مُسلّح مجھ کو پکڑ کر دروازے میں باغ کے لے گیا۔ دیکھوں تو ایک جوان، شیر کی سی صُورت، سونے کی کُرسی پر زرہ داؤدی پہنے، چار آئینہ باندھے فولادی خُود سر پر دھرے، نہایت شان شوکت (۵۱۹) سے بیٹھا ہے اور پانچ سَے جوان تیار، ڈھال تلوار ہاتھ میں لیئے اور ترکش کمان باندھے مُستعد پَرا باندھے کھڑے ہیں۔ میں نے سلام کیا، مجھے نزدیک بُلایا۔ میں نے وہ خاتم دی اور خوشامد کی باتیں کر کر وہ رومال دِکھایا اور رُقعے کے بھی لانے کا احوال کہا۔ اُس نے سُنتے ہی انگلی دانتوں سے کاٹی اور سر دُھن کر بولا کہ شاید تیری اَجل تجھ کو لے کر آئی ہے۔ خیر باغ کے اندر جا سرد کے درخت میں ایک آہنی پنجرہ لٹکتا ہے، اُس میں ایک جوان قید ہے۔ اُس کو یہ خط دے کر جواب لے کر جلدی پھر آ۔ میں شتاب باغ میں گُھسا۔ باغ کیا تھا، گویا جیتے جی بہشت میں گیا۔ ایک ایک چمن رنگ بہ رنگ کا پُھول رہا تھا اور فوّارے چُھوٹ رہے تھے۔ جانور چہچہے مار رہے تھے۔ میں سیدھا چلا گیا اور اُس درخت میں قفص دیکھا، اُس میں ایک حسین نظر آیا۔ (۵۲۰) میں نے ادب سے سر نہوڑایا

اور سلام کیا اور وہ خریطہ سر بمُہر پنجرے کی تیلیوں کی راہ سے دیا۔ وہ عزیز رُقعہ کھول کر پڑھنے لگا اور مجھ سے مشتاق وار احوال ملکہ کا پوچھنے لگا۔

ابھی باتیں تمام نہ ہوئیں تھیں کہ ایک فوج زنگیوں کی نمودار ہوئی اور چاروں طرف سے مجھ پر آ ٹوٹی اور بے تحاشی برچھی و تلوار مارنے لگی۔ ایک آدمی نہتھے (۵۲۱) کی بِساط کیا؟ ایک دَم میں چُور زخمی کر دیا۔ کچھ اپنی سُدھ بُدھ نہ رہی۔ پھر جو ہوش آیا، اپنے تئیں چار پائی پر پایا کہ دو پیادے اٹھائے لیئے جاتے ہیں اور آپس میں بتیاتے ہیں۔ ایک نے کہا: ''اِس مُردے کی لوتھ کو میدان میں پھینک دو؛ کُتّے، کوّے کھا جائیں گے''۔ دُوسرا بولا: ''اگر بادشاہ تحقیق کرے اور یہ خبر پہنچے تو جیتا گڑوا دے اور بال بچّوں کو کولھو میں پڑوا دے۔ کیا ہمیں اپنی جان بھاری پڑی ہے جو ایسی نامعقول حرکت کریں؟''

میں نے یہ گفتگو سُن کر دونوں یاجُوج ماجُوج سے کہا کہ واسطے خدا کے مجھ پر رحم کرو۔ ابھی مجھ میں ایک رمق جان باقی ہے۔ جب مر جاؤں گا تو تمھارا جی چاہے گا، سو کیجو، مُردہ بدست زندہ۔ لیکن یہ تو کہو مجھ پر یہ کیا حقیقت بیتی۔ مجھے کیوں مارا؟ اور تم کون ہو؟ بھلا اِتنا تو کہہ سناؤ۔

تب اُنھوں نے رحم کھا کر کہا کہ وہ جوان جو قفص (۵۲۲) میں بند ہے، اِس بادشاہ کا بھتیجا ہے۔ اور پہلے اس کا باپ تخت نشین تھا۔ رحلت کے وقت یہ وصیت اپنے بھائی کو کی کہ، ابھی میرا بیٹا جو وارث اِس سلطنت کا ہے، لڑکا اور بے شعور ہے۔ کاربار بادشاہت کا خیر خواہی اور ہوشیاری سے تم کیا کیجو۔ جب یہ بالغ ہو اپنی بیٹی سے شادی اُس کی کر دیجو اور مختار تمام ملک اور خزانے کا کیجو۔

یہ کہہ کر اُنھوں نے وفات پائی اور سلطنت کی نوبت چھوٹے بھائی پر آئی۔ اُس نے وصیت پر عمل نہ کیا بلکہ دیوانہ اور سودائی مشہور کر کے پنجرے میں ڈال دیا۔ اور چوکی گاڑھی، چاروں طرف باغ کے رکھی ہے کہ پرندہ پَر نہیں مار سکتا۔ اور کئی مرتبے زہرِ ہلاہل دیا ہے، لیکن زندگی زبردست ہے، اثر نہیں کیا۔ اب وہ شہزادی اور یہ شہزادہ (۵۲۳) دونوں عاشق و معشوق بن رہے ہیں۔ وہ گھر میں تلپھے ہے، اور یہ قفص میں تڑپھے ہے۔ تیرے ہاتھ شوق کا نامہ اُس نے بھیجا۔ یہ خبر ہرکاروں نے بے جنس بادشاہ کو پہنچائی۔ حبشیوں کا دستہ متعیّن ہُوا، تیرا یہ احوال کیا اور اُس جوان قیدی کے قتل کی وزیر سے تدبیر پُوچھی۔ اُس نمک حرام نے ملکہ کو راضی کیا ہے کہ اُس بے گناہ کو بادشاہ کے حضور اپنے ہاتھ سے شہزادی مار ڈالے۔

میں نے کہا، چلو مرتے مرتے یہ بھی تماشا دیکھ لیں (۵۲۴)۔ آخر راضی ہو کر وہ دونوں اور میں زخمی، چپکے

ایک گوشے میں جا کھڑے ہوئے۔ دیکھا تو تخت پر پادشاہ بیٹھا ہے اور ملکہ کے ہاتھ میں ننگی تلوار ہے اور شہزادے کو پنجرے سے باہر نکال کر رُوبہ رُو کھڑا کیا۔ ملکہ جلاد بن کر شمشیر برہنہ لیئے ہوئے اپنے عاشق کو قتل کرنے کو آئی۔ جب نزدیک پہنچی، تلوار پھینک دی اور گلے میں چمٹ گئی۔ تب وہ عاشق بولا کہ ایسے مرنے پر میں راضی ہوں۔ یہاں تیری آرزو ہے، وہاں بھی تیری تمنا رہے گی۔ ملکہ بولی کہ اِس بہانے سے میں تیرے دیکھنے کو آئی تھی۔ پادشاہ یہ حرکت دیکھ کر سخت برہم ہوا اور وزیر کو ڈانٹا کہ تُو یہ تماشا مجھے دکھلانے کو لایا تھا؟ مَحَلّی ملکہ کو جُدا کر کے محل میں لے گئے اور وزیر نے خفا ہو کر تلوار اُٹھائی اور پادشاہ زادے کے اُوپر دوڑا کہ ایک ہی وار میں کام اُس بچارے کا تمام کرے۔ جوں چاہتا ہے کہ تیغا چلاوے، غیب سے ایک تیر ناگہانی اُس کی پیشانی پر بیٹھا کہ دو سار ہو گیا اور وہ گر پڑا۔ پادشاہ یہ واردات دیکھ کر محل میں گھس گئے۔ جوان کو پھر قفس میں بند کر کر باغ میں لے گئے۔ میں بھی وہاں سے نکلا۔ راہ میں سے ایک آدمی مجھے بُلا کر ملکہ کے حضور لے گیا۔ مجھے گھائل دیکھ کر ایک جرّاح کو بُلوایا اور نہایت تقید سے فرمایا کہ اِس نوجوان کو چنگا کر کے غُسلِ شِفا کا دے، یہی تیرا مُجرا ہے۔ اِس کے اُوپر جتنی محنت تُو کرے گا، ویسا ہی انعام اور سرفرازی پاوے گا۔ غرض وہ جرّاح بموجب اِرشاد ملکہ کے، تگ و دو کر کے ایک چلّے میں نہلا دُھلا، مجھے حضور میں لے گیا۔ ملکہ نے پُوچھا کہ اب تو کچھ کسر باقی نہیں رہی؟ میں نے کہا کہ آپ کی توجہ سے اب ہٹا کٹا ہوں۔ تب ملکہ نے ایک خِلعت اور بہت سے روپے جو فرمائے تھے، بلکہ اُس سے بھی دوچند عطا کیئے اور رُخصت کیا۔

میں نے وہاں سے رفیق اور نوکر چاکروں کو لے کر کُوچ کیا۔ جب اس مقام پر پہنچا، سب کو کہا: ”تُم اپنے وطن کو جاؤ۔“ اور میں نے اس پہاڑ پر یہ مکان اور اُس کی صُورت بنا کر اپنا رہنا مقرر کیا۔ اور نوکروں اور غلاموں کو موافق ہر ایک کی قدر کے روپے دے کر آزاد کیا اور یہ کہہ دیا کہ جب تلک میں جیتا رہوں، میرے قُوت کی خبر گیری تمھیں ضرور ہے، آگے مُختار ہو۔ اب وہی نمک حلالی سے میرے کھانے کی خبر لیتے ہیں اور میں بہ خاطر جمع اِس بُت کی پرستش کرتا ہُوں۔ جب تلک جیتا ہوں، میرا یہی کام ہے۔ یہ میری سرگذشت ہے جو تُو نے سُنی (۵۲۵)۔ یا فُقرا! میں نے بہ مجرد سُننے اِس قصّے کے، کفنی گلے میں ڈالی اور فقیروں کا لباس کیا اور اِشتیاق میں فرنگ کے ملک کے دیکھنے کے لیئے روانہ ہُوا۔ کِتنے ایک عرصے میں جنگل پہاڑوں کی سَیر کرتا ہُوں، مجنوں اور فرہاد کی صُورت بن گیا۔ (۵۲۶)

آخر میرے شوق نے اِس شہر تلک پہنچایا۔ گلی کوچے میں باولا سا پھرنے لگا۔ اکثر ملکہ کے محل کے آس پاس رہا کرتا، لیکن کوئی ڈھب ایسا نہ ہوتا جو وہاں تلک رسائی ہو۔ عجب حیرانی تھی کہ جس واسطے یہ محنت کر کر گیا، وہ

مطلب ہاتھ نہ آیا۔ ایک دن بازار میں کھڑا تھا کہ ایک بارگی آدمی بھاگنے لگے اور دوکاندار دوکانیں (۵۲۷) بند کر کے چلے گئے۔ یا وہ رونق تھی یا سُنسان ہوگیا۔ ایک طرف سے ایک جوان، رُستم کا سا کلّہ جبڑا، شیر کی مانند گونجتا اور تلوار دودستی جھاڑتا ہُوا، زرہ بکتر گلے میں اور ٹوپ جھلم کا سر پر اور طمنچے کی جوڑی کمر میں، کیفی کی طرح بکتا جھکتا نظر آیا۔ اور اُس کے پیچھے دو غُلام، بنات کی پوشاک پہنے ایک تابوت تحمّل کا شانی سے مَڑھا ہُوا سر پر لیئے چلے آتے ہیں (۵۲۸)۔ میں نے یہ تماشا دیکھ کر ساتھ چلنے کا قصد کیا۔ جو کوئی آدمی میری نظر پڑتا، مجھے منع کرتا لیکن میں کب سُنتا ہُوں۔ رفتہ رفتہ وہ جواں مرد ایک عالی شان مکان میں چلا، میں بھی ساتھ ہُوا۔ اُس نے پھر تے ہی چاہا کہ ایک ہاتھ مارے اور مجھے دو ٹکڑے کرے۔ میں نے اُسے قسم دی کہ میں بھی یہی چاہتا ہوں، میں نے اپنا خون مُعاف کیا۔ کِسو طرح مجھے اِس زندگی کے عذاب سے چُھڑا دے کہ نہایت تنگ آیا ہوں، میں جان بوجھ کر تیرے سامنے آیا ہوں، دیر مت کر۔ مجھے مرنے پر ثابت قدم دیکھ کر خُدا نے اُس کے دل میں رحم ڈالا اور غصّہ بھی ٹھنڈا ہُوا۔ بہت توجہ اور مہربانی سے پوچھا کہ تُو کون ہے؟ اور کیوں اپنی زندگی سے بیزار ہُوا ہے؟

میں نے کہا: ''ذرا بیٹھیئے تو کہوں۔ میرا قِصّہ بہت دُور دراز ہے اور عشق کے پنجے میں گرفتار ہوں، اِس سبب سے لاچار ہوں''۔ یہ سُن کر اس نے اپنی کمر کھولی اور ہاتھ مُنہہ دھو دھا کر کچھ ناشتا کیا۔ مجھے بھی باعث ہُوا۔ جب فراغت کر کے بیٹھا، بولا: ''کہہ تجھ پر کیا گزری؟'' میں نے سب واردات اُس پیر مرد کی اور ملکہ کی اور وہاں اپنے جانے کی (۵۲۹) کہہ سُنائی۔ پہلے سُن کر رویا اور یہ کہا کہ اس کم بخت نے کِس کِس کا گھر گھالا۔ لیکن بھلا تیرا علاج میرے ہاتھوں میں ہے۔ اغلب ہے کہ اِس عاصی کے سبب سے تُو اپنی مُراد کو پہنچے اور تُو اندیشہ نہ کر اور خاطر جمع رکھ۔ حجّام کو فرمایا کہ اِس کی حجامت کر کے حمام کروا دے۔ ایک جوڑا کپڑا اُس کے غلام نے لا کر پہنایا۔ تب مجھ سے کہنے لگا کہ یہ تابُوت جو تُو نے دیکھا، اُسی شہزادۂ مرحوم کا ہے، جو قفص میں مُقیّد تھا۔ اُس کو دوسرے وزیر نے آخر مکر سے مارا۔ اُس کو تو نجات ہوئی کہ مظلوم مارا گیا، میں اُس کا کوکا ہوں۔ میں نے بھی اس وزیر کو بہ ضربِ شمشیر مارا اور پادشاہ کے بھی مارنے کا اِرادہ کیا۔ پادشاہ گِڑگڑایا اور سوگند کھانے لگا کہ میں بے گناہ ہوں۔ میں نے اُسے نامَرد جان کر چھوڑ دیا۔ تب سے میرا کام یہی ہے کہ ہر مہینے کی نوچندی جُمعے رات کو میں اس تابُوت کو اس طرح شہر میں لیئے پھرتا ہوں، اور اُس کا ماتم کرتا ہوں۔

اُس کی زبانی یہ احوال سُننے سے مجھے تسلی ہوئی کہ اگر یہ چاہے گا تو میرا مقصد بر آوے گا۔ خدا نے بڑا احسان کیا جو ایسے جنونی کو مجھ پر مہربان کیا۔ سچ ہے خدا مہربان تو کُل مہربان۔ جب شام ہوئی اور آفتاب غروب

ہُوا۔ اُس جوان نے تابُوت کو نِکالا اور ایک غلام کے عِوض وہ تابُوت میرے سر پر دھرا اور اپنے ساتھ لے کر چلا۔ فرمانے لگا کہ ملکہ کے نزدیک جاتا ہوں، تیری سفارش تا بہ مقدور کروں گا۔ تُو ہر گز دم نہ ماریو، چُپکا بیٹھا سُنا کیجو۔ میں نے کہا: ''جو کچھ صاحب فرماتے ہیں سو ہی کروں گا، خُدا تم کو سلامت رکھے جو میرے احوال پر ترس کھاتے ہو''۔ اُس جوان نے قصد پادشاہی باغ کا کیا۔ جب اندر داخل ہُوا، ایک چبُوترا سنگِ مرمر کا ہشت پہلُو باغ کے صحن میں تھا اور اُس پر ایک نم گیرا سفید بادلے کا موتیوں کی جھالر لگی ہوئی، الماس کے اِستادوں پر کھڑا تھا؛ اور ایک مسند مُغرق بچھی تھی۔ گاؤ تکیہ اور بغلی تکیے زربفت کے لگے ہُوئے۔ وہ تابُوت وہاں رکھوایا اور ہم دونوں کو فرمایا کہ اُس درخت کے پاس جا کر بیٹھو۔

بعد ایک ساعت کے مَشعل کی روشنی نظر آئی۔ ملکہ آپ کئی خواصیں پس و پیش اہتمام کرتی ہوئیں، تشریف لائیں؛ لیکن اُداسی خفگی چہرے پر ظاہر تھی۔ آ کر مَسند پر بیٹھیں۔ یہ کوکا ادب سے دست بستہ کھڑا رہا۔ پھر ادب سے دُور فرش کے کنارے مؤدب بیٹھا، فاتحہ پڑھی (۵۳۰) اور کچھ باتیں کرنے لگا۔ میں کان لگائے سُن رہا تھا۔ آخر اُس جوان نے کہا کہ ملکہء جہاں سلامت! ملکِ عَجم کا شہزادہ آپ کی خُوبیاں اور محبُوبیاں غائبانہ سُن کر اپنی سلطنت کو برباد دے، فقیر بَن، مانند ابراہیم اَدہم کے تباہ ہو، اور بڑی محنت کھینچ کر یہاں تلک آ پہنچا ہے۔ سائیں تیرے کارن چھوڑا شہر بلخ اور اس شہر میں بہت دنوں سے حیران پریشان پھرتا ہوں۔ آخر وہ قصد مرنے کا کر کے میرے ساتھ لگ چلا۔ میں نے تلوار سے ڈرایا، اُس نے گردن آگے دھر دی کہ اب میں یہی چاہتا ہوں، دیر مَت کر (۵۳۱)۔

غرض تمھارے عشق میں ثابت ہے۔ میں نے خُوب آزمایا، سب طرح پُورا پایا؛ اِس سبب سے اُس کا مذکور میں درمیان لایا۔ اگر حضور سے اُس کے احوال پر مُسافر جان کر توجہ ہو تو خُدا ترسی اور حق شناسی سے دُور نہیں۔ (۵۳۲) یہ ذکر ملکہ نے سُن کر فرمایا: ''کہاں ہے؟ اگر شہزادا ہے تو کیا مُضایقہ؟ رُو بہ رُو آوے۔'' وہ کوکا وہاں سے اُٹھ کر آیا اور مجھے ساتھ لے کر گیا۔ میں ملکہ کے دیکھنے سے نہایت شاد ہُوا لیکن عقل و ہوش برباد ہوئے۔ عالَم سکوت کا ہو گیا۔ یہ ہوا وَ نہ پڑا کہ کچھ کہوں ایک دَم میں ملکہ سدھاری اور کوکا اپنے مکان کو چلا۔ گھر آ کر بولا کہ میں نے تیری سب حقیقت اوّل سے آخر تک کہہ سُنائی اور سفارش بھی کی، اب تو ہمیشہ رات کو بلا ناغہ جایا کر اور عیش خوشی منایا کر۔ میں اُس کے قدم پر گر پڑا، اُس نے گلے لگالیا۔ تمام دن گھڑیاں گِنتا رہا کہ کب سانجھ ہو، (۵۳۳) جو میں جاؤں۔ جب رات ہُوئی، میں اُس جوان سے رخصت ہو کر چلا اور پائیں باغ میں ملکہ کے چبوترے پر تکیہ لگا کے جا بیٹھا۔

بعد ایک گھڑی کے، ملکہ تن تنہا ایک خواص کو ساتھ لے کر آہستہ آہستہ آ کر مسند پر بیٹھیں۔ خوش طالعی سے یہ دن میسّر ہُوا۔ میں نے قدم بوس کیا، اُنھوں نے میرا سر اُٹھالیا اور گلے سے لگالیا۔ اور بولیں کہ اِس فرصت کو غنیمت جان، میرا کہا مان، مجھے یہاں سے لے نکل، کسو اور ملک کو چَل۔ میں نے کہا: ''چلیئے۔'' یہ کہہ کر ہم دونوں باغ کے باہر تو ہُوئے، پر حیرت سے اور خوشی سے ہاتھ پاؤں پھُول گئے اور بھُول گئے اور ایک طرف کو چلے جاتے تھے، پر کچھ ٹھکانا نہیں پاتے تھے۔ ملکہ برہم ہو کر بولی: ''اب میں تھک گئی۔ تیرا مکان کہاں ہے، جلدی چل کر پہنچ۔ نہیں، تُو کیا کیا چاہتا ہے؟ میرے پاؤں میں پھپھولے پڑ گئے ہیں۔ رستے میں کہیں بیٹھ جاؤں گی۔''(۵۳۴)

میں نے کہا کہ میرے غُلام کی حویلی نزدیک ہے، اب آ پہنچے۔ خاطر جمع رکھو اور قدم اُٹھاؤ۔ جھُوٹھ تو بولا پر دل میں حیران تھا کہ کہاں لے جاؤں؟ عین راہ پر ایک دروازہ مُقفل نظر پڑا۔ جلدی سے قُفل کو توڑ کر مکان کے بھیتر گئے۔ اچھی حویلی، فرش بچھا ہُوا، شراب کے شیشے بھَرے، قرینے سے طاق میں دَھرے اور باورچی خانے میں نان کباب تیار تھے۔ ماندگی کمال ہو رہی تھی، ایک ایک گلابی شرابِ پُرتگالی کی اُس گزک کے ساتھ لی اور ساری رات باہم خوشی کی۔ جب اِس چَین سے صبح ہوئی۔ شہر میں غُل مچا کہ شہزادی غایب ہُوئی۔ مُحلہ مُحلہ، کُوچہ کُوچہ مُنادی پھرنے لگی اور کٹنیاں اور ہرکارے چھُوٹے کہ جہاں ہاتھ آوے پیدا کریں، اور سب دروازوں پر شہر کے پادشاہی غلاموں کی چوکی آ بیٹھی۔ گذربانوں کو حکم ہُوا کہ بغیر پروانگی، چیونٹی باہر شہر کے نہ نکل سکے۔ جو کوئی سُراغ ملکہ کا لاوے گا، ہزار اشرفی اور خلعت انعام پاوے گا۔ تمام شہر میں کُٹنیاں پھرنے اور گھر گھر میں گھُسنے لگیں (۵۳۵)۔ مجھے جو کم بختی لگی، دروازہ بند نہ کیا۔ ایک بُڑھیا شیطان کی خالا، اُس کا خُدا کرے مُنہہ کالا، ہاتھ میں تسبیح لٹکائے بُرقع اَوڑھے، دروازہ کھُلا پا کر دھڑک چلی آئی اور سامنے ملکہ کے کھڑی ہو کر ہاتھ اُٹھا کر دعا دینے لگی کہ الٰہی تیری نتھ چُوڑی سُہاگ کی سلامتی رہے اور کماؤ کی پگڑی قایم رہے۔ میں غریب رنڈیا فقیرنی ہُوں۔ ایک بیٹی میری ہے کہ وہ دُوجی سے، پُورے دنوں، دروازے میں مرتی ہے اور مجھ کو اِتنی وسعت نہیں کہ اَدھی کا تیل چراغ میں جلاؤں، کھانے پینے کو تو کہاں سے لاؤں۔ اگر مرگئی تو گور و کفن کیوں کر کروں گی، اور جنی تو دائی جنائی کو کیا دُوں گی۔ اور بچّہ کو ستھورا(۵۳۶) اور اچھوانی کہاں سے پلاؤں گی؟ آج دو دن ہُوے ہیں کہ بھُوکھی پیاسی پڑی ہے۔ اے صاحب زادی! اپنی خیر، کچھ ٹکڑا پارچہ دِلاؤ (۵۳۷) تو اُس کو پانی پینے کا ادھار ہو۔''

ملکہ نے ترس کھا کر، اپنے نزدیک بُلا کر، چار نان اور کباب اور ایک انگوٹھی چھنگلیا سے اُتار کر حوالے کی کہ اِس کو بیچ باچ کر گہنا پاتا بنا دیجو اور خاطر جمع سے گُوران کیجو اور کھوآیا کیجو، تیرا گھر ہے۔ اُس نے اپنے دل کا

مدّعا، جس کی تلاش میں آئی تھی بہ جنس پایا۔ خوشی سے دُعائیں دیتی اور بلائیں لیتی دفع ہوئی۔ ڈیوڑھی میں نان کباب پھینک دیئے، مگر انگوٹھی کو مُٹھی میں لے لیا کہ پتا ملکہ کے ہات کا میرے ہاتھ آیا۔ خُدا اُس آفت سے جو بچایا چاہے، اُس مکان کا مالِک جواں مرد سپاہی، تازی گھوڑے پر چڑھا ہُوا، نیزہ ہاتھ میں لیئے شِکار سے ایک ہرن لٹکائے آ پہنچا۔ اپنی حویلی کا تالا ٹوٹا اور کواڑ کُھلے پائے، اُس دلالہ کو نکلتے دیکھا، مارے غصّے کے ایک ہاتھ سے اُس کے جھونٹے پکڑ کر لٹکا لیا اور گھر میں آیا۔ اُس کے دونوں پاؤں میں رسّی باندھ کر ایک درخت کی ٹہنی میں لٹکایا۔ سر تلے، پاؤں اُوپر کیئے ایک دم میں تڑپھ تڑپھ کر مرگئی۔ اُس مَرد کی صُورت دیکھ کر یہ ہیبت غالب ہوئی کہ ہَوائیاں مُنہہ پر اُڑنے لگیں اور مارے ڈر کے کلیجہ کانپنے لگا۔ (۵۳۸) اُس عزیز نے ہم دونوں کو بدحواس دیکھ کر تسلّی دی کہ بڑی نادانی تم نے کی، ایسا کام کیا اور دروازہ کھول دیا۔ ملکہ نے مُسکرا کر فرمایا کہ شہ زادہ اپنے غلام کی حویلی کہہ کر مجھے لے آیا اور مجھ کو پُھسلایا۔ اُس نے اِلتماس کیا کہ شہزادے نے بیان واقعی کہا۔ جتنی خلق اللہ ہے بادشاہوں کے لونڈی غُلام ہیں (۵۴۰)۔ انھیں کی برکت اور فیض سے سب کی پرورش اور پناہ ہے (۵۴۱)۔ یہ غلام بے دام و درم، زرخریدہ (۵۴۲) تمھارا ہے لیکن بَھید چھپانا عقل کا مُقتضا ہے۔ اے شہزادے، تمھارا اور ملکہ کا اس غریب خانے میں توجہ فرمانا اور تشریف لانا میری سعادت دونوں جہاں کی ہے۔ اور آپ نے فِدوی کو سرفراز کیا (۵۴۳)، میں نِثار ہونے کو تیار ہوں۔ کسو صورت میں جان مال سے دریغ نہ کروں گا۔ آپ شوق سے آرام فرمایئے، اب کوڑی بھر خطرہ نہیں۔ یہ مُردار کُٹنی اگر سلامت جاتی تو آفت لاتی۔ اب جب تلک مزاج شریف چاہے (۵۴۴) بیٹھے رہیئے اور جو کچھ درکار ہو اِس خانہ زاد کو کہیئے سب حاضر کرے گا۔ اور پادشاہ تو کیا چیز ہے، تمھاری خبر فرشتے کو بھی نہ ہوگی۔ اُس جواں مرد نے ایسی ایسی باتیں تسلّی کی کہیں کہ ٹک خاطر جمع ہُوئی، تب میں نے کہا: ''شاباش تُم بڑے مَرد ہو۔ اِس مُروّت کا عِوض ہم سے بھی جب ہو سکے گا، تب ظہور میں آوے گا۔ تمھارا نام کیا ہے؟'' اُس نے کہا کہ غلام کا اِسم بہزاد خاں ہے۔ غرض چھ مہینے تک جتنی شرط خدمت کی تھی بہ جان و دل بجا لایا۔ خوب آرام سے گُزری۔

ایک دن مجھے اپنا ملک اور ماباپ یاد آئے، اِس لیئے نہایت مُتفکر بیٹھا تھا۔ میرا چہرا ملین دیکھ کر بہزاد خاں رُوبرُو ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہُوا اور کہنے لگا: ''اِس فِدوی سے اگر کچھ تقصیر چرن برداری میں واقع ہوئی ہو تو اِرشاد ہو۔'' میں نے کہا: ''از برائے خُدا یہ کیا مذکور ہے! تُم نے ایسا سلُوک کیا کہ اِس شہر میں ایسے آرام سے رہے، جیسے اپنی ما کے پیٹ میں کوئی رہتا ہے۔ نہیں تو یہ ایسی حرکت ہم سے ہُوئی تھی کہ تنکا تنکا ہمارا دشمن تھا۔ ایسا دوست ہمارا کون تھا کہ ذرا دَم لیتے۔ خدا تمھیں خوش رکھے، بڑے مَرد ہو''۔ تب اُس نے کہا: ''اگر یہاں سے دل برداشتہ ہُوا ہو تو

جہاں حکم ہو وہاں خیر و عافیت سے پہنچاؤں"۔ فقیر بولا کہ اگر اپنے وطن تک پہنچوں تو والدین کو دیکھوں۔ میری تو یہ صُورت ہوئی، خدا جانے اُن کی کیا حالت ہُوئی۔ جس واسطے جلاوطن ہوا تھا میری آرزو بر آئی۔ اب اُن کی بھی قدم بوسی واجب ہے۔ میری خبر اُن کو کچھ نہیں کہ مُوا، یا جیتا ہے، اُن کے دل پر کیا قلق گزرتا ہوگا! وہ جواں مرد بولا کہ بہت مُبارک ہے، چلیئے۔ یہ کہہ کر ایک راس گھوڑا تُرکی، سَو کوس چلنے والا اور ایک گھوڑی جَلد، جس کے پَر نہیں کٹے تھے، لیکن شایستہ، ملکہ کی خاطر لایا اور ہم دونوں کو سوار کروایا۔ پھر زرہ بکتر پہن، سلاح باندھ، اُو پچی بَن، اپنے مَرکب پر چڑھ بیٹھا اور کہنے لگا: "غُلام آگے ہو لیتا ہے۔ صاحب خاطر جمع سے گھوڑے دبائے چلے آویں۔"(۵۴۵) جب شہر کے دروازے پر آیا، ایک نعرہ مارا اور تیر سے قُفل کو توڑا، اور نگہبانوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر للکارا کہ بڑ چودو! اپنے خاوند کو جا کر کہو کہ بہزاد خاں، ملکہ مہر نگار اور شہزادۂ کامگار کو جو تمھارا داماد ہے، ہانکے پُکارے لیئے جاتا ہے، اگر مَردُمی کا کچھ نشہ ہے تو باہر نکلو اور ملکہ کو چھین لو۔ یہ نہ کہیو کہ چُپ چاپ لے گیا، نہیں تو قلعے میں بیٹھے آرام کیا کرو۔ یہ خبر بادشاہ کو جلد جا پہنچی۔ وزیر اور میر بخشی کو حکم ہُوا: "اُن تینوں بدذات مُفسدوں کو باندھ کر لاؤ یا اُن کے سر کاٹ کر حضور میں پہنچاؤ۔" ایک دَم کے بعد غَٹ فوج کا نمود ہُوا اور تمام زمین و آسمان گرد باد ہو گیا۔ بہزاد خاں نے ملکہ کو اور اِس فقیر کو ایک دَر میں پُل کے، کہ بارہ پلے اور جَون پور کے پُل کے برابر تھا، کھڑا کیا اور آپ گھوڑے کو ٹنکیا کر اُس فوج کی طرف پھرا اور شیر کی مانند گُونج کر، مرکب کو ڈپٹ کر فوج کے درمیان گھسا۔ تمام لشکر، کائی سا پھٹ گیا اور یہ دونوں سرداروں تلک جا پہنچا۔ دونوں کے سر کاٹ لیئے۔ جب سردار مارے گئے لشکر تتر بتر ہو گیا۔ وہ کہاوت ہے: سر سے سر واہ۔ جب بیل پھُوٹی، رائی رائی ہو گئی۔ ڈ ونہیں آپ بادشاہ کتنی فوج بکتر پوشوں کی، ساتھ لے کر کُمک کو آئے۔ اُن کی بھی لڑائی اُس یکّا جوان نے ماردی۔ شکستِ فاش کھائی۔ (۵۴۶)

بادشاہ پسپا ہُوئے۔ سچ ہے فتح دادِ الٰہی ہے، لیکن بہزاد خاں نے ایسی جواں مَردی کی کہ شاید رُستم سے بھی نہ ہو سکتی۔ (۵۴۷) جب بہزاد خاں نے دیکھا کہ مطلع صاف ہُوا، اب کون باقی رہا ہے جو ہمارا پیچھا کرے گا، بے وسواس ہو کر اور خاطر جمع (۵۴۸) سے جہاں ہم کھڑے تھے، آیا اور ملکہ کو اور مجھ کو ساتھ لے کر چلا۔ سفر کی عُمر کوتاہ ہوتی ہے۔ تھوڑے عرصے میں اپنے ملک کی سرحد میں جا پہنچے۔ (۵۴۹)

ایک عرضی، صحیح سلامت آنے کی بادشاہ کے حضور میں؛ جو قبلہ گاہ مُجھ فقیر کے تھے، لکھ کر روانہ کی۔ جہاں پناہ پڑھ کر شاد ہُوئے۔ دوگانہ شکر کا ادا کیا، جیسے سُوکھے دھان میں پانی پڑا۔ خُوش ہو کر سب امیروں کو جلو میں لے کر اِس عاجز کے استقبال کی خاطر لبِ دریا آ کر کھڑے ہوئے۔ اور نواڑوں کے واسطے میرِ بحر کو حُکم ہُوا۔ میں نے

دوسرے کنارے پر سواری پادشاہ کی کھڑی دیکھی، قدم بوسی کی آرزو میں گھوڑے کو دریا میں ڈال دیا۔ ہیلہ مار کر حضور میں حاضر ہُوا، مجھے مارے اِشتیاق کے کلیجے سے لگالیا۔ (۵۵۰) اب ایک اور آفت ناگہانی پیش آئی، (۵۵۱) جس گھوڑے پر میں سوار تھا شاید وہ بچہ اُسی مادیان کا تھا، جس پر ملکہ سوار تھی۔ یا جنسیت کے باعث میرے مرکب کو دیکھ کر گھوڑے نے بھی جلدی کر کر اپنے تئیں ملکہ سمیت میرے پیچھے دریا میں گرایا اور پیرنے لگی۔ ملکہ نے گھبرا کے باگ کھینچی، وہ منہہ کی نرم تھی اُلٹ گئی۔ ملکہ غوطے کھا کر بمعہ گھوڑی دریا میں ڈوب گئی کہ پھر اُن دونوں کا نشان نظر نہ آیا۔ بہزاد خاں نے یہ حالت دیکھ کر اپنے تئیں گھوڑے سمیت ملکہ کی مدد کی خاطر دریا میں پہنچایا۔ وہ بھی اُس بھنور میں آ گیا، پھر نکل نہ سکا۔ بُہتیرے ہاتھ پانوں مارے، کچھ بس نہ چلا، ڈُوب گیا۔ جہاں پناہ نے یہ واردات دیکھ کر مہا جال منگوا کر پھنکوایا، اور ملاّحوں اور غوطہ خوروں کو فرمایا۔ اُنھوں نے سارا دریا چھان مارا۔ تھاہ کی مٹّی لے لے آئے، پر وہ دونوں ہاتھ نہ آئے۔ یا فُقرا! یہ حادثہ ایسا ہُوا کہ میں سَودائی اور جنونی ہوگیا اور فقیر بن کر یہی کہتا پھرتا تھا: اِن نینوں کا یہی بسیکھ، وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ۔ اگر ملکہ کہیں غایب ہو جاتی یا مر جاتی تو دل کو تسلّی آتی۔ پھر تالاش کو نکلتا (۵۵۲) یا صبر کرتا، لیکن جب نظروں کے رُو برُو غرق ہوگئی تو کچھ بس نہ چلا۔ آخر جی میں یہی لہر آئی کہ دریا میں ڈُوب جاؤں، شاید اپنے محبوب کو مر کر پاؤں۔

ایک روز رات کو اُسی دریا میں بیٹھا، اور ڈُوبنے کا اِرادہ کر کر گلے تک پانی میں گیا۔ چاہتا ہوں کہ آگے پانوں رکھوں اور غوطہ کھاؤں۔ وہی سوار بُرقعا (۵۵۳) پوش جنھوں نے تُم کو بشارت دی ہے، آ پہنچے۔ میرا ہاتھ پکڑ لیا اور دِلاسا دیا کہ خاطر جمع رکھ، ملکہ اور بہزاد خاں جیتے ہیں۔ تُو اپنی جان ناحق کیوں کھوتا ہے، دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ خُدا کی درگاہ سے مایوس مت ہو۔ اگر جیتا رہے گا تو تیری ملاقات اُن دونوں سے ایک نہ ایک روز ہو رہے گی۔

اب تُو رَوم کی طرف جا، اور بھی دو درویش دلِ ریش وہاں گئے ہیں۔ اُن سے تُو جب ملے گا اپنی مُراد کو پہنچے گا۔ (۵۵۴) یا فُقرا! بہ مُوجب حُکم اپنے ہادی کے، میں بھی خدمت شریف میں آ کر حاضر ہُوا ہُوں۔ اُمیدِ قوی ہے کہ ہر ایک اپنے اپنے مطلب کو پہنچے۔ اِس فقیر گدا کا یہ احوال تھا جو تمام کمال کہہ سنایا۔

O

چوتھے دَرویش کی سَیر (۵۵۵)

چوتھا فقیر اپنی سَیر کی حقیقت رو رو کر اِس طرح دُہرانے لگا :

قصّہ ہماری بے سرو پائی کا اب سُنو
ٹک اپنا دھیان رکھ کر مرا حال سب سُنو
کِس واسطے میں آیا ہُوں یاں تک تباہ ہو(۵۵۶)
سارا بیان کرتا ہوں ، اِس کا سبب سُنو

یامُرشداللہ! ذرا مُتوجہ ہو۔ یہ فقیر اِس حالت میں گرفتار ہے، چین کے بادشاہ کا بیٹا ہے۔ ناز و نعمت سے پرورش پائی، اور بخوبی تربیتِ ہُوا۔ زمانے کے بَھلے بُرے سے کچھ واقف نہ تھا، جانتا تھا کہ یُونہیں ہمیشہ نبھے گی۔ عین بے فکری میں یہ حادثہ رُوبکار ہُوا کہ (۵۵۷) قبلہء عالم، جو والد اِس یتیم کے تھے، اُنھوں نے رِحلت فرمائی۔ جان کندنی کے وقت اپنے چھوٹے بھائی کو، جو میرے چچا ہیں، بُلایا اور فرمایا کہ ہم نے تو سب مال مالک چھوڑ کر اِرادہ کُوچ کا کیا(۵۵۸)۔ لیکن یہ وصیت میری تم بجالائیو، اور بزرگی کو کام فرمائیو۔ جب تلک شہزادہ، جو مالِک اِس تخت و چھتر کا ہے، جوان ہو اور شعور سنبھالے اور اپنا گھر دیکھے بھالے، تُم اِس کی نیابت کیجو اور سپاہ و رعیت کو خراب نہ ہونے دیجو۔ جب وہ بالغ ہو، اُس کو سب سمجھا بُجھا کر تخت حوالے کرنا۔ اور روشن اختر جو تمھاری بیٹی ہے، اُس سے شادی کر کے تم سلطنت سے کنارہ پکڑنا۔ اِس سلُوک (۵۵۹) سے پادشاہت ہمارے خاندان میں قائم رہے گی۔ کچھ خلل نہ آوے گا۔ یہ کہہ کر آپ تو جاں بحق تسلیم ہُوئے، چچا، پادشاہ ہُوا اور بندوبست ملک کا کرنے لگا۔ مُجھے حکم کیا کہ زنانے محل میں رہا کرے۔ جب تک جوان نہ ہو، باہر نہ نکلے (۵۶۰)۔ یہ فقیر چودہ برس کی عمر تلک بیگمات اور خواصوں میں پلا کیا اور کھیلا کُودا کیا۔ چچا کی بیٹی سے شادی کی خبر سُن کر شاد تھا اور اِس اُمید پر بےفکر رہتا اور دل میں کہتا کہ اب کوئی دن میں پادشاہت بھی ہاتھ لگے گی اور کتخدائی بھی ہوگی۔ دنیا بہ اُمید قائم ہے۔ ایک حَبشی مُبارک نام کہ والدِ مرحوم کی خدمت میں تربیت ہُوا تھا اور اُس کا بڑا اعتبار تھا اور صاحب شعور اور نمک حلالِ تھا۔ میر

اکثر اُس کے نزدیک جا بیٹھتا۔ وہ بھی مجھے بہت پیار کرتا اور میری جوانی دیکھ خوش ہوتا اور کہتا کہ الحمدللہ! اے شاہ زادے! اب تم جوان ہوئے، اِنشاء اللہ تعالیٰ عنقریب تمھارا عمو ظلِ سبحانی کی نصیحت پر عمل کرے گا۔ اپنی بیٹی اور تمھارے والد کا تخت تمھیں دے گا۔

ایک روز یہ اتفاق ہُوا کہ ایک اَدنیٰ سہیلی (۵۶۱) نے بے گناہ میرے تئیں ایسا طمانچہ کھینچ کر مارا کہ میرے گال پر پانچ (۵۶۲) اُنگلیوں کا نشان اُکھڑ آیا۔ میں روتا ہُوا مُبارک کے پاس گیا۔ اُن نے مجھے گلے سے لگا لیا اور آنسو آستین سے پونچھے اور کہا کہ چلو آج تمھیں پادشاہ پاس لے چلوں۔ شاید دیکھ کر مہربان ہو اور لایق سمجھ کر تمھارا حق تمھیں دے۔ اُسی وقت چچا کے حضور میں لے گیا۔ چچا نے دربار میں نہایت شفقت کی اور پُوچھا کہ کیوں دلگیر ہو اور آج یہاں کیوں کر آئے؟ مُبارک بولا: ''کچھ عرض کرنے آئے ہیں۔'' یہ سُن کر خود بخود کہنے لگا کہ اب میاں کا بیاہ کر دیتے ہیں۔ مُبارک نے کہا: ''بہت مُبارک ہے۔'' ڈنہیں نجومی اور رمالوں کو رُوبرو طلب کیا اور اُوپری دل سے پُوچھا کہ اِس سال کون سا مہینا اور کون سا دِن اور گھڑی مہورت مُبارک ہے کہ سرانجام شادی کا کروں؟ انھوں نے مرضی پا کر گن گنا کر عرض کی کہ قبلۂ عالم! یہ برس سارا نحس ہے۔ کسی چاند میں کوئی تاریخ سعد نہیں ٹھہرتی۔ اگر یہ سال تمام بخیر و عافیت کٹے تو آیندہ کارِ خیر کے لیئے بہتر ہے۔

پادشاہ نے مُبارک کی طرف دیکھا، اور کہا: ''شاہ زادے کو محل میں لے جا۔ خدا چاہے، اِس سال کے گزرنے سے اِس کی امانت اِس کے حوالے کر دوں گا۔ خاطر جمع رکھے اور پڑھے لکھے''۔ مبارک نے سلام کیا اور مجھے ساتھ لے محل میں پہنچا دیا (۵۶۳)۔ دو تین دن کے بعد میں مُبارک کے پاس گیا۔ مجھے دیکھتے ہی رونے لگا۔ میں حیران ہُوا اور پُوچھا کہ دادا! خیر تو ہے، تمھارے رونے کا کیا باعث ہے؟ تب وہ خیر خواہ، کہ مجھے دل و جان سے چاہتا تھا، بولا کہ میں اُس روز تمھیں اُس ظالم کے پاس لے گیا۔ کاش کے اگر یہ جانتا تو نہ لے جاتا۔ میں نے گھبرا کر کہا: ''میرے جانے میں کیا ایسی قباحت ہوئی؟ کہو تو سہی''۔ تب اُس نے کہا کہ سب امیر وزیر، ارکانِ دولت، چھوٹے بڑے، تمھارے باپ کے وقت کے تمھیں دیکھ کر خوش ہُوئے اور خُدا کا شکر ادا کرنے لگے، کہ اب ہمارا صاحبزادہ جوان ہُوا اور سلطنت کے لائق ہُوا؛ اب کوئی دن میں حق، حق دار کو ملے گا۔ تب ہماری قدر دانی کرے گا اور خانہ زاد موروثیوں کی قدر سمجھے گا۔ یہ خبر اُس بے ایمان کو پہنچی۔ اُس کی چھاتی پر سانپ لوٹنے لگا۔ (۵۶۴) مجھے خلوت میں بُلا کر کہا: ''اے مُبارک! اب ایسا کام کر کہ شہزادے کو کسو فریب سے مار ڈال اور اُس کا خطرہ میرے جی سے نکال، جو میری خاطر جمع ہو''۔ تب سے میں بے حواس ہو رہا ہُوں کہ تیرا چچا تیری جان کا دُشمن ہُوا''۔ جُونہیں

مُبارک سے یہ خبرِ نامُبارک میں نے سُنی، بغیر مارے مرگیا اور جان کے ڈر سے اُس کے پانوں پر گر پڑا کہ واسطے خُدا کے میں سلطنت سے گُزرا، کسو طرح میرا جی بچے۔ اُس غلامِ باوفا نے میرا سر اٹھا کر چھاتی سے لگالیا اور جواب دیا کہ کچھ خطرہ نہیں۔ ایک تدبیر مجھے سُوجھی ہے۔ اگر راست آئی تو کچھ پَروا نہیں۔ زندگی ہے تو سب کچھ ہے۔ اغلب ہے کہ اس فکر سے تیری جان بھی بچے اور اپنے مطلب سے کامیاب ہو (۵۶۵)۔ یہ بھروسا دے کر، مجھے ساتھ لے کر، اُس جگہ، جہاں پادشاہ مغفور یعنے والد اِس فقیر کے سوتے بیٹھتے تھے، گیا اور میری بہت خاطر جمع کی۔ وہاں ایک کرسی بچھی تھی۔ ایک طرف مجھے کہا اور ایک طرف آپ پکڑ کر صندلی کو سرکایا اور کرسی کے تلے کا فرش اٹھایا اور زمین کو کھودنے لگا۔ ایک بارگی ایک کھڑکی نمُود ہوئی کہ زنجیر اور قُفل اُس میں لگا ہے۔ مجھے بُلایا۔ میں نے اپنے دل میں (۵۶۶) مقرر یہ سمجھا کہ میرے ذبح کرنے اور گاڑ دینے کو یہ گڑھا اِس نے کھودا ہے۔ مَوت آنکھوں کے آگے پھر گئی۔ لاچار چپکے چپکے کلمہ پڑھتا ہُوا نزدیک گیا۔ دیکھتا ہُوں تو اُس دریچے کے اندر عمارت ہے اور چار مکان ہیں۔ ہر ایک دالان میں دس دس خُمیں سونے کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی لٹکتی ہیں اور ہر ایک گولی کے مُنہہ پر ایک سونے کی اینٹ اور ایک بندر جڑاؤ کا بنا ہُوا بیٹھا ہے۔ اُنتالیس گولیاں چاروں مکان میں گنیں اور ایک خُم کو دیکھا کہ مُونہا مُونہہ اشرفیاں بھری ہیں۔ اس پر نہ میمون (۵۶۷) ہے، نہ خشت ہے۔ اور ایک حوض جواہر سے لبالب بھرا ہُوا دیکھا۔ میں نے مُبارک سے پُوچھا کہ اے دادا! یہ کیا طلسم ہے اور یہ کِس کام کے ہیں؟ بولا کہ یہ بُوزنے جو دیکھتے ہو، اِن کا یہ ماجرا ہے کہ تمھارے باپ نے جوانی کے وقت سے ملک صادق، جو بادشاہ جنوں کا ہے، اُس کے ساتھ دوستی اور آمد و رفت پیدا کی تھی۔ (۵۶۸)

چنانچہ ہر سال میں ایک دفعہ کئی طرح کے تحُفے، (۵۶۹) خُوشبوئیں اور اِس ملک کی سوغاتیں لے جاتے، اور ایک مہینے کے قریب اُس کی خدمت میں رہتے۔ جب رُخصت ہوتے تو ملک صادق، ایک بندر زمُرد کا دیتا۔ ہمارا بادشاہ اُسے لا کر اِس تہہ خانے میں رکھتا۔ اِس بات سے سِوائے میرے کوئی دُوسرا مُطلع نہ تھا۔ ایک مرتبہ غُلام نے عرض کی کہ جہاں پناہ! لاکھوں روپے کے تحُفے لے جاتے ہیں اور وہاں سے ایک بُوزنہ پتھر کا، مُردہ آپ لے آتے ہیں۔ اِس کا آخر فایدہ کیا ہے؟ جواب میری اس بات کا مسکرا کر فرمایا: ''خبردار کہیں ظاہر نہ کیجو۔ خبر شرط ہے۔ یہ ایک ایک میمون بے جان جو تُو دیکھتا ہے، ہر ایک کے ہزار دیو زبردست، تابع اور فرماں بردار ہیں، لیکن جب تلک میرے پاس چالیسوں بندر پُورے جمع نہ ہوویں، تب تک یہ سب نکمّے ہیں۔ کچھ کام نہ آویں گے۔'' سو ایک بندر کی کمی تھی کہ اُسی برس پادشاہ نے وفات پائی۔

اِتنی محنت کچھ نیک نہ لگی، (۵۷۰) اُس کا فائدہ ظاہر نہ ہُوا۔ اے شاہ زادے، تیری یہ حالت بے کسی کی دیکھ کر مجھے یاد آیا اور یہ جی میں ٹھہرایا، کسو طرح تجھ کو ملک صادق کے پاس لے چلوں اور تیرے چچا کا ظلم بیان کروں۔ غالب ہے کہ وہ دوستی تمھارے باپ کی یاد کر کر ایک بُوزنہ جو باقی ہے، تجھے دے۔ تب اُن کی مدد سے تیرا ملک تیرے ہاتھ آدے اور چَین سے (۵۷۱) سلطنت تُو بہ خاطر جمع کرے۔ اور بالفعل اِس حرکت سے تیری جان بچتی ہے۔ اگر اور کچھ نہ ہُوا تو اِس ظالم کے ہاتھ سے سوائے اس تدبیر کے اور کوئی صُورت مخلصی کی نظر نہیں آتی۔ میں نے اُس کی زبانی یہ سب کیفیت سُن کر کہا کہ دادا جان! اب تُو میری جان کا مختار ہے، جو میرے حق میں بھلا ہو، سو کر۔ میری تسلی کر کے آپ عطر اور بخور اور جو کچھ وہاں کے لے جانے کی خاطر مُناسب جانا، خرید کرنے بازار میں گیا۔

دُوسرے دن میرے اُس کافر چچا کے پاس، جو بجائے ابُوجہل کے تھا، (۵۷۲) گیا اور کہا: ''جہاں پناہ ! شہزادے کے مار ڈالنے کی ایک صُورت میں نے دِل میں ٹھہرائی ہے۔ اگر حُکم ہو تو عرض کروں۔'' وہ کم بخت خوش ہو کر بولا: ''وہ کیا تدبیر ہے؟'' تب مُبارک نے کہا کہ اِس کے مار ڈالنے میں سب طرح آپ کی بدنامی ہے۔ مگر میں اِسے باہر جنگل میں لے جا کر ٹھکانے لگاؤں اور گاڑ داب کر چلا آؤں، ہرگز کوئی محرم نہ ہو گا کہ کیا ہُوا۔ یہ بندش، مُبارک سے سُن کر بولا کہ بہت مُبارک۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ سلامت نہ رہے۔ اِس کا دغدغہ میرے دل میں ہے۔ اگر مجھے اِس فکر سے تو چھُڑاوے گا تو اِس خدمت کے عِوض بہت کچھ پاوے گا۔ جہاں تیرا جی چاہے لے جا کر کھپادے، اور مجھے یہ خوشخبری لا دے۔

مُبارک نے بادشاہ کی طرف سے اپنی دِل جمعی کر کے مجھے ساتھ لیا اور وے تُحفے لے کر آدھی رات کو شہر سے کُوچ کیا اور اُتّر کی سمت چلا۔ ایک مہینے تلک مُبہم چلا کیا۔ ایک روز رات کو چلے جاتے تھے، جو مُبارک بولا کہ شُکر خدا کا اب منزلِ مقصود کو پہنچے۔ میں نے سُن کر کہا کہ دادا ! یہ تُو نے کیا کہا؟ کہنے لگا: ''اے شہزادے! تُو جنوں کا لشکر کیا نہیں دیکھتا''؟ (۵۷۳) میں نے کہا: ''مجھے تیرے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔'' مُبارک نے ایک سُرمہ دانی (۵۷۴) نکال کر سُلیمانی سُرمے کی سلائیاں میری دونوں آنکھوں میں پھیر دیں۔ وُونہیں جنوں کی خلقت اور لشکر کے تنبو قنات نظر آنے لگے، لیکن سب خوش رُو اور خوش لباس۔ مُبارک کو پہچان کر ہر ایک آشنائی کی راہ سے گلے ملتا اور مزاخیں کرتا۔

آخر جاتے جاتے پادشاہی سراچوں کے نزدیک گئے اور بارگاہ میں داخل ہُوئے۔ دیکھتا ہوں تو روشنی

قرینے سے روشن ہے اور صندلیاں طرح بہ طرح کی دورَویہ بچھی ہیں۔ اور عالم، فاضل، درویش اور امیر، وزیر، میر بخشی، دیوان اُن پر بیٹھے ہیں اور یساول، گُرز بردار، اَحدی، چیلے اور ہاتھ باندھے کھڑے ہیں (۵۷۵) اور درمیان میں ایک تخت مُرصّع کا بچھا ہے۔ اُس پر ملک صادِق، تاج اور چار قُب موتیوں کے پہنے ہُوئے مِسند پر تکیئے لگائے، بڑی شان شوکت سے بیٹھا ہے۔ میں نے نزدیک جا کر سلام کیا، مہربانگی سے بیٹھنے کا حکم کیا۔ پھر کھانے کا چرچا ہُوا۔ بعد فراغت کے، دسترخوان بڑھایا گیا۔ تب مُبارک کی طرف متوجہ ہوکر احوال میرا پُوچھا۔ مُبارک نے کہا کہ اب اِن کے باپ کی جگہہ پر چچا اِن کا پادشاہت کرتا ہے۔ اور اِن کا دشمنِ جانی ہوا ہے۔ اِس لیئے میں اِنھیں وہاں سے لے بھاگ کر آپ کی خدمت میں لایا ہوں کہ یتیم ہیں اور سلطنت اِن کا حق ہے، لیکن بغیر مُربّی کِسو سے کچھ نہیں ہوسکتا۔ حضور کی دستگیری کے باعث اِس مظلوم کی پرورش ہوتی ہے۔ اِن کے باپ کی خدمت کا حق یاد کریئے (۵۷۶) اِن کی مدد فرمایئے اور وہ چالیسواں بندر عنایت کیجیئے۔ جو چالیسوں پُورے ہوں اور یہ اپنے حق کو پہنچ کر تمھارے جان و مال کو دعا دیں۔ سِوائے صاحب کی پناہ کے، کوئی اِن کا ٹھکانا نظر نہیں آتا۔

یہ تمام کیفیت سُن کر صادِق (۵۷۷) نے تامّل کر کے کہا کہ واقعی حقوقِ خدمت اور دوستی بادشاہ مغفور کے ہمارے اُوپر بہت تھے اور یہ بے چارہ (۵۷۸) تباہ ہوکر اپنی سلطنتِ موروثی چھوڑ کر جان بچانے کے واسطے یہاں تلک آیا ہے اور ہمارے دامنِ دولت میں پناہ لی ہے۔ تامقدور کِسو طرح ہم سے کمی نہ ہوگی اور درگذر نہ کروں گا لیکن ایک کام ہمارا ہے۔ اگر وہ اِس سے ہوسکا اور خیانت نہ کی اور بخوبی انجام دیا اور اِس امتحان میں پُورا اُترا تو قول قرار کرتا ہوں کہ زیادہ پادشاہ سے سلوک کروں گا، اور جو یہ چاہے گا سو دُوں گا۔

میں نے ہاتھ باندھ کر التماس کیا کہ اِس فِدوی سے تابہ مقدُور جو خِدمت سرکار کی ہوسکے گی بہ سرو چشم بجالاوے گا اور اُس کو خُوبی و دیانت داری (۵۷۹) اور ہوشیاری سے کرے گا اور دونوں جہاں کی سعادت سمجھے گا۔ (۵۸۰) فرمایا: ''تُو ابھی لڑکا ہے۔ اِس واسطے باربار تاکید کرتا ہوں، مُبادا خیانت کرے اور آفت میں پڑے''۔ میں نے کہا: ''خدا پادشاہ کے اِقبال سے آسان کرے گا اور میں حتی المقدُور کوشش کروں گا اور امانت حضور تلک (۵۸۱) لے آوں گا۔'' یہ سُن کر ملک صادِق نے مجھ کو قریب بُلایا اور ایک کاغذ بغل سے نکال کر میرے تیئں دکھلایا اور کہا: ''یہ جس شخص کی شبیہہ ہے، اُسے جہاں سے جانے (۵۸۲)، تلاش کر کے میری خاطر پیدا کر کے لا۔ اور جس گھڑی تُو اُس کا نام و نشان پاوے اور سامنے جاوے، میری طرف سے بہت اشتیاق ظاہر کیجو۔ اگر یہ خدمت تجھ سے سرانجام ہوئی، (۵۸۳) جتنی توقع تجھے منظور ہے، اُس سے زیادہ غور پرداخت کی جائے گی۔ وَاِلّا نہ جیسا کرے گا،

ویسا پاوے گا۔‘‘

میں نے اُس کاغذ کو جو دیکھا، ایک تصویر نظر پڑی کہ غش سا آنے لگا۔ بزور مارے ڈر کے اپنے تیئں سنبھالا اور کہا: ’’بہت خُوب۔ میں رُخصت ہوتا ہُوں۔ اگر خُدا کو میرا بھلا کرنا ہے تو بُو جب حکمِ حضور کے مُجھ سے عمل میں آوے گا‘‘۔ یہ کہہ کر مُبارک کو ہمراہ لے کر جنگل کی راہ لی۔ گانو گانو بستی بستی، شہر شہر، ملک ملک پھرنے لگا اور ہر ایک سے اُس کا نام ونشان تحقیق کرنے۔ کِسو نے نہ کہا کہ ہاں میں جانتا ہوں، یا کسی سے مذکور سُنا ہے۔ سات برس تک اُسی عالم میں حیرانی و پریشانی سہتا ہُوا ایک نگر میں وارِد ہُوا۔ عمارتِ عالی اور آباد، لیکن وہاں کا ہر ایک مُتنفس اسمِ اعظم پڑھتا تھا اور خُدا کی عبادت بندگی کرتا تھا۔

ایک اندھا ہندوستانی فقیر بھیک مانگتا نظر آیا، لیکن کِسو نے ایک کوڑی یا نوالہ نہ دیا۔ مجھے تعجب آیا اور اس کے اُوپر رحم کھایا۔ جیب میں سے ایک اشرفی نکال کر اُس کے ہاتھ دی۔ وہ لے کر بولا کہ اے داتا! خُدا تیرا بھلا کرے، تُو شاید مسافر ہے، اس شہر کا باشندہ نہیں۔ میں نے کہا: ’’فی الواقع سات برس سے میں تباہ ہُوا ہُوں۔ جس کام کو نکلا ہوں اُس کا سراغ نہیں ملتا۔ آج اِس بَلدے میں آپہنچا ہوں‘‘۔ وہ بُوڑھا دعائیں دے کر چلا، اُس کے پیچھے لگ لیا (۵۸۴)۔ باہر شہر کے ایک مکان عالیشان نظر آیا۔ وہ اُس کے اندر گیا، میں بھی چلا۔ دیکھا تو جا بجا عمارت گر پڑی ہے اور بے مَرمّت ہو رہی ہے۔

میں نے دل میں کہا کہ یہ محل لائق پادشاہوں کے ہے، جس وقت تیاری اِس کی ہوگی، کیا ہی مکان دلچسپ بنا ہوگا! اور اب تو ویرانی سے کیا صُورت بن رہی ہے! پر معلوم نہیں کہ اُجاڑ کیوں پڑا ہے، اور یہ نابینا اِس محل میں کیوں بستا ہے؟ وہ کور، لاٹھی ٹیکتا ہُوا چلا جاتا تھا کہ ایک آواز آئی، جیسے کوئی کہتا ہے کہ اے باپ! خَیر تو ہے۔ آج سویرے کیوں پھرے آتے ہو؟ پِیر مرد نے سُن کر جواب دیا کہ بیٹی، خدا نے ایک جوان مسافر کو میرے احوال پر مہربان کیا۔ (۵۸۵)

اُس نے ایک مُہر مجھ کو دی۔ بہت دنوں سے پیٹ بھر کر اچھا کھانا نہ کھایا تھا، سو گوشت، مصالحہ، گھی، تیل، آٹا، لُون مول لیا اور تیری خاطر کپڑا جو ضرور تھا، خرید کیا۔ اب اِس کو قطع کر، اور سی کر پہن۔ اور کھانا پکا تو کھا پی کے اُس سخی کے حق میں دُعا دیں۔ اگر چہ مطلب اُس کے دل کا معلوم نہیں، پر خُدا دانا بینا ہے۔ ہم بے کسوں کی دُعا قبول کرے۔‘‘ (۵۸۶) میں نے یہ احوال اُس کی فاقہ کشی کا جو سُنا، بے اختیار جی میں آیا کہ بیس اشرفیاں اور اُس کو دوں، لیکن آواز کی طرف دھیان جو گیا تو ایک عورت دیکھی کہ ٹھیک وہ تصویر اُسی معشوق کی تھی۔ تصویر کو نکال کر

مُقابل کیا، سرِ مُو تفاوت نہ دیکھا۔ایک نعرہ دِل سے نِکلا اور بے ہوش ہُوا۔مُبارک میرے تئیں بغل میں لے کر بیٹھا اور پنکھا کرنے لگا۔مجھ میں ذرا سا ہوش آیا۔اُسی کی طرف تاک رہا تھا جو مُبارک نے پُوچھا کہ تم کو کیا ہو گیا؟ ابھی مُنھہ سے جواب نہیں نِکلا تھا(۵۸۷) وہ نازنین بولی کہ اے جوان! خدا سے ڈر، بگانے سَتَر پر نگاہ مت کر۔حیا اور شرم سب کو ضرور ہے۔اِس لیاقت سے گفتگو کی کہ میں اُس کی صُورت اور سیرت پر محو ہو گیا۔مُبارک میری خاطر داری بہت سی کرنے لگا، لیکن دِل کی حالت کی اُس کو کیا خبر تھی؟ لاچار ہو کر میں نے(۵۸۸) پُکارا کہ اے خدا کے بندو اور اس مکان کے رہنے والو! میں غریب مسافر ہُوں۔اگر اپنے پاس مجھے بُلاؤ اور رہنے کو جگہہ دو تو بڑی بات ہے۔اُس اندھے نے نزدیک بُلایا اور آواز پہچان کر گلے لگایا اور جہاں وہ گُل بدن بیٹھی تھی، اُس مکان میں لے گیا، وہ ایک کونے میں چُھپ گئی۔اُس بُوڑھے نے مجھ سے پُوچھا کہ اپنا ماجرا کہہ کہ کیوں گھر بار چھوڑ کر اکیلا پڑا پھرتا ہے، اور تُجھے کِس کی تلاش ہے؟ میں نے ملک صادِق کا نام نہ لیا اور وہاں کا کچھ ذکر مذکور نہ کیا۔اِس طور سے کہا کہ یہ بے کس شہزادہ چین و ماچین کا ہے۔چنانچہ میرے ولی نعمت ہنوز پادشاہ ہیں۔ایک سوداگر سے لاکھوں روپے دے کر یہ تصویر مَول لی تھی، اِس کے دیکھنے سے سب ہوش آرام جاتا رہا اور فقیر کا بھیس کر کر تمام دُنیا چھان ماری۔ اب یہاں میرا مطلب ملا ہے، سو تمھارا اختیار ہے۔

یہ سُن کر اندھے نے ایک آہ ماری اور بولا: ''اے عزیز! میری لڑکی بڑی مُصیبت میں گرفتار ہے۔کِسو بشر کی مجال نہیں کہ اِس سے نکاح کرے اور پھل پاوے''۔میں نے کہا: ''اُمیدوار ہوں کہ مُفصّل بیان کرو''۔تب اُس مردِ عجمی نے اپنا ماجرا اِس طور سے ظاہر کیا کہ سُن اے بادشاہ زادے! میں رئیس اور اکابر اس کم بخت شہر کا ہُوں۔ میرے بزرگ نام آور اور عالی خاندان تھے۔حق تعالیٰ نے یہ بیٹی مجھے عنایت کی۔جب بالغ ہوئی تو اِس کی خُوب صُورتی اور نزاکت اور سلیقے کا شور ہُوا اور سارے ملک میں مشہور ہوا کہ فُلانے کے گھر میں ایسی لڑکی ہے کہ اُس کے حُسن کے مُقابل حُور پری شرمندہ ہے۔انسان کا تو کیا مُنھہ ہے کہ برابری کرے؟ یہ تعریف اِس شہر کے شہزادے نے سُنی۔غائبانہ بغیر دیکھے بھالے عاشق ہُوا، کھانا پینا چھوڑ دیا۔اٹھوائی کٹھوائی(۵۸۹) لے کر پڑا۔

آخر پادشاہ کو یہ بات معلوم ہوئی۔میرے تئیں رات کو خلوت میں بُلایا اور یہ مذکور درمیان میں لایا۔ اور مجھے باتوں میں پُھسلایا؛ حتیٰ کہ نسبت ناتا کرنے میں راضی کیا۔میں بھی سمجھا کہ جب بیٹی گھر میں پیدا ہوئی تو کِسو نہ کِسو سے بیاہی چاہیئے۔(۵۹۰) پس اِس سے کیا بہتر ہے کہ بادشاہ زادے سے منسُوب کر دوں؛ اِس میں بادشاہ بھی مِنت وار ہوتا ہے، میں قبول کر کے رخصت ہُوا۔اُسی دن سے دونو(۵۹۱) طرف تیاری بیاہ کی ہونے لگی۔

ایک روز اچھی ساعت میں قاضی، مُفتی، عالم، فاضل، اکابر سب جمع ہوئے؛ نکاح باندھا گیا اور مہر مُعیّن ہُوا۔ دُلہن کو بڑی دُھوم (۵۹۲) سے لے گئے۔ سب رسم رسومات کر کے فارغ ہُوئے۔ نوشہ نے رات کو جب قصد جماع کا کیا، اُس مکان میں ایک شور غُل ایسا ہُوا کہ جو باہر لوگ چوکی میں تھے، حیران ہُوئے۔ دروازہ کوٹھری کا کھول کر چاہا، دیکھیں کہ یہ کیا آفت ہے۔ اندر سے ایسا بند تھا کہ کواڑ کھول نہ سکے۔ ایک دَم میں وہ رونے کی آواز بھی کم ہوئی۔ پٹ کی چُول اُکھاڑ کر دیکھا تو دُولھا سر کٹا ہُوا پڑا تڑپھتا ہے اور دلہن کے مُنہہ سے کف چلا جاتا ہے اور اُسی مٹی لہو میں لتھڑی ہوئی بے حواس پڑی لوٹتی ہے۔

یہ قیامت دیکھ کر سب کے ہوش جاتے رہے۔ ایسی خوشی میں یہ غم ظاہر ہُوا۔ پادشاہ کو خبر پہنچی، سر پیٹتا ہوا دوڑا۔ تمام ارکان سلطنت کے جمع ہوئے پر کسو کی عقل کام نہیں کرتی کہ اس احوال کو دریافت کرے۔ نہایت کو پادشاہ نے اُس قلق کی حالت میں حُکم کیا کہ اِس کم بخت بُھنڈ پیری (۵۹۳) دلہن کا بھی سر کاٹ ڈالو۔ یہ بات پادشاہ کی زبان سے جُونہیں نکلی، پھر ویسا ہی ہنگامہ برپا ہُوا۔ پادشاہ ڈرا اور اپنی جان کے خطرے سے نکل بھاگا اور فرمایا کہ اِسے محل سے باہر نکال دو۔ خواصوں نے اِس لڑکی کو میرے گھر میں پہنچا دیا۔ یہ چرچا دنیا میں مشہور ہُوا۔ جن نے سُنا حیران ہُوا اور شہزادے کے مارے جانے کے سبب سے خود پادشاہ اور جتنے باشندے اِس شہر کے ہیں، میرے دشمن جانی ہُوئے۔

جب ماتم داری سے فراغت ہُوئی اور چہلم ہو چُکا۔ پادشاہ نے ارکانِ دولت سے صلاح پوچھی کہ اب کیا کیا چاہیئے؟ سبھوں نے کہا کہ اور تو کچھ ہو نہیں سکتا پر ظاہر میں دل کی تسلی اور صبر کے واسطے اُس لڑکی کو اُس کے باپ سمیت مروا ڈالیئے اور گھر بار ضبط کر لیجیئے۔ جب میری یہ سزا مقرر کی، کوتوال کو حُکم ہُوا؛ اُس نے آ کر چاروں طرف سے میری حویلی کو گھر لیا اور نرسنگا دروازے پر بجایا اور چاہا کہ اندر گُھسیں اور پادشاہ کا حکم بجا لاویں۔ غیب سے اینٹ پتھر ایسے برسنے لگے کہ تمام فوج تاب نہ لا سکی۔ اپنا سر مُنہہ بچا کر جیدھر تدھر بھاگی۔ اور ایک آوازِ مُہیب پادشاہ نے محل میں اپنے کانوں سُنی کہ کیوں کم بختی آئی ہے؛ کیا شیطان لگا ہے؟ بھلا چاہتا ہے تو اِس نازنین کے احوال کا مُتعرض نہ ہو، نہیں تو جو کچھ تیرے بیٹے نے اُس سے شادی کر کر دیکھا، تُو بھی اُس کی دشمنی سے دیکھے گا۔ اب اگر اِن کو ستاوے گا تو مزا پاوے گا۔

پادشاہ کو مارے دہشت کے تَپ چڑھی۔ وُونہیں حکم کیا کہ اِن بدبختوں سے کوئی مزاحم نہ ہو۔ کچھ کہو نہ سُنو، حویلی میں پڑا رہنے دو۔ زور ظُلم اِن پر نہ کرو۔ اُس دن سے عامل، باؤ بتاس جان کر دُعا، تعویذ اور سیانے، جنتر

منتر کرتے ہیں اور سب باشندے اِس شہر کے، اسمِ اعظم اور قرآنِ مجید پڑھتے ہیں۔ مدّت سے یہ تماشا ہو رہا ہے لیکن اب تک کچھ اسرار معلوم نہیں (۵۹۴) اور مجھے بھی ہرگز اطلاع نہیں، مگر اِس لڑکی سے ایک بار پُوچھا کہ تم نے اپنی آنکھوں سے کیا دیکھا تھا؟ یہ بولی کہ اور تو کچھ میں نہیں جانتی، لیکن یہ نظر آیا کہ جس وقت میرے خاوند نے قصد مُباشرت کا کیا، چھت پھٹ کر ایک تخت مرصّع کا نکلا۔ اُس پر ایک جوان خُوبصورت، شاہانہ لباس پہنے بیٹھا تھا اور ساتھ بہت سے آدمی اہتمام کرتے ہُوئے اُس مکان میں آئے، اور شہزادے کے قتل کے مُستعد ہُوئے۔ وہ شخص، سردار میرے نزدیک آیا، بولا: "کیوں جانی! اب ہم سے کہاں بھاگو گی؟" اُن کی صُورتیں آدمی کی سی تھیں لیکن پأنوں بکریوں کے سے نظر آئے۔ میرا کلیجا دھڑکنے لگا اور خوف سے غش میں آ گئی۔ پھر مجھے کچھ سُدھ نہیں کہ آخر کیا ہُوا۔

تب سے میرا یہ احوال ہے کہ اِس ٹُوٹے مکان (۵۹۵) میں ہم دونوں پڑے رہتے ہیں۔ پادشاہ کے غُصّے کے باعث اپنے رفیق سب جُدا ہو گئے اور میں گدائی کرنے جو نکلتا ہوں تو کوئی کوڑی نہیں دیتا، بلکہ دوکان (۵۹۶) پر کھڑے رہنے کے روادار نہیں۔ اِس کم بخت لڑکی کے بدن پر لتّا نہیں کہ سر چُھپاوے (۵۹۷) اور کھانے کو مُیسّر نہیں جو پیٹ بھر کھاوے۔ خُدا سے یہ چاہتا ہُوں کہ موت ہماری آوے یا زمین پھاٹے اور یہ ناشُدنی سماوے۔ اِس جینے سے مرنا بھلا ہے۔ خدا نے شاید ہمارے ہی واسطے تجھے بھیجا ہے جو تُو نے رحم کھا کر ایک مُہر دی، کھانا مزے دار (۵۹۸) پکا کر کھایا اور بیٹی کی خاطر کپڑا بھی بنایا۔ خُدا کی درگاہ میں شُکر کیا اور تُجھے دُعا دی۔ اگر اِس پر آسیب جن یا پری کا نہ ہوتا، تیری خدمت میں لونڈی کی جگہ دیتا اور اپنی سعادت جانتا۔ یہ احوال اِس عاجز کا ہے۔ تُو اِس کے در پے مَت ہو اور اِس قصد سے درگذر۔

یہ سب ماجرا سُن کر میں نے بہت مِنت وزاری کی کہ مجھے اپنی فرزندی میں قبول کر۔ جو میری قسمت بَدھا ہوگا، سو ہوگا (۵۹۹)۔ وہ پیر مرد ہرگز راضی نہ ہُوا۔ شام جب ہوئی، اُس سے رخصت ہو کر سرا میں آیا۔ مُبارک نے کہا: "لو شہزادے! مُبارک ہو، خدا نے اسباب تو درست کیا ہے۔ بارے یہ محنت اکارت نہ گئی۔" میں نے کہا: "آج کتنی خوشامد کی، پر وہ اللہ ماریا بے ایمان راضی نہیں ہوتا۔ خدا جانے دیوے گا یا نہیں"۔ پر میرے دل کی یہ حالت تھی کہ رات کاٹنی مشکل ہُوئی کہ کب صبح ہو تو پھر جا کر حاضر ہُوں۔ کبھو یہ خیال آتا، اگر وہ مہربان ہو اور قبول کرے تو مُبارک، ملک صادق کی خاطر لے جاوے گا۔ پھر کہتا، بھلا ہاتھ تو آوے، مُبارک کو منا وَنا کر میں عیش کروں گا۔ پھر جی میں یہ خطرہ آتا کہ اگر مُبارک بھی قبول کرے تو جنوں کے ہاتھ سے وہی نوبت میری ہو گی جو پادشاہ زادے کی ہوئی اور اِس شہر کا پادشاہ کب چاہے گا کہ اُس کا بیٹا مارا جائے اور دُوسرا خوشی منائے۔ (۶۰۰) تمام

رات نیند اُچاٹ ہوگئی اور اِسی منصوبے کے اُلجھیڑے میں کٹی۔ جب روز روشن ہُوا، میں چلا۔ چوک میں سے اچھے اچھے پوشاکی اور گوٹا کناری اور (٦٠١) میوہ خشک وتر خرید کر کے اُس بزرگ کی حالت میں حاضر ہُوا۔ نہایت خوش ہو کر بولا کہ سب کو اپنی جان سے زیادہ کچھ عزیز نہیں؛ پر اگر میری جان بھی تیرے کام آوے تو دریغ نہ کروں اور اپنی بیٹی ابھی تیرے حوالے کروں۔ لیکن یہی خوف آتا ہے کہ اِس حرکت سے تیری جان کو خطرہ نہ ہو کہ یہ داغ لعنت کا میرے اُوپر تا قیامت رہے۔ میں نے کہا: ''اب اِس بستی میں بے کس واقع ہوں اور تم میرے دین دُنیا کے باپ ہو۔ میں اس آرزو میں مُدّت سے کیا کیا تباہی اور پریشانی کھینچتا ہُوا اور کیسے کیسے صدمے اُٹھاتا ہُوا یہاں تک آیا، اور مطلب کا بھی سُراغ پایا۔ خُدا نے تمھیں بھی مہربان کیا جو بیاہ دینے پر رضامند ہوئے۔ لیکن میرے واسطے آگا پیچھا کرتے ہو۔ ذرا مُنصف ہو کر غور فرماؤ تو عشق کی تلوار سے (٦٠٢) سر بچانا اور اپنی جان کو چُھپانا، کس مذہب میں درست ہے؟ ہر چہ بادا باد۔ میں سب طرح اپنے تئیں برباد دیا ہے۔ معشوق کے وِصال کو میں زندگی سمجھتا ہوں۔ اپنے مرنے جینے کی کچھ پروا نہیں، بلکہ اگر نا اُمید ہُوں گا تو بن اَجل مر جاؤں گا اور تمھارا قیامت میں دامن گیر ہُوں گا''۔

غرض اِس گُفت وشُنید اور ہاں نانہہ میں قریب ایک مہینے کے خوف ورِجا میں گُزرا۔ ہر روز اُس بزرگ کی خدمت میں دوڑا جاتا اور خوشامد برآمد کیا کرتا۔ اِتفاقاً وہ بوڑھا، کاہلا ہُوا۔ میں اُس کی بیمارداری میں حاضر رہا۔ ہمیشہ قارورہ حکیم پاس لے جاتا۔ جو نسخہ لکھ دیتا اُسی ترکیب سے بنا کر پلاتا اور شُولا اور غِذا اپنے ہاتھ سے پکا کر کوئی (٦٠٣) نِوالا کھلاتا۔ ایک دن مہربان ہو کر کہنے لگا: ''اے جوان! تُو بڑا ضِدی ہے۔ میں نے ہر چند ساری قباحتیں کہہ سُنائیں اور منع کرتا ہوں کہ اِس کام سے باز آ۔ جی ہے تو جہان ہے، پر خواہ مخواہ کُوئے میں گرا چاہتا ہے۔ اچھا، اپنی لڑکی سے تیرا مذکور کروں گا، (٦٠٤) دیکھوں وہ کیا کہتی ہے؟'' یا فُقرا اللہ! یہ خُوش خبری سُن کر میں ایسا پھُولا کہ کپڑوں میں نہ سمایا۔ آداب بجالایا اور کہا: (٦٠٥) ''اب آپ نے میرے جینے کی فکر کی''۔ رُخصت ہو کر مکان پر آیا اور تمام شب، مُبارک سے یہی ذکر مذکور رہا۔ کہاں کی نیند اور کہاں کی بھُوکھ؟ صُبح کو تُور کے وقت پھر جا کر موجود ہُوا۔ سلام کیا۔ فرمانے لگا کہ لو اپنی بیٹی ہم نے تُم کو دی۔ خُدا مبارک کرے۔ تم دونوں کو خدا کے حِفظ وامان میں سونپا (٦٠٦)۔ جب تلک میرے دم میں دم ہے، میری آنکھوں کے سامنے رہو۔ جب میری آنکھ مُند جائے گی، جو تمھارے جی میں آوے گا سو کیجو، مُختار ہو۔'' (٦٠٧) کتنے دن پیچھے وہ مردِ بزرگ جاں بحق تسلیم ہُوا۔ رو پیٹ کر تجہیز و تکفین کیا۔ بعد تیجے کے، اُس نازنین کو مُبارک، ڈولے (٦٠٨) کر کر کارواں سرا میں لے آیا اور مجھ سے کہا کہ یہ

امانت ملک صادِق کی ہے۔ خبردار خیانت نہ کیجو اور یہ محنت مشقت برباد نہ دیجو۔ میں نے کہا: ''اے کاکا! ملک صادِق یہاں کہاں ہے، دل نہیں مانتا، میں کیوں کر صبر کروں؟ جو کچھ ہو سو ہو، جیوں یا مَروں، اب تو عیش کروں''۔ (۶۰۹)مُبارک نے دِق ہو کر ڈانٹا کہ لڑکپن نہ کرو۔ ابھی ایک دَم میں کُچھ کا کُچھ ہو جاتا ہے۔ ملک صادِق کو دُور جانتے ہو، جو اُس کا فرمانا نہیں مانتے ہو؟ اُس نے چلتے وقت پہلے ہی اُونچ نیچ سب سمجھا دی ہے۔ اگر اس کے کہنے پر رہو گے اور صحیح سلامت اس کو وہاں تک لے چلو گے تو وہ بھی بادشاہ ہے۔ شاید تمھاری محنت پر توجہ کر کے تُمھیں کو بخش دے، تو کیا اچھی بات ہووے۔ پیت کی پیت رہے اور میت کا میت ہاتھ لگے۔ (۶۱۰)اُس کے ڈرانے اور سمجھانے سے میں حیران ہو کر چُپکا ہو رہا۔ (۶۱۱)دو سانڈ نیاں خرید کیں اور کجاووں پر سوار ہو کر ملک صادِق کے مُلک کی راہ لی۔ چلتے چلتے ایک میدان میں آواز شَور غُل (۶۱۲)کی آنے لگی۔ مُبارک نے کہا: ''شُکر خُدا، ہماری محنت نیگ لگی۔ (۶۱۳)یہ لشکر جِنوں کا آ پہنچا''۔ بارے مُبارک نے اُن سے مِل جُل کر پُوچھا کہ کہاں کا ارادہ کیا ہے؟ وہ بولے کہ بادشاہ نے تمھارے استقبال کے واسطے ہمیں تعینات کیا ہے۔ اب تمھارے فرماں بردار ہیں۔ اگر کہو تو ایک دم میں رُوبرُو لے چلیں۔ مُبارک نے کہا: ''دیکھو کِس کِس محنتوں (۶۱۴)سے خُدا نے بادشاہ کے حضور میں ہمیں سرخ رُو کیا، اب جلدی کیا ضرور ہے؟ اگر خدانخواستہ کچھ خلل ہو جاوے تو ہماری محنت اکارت ہو، اور جہاں پناہ کی غضبی میں پڑیں۔ سبھوں نے کہا کہ اس کے تُم مختار ہو۔ جس طرح جی چاہے چلو۔ اگرچہ سب طرح کا آرام تھا، پر رات دن چلنے سے کام تھا۔ جب نزدیک جا پہنچا، (۶۱۵)مَیں مُبارک کو سوتا دیکھ کر اُس نازنین کے قدموں پر سر رکھ کر اپنے دل کی بے قراری اور ملک صادق کے سبب سے لاچاری نہایت مِنت وزاری سے کہنے لگا کہ جس روز سے تمھاری تصویر دیکھی ہے، خواب و خورش اور آرام میں نے اپنے اُوپر حرام کیا ہے۔ اب جو خُدا نے یہ دن دکھایا تو محض بے گانہ ہو رہا ہوں۔ فرمانے لگی کہ میرا بھی دل تمھاری طرف مائل ہے کہ تم نے میری خاطر کیا کیا ہرج مرج اُٹھایا اور کِس کِس مُشقتوں سے لے آئے ہو۔ خُدا کو یاد کرو اور مجھے بھول نہ جائیو۔ دیکھو تو پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ یہ کہہ کر ایسی بے اختیار داڑھ مار کر روئی کہ ہچکی لگ گئی۔ اِیدھر میرا یہ حال، اُدھر اُس کا وہ احوال۔ اِس میں مُبارک کی نیند ٹوٹ گئی۔ وہ ہم دونوں مُشتاقوں کا رونا دیکھ کر رونے لگا اور بولا کہ خاطر جمع رکھو۔ ایک روغن میرے پاس ہے۔ اِس گُل بدن کے بدن میں مل دُوں گا۔ اُس کی بُو سے ملک صادق کا جی ہٹ جائے گا۔ غالب ہے کہ تمھیں کو بخش دے۔

مُبارک سے یہ تدبیر سُن کر دل کو ڈھارس ہو گئی۔ اُس کے گلے سے لگ کر لاڑ کیا اور کہا: ''اے دادا، اب

تُو میرے باپ کی جگہ ہے۔ تیرے باعث میری جان بچی۔ اب بھی ایسا کام کر جس میں میری زندگانی ہو۔ نہیں تو اِس غم میں مرجاؤں گا''۔ اُس نے ڈھیری تسلی دی۔ جب روزِ روشن ہُوا، آوازِ جِنّوں کی معلوم ہونے لگی۔ دیکھا تو کئی خواص، ملک صادِق کے آئے ہیں اور دُوسرے پادبھاری (۶۱۶) ہمارے لیئے لائے ہیں۔ اور ایک چوں ڈول (۶۱۷) موتیوں کی توڑ پڑی ہوئی اُن کے ساتھ ہے۔ مُبارک نے اُس نازنین کو وہ تیل مل دیا اور پوشاک پہنا، بناؤ کروا کر ملک صادِق کے پاس لے چلا۔ پادشاہ نے دیکھ کر مجھے بہت سرفراز کیا اور عزت، وحُرمت سے بٹھایا اور فرمانے لگا کہ تُجھ سے میں ایسا سلوک کروں گا کہ کِسو نے آج تک کِسو سے نہ کیا ہوگا۔ پادشاہت تو تیرے باپ کی موجود ہے، علاوہ اب تُو میرے بیٹے کی جگہہ ہُوا (۶۱۸)۔ یہ توجہ کی باتیں کر رہا تھا، اتنے میں وہ نازنین بھی رُوبرُو آئی۔ اُس روغن کی بُو سے یک بہ یک دماغ پراگندہ ہُوا اور حال بے حال ہوگیا۔ تاب اُس باس کی نہ لاسکا۔ اُٹھ کر باہر چلا گیا اور ہم دونوں کو بُلوایا۔ اور مبارک کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ کیوں جی! خُوب شرط بجالائے۔

میں نے خبردار کردیا تھا کہ اگر خیانت کروگے تو خفگی میں پڑوگے۔ یہ بُو کیسی ہے۔ اب دیکھو تمھارا کیا حال کرتا ہوں۔ بہت چِڑ بِڑ ہُوا۔ مُبارک نے مارے ڈر کے اپنا ازاربند کھول کر دکھادیا کہ پادشاہ سلامت! جب حضور کے حکم سے اس کام کے ہم متعین ہوئے تھے۔ غلام نے پہلے ہی اپنی علامت کاٹ کر ڈبیا میں بند کر کے سربہ مُہر سرکار کے خزانچی کے سپرد کردی تھی اور مرہمِ سُلیمانی لگا کر روانہ ہُوا تھا۔ مُبارک سے یہ جواب سُن کر تب میری طرف آنکھیں نِکال کے گُھورا اور کہنے لگا: ''تو یہ تیرا کام ہے!'' اور تیش میں آکر مُنہہ سے بُرا بھلا بکنے لگا۔ اُس وقت اُس کے بَت کہاؤ سے یُوں معلوم ہوتا تھا کہ شاید جان سے مجھے مروا ڈالے گا۔ جب میں نے اُس کے بُشرے سے یہ دریافت کیا، اپنے جی سے ہاتھ دھو کر اور جان کھو کر سرِ غلاف مُبارک کی کمر سے کھینچ کر ملک صادِق کی توند میں ماری۔ چُھری کے لگتے ہی نُہڑا اور جُھونما۔ میں نے حیران ہو کر جانا کہ مُقرر مرگیا۔ پھر اپنے دل میں خیال کیا کہ زخم تو ایسا کاری نہیں لگا، یہ کیا سبب ہُوا؟ میں کھڑا دیکھتا تھا کہ وہ زمین پر لوٹ لاٹ، گیند کی صُورت بن کر آسمان کی طرف اُڑ چلا۔ ایسا بُلند ہُوا کہ آخر نظروں سے غایب ہوگیا۔ پھر ایک پَل کے بعد بجلی کی طرح کڑکتا اور غصّے میں کچھ بے معنی بَکتا ہُوا نیچے آیا اور مجھے ایک لات ماری کہ میں تیورا کر چاروں شانے چت گر پڑا، اور جی ڈُوب گیا۔ خُدا جانے کتنی دیر میں ہوش میں آیا۔ آنکھیں کھول کر جو دیکھا تو ایک ایسے جنگل میں پڑا ہُوں کہ جہاں سوائے کیکڑ اور ٹیلیٹی اور جھڑبیری کے درختوں کے کچھ اور نظر نہیں آتا۔ اب اُس گھڑی عقل کچھ کام نہیں کرتی کہ کیا کروں اور کہاں جاؤں! نااُمیدی سے ایک آہ بھر کر ایک طرف کی راہ لی۔ اگر کہیں کوئی آدمی کی صورت نظر پڑتی تو

ملک صادق کا نام پُوچھتا۔ وہ دیوانہ جان کر جواب دیتا کہ ہم نے تو اُس کا نام بھی نہیں سُنا۔

ایک روز پہاڑ پر جا کر میں نے بھی اِرادہ کیا کہ اپنے تئیں گرا کر ضائع کروں۔ جُوں مُستعد گرنے کا ہُوا، وہی سوار، صاحبِ ذُوالفقار، بُرقع پوش آ پہنچا اور بولا کہ کیوں جان (۶۱۹) کھوتا ہے؟ آدمی پر دُکھ درد سب ہوتا ہے۔ اب تیرے بُرے دن گئے اور بھلے دن آئے۔ جلد رُوم کو جا۔ تین شخص ایسے ہی آگے گئے ہیں۔ اُن سے ملاقات کر اور وہاں کے سُلطان سے مِل۔ تم پانچوں کا مطلب ایک ہی جگہہ ملے گا۔

اِس فقیر کی سَیر کا یہ ماجرا ہے، جو عرض کیا۔ بارے بشارت سے اپنے مَولا مُشکل کُشا کی، مُرشدوں کی حضوری میں آ پہنچا ہُوں اور پادشاہ ظلِ اللہ کی بھی ملازمت حاصل ہوئی۔ چاہیئے کہ اب سب کی خاطر جمع ہو۔"

یے باتیں چار درویش اور پادشاہ آزاد بخت میں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں ایک مَحلی، پادشاہ کے محل میں سے دَوڑا ہُوا آیا اور مُبارک باد کی تسلیمیں پادشاہ کے حضُور بجالایا اور عرض کی کہ اِس وقت شاہزادہ پیدا ہُوا کہ آفتاب و مہتاب اُس کے حُسن کے رُوبرُو شرمندہ ہیں۔ بادشاہ نے مُتعجب ہو کر پُوچھا کہ ظاہر میں تو کِسو کو حمل نہ تھا۔ یہ آفتاب کِس برجِ حمل سے نمُوْد ہُوا؟ (۶۲۰) اُس نے اِلتماس کیا کہ ماہ رُو خواص جو بہت دنوں سے غضبِ پادشاہی میں پڑی تھیں، بے کسوں کی مانند ایک کونے رہتی تھی اور مارے ڈر کے اس کے نزدیک کوئی نہ جاتا، نہ احوال پُوچھتا تھا، اُس پر یہ فضلِ الٰہی ہُوا کہ چاند سا بیٹا اُس کے پیٹ سے پیدا ہُوا۔

پادشاہ کو ایسی خوشی حاصل ہُوئی کہ شاید شادیِ مرگ ہو جائے۔ چاروں فقیر نے بھی دعا دی کہ بھلا بابا! تیرا گھر آباد رہے اور اُس کا قدم مُبارک ہو۔ تیرے سائے کے تلے بُوڑھا، بڑا ہو۔ پادشاہ نے کہا: "یے تُمھارے قدم کی برکت ہے۔ وإلّا نہ، اپنے تو سان گُمان میں بھی یہ بات نہ تھی (۶۲۱)۔ اجازت ہو تو جا کر دیکھوں۔" درویشوں نے کہا: "بسم اللہ سِدھاریئے۔" پادشاہ محل میں تشریف لے گئے۔ شہزادے کو گود میں لیا اور شکر پروردگار کی جناب میں کیا۔ کلیجا ٹھنڈا ہُوا۔ ڈُنہیں چھاتی سے لگائے ہوئے لا کر فقیروں کے قدموں پر ڈالا۔ درویشوں نے دعائیں پڑھ کر جھاڑ پھونک دیا۔ پادشاہ نے جشن کی تیاری کی۔ دوہری نوبتیں جھڑنے لگیں (۶۲۲)۔ خزانے کا مُنھ کھول دیا۔ داد و دہش سے ایک کوڑی کے مُحتاج کو لکھ پتی کر دیا۔ ارکانِ دولت جتنے تھے، سب کو دو چند جاگیر و منصب کے فرمان ہو گئے۔ جتنا لشکر تھا، اُنھیں پانچ برس کے طلب انعام ہوئی۔ مشائخ اور اکابر کو مددِ مُعاش اور آلتمغا عنایت ہُوا۔ بے نواؤں کے مِیحے اور ٹکو، گداؤں کے کَھپلے اشرفی اور روپیوں کی کھچڑی سے بھر دیئے، اور تین برس کا خزانہ رعیّت کو مُعاف کیا کہ جو کچھ بوویں، جو تیں دونوں حصّے اپنے گھروں میں اُٹھا لے جائیں۔ تمام شہر میں

ہزاری بزاری کے گھروں میں جہاں دیکھو وہاں تھئی تھئی ناچ ہو رہا ہے۔ مارے خوشی کے ہر ایک اُدنا اعلا پادشاہِ وقت بن بیٹھا (۲۲۳)۔ عین شادی میں ایک بارگی اندروں محل سے رَونے پیٹنے کا غُل اُٹھا۔ خواصین اور تُرکنیاں اور اُردا بیگنیاں اور محلی، خوجے سر میں خاک ڈالے ہوئے باہر نکل آئے اور پادشاہ سے کہا کہ جس وقت شہزادے کو نہلا دُھلا کر دائی کی گود میں دیا، ایک ابر کا ٹکڑا آیا اور دائی کو گھیر لیا۔ بعد ایک دَم کے دیکھیں تو اُنگا بے ہوش پڑی ہے اور شہزادہ غایب ہوگیا۔ یہ کیا قیامت ٹوٹی! بادشاہ یہ تعجبات سُن کر حیران ہو رہا اور تمام ملک میں واویلا پڑی۔ دو دن تلک کسو کے گھر میں ہانڈی نہ چڑھی۔ شہزادے کا غم کھاتے اور لہوا پنا پیتے تھے۔ (۲۲۴)

غرض زندگانی سے لاچار تھے، جو اِس طرح جیتے تھے (۲۲۵)۔ جب تیسرا دن ہُوا، وہی بادل پھر آیا اور ایک پنگھوڑا، جڑاؤ موتیوں کی توڑ پڑی ہوئی لایا۔ اُسے محل میں رکھ کر آپ ہَوا ہُوا۔ لوگوں نے شہزادے کو اُس میں انگوٹھا چُوستے ہُوئے پایا۔ پادشاہ بیگم نے جلدی بلائیں لے کر ہاتھوں میں اُٹھا کر چھاتی سے لگا لیا۔ دیکھا تو، گُرتا آبِ رواں کا، موتیوں کا دردامن ٹکا ہُوا گلے میں ہے اور اُس پے شلُوکا تمامی کا پہنایا ہے۔ اور ہاتھ پانو میں کھڑوے مُرصّع کے، اور گلے میں ہیکل نورتن کی پڑی ہے (۲۲۶) اور جھنجھنا، چُسنی، چٹّے بٹّے جڑاؤ دھرے ہیں۔ سب مارے خوشی کے واری پھیری ہونے لگیں اور دعائیں دینے لگیں کہ تیری ما کا پیٹ ٹھنڈا رہے اور تُو بُوڑھا آڑھا ہو۔

پادشاہ نے ایک بڑا محل، نیا تعمیر کروا کر اور فرش بچھوا، اُس میں درویشوں کو رکھا۔ جب سلطنت کے کام سے فراغت ہوتی، تب آ بیٹھتے اور سب طرح سے خِدمت اور خبر گیری کرتے۔ لیکن ہر چاند کی نوچندی جُمیرات کو وہی پارۂ اَبر آتا اور شہزادے کو لے جاتا۔ بعد دو دن کے تُحفہ، کھلونے اور سوغاتیں ہر ایک ملک کی اور ہر ایک قسم کی شہزادے کے ساتھ لے آتا۔ جن کے دیکھنے سے عقل انسان کی حیران ہو جاتی۔ اِسی قاعدے سے پادشاہ زادے نے خیریت سے ساتویں برس میں پانو دیا۔ عین سالگرہ کے روز پادشاہ آزاد بخت نے فقیروں سے کہا کہ سائیں اللہ! کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ شہزادے کو کون لے جاتا ہے اور پھر دے جاتا ہے، بڑا تعجب ہے۔ دیکھیئے انجام اِس کا کیا ہوتا ہے؟ درویشوں نے کہا: ''ایک کام کرو۔ ایک شُقہ شوقیہ اِس مضمون کا لکھ کر شہزادے کے گہوارے میں رکھ دو کہ تمھاری مہربانگی اور محبت دیکھ کر اپنا بھی دل، مُشتاق ملاقات کا ہُوا ہے۔ اگر دوستی کی راہ سے اپنے احوال کی اطلاع دیجیئے تو خاطر جمع ہو اور حیرانی بالکل دفع ہو۔'' پادشاہ نے مُوافق صلاح درویشوں کے، افشانی کاغذ پر ایک رُقعہ اِسی عبارت کا ترقیم کیا اور مہدِ زریں میں رکھ دیا۔

شہزادہ بموجب قاعدۂ قدیم کے غایب ہُوا۔ جب شام ہُوئی، آزاد بخت درویشوں کے بستروں پر آ کر بیٹھے اور کلمہ کلام ہونے لگا۔ ایک کاغذ لپٹا ہُوا پادشاہ کے پاس آ پڑا۔ کھول کر پڑھا تو جواب اُسی رُقعے کا تھا۔ یہی دو سطریں لکھی تھیں کہ ہمیں بھی اپنا مشتاق جانیئے۔ سواری کے لیئے تخت جاتا ہے، اُس وقت اگر تشریف لایئے تو بہتر ہے، باہم مُلاقات ہو۔ سب اسباب عیش وطرَب کا مُہیا ہے۔ صاحب ہی کی جگہہ خالی ہے۔

پادشاہ آزاد بخت، درویشوں کو ہمراہ لے کر تخت پر بیٹھے۔ وہ تخت حضرتِ سُلیمان کے تخت کی مانند (۶۲۸) ہوا پر چلا۔ رفتہ رفتہ ایسے مکان پر جا اُترے کہ عمارت عالیشان اور تیاری کا سامان نظر آتا ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہاں کوئی ہے یا نہیں۔ اِتنے میں کِسو نے ایک ایک سلائی سلیمانی سُرمے کی اُن پانچوں کی آنکھوں میں پھیر دی۔ دو دو بوندیں آنسو کی ٹپک پڑیں۔ پریوں کا اکھاڑا دیکھا کہ اِستقبال کی خاطر، گلاب پاشیں لیئے ہوئے اور رنگ برنگ کے جوڑے پہنے ہُوئے کھڑا ہے۔ آزاد بخت آگے چلے تو دو رویہ ہزاروں پری زاد مؤدب کھڑے ہیں اور صدر میں ایک تخت زمرد کا دَھرا ہے۔ اُس پر ملک شہبال شاہرُخ کا بیٹا تکیئے لگائے بڑے تُزک سے بیٹھا ہے اور ایک پری زاد لڑکی رُوبرَو بیٹھی شہزادۂ بختیار کے ساتھ کھیل رہی ہے اور دونوں بغل میں کُرسیاں اور صندلیاں قرینے سے بچھی ہیں۔ اُن پر عمدہ پری زاد بیٹھے ہیں۔ ملک شہبال، بادشاہ کو دیکھتے ہی سَروقد اُٹھ اور تخت سے اُتر کر بغل گیر ہُوا اور ہاتھ میں ہاتھ پکڑے، اپنے برابر تخت پر لاکر بٹھایا اور بڑے تپاک اور گرم جوشی سے باہم گفتگو ہونے لگی۔ تمام روز ہنسی خوشی کھانے اور میوے اور خوشبوؤں کی ضیافت رہی اور راگ رنگ سُنا کیئے (۶۲۸)۔

دوسرے دن جب پھر دونوں پادشاہ جمع ہوئے۔ شہبال نے پادشاہ سے درویشوں کے ساتھ لانے کی کیفیت پُوچھی۔

پادشاہ نے چاروں بے نواؤں کا ماجرا جو سُنا تھا، مُفصّل بیان کیا اور سِفارش کی اور مدد چاہی کہ اِنھوں نے اتنی محنت اور مصیبت کھینچی ہے۔ اب صاحب کی توجہ سے اگر اپنے اپنے مقصد کو پہنچیں تو ثوابِ عظیم ہے۔ اور یہ مُخلص بھی تمام عمر شُکر گزار رہے گا۔ آپ کی نظرِ توجہ سے اِن سب کا بیڑا پار ہوتا ہے۔ ملک شہبال نے سُن کر کہا: ''بہ سروچشم۔ میں تمھارے فرمانے سے قاصر نہیں۔'' یہ کہہ کر نگاہِ گرم سے دَیووں اور پَریوں کی طرف دیکھا اور بڑے بڑے جن، جو جہاں سردار تھے، اُن کو نامے لکھے کہ اِس فرمان کے دیکھتے ہی (۶۲۹) اپنے تیئں حضورِ پُرنُور میں حاضر کرو۔ اگر کسی کے آنے میں توقف ہوگا تو اپنی سزا پاوے گا اور پکڑا ہُوا آوے گا۔ اور آدم زاد، خواہ عورت خواہ مرد، جس کے پاس ہو اُسے اپنے ساتھ لیئے آوے۔ اگر کوئی پوشیدہ کر رکھے گا اور ثانی الحال ظاہر ہوگا۔ تو اُس کا زن و بچہ، کولھو میں پیڑا جائے گا اور اُس کا نام و نشان (۶۳۰) باقی نہ رہے گا۔''

یہ حکم نامے لے کر دیو چاروں طرف متعیّن ہُوئے۔ یہاں دونوں بادشاہوں میں صُحبت گرم ہوئی اور باتیں اِختلاط کی ہونے لگیں۔ اِس میں ملک شہبال درویشوں سے مُخاطب ہوکر بولا کہ اپنے تئیں بھی بڑی آرزو لڑکے ہونے کی تھی اور دل میں یہ عہد کیا تھا کہ اگر خُدا، بیٹا دے یا بیٹی تو اُس کی شادی بنی آدم کے پادشاہ کے یہاں جولڑکا پیدا ہوگا اُس سے کروں گا۔ اِس نیت کرنے کے بعد معلوم ہُوا کہ پادشاہ بیگم پیٹ سے ہیں۔ بارے دن اور گھڑیاں اور مہینے گنتے گنتے پُورے دن ہُوئے اور یہ لڑکی پیدا ہُوئی۔ مُوافق وعدے کے تلاش کرنے کے واسطے، عالمِ جنّیات کو میں نے حُکم کیا چاردانگ دنیا میں جُستجو کرو۔ جس پادشاہ یا شہنشاہ کے یہاں فرزند پیدا ہُوا ہو، اُس کو بہ جنس احتیاط سے جلد اٹھا کر لے آؤ۔ وونہیں بموجب فرمان کے، پری زاد چاروں سمت پراگندہ ہُوئے۔ بعد دیر کے، اِس شہزادے کو میرے پاس لے آئے۔ (۶۳۱)

میں نے شُکر خدا کا کیا اور اپنی گود میں لے لیا۔ اپنی بیٹی سے زیادہ اِس کی محبت میرے دل میں پیدا ہُوئی۔ جی نہیں چاہتا کہ ایک دَم نظروں سے جُدا کروں۔ لیکن اِس خاطر بھیج دیتا ہوں کہ اگر اس کے ماباپ نہ دیکھیں گے، (۶۳۲) اُن کا کیا احوال ہوگا۔ لہٰذا ہر مہینے مَیں ایک بار منگا لیتا ہوں۔ کئی دن اپنے نزدیک رکھ کر پھر بھیج دیتا ہوں۔ انشاءاللہ تعالی، اب ہماری تمھاری ملاقات ہوئی، (۶۳۳) اِس کی کتخُدائی کر دیتا ہوں۔ مَوت حیات سب کو لگی پڑی ہے۔ بھلا جیتے جی اِن کا سہرا دیکھ لیں۔"

پادشاہ آزاد بخت یے باتیں ملک شہبال کی سُن کر، اور اُس کی خُوبیاں دیکھ کر نہایت محظوظ ہوئے اور بولے: "پہلے ہم کو شہزادے کے غایب ہو جانے اور پھر آنے سے عجب عجب طرح کے خطرے دل میں آتے تھے، لیکن اب صاحب کی گفتگو سے تسلی ہوئی۔ یہ بیٹا اب تمھارا ہے۔ جس میں تمھاری خوشی ہو سو کیجیے۔" غرض دونوں پادشاہوں کو صُحبت مانندِ شکر و شیر (۶۳۴) کے رہتی اور عیش کرتے۔ دس پانچ دن کے عرصے میں بڑے بڑے پادشاہ گُلستانِ اِرم کے اور کوہستان کے، اور جزیروں کے، جن کی طلب کی خاطر لوگ تعینات ہُوئے تھے، سب آ کر حضور میں حاضر ہوئے۔ پہلے ملک صادق سے فرمایا کہ تیرے پاس جو آدم زاد ہے، حاضر کر۔ اُس نے نپٹ غم و غصہ (۶۳۵) کھا کر لاچار اس گُلعذار کو حاضر کیا اور ولایت عمان کے پادشاہ سے شہزادی جن کی، جس کے واسطے شہزادہ، ملک نیمروز کا گاؤ سوار ہوکر سودائی بنا تھا، مانگی (۶۳۶)۔ اُس نے بھی بہت سی عذر معذرت کر کے حاضر کی۔ جب پادشاہِ فرنگ کی بیٹی اور بہزاد خاں کو طلب کیا، سب منکر پاک ہُوئے اور حضرت سُلیمان کی قسم کھانے لگے۔ آخر دریائے قُلزم کے پادشاہ سے جب پُوچھنے کی نوبت آئی تو وہ سر نیچا کر کے چُپ ہو رہا۔ ملک شہبال نے اُس کی

خاطر کی اور قسم دی اور اُمیدوار سرفرازی کا کیا اور کچھ ڈھونس دھڑ کا بھی دیا۔ تب وہ بھی ہاتھ جوڑ کر عرض کرنے لگا کہ پادشاہ سلامت! حقیقت یہ ہے کہ جب پادشاہ اپنے بیٹے کے اِستقبال کی خاطر دریا پر آیا اور شہزادے نے مارے جلدی کے، گھوڑا دریا میں ڈالا۔ اتفاقاً میں اُس روز سَیر وشکار کی خاطر نکلا تھا۔ اُس جگہہ میرا گزر ہُوا۔ سَواری کھڑی کر کے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ اُس میں شہزادی کو بھی گھوڑی دریا میں لے گئی۔ میری نگاہ جو اُس پر پڑی، دل بے اختیار ہُوا۔ پَری زادوں کو حکم کیا کہ شہزادی کو بمعہ گھوڑی لے آوَ۔ اُس کے پیچھے بہزاد خاں نے گھوڑا پھینکا۔ جب وہ بھی غوطے کھانے لگا، اُس کی دِلاوری اور مردانگی پسند آئی۔ اُس کو بھی ہاتھوں ہاتھ پکڑ لیا۔ اُن دونوں کو لے کر میں نے سواری پھیری۔ سو یے دونوں صحیح سلامت میرے پاس موجود ہیں۔

یہ احوال کہہ کر دونوں کو رُوبرُو بُلایا اور سُلطانِ شام کی شہزادی کی تلاش بہت کی۔ اور سبھوں سے سختی و مُلایمت سے اِستفسار کیا۔ لیکن کِسو نے حامی نہ بھری اور نہ نام ونشان بتایا۔ تب ملک شہبال نے فرمایا کہ کوئی پادشاہ یا سردار غیر حاضر بھی ہے یا سب آ چکے؟ جِنّوں نے عرض کی کہ جہاں پناہ! سب حضور میں آئے ہیں مگر ایک، مُسلسل جادو، جس نے کوہ قاف کے پردے میں ایک قلعہ جادو کے عِلم سے بنایا ہے، وہ اپنے غرور سے نہیں آیا ہے اور ہم غُلاموں کو طاقت نہیں جو بزور اس کو پکڑ لاویں۔ وہ بڑا قلب مکان ہے اور وہ خود بھی بڑا شیطان ہے۔

یہ سُن کر ملک شہبال کو طیش آیا اور لڑا کی فوج جِنّوں اور عِفریتوں اور پری زادوں کی تعینات کی اور فرمایا: ''اگر راستی میں اُس شہزادی کو ساتھ لے کر حاضر ہو، فبہا۔ وِالّا نہ اُس کو زیروزَبر کر کے مُشکیں باندھ کر اور آ وَاور اُس کے گڑھ اور مُلک کو نیست نابُود کر کے گدھے کا ہل پھروا دو۔'' وُونہیں حُکم ہَوتے ہی ایسی کتنی فوج روانہ ہوئی کہ ایک آدھ دن کے عرصے میں ویسے جوش خروش والے سَرکَش کو حلقہ بگوش کر کے پکڑ لائے اور حضور میں دست بستہ کھڑا کیا۔ ملک شہبال نے ہرچند سرزنش کر کر پوچھا لیکن اُس مغرور نے سِوائے نانہہ کے، ہاں نہ کی۔ نہایت کو غصّے ہو کر فرمایا کہ اِس مَردُود کے بند بند جُدا کرو اور کھال کھینچ کر بُھس بھَرو۔ اور پَری زاد کے لشکر کو تعیّن کیا کہ کوہ قاف میں جا کر ڈھونڈ ھ ڈھانڈھ کر پیدا کرو۔ وہ لشکرِ متعینہ شہزادی کو بھی تلاش کر کے لے آیا اور حضور میں پہنچایا۔ اُن سب اَسیروں نے اور چاروں فقیروں نے، ملک شہبال کا حُکم اور اِنصاف دیکھ کر دعائیں دیں اور شاد ہُوئے۔ پادشاہِ آزاد بخت بھی بہت خُوش ہُوا۔ تب ملک شہبال نے فرمایا کہ مَردوں کو دیوان خاص میں، اور عورتوں کو پادشاہی محل میں داخل کرو۔ اور شہر میں آئینہ بندی کا حُکم کرو اور شادی کی تیاری جلدی ہو۔ گویا حُکم کی دیر تھی۔

ایک روز نیک ساعت اور مُبارک مہُورت دیکھ کر شہزادۂ بختیار کا عقد اپنی بیٹی روشن اختر سے باندھا۔ اور

خواجہ زادہ یمن کو دمشق کی شہزادی سے بیاہا اور مُلکِ فارس کے شہزادے کا نِکاح بصرے کی شہزادی سے کر دیا۔ اور عجم کے پادشاہزادے کو فرنگ کی ملکہ سے مَنسُوب کیا۔ اور نیمروز کے پادشاہ کی بیٹی کو بہزاد خاں کو دیا۔ اور شہزادۂ نیمروز کو جن کی شہزادی حوالے کی۔ اور چین کے شہزادے کو اُس پیرمَردِ عَجمی کی بیٹی سے، جو ملک صادِق کے قبضے میں تھی، کتخُدا کیا (۶۳۷)۔ ہر ایک نامُراد بدولت مَلِک شہبال کے اپنے اپنے مقصد اور مُراد کو پُہنچا۔ بعد اِس کے چالیس دن تلک جشن فرمایا اور عیش وعشرت میں رات دن مشغول رہے۔

آخر مَلِک شہبال نے ہر ایک پادشاہزادے کو تُحفے اور سَوغاتیں اور مال اسباب دے دے کر، اپنے اپنے وطن کو رُخصت کیا۔ وہ سب (۶۳۸) بخوشی و خاطر جمعی روانہ ہُوئے اور خیر عافیت سے پُہنچے اور پادشاہت کرنے لگے۔ مگر ایک بہزاد خاں اور خواجہ زادہ یمن کا، اپنی خوشی سے پادشاہ آزاد بخت کی رِفاقت میں رہے۔ آخر یمن کے خواجہ زادے کو خانساماں اور بہزاد خاں کو میر بخشی شہزادہ صاحبِ اقبال یعنے بختیار کی فوج کا کیا۔ جب تلک جیتے رہے، عیش کرتے رہے۔ الٰہی! جس طرح یہ چاروں درویش اور پانچواں پادشاہ آزاد بخت اپنی مُراد کو پہنچے، اِسی طرح ہر ایک نامُراد کا مقصدِ دِلی اپنے کرم اور فضل سے بَرلا، بہ طُفَیلِ پنجتن پاک، دوازدہ اِمام، چہاردہ معصوم علیہم الصَّلوٰۃ وَالسَّلام (۶۳۹)۔ آمین یا اِلٰہ العالمین۔

O

خاتمۂ کتاب میں (۶۴۰)

جب یہ کتاب فضلِ الٰہی سے اِختتام کو پہنچی، جی میں آیا کہ اِس کا نام بھی ایسا رکھوں کہ اِسی میں تاریخ نکلے۔ جب حِساب کیا تو بارہ سو پندرہ ہجری کے آخر سال میں کہنا شروع کیا تھا۔ باعث عدم فُرصت کے بارہ سَو سترہ سنہ کی ابتدا میں انجام ہُوئی۔ اِس فِکر میں تھا کہ دِل نے کہا کہ "باغ و بہار" اچھا نام ہے کہ ہم نام وہم تاریخ اِس میں نکلتی ہے۔ تب میں نے یہی نام رکھا۔ جو کوئی اِس کو پڑھے گا، گویا باغ کی سیر کرے گا، بلکہ باغ کو آفت خزاں کی بھی ہے اور اِس کو نہیں۔ یہ ہمیشہ سرسبز رہے گا۔

مُرتب ہُوا جب یہ باغ و بہار
تھے سنہ بارہ سو سترہ در شُمار
کرو سَیر اَب اِس کی تُم رات دن
کہ ہے نام و تاریخ باغ و بہار
خزاں کا نہیں اِس میں آسیب کُچھ
ہمیشہ تر و تازہ ہے یہ بہار
مرے خونِ دِل سے یہ سیراب ہے
اور لختِ جگر کے ہیں سب برگ و بار
مجھے بُھول جاویں گے سب بعدِ مرگ
رہے گا مگر یہ سُخن یاد گار
اِسے جو پڑھے، یاد مُجھ کو کرے
یہی قاریوں سے مرا ہے قرار
خطا گر کہیں ہو تو رکھیو مُعاف
کہ پُھولوں میں پوشیدہ رہتا ہے خار

ہے انساں مرکّب ز سہو و خطا
یہ چوکے گا ہر چند ہو ہوشیار
میں اس کے سوا چاہتا کچھ نہیں
یہی ہے دُعا میری اے کردگار
تری یاد میں ، میں رہوں دم بدم
کٹے اس طرح میرا لَیل و نہار
نہ پُرسش کی سختی ہو مُجھ پر کبھو
نہ شب گور کی اور نہ روزِ شُمار
تُو کونین میں لُطف پر لُطف رکھ
خُدایا بحقِ رسُولِ کبار

O

حواشی : بابت مُقابلہ متون

دیباچہ از میر اَمّن:

۱۔ ہمارے مآخذی نُسخہ فیض اللہ، مطبوعہ کلکتہ: ۱۸۴۳ء میں کمپوزنگ کی غلطی سے ''گورا'' کی بجائے ''گورہ'' کمپوز ہوگیا ہے۔ یہاں ہم نے ڈنکن فاربس کی پیروی کی ہے۔

۲۔ ''باغ و بہار'' اشاعتِ اوّل : ۱۸۰۴ء، ہندی مینول : ۱۸۰۲ء، ڈنکن فاربس (۱۸۴۹ء)، عبدالحق (۱۹۴۴ء)، ممتاز حسین (۱۹۵۸ء)، ممتاز منگلوری (۱۹۶۶ء)، ابوالخیر کشفی (۱۹۶۴ء) اور رشید حسن خاں (۱۹۹۲ء) کے فراہم کردہ متون میں یہ مصرع یوں درج ہے:

''حمد اُس کی گر لکھا چاہوں تو کیا اِمکان ہے۔''

۳۔ دیگر تمام نُسخوں بشمول طباعت اوّل: ۱۸۰۴ء میں یہ مصرع یُوں درج ہے: ''پر ہر ایک واحد کی صُورت دیدۂ حیران ہے۔'' جس سے مصرع خارج از وزن ہوگیا۔ رشید حسن خاں نے اِس خرابی کو دُور کرنے کے لیے ''ایک'' کی بجائے از خود ''اِک'' کر دیا۔

۴۔ ہمارے مآخذی نُسخے میں ''رازق'' کی بجائے ''رزاق'' کمپوز ہوگیا، جس سے مصرع بے وزن ہو جاتا ہے۔ یہاں ہم نے اشاعت اوّل اور ڈنکن فاربس کی پیَروی کی ہے۔

۵۔ ڈنکن فاربس کے نُسخے میں ''جسمِ پاک مصطفےٰ'' تا ''مقبول طبعِ خاص و عام'' چار اشعار نہیں ملتے۔

۶۔ ہمارے مآخذی نُسخے میں کمپوزنگ کی غلطی سے ''درگاہ اُن کا'' درج ہوگیا ہے۔ یہاں ہم نے فاربس کی پیروی کی ہے۔

۷۔ ڈنکن فاربس تا رشید حسن خاں سب نے، سکتہ (COMMA) اور وقفہ (SEMICOLON) کے لیے ۱۸ویں صدی کی قدیم ٹریڈل مشین کے اِشارے (پھول کا نشان) سے قوسین (BRACKETS)

مُراد لی ہے اور متن میں مَوقع بے مَوقع، جُملہ مُعترضہ کے لیے قوسین بنا دیے ہیں۔ اِس مقام پر: ''جب تلک گنگا جمنا بہے'' کو بھی نے قوسین میں درج کیا ہے، جس سے میر اَمّن کا نثری آہنگ بُری طرح مجروح ہوتا ہے۔ ایسے مقامات پر سکتہ، وقفہ اور خط سے بھی کام لیا جا سکتا تھا۔

۸۔ فاربس، مونیئر ولیمز اور رشید حسن خاں کے ہاں ''ٹھیٹھ'' درج ہے۔

۹۔ ڈنکن فاربس، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں کے ہاں ''عنایات'' مِلتا ہے۔

۱۰۔ رشید حسن خاں نے یہاں ڈنکن فاربس کی پیروی میں ''یہ نوبت پُہنچی کہ ظاہر ہے'' درج کیا ہے۔

۱۱۔ رشید حسن خاں نے اِس عبارت: ''جس کا ناخُدا بادشاہ تھا''، کو قوسین میں درج کیا ہے۔

۱۲۔ فاربس تا رشید حسن خاں تمام نُسخوں میں ''ٹکڑا'' درج کیا گیا ہے۔ جب کہ ہمارے مآخذ میں ''ٹکرا'' ملتا ہے۔ متن میں آگے چل کر ''ٹکر'' (پنجابی بہ معنی روٹی کا ٹکڑا) مِلتا ہے۔ اِس لیے ''ٹکر'' سے ''ٹکرا'' ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱۳۔ فاربس، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں کے ہاں ''ہندووں'' درج کیا گیا ہے۔ جب کہ میر اَمّن نے ''ہندوؤں'' لکھتے ہوئے ہمزہ کے ساتھ ایک واو دی ہے۔

۱۴۔ ممتاز حسین کے ہاں ''قدیم سے وہاں رہتے تھے'' درج ہے۔

۱۵۔ اِس عبارت: ''جن کے گھرانے میں اب تلک نام نہاد سلطنت کا چلا جاتا ہے'' کو رشید حسن خاں نے قوسین میں درج کیا ہے۔

۱۶۔ ممتاز حسین کے ہاں ''اِستادکر'' کی جگہ ''اِستادہ کر'' درج ہے، جس کا محل نہیں۔

۱۷۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں کے ہاں ''تلک'' درج ہے۔

شُروع قصّے کا:

۱۸۔ اِس عبارت: ''جس کو استنبول کہتے ہیں'' کو رشید حسن خاں نے قوسین میں درج کیا ہے۔

۱۹۔ ممتاز حسین کے ہاں ''پایۂ تخت'' ملتا ہے۔

۲۰۔ اِس عبارت کے جُملۂ معترضہ: ''کہ زندگانی کا مَحل ہے'' کو رشید حسن خاں نے قوسین میں درج کیا ہے، جس سے میر اَمّن کا نثری آہنگ مجروح ہوتا ہے۔ خط سے کام لیا جا سکتا تھا۔

۲۱۔ رشید حسن خاں نے ڈنکن فاربس اور ممتاز حسین کی طرح یہاں سے نیا پیراگراف بنایا ہے۔

۲۲۔ رشید حسن خاں نے ''بادشاہ'' درج کیا ہے۔

۲۳۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں نے ''ٹھنڈی'' درج کیا ہے۔

۲۴۔ ممتاز حسین اور عبدالحق کے ہاں ''چھوہارا'' درج ہے۔

۲۵۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''جانماز'' درج ہے، جو کسی طور پر درست نہیں۔

۲۶۔ یہاں سے رشید حسن خاں نے نیا پیراگراف بنایا ہے۔

۲۷۔ یہاں سے رشید حسن خاں نے دوبارہ نیا پیراگراف بنایا ہے۔

۲۸۔ ہمارے مآخذی نُسخے میں ''کہا'' کی جگہ ''کہے'' درج ہے۔ جسے کمپوزنگ کی غلطی کہنا چاہیے۔

۲۹۔ ہمارے مآخذی نُسخے کے علاوہ تمام نُسخوں میں ''ہُوا'' درج ہے۔

۳۰۔ رشید حسن خاں نے ''بادشاہ'' لکھا ہے۔

۳۱۔ رشید حسن خاں نے ''لا'' کی بجائے ''لایا'' درج کیا ہے، جس کا محل نہیں۔

۳۲۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیَراگراف بنایا ہے۔

۳۳۔ رشید حسن خاں نے ''بادشاہ'' درج کیا ہے۔

۳۴۔ رشید حسن خاں نے ''زار بہ زار'' درج کیا ہے، جو کسی طور درست نہیں۔

۳۵۔ ممتاز حسین نے یہاں سے نیا پیَراگراف بنایا ہے۔

۳۶۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیَراگراف بنایا ہے۔

۳۷۔ ممتاز حسین کے ہاں ''دھاڑ'' درج ہے۔ یعنی ''ڈاڑھ'' کی جدید اِملائی صُورت۔

۳۸۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''رویا'' درج ہے، جس کا محل نہیں۔ اُنھوں نے ''تم سلطنت کرو'' کے بعد نیا پیراگراف بنایا ہے۔

۳۹۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''کچے'' درج ہے۔

۴۰۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''یہ'' درج ہے۔

۴۱۔ رشید حسن خاں نے ''پادشاہ'' کی بجائے ''بادشاہ'' درج کیا ہے۔

۴۲۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''بندہ ہائے بادشاہی'' ملتا ہے۔

۴۳۔ رشید حسن خاں نے ''آویں گے'' کے بعد نیا پیراگراف بنایا ہے۔ جس کا محل نہیں۔

۴۴۔ رشید حسن خاں نے چونکہ اوپر والا پیراگراف غلط بنایا تھا، اِس لیے یہاں نیا پیراگراف نہیں بنا پائے۔ جب کہ یہاں ضروری تھا۔

۴۵۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''مُلک لے یا مال لے'' درج ہے۔ دُوسرے ''لے'' کا محل نہیں۔

۴۶۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں نے اِس کے بعد نیا پیراگراف بنایا ہے۔

۴۷۔ فاربس، عبدالحق اور رشید حسن خاں نے ''ایک ذرا میں'' درج کیا ہے۔

۴۸۔ رشید حسن خاں نے ''ہو جائے گا'' درج کیا ہے۔

۴۹۔ رشید حسن خاں نے فاربس اور ممتاز حُسین کی طرح یہاں سے نیا پیراگراف بنا دیا۔

۵۰۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''بادشاہ'' درج ہے۔

۵۱۔ عبدالحق، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں کے ہاں ''کی'' درج ہے۔

۵۲۔ عبدالحق اور ممتاز حسین کے ہاں ''ہوئی'' درج ہے۔

۵۳۔ ممتاز حسین اور ممتاز منگلوری کے ہاں ''دربارِ عام'' درج ہے۔ مونیئر ولیمز کے ہاں ''بارِ عام'' ہے۔

۵۴۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''اعلا ادنا'' درج ہے۔

۵۵۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''جلوۂ بادشاہی'' درج ہے۔

۵۶۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیراگراف بنا دیا۔

۵۷۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''کسو'' درج ہے۔

۵۸۔ فاربس، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں کے ہاں ''کرے'' درج ہے۔

۵۹۔ ممتاز حسین کے ہاں ''دُنیوی'' درج ہے۔

۶۰۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں کے ہاں ''اپنی'' درج ہے۔

۶۱۔ ممتاز حسین کے ہاں ''کسی'' درج ہے۔

۶۲۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیراگراف بنا دیا۔

۶۳۔ ہمارے مآخذی نُسخے میں ''مُطالع'' درج ہے، جسے کمپوزنگ کی غلطی کہا جا سکتا ہے۔

۶۴۔ فاربس، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں کے ہاں اس مقام سے نیا پیراگراف بنا دیا گیا ہے۔

۶۵۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں کے ہاں ''کیسی'' درج ہے۔

۶۶۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیراگراف بنادیا۔

۶۷۔ کشفی نے ازخود ''اُس کا'' کردیا۔

۶۸۔ رشید حسن خاں کے ہاں: ''وہیں''۔

۶۹۔ ہمارے مآخذی نُسخے میں کمپوزنگ کی غلطی سے ''ذرہ دیکھ لے'' ہوگیا ہے۔

۷۰۔ ممتاز حسین کے ہاں: ''جانتا''۔

۷۱۔ رشید حسن خاں کے ہاں: ''بادشاہ''۔

۷۲۔ عبدالحق، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''اس کے آنے کی آہٹ کی خبر نہ ہوئی'' درج ہے، جو کسی طور درست نہیں۔

۷۳۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیراگراف بنادیا ہے۔

۷۴۔ ممتاز حسین کے ہاں ''وہ''۔

۷۵۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''چار صُورتیں''۔ مونیئر ولیمز: ''ہم چار صورتیں''۔

۷۶۔ فاربس، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''الحمدللہ کہ''۔

۷۷۔ کشفی: ''ابھی سے پڑ رہنا خوب نہیں''۔ یہ اصلاح ازخود کردی گئی ہے۔ ۱۸۳۹ء کے ایڈیشن میں بھی ''پڑپڑ رہنا'' ہی ہے۔

۷۸۔ ممتاز حسین کے ہاں: ''کٹ جائے گی۔''

۷۹۔ ممتاز حسین کے ہاں ''تب'' کی بجائے ''تو'' ملتا ہے۔

۸۰۔ ممتاز حسین کے ہاں: ''حال''۔

۸۱۔ اِس عبارت کے جُملہء مُعترضہ : ''جودیکھا ہے'' کو رشید حسن خاں نے قوسین میں بند کردیا۔

سَیر پہلے درویش کی :

۸۲۔ ممتاز حسین کے ہاں ''میرے تئیں'' درج ہے۔ ''میرے'' درج کرنے سے مصرع بے وزن ہوگیا۔

۸۳۔ ممتاز حسین، عبدالحق، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''خرید وفروخت''۔ فاربس: ''خرید فروخت''۔

۸۴۔ اِس کے بعد رشید حسن خاں نے نیا پیرا گراف بنایا ہے۔

۸۵۔ ممتاز حسین نے یہاں سے نیا پیرا گراف بنادیا۔

۸۶۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیَرا گراف بنادیا۔

۸۷۔ ممتاز حسین: ''کوٹھی''۔

۸۸۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں ''آیا'' کی بجائے ''آتا'' درج ہے۔

۸۹۔ مونیئر ولیمز اور رشید حسن خاں کے ہاں ''دوست آشنا'' کی بجائے ''دو آشنا'' ملتا ہے، جو کسی طور درست نہیں۔

۹۰۔ اِس عبارت کا جُملہء مُعترضہ: ''جو دانت کاٹی......نِثار کرتے تھے۔'' رشید حسن خاں نے قوسین میں ڈال دیا ہے۔

۹۱۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''اُن کا بھی جواب''۔

۹۲۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں ''وے'' کو ''وہ'' درج کیا گیا ہے۔

۹۳۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں ''ہزار شکر بجالیا'' کی بجائے ''ہزار ہزار شکر بجالایا'' ملتا ہے۔

۹۴۔ رشید حسن خاں کے ہاں: ''پانو''۔

۹۵۔ یہ جُملہء مُعترضہ، رشید حسن خاں نے قوسین میں بند کر کے عبارت کا نثری آہنگ مجروح کیا۔

۹۶۔ دیگر تمام نُسخوں میں ''آئے'' کی بجائے ''آنے'' درج ہے۔

۹۷۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''ٹھنڈا'' درج ہے جب کہ ہمارے متن میں قدیم اِملا ہے۔

۹۸۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیَرا گراف بنادیا، جس کا کوئی جواز نہیں۔

۹۹۔ کشفی نے از خود ''روپیوں'' کو ''روپوں'' کر دیا۔

۱۰۰۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں کے ہاں ''فاتحہ خیر کی'' ملتا ہے۔

۱۰۱۔ فاربس، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''آنکھیں بند کیے پڑی کُلبلاتی ہے۔''

۱۰۲۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''کسی'' کی بجائے ''کِس'' درج ہے۔

۱۰۳۔ ہمارے مآخذی نُسخے کے علاوہ کسی دوسرے نُسخے میں ''مجھے غش آنے لگا'' نہیں ملتا۔

۱۰۴۔ ہمارے مآخذی نُسخے میں ''لگا'' کمپوز ہونے سے رہ گیا ہے۔ یہاں ہم نے بھی فاربس کے مطابق ''لگا'' درج کیا۔

۱۰۵۔ فاربس، ممتاز حسین اور کشفی کے ہاں دل کے ساتھ ''میرے'' نہیں ملتا۔

۱۰۶۔ فاربس، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیرا گراف بنایا ہے۔

۱۰۷۔ تمام دیگر نُسخوں میں ''تالاش'' کا جدید اِملا ''تلاش'' ملتا ہے۔ یہ لفظ آگے چل کر بھی آیا ہے اور ہمارے مآخذی نُسخے میں ''تالاش'' ہی ہے۔

۱۰۸۔ ''یکا'' بہ معنی یکتا کو کشفی نے ''پکا'' اور رشید حسن خاں نے ''یکہ'' کر دیا۔ طباعتِ اوّل: ۱۸۰۴ء میں ''پکا'' کمپوزنگ کی غلطی ہے۔

۱۰۹۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں نے ''تلاش'' درج کیا ہے، جو اُس دور کا اِملا ہی نہیں۔

۱۱۰۔ کشفی نے از خود ''جو'' کو ''کہ'' کر دیا۔

۱۱۱۔ رشید حسن خاں نے یہاں بلا وجہ نیا پیرا گراف بنا دیا ہے۔ جس سے بیان کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔

۱۱۲۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''نفع'' کی بجائے ''نفعے'' درج ہے۔

۱۱۳۔ ''حاضر کر'' کو کشفی نے ''حاصل کر'' درج کیا ہے، جو کسی طور درست نہیں۔

۱۱۴۔ فاربس، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''قلعے''۔

۱۱۵۔ فاربس اور رشید حسن خاں نے اس کے بعد نیا پیرا گراف بنایا ہے۔

۱۱۶۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں ''نام و نشان'' درج ہے۔

۱۱۷۔ رشید حسن خاں نے ''وُنہیں'' درج کیا ہے۔

۱۱۸۔ کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں ''رُخصت ہو'' درج ہے۔

۱۱۹۔ کشفی نے ''غریب خانے میں'' کو از خود ''غریب خانے پر'' کر دیا۔

۱۲۰۔ رشید حسن خاں نے نیا پیرا گراف نہیں بنایا۔

۱۲۱۔ فاربس، ممتاز منگلوری اور رشید حسن خاں کے ہاں ''قول قرار'' درج ہے۔

۱۲۲۔ فاربس، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں کے ہاں صرف ''سُنّت رسول کی ہے'' ملتا ہے۔

۱۲۳۔ یہاں سے رشید حسن خاں نے نیا پیراگراف بنادیا ہے، جس سے بیان کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

۱۲۴۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''سماں بندھا'' درج ہے، جب کہ بیان میں بندھنے کا نہیں باندھنے کا محل ہے۔

۱۲۵۔ یہاں سے فاربس اور رشید حسن خاں نیا پیراگراف بنادیتے ہیں، جو کسی طور درست نہیں۔

۱۲۶۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیراگراف بنایا ہے۔

۱۲۷۔ کشفی نے یہاں از خود ''راضی نہ ہُوا'' کردیا۔

۱۲۸۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''چھگیریں'' درج ہے، جس کا کم از کم اس مقام پر کوئی قرینہ نہیں۔

۱۲۹۔ رشید حسن خاں نے یہاں نیا پیراگراف نہیں بنایا۔

۱۳۰۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیراگراف بنایا ہے۔

۱۳۱۔ ابوالخیر کشفی نے یہاں از خود ''یہ ہی'' کردیا۔

۱۳۲۔ فاربس، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیراگراف بنایا ہے۔

۱۳۳۔ فاربس، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیراگراف بنایا ہے۔

۱۳۴۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیراگراف بنایا ہے۔

۱۳۵۔ دیگر نسخوں میں ''لپٹاہُوا'' درج ہے۔ فاربس اور مونیئر ولیمز کے ہاں: ''لپیٹا''۔

۱۳۶۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''ہوگیا'' کی بجائے ''ہُوا'' درج ہے۔

۱۳۷۔ اِس عبارت کا جُملہ ٔ مُعترضہ: ''جسے ضیافت...... دیکھا تھا'' کو رشید حسن خاں نے قوسین میں درج کیا ہے۔

۱۳۸۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''معنے'' مِلتا ہے۔

۱۳۹۔ اِس کے بعد رشید حسن خاں نے نیا پیرا نہیں بنایا۔

۱۴۰۔ اِس عبارت کا جُملہ ٔ مُعترضہ: ''کہ سب راز و نیاز کا محرم تھا'' کو رشید حسن خاں نے قوسین میں درج کیا ہے۔

۱۴۱۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''تلک'' درج ہے۔

۱۴۲۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیراگراف بنایا ہے۔

۱۴۳۔ ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں ''دروازہ'' کی بجائے ''دروازے'' ملتا ہے۔

۱۴۴۔ فاربس، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں کے ہاں ''شہ نشین میں مُغرق'' درج ہے۔

۱۴۵۔ اِس عبارت کے جُملہ ءمُعترضہ: ''جیسے شمع کے گرد پھرتا ہے'' کو رشید حسن خاں نے قوسین میں ڈال دیا ہے۔ جب کہ خط یا سکتہ سے بھی کام لیا جا سکتا تھا۔

۱۴۶۔ فاربس، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پَیراگراف بنایا ہے۔

۱۴۷۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''مُجھ سے'' درج ہے۔

۱۴۸۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''سوجاتا'' کی بجائے ''سوتا'' درج ہے۔

۱۴۹۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''ایک روز وہی'' کی بجائے ''یک روز وہی'' درج ہے۔

۱۵۰۔ یہاں سے رشید حسن خاں نے نیا پَیراگراف نہیں بنایا۔

۱۵۱۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''بٹھایا'' درج ہے۔

۱۵۲۔ یہاں سے رشید حسن خاں نے نیا پَیراگراف بنایا ہے۔

۱۵۳۔ رشید حسن خاں کے ہاں: ''دو''۔

۱۵۴۔ یہاں سے رشید حسن خاں نے نیا پَیرا بنایا ہے۔

۱۵۵۔ رشید حسن خاں کے ہاں: ''بادشاہی''۔

۱۵۶۔ رشید حسن خاں کے ہاں: ''پھبے ہے''۔

۱۵۷۔ اِس عبارت کے جُملہءمُعترضہ: ''جس نے ایک پُرزے...... میرے حوالے کیئے'' کو رشید حسن خاں نے قوسین کے سپرد کر دیا ہے۔

۱۵۸۔ رشید حسن خاں کے ہاں: ''بادشاہوں''۔

۱۵۹۔ ممتاز حسین اور رشید حسن خاں کے ہاں ''ٹھنڈھے'' کا جدید اِملا ''ٹھنڈے'' ملتا ہے۔

۱۶۰۔ اِس عبارت کا جُملہءمُعترضہ: ''جو خیال میں...... نہیں کُھلتیں'' رشید حسن خاں نے قوسین کے سپرد کر دیا۔

۱۶۱۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں ''کہا ہے کہ'' درج ہے۔

۱۶۲۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''ہو جو'' درج ہے، جو کسی طور بھی مناسب نہیں۔

۱۶۳۔ کشفی کے ہاں ''ہرگز'' دو بار نہیں ایک بار آیا ہے۔

۱۶۴۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''بادشاہ'' درج ہے۔

۱۶۵۔ ممتاز حسین اور کشفی کے ہاں ''اُمرازادیاں'' کی بجائے ''امیرزادیاں'' درج ہے۔

۱۶۶۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں ''اچّھی اچّھی'' درج ہے۔

۱۶۷۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیَراگراف بنایا ہے۔ نئے پیَراگراف کا محل نہیں۔

۱۶۸۔ رشید حسن خاں کے ہاں: ''ایسے''۔

۱۶۹۔ اِس عبارت کے جُملہ ءمُعترضہ: ''جیسے ہمیشہ پہنے رہتا تھا'' کو رشید حسن خاں نے قوسین میں ڈال کر نثری آہنگ توڑ دیا۔ نیز یہاں سے نیا پیَراگراف نہیں بنایا۔

۱۷۰۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیَراگراف بنایا ہے۔

۱۷۱۔ رشید حسن خاں کے ہاں فاربس اور ممتاز حسین کے تتبع میں ''آنسوں'' کا جدید اِملا ''آنسو'' درج ہے۔

۱۷۲۔ فاربس، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں ''ٹھنڈھک'' کی جدید املائی صُورت ''ٹھنڈک'' دیکھنے کو ملتی ہے۔

۱۷۳۔ فاربس، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں ''رَوتے'' مِلتا ہے جب کہ ہمارے مآخذی نُسخے میں ''رَوتے'' درج ہے۔

۱۷۴۔ اِس مُکالمے کا جُملہ ءمُعترضہ: ''جو میرا بھیدُو تھا'' کو رشید حسن خاں نے قوسین میں ڈال دیا ہے۔

۱۷۵۔ ممتاز حسین کے ہاں: ''اُس کے پاس'' درج کیا گیا ہے، جو کمپوزر کی کارگزاری ہے۔

۱۷۶۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیَراگراف نہیں بنایا۔

۱۷۷۔ رشید حسن خاں کا بنایا ہُوا نیا پیَراگراف یہاں سے آغاز ہوتا ہے۔

۱۷۸۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیراگراف نہیں بنایا اور فاربس کی پیروی کی۔

۱۷۹۔ اِس عبارت کے جُملہ ءمعترضہ: ''جنھوں نے مجھے دُودھ پلایا اور پالا تھا'' کو رشید حسن خاں نے قوسین میں ڈال کر نثری آہنگ توڑ دیا۔

۱۸۰۔ ممتاز حسین کے ہاں: ''خواجہ سرا''۔

۱۸۱۔ ممتاز حسین اور کشفی کے ہاں: ''پھر آیا اور احوال'' درج ہے۔

۱۸۲۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیراگراف بنا دیا، جس کا کوئی جواز نہیں۔

۱۸۳۔ رشید حسن خاں سمیت تمام مرتّبینِ باغ و بہار کے ہاں ''ہو'' کی بجائے ''ہُوا'' درج ہے۔

۱۸۴۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''کنُوئیں پختہ'' درج ہے۔

۱۸۵۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''پھُوئیاں'' درج ہے۔

۱۸۶۔ ممتاز حسین اور رشید حسن خاں کے ہاں ''جُو نُہیں'' درج ہے، جس کا محل نہیں۔ اِس مقام پر بہر صورت ''دُو نُہیں'' کی جگہ بنتی ہے۔

۱۸۷۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''ناچایا'' کی جدید اِملائی صُورت ''نچایا'' ملتی ہے۔

۱۸۸۔ رشید حسن خاں نے نیا پیَرا گراف نہیں بنایا۔

۱۸۹۔ مونیئرَ ولیمز اور رشید حسن خاں کے ہاں'' گلے میں بانہہ ڈالے'' درج ہے۔ جب کہ فاربس اور کشفی کے ہاں: ''ہاتھ ڈالے''۔

۱۹۰۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیرا گراف بنایا ہے۔

۱۹۱۔ رشید حسن خاں نے کہاوت کو قوسین میں ڈال دیا ہے، جس سے مکالمے کا سارا حُسن غارت ہو گیا۔ دوُسرا ظلم یہ کیا کہ یہاں سے نیا پیراگراف بنا دیا، جس سے بیان کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

۱۹۲۔ ڈنکن فاربس اور عبدالحق کے ہاں: ''اب بہتر ہے کہ شاہزادی کو مار ڈالوں'' درج ہے۔

۱۹۳۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''چکّی'' کی بجائے ''چکیَ'' درج ہے۔ مونیئرَ ولیمز کے ہاں: چکّی۔

۱۹۴۔ رشید حسن خاں کے ہاں: ''پھُسلا پنُد ھلا کر''۔

۱۹۵۔ یہ شعر مرزا رفیع سودا کا ہے۔

۱۹۶۔ اِس عبارت کا جُملہ ٔ مُعترضہ: ''جو میرا خزانچی تھا'' کو رشید حسن خاں نے قوسین میں ڈال دیا ہے۔

۱۹۷۔ ممتاز منگلوری اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''دو کشتیاں نقد کی''۔

۱۹۸۔ فاربس، مونیئرَ ولیمز اور عبدالحق کے ہاں ''دکان پر'' کی بجائے ''دُکان کو'' درج ہے۔

۱۹۹۔ فاربس اور عبدالحق کے ہاں: ''وہ کم حوصلہ جلد ہر ایک سے آشنا ہو بیٹھتا ہے'' درج ہے۔

۲۰۰۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیرا گراف نہیں بنایا، جس کی ضرورت تھی۔

۲۰۱۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیرا گراف بنایا ہے، جس کی ضرورت نہ تھی۔

۲۰۲۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''لیعنی'' کی بجائے ''یعنے'' ملتا ہے۔ یہاں انھوں نے یائے معروف اور یائے مجہول میں فرق نہیں کیا۔

۲۰۳۔ رشید حسن خاں نے اِس عبارت کا جُملہ مُعترضہ: ''کہ والدہ مُجھ ناپاک کی ہیں'' کو قوسین میں ڈال دیا۔

۲۰۴۔ رشید حسن خاں نے یہاں نیا پیَرا گراف بنا کر بیان کو دولخت کر دیا۔

۲۰۵۔ اِس عبارت کو جُملہ ءمُعترضہ: ''جو میرا محرم تھا'' کو رشید حسن خاں نے قوسین کے سپرد کر دیا۔

۲۰۶۔ ابوالخیر کشفی کے ہاں ''شمشیر نکال کر دونہیں'' درج ہے۔

۲۰۷۔ اِس عبارت کے جُملہ ءمُعترضہ: ''کہ چلنے میں ہوا سے باتیں کریں'' کو بھی رشید حسن خاں نے قوسین میں ڈال دیا۔ جب کہ جُملہ ءمُعترضہ کے آغاز میں ''کہ'' کا استعمال قوسین کی راہ میں رُکاوٹ بننا چاہیے تھا۔

۲۰۸۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''پادشاہ زادی'' کی بجائے ''بادشاہ زادہ'' مِلتا ہے۔ جب کہ مکالمہ شہزادی سے ہو رہا ہے۔

۲۰۹۔ اِس عبارت کا جُملہ ءمُعترضہ: ''کہ جس کے دیکھنے سے کلیجا پانی ہو'' کو بھی ''کہ'' کے استعمال کے باوجود رشید حسن خاں نے قوسین میں ڈال دیا۔

۲۱۰۔ کشفی کے ہاں: ''کرنے کی تدبیر کر'' درج ہے۔ جب کہ اِسی مقام سے رشید حسن خاں نے نیا پیرا گراف بنایا ہے۔

۲۱۱۔ رشید حسن خاں نے اِس مقام سے نیا پیَرا گراف بنا کر بیان کو دولخت کر دیا ہے۔

۲۱۲۔ ڈنکن فاربس اور عبدالحق کے ہاں: ''چلا آیا تھا'' درج ہے۔

۲۱۳۔ رشید حسن خاں نے نیا پیرا گراف نہیں بنایا۔

۲۱۴۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیرا گراف بنایا ہے۔

سَیر دوسرے درویش کی:

۲۱۵۔ اِس بیان کا جُملہ ءمُعترضہ: ''جو پادشاہ اس ملک کے تھے'' کو قوسین میں ڈال دیا ہے۔

۲۱۶۔ دیگر قدیم و جدید نُسخوں میں ''کہنے لگا'' پر بات ختم ہو جاتی ہے، جب کہ ہمارے مآخذی نُسخے میں ''کہنے لگا کہ'' آگے بات بڑھانے میں مدد دیتا ہے۔ رشید حسن خاں کے ہاں بھی ''کہنے لگا کہ'' مِلتا ہے۔

۲۱۷۔ رشید حسن خاں نے نیا پیرا گراف نہیں بنایا۔

۲۱۸۔ دیگر مطبوعہ نُسخوں میں ''دَھنڈھے'' کی جدید اِملا ''دَھنڈے'' دیکھنے کو ملتی ہے۔

۲۱۹۔ ہمارے مآخذی نُسخے اور فاربس کے ہاں ''لون روٹی'' درج نہیں، صرف ''روٹی'' ہے۔

۲۲۰۔ دیگر تمام نُسخوں میں ''پادشاہ'' کے بعد ''سے'' بھی درج۔ جب کہ اُس وقت حاتم طائی لوگوں کو روپے دِلوانے کے لیے کوشاں نہ تھا۔ یہ بادشاہ کا اعلان تھا کہ جو کوئی اسے گرفتار کروائے گا، اُسے انعام ملے گا۔ لہٰذا یہاں ''سے'' کے استعمال کا محل نہیں۔

۲۲۱۔ دیگر تمام نُسخوں میں ''ٹھنڈھی'' کی جدید اِملائی صورت یعنی ''ٹھنڈی'' دیکھنے کو ملتی ہے۔ میر اَمّن نے اِس سے قبل ''ٹھنڈھک'' بھی برتا ہے۔ لہذا یہاں ''ٹھنڈھک'' کا استعمال ہی مناسب ہے۔ ہمارے مآخذی نسخے میں ''ٹھنڈھی'' درج ہے۔

۲۲۲۔ فاربس کے ہاں اور ہمارے مآخذی نُسخے میں چُھپایئے، بچایئے اور پہنچایئے درج ہے، جب کہ دیگر تمام قدیم و جدید نُسخوں میں چُھپائے، بچائے اور پہنچائے ملتا ہے۔ یہاں حاتم طائی کی سوچ ظاہر کی جا رہی ہے لہذا ہمارا مآخذی نُسخہ اور فاربس کا مُرتب کردہ متن درست ہے۔

۲۲۳۔ یہ شعر میر درد کا ہے۔

۲۲۴۔ عبدالحق کے ہاں ''تُجھ سے'' کی بجائے ''تُجھ کو'' درج ہے۔

۲۲۵۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پَیرا گراف بنایا ہے۔

۲۲۶۔ دیگر نُسخوں میں ''پانچ پانچ سو جُوتیاں'' درج ہے۔ یعنی ''سَے'' کی جدید املائی صورت: ''سَو''۔

۲۲۷۔ دیگر نُسخوں میں ''بیٹھلایا'' کی بجائے اُس کی جدید اِملائی صورت ''بٹھلایا'' ملتا ہے۔

۲۲۸۔ فاربس اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''ویسی ہی''۔

۲۲۹۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پَیرا گراف بنایا ہے۔

۲۳۰۔ رشید حسن خاں نے اِس عبارت کے جُملہ ٔ مُعترضہ: ''کہ دانائی اُس کے قیافے سے ظاہر تھی'' کو ابتداء میں ''کہ'' ہونے کے باوجود قوسین میں ڈال دیا۔

۲۳۱۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پَیرا بنا دیا۔

۲۳۲۔ ابوالخیر کشفی کے ہاں ''خوشبودار بیسن''۔ جب کہ اُن کے مآخذی نُسخے (۱۸۳۹ء) میں ''خوشبو، بیسن'' ہی درج ہے۔

۲۳۳۔ کشفی صاحب کے ہاں کاتب نے ''کِھلوریاں'' کو ''گِلوریاں'' کر دیا۔

۲۳۴۔ کشفی صاحب کے ہاں سہوِ کتابت سے ''رُوپے'' (یعنی چاندی)، ''رُوپہلے'' ہو گیا۔

۲۳۵۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیرا گراف نہیں بنایا۔

۲۳۶۔ رشید حسن خاں نے جُملہء مُعترضہ: ''کہ جس کے آگے دَلدا پیش گیر کھڑا ہے'' کو ابتداء میں ''کہ'' ہونے کے باوجود قوسین میں ڈال دیا۔

۲۳۷۔ کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''ہم فقیروں''۔

۲۳۸۔ رشید حسن خاں نے جُملہء مُعترضہ: ''کہ پھولوں کی سیج سے بھی نرم تھے'' کو ابتداء میں ''کہ'' ہونے کے باوجود قوسین میں ڈال دیا۔

۲۳۹۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیرا گراف نہیں بنایا۔

۲۴۰۔ ایضاً

۲۴۱۔ رشید حسن خاں نے جُملہء مُعترضہ: ''کہ پہلے مکان سے بہتر تھی'' کو ابتداء میں ''کہ'' ہونے کے باوجود قوسین میں ڈال دیا۔

۲۴۲۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں ''اُس نے'' کی بجائے ''اُسی'' درج ہے، جس کا محل نہیں۔

۲۴۳۔ رشید حسن خاں نے نیا پیرا نہیں بنایا۔

۲۴۴۔ ایضاً

۲۴۵۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''لٹکتیں'' اور کشفی کے ہاں ''لٹکی''۔

۲۴۶۔ ممتاز منگلوری اور رشید حسن خاں کے ہاں ''بہرور'' درج ہے، جو یکسر غلط ہے۔ ڈنکن فاربس کے ہاں بھی: ''بہروز'' یعنی ہمارے مآخذی نسخے کی صورت دیکھنے کو ملتی ہے۔

۲۴۷۔ ڈنکن فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں ''جواب میرانہ دیتا'' درج ہے۔

۲۴۸۔ قدیم و جدید، کسی نُسخے میں ''ایک غلام، گُل اندام'' نہیں ملتا۔ جب کہ عبارت میں ''غلام'' کی جگہ موجود ہے۔

۲۴۹۔ قدیم و جدید، کسی نُسخے میں ''دیکھاتا'' نہیں ملتا۔ ہر ایک نے اس کی جدید اِملائی صُورت: ''دکھاتا'' درج کی ہے۔

۲۵۰۔ کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''بیٹھلاویں'' کی جدید اِملائی صُورت: ''بٹھلادیں''۔

۲۵۱۔ رشید حسن خاں کے ہاں نیا پیَرا گراف نہیں بنایا گیا۔

۲۵۲۔ دیگر تمام نُسخوں، بہ شمول رشید حسن خاں کے: ''فقیر تنہا سے''۔

۲۵۳۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی، ممتاز منگلوری اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''حاضر ہُوں''۔ جس کا کوئی قرینہ نہیں۔

۲۵۴۔ عبدالحق اور رشید حسن خاں کے ''بھجایا'' کی جدید اِملائی صُورت: ''بھیجا''۔

۲۵۵۔ دیگر تمام نُسخوں بہ شمول رشید حسن خاں کے: ''آرایش کہ''۔

۲۵۶۔ رشید حسن خاں نے نیا پیَرا گراف نہیں بنایا۔

۲۵۷۔ ایضاً

۲۵۸۔ ہمارے مآخذی نسخے میں کمپوزنگ کی غلطی ہے: ''کڑوے لگتی ہے''۔ یہاں ہم نے فاربس کی پیَروی کی ہے۔

۲۵۹۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین کے ہاں: ''مگر نصیب ہر ایک کے ساتھ ہیں''۔ یُوں جُملہ اَدھورا رہ جاتا ہے۔ ''ہر ایک'' کی تکرار سے بات مکمل ہو جاتی ہے۔

۲۶۰۔ فاربس، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''پر نہ مارتا''۔

۲۶۱۔ میر امّن بعض مقامات پر دو یکساں حروف میں سے ایک حرف کم دیتے ہیں جیسے ''سُننے'' کی بجائے ''سُنے''، ''اُس سے'' کی بجائے ''اُسے''۔ رشید حسن خاں کے ہاں اِس مقام پر ''نا اُمید'' ملتا ہے۔ دیگر مقامات پر بھی اُنھوں نے میر امّن کی اِملائی صُورت کو جدید اِملا میں بدل دیا ہے۔

۲۶۲۔ رشید حسن خاں کے ہاں: ''رہیں تھیں''۔ کشفی کے ہاں: ''رہتی تھیں''۔ خاں صاحب نے ''رہی'' کو ''رہیں'' پڑھا اور کشفی نے ''رہی'' کو از خود ''رہتی'' کر دیا۔

۲۶۳۔ فاربس، عبدالحق، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں ''بھیکھ'' کی جدید اِملائی صُورت ''بھیک'' دکھائی دیتی ہے۔

۲۶۴۔ رشید حسن خاں کے ہاں: ''پانی نکلا''۔

۲۶۵۔ کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں ''بھیکھ'' کی جدید اِملائی صورت: ''بھیک''۔

۲۶۶۔ ''کارخان جات'' قدیم اِملائی صُورت ہے۔ رشید حسن خاں کے ہاں جدید اِملائی صورت ''کارخانہ جات'' دکھائی دیتی ہے۔

۲۶۷۔ فاربس، عبدالحق اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''عین غریب نوازی اور مسافر پروری ہے''۔

۲۶۸۔ رشید حسن خاں کے ہاں: ''خاص خواص''۔

۲۶۹۔ رشید حسن خاں سمیت تمام مُرتّبینِ ''باغ و بہار'' کے ہاں ''بیٹھا کر'' کی جدید اِملائی صُورت ''دِٹھا کر'' دکھائی دیتی ہے۔

۲۷۰۔ فاربس اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''کوئی لائق اِس کام کے نہ تھا''۔ جب کہ اِس صُورت میں ''کام'' کا لفظ زائد ہے۔

۲۷۱۔ رشید حسن خاں نے نیا پیَراگراف نہیں بنایا۔

۲۷۲۔ ایضاً

۲۷۳۔ ہمارے مآخذی نُسخے میں ''قدیم کا قاعدے پر'' درج ہے، جو درست معلوم نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہم نے اپنے مآخذی نسخے کی پابندی ضروری نہیں سمجھی۔

۲۷۴۔ رشید حسن خاں نے نیا پیَراگراف نہیں بنایا۔

۲۷۵۔ فاربس، کشفی، ممتاز منگلوری اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''میں نے اُس کا پیچھا کیا''۔

۲۷۶۔ رشید حسن خاں نے نیا پیَراگراف نہیں بنایا۔

۲۷۷۔ ایضاً

۲۷۸۔ ایضاً

۲۷۹۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی، ممتاز منگلوری اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''وہ در آپ سے آپ کھل گیا۔''

۲۸۰۔ رشید حسن خاں کے ہاں: ''وہ اندر پیٹھا۔''

۲۸۱۔ کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''ٹھہرا''

۲۸۲۔ رشید حسن خاں کے ہاں: ''اِلتماس کیا کہ خُدا''۔

۲۸۳۔ کشفی کے ہاں: ''آدمیوں کے خون کرے''۔

۲۸۴۔ کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''ہفت قلم لکھنے''۔

۲۸۵۔ ہمارے مآخذی نُسخے میں ''جُوں جُوں'' کے نُون غُنہ کمپوز ہونے سے رہ گئے۔

۲۸۶۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پَیرا گراف بنادیا۔

۲۸۷۔ کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں ''ٹھنڈھی'' کی جدید اِملائی صورت: ''ٹھنڈی''

۲۸۸۔ ہمارے مآخذی نُسخے کے سِوا کسی نُسخے میں بھی ''جو'' نہیں ملتا۔

۲۸۹۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی، منگلوری اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''جام شراب گُلِ گلاب کا''۔

۲۹۰۔ رشید حسن خاں کے ہاں: ''معشوق''۔ جب کہ ''معشوقہ'' کا محل ہے۔

۲۹۱۔ رشید حسن خاں نے نیا پَیرا گراف نہیں بنایا۔

۲۹۲۔ ایضاً

۲۹۳۔ ایضاً

۲۹۴۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین، منگلوری، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''دعائیں پڑھ پڑھ کر''۔

۲۹۵۔ ہمارے مآخذی نُسخے میں ''مُلک'' درج نہیں۔

۲۹۶۔ رشید حسن خاں نے نیا پیرا گراف نہیں بنایا۔

۲۹۷۔ ابوالخیر کشفی نے ''اُس پاس'' کو ''اُس کے پاس'' کردیا۔

۲۹۸۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین اور کشفی کے ہاں ''بھی'' نہیں مِلتا۔

۲۹۹۔ اِس شعر کے مصرعِ اُولیٰ کے اخیر میں یائے معروف کی آواز کو دبا کر پڑھیں تو درست، بہ صورتِ دیگر شعر بے وزن ہو جاتا ہے۔

۳۰۰۔ رشید حسن خاں نے ''کہ ضعف سے کھڑے ہونے کی طاقت اُس میں نہ تھی'' کو قوسین کے سپرد کردیا ہے۔

۳۰۱۔ فاربس، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''ایک درخت کولے میں پکڑ''۔

۳۰۲۔ رشید حسن خاں کے ہاں: ''نے'' درج نہیں۔

۳۰۳۔ دیگر قدیم و جدید نُسخوں میں: ''حُجرے'' جب کہ ''حُجروں'' ہونا چاہیے۔ ہمارا مآخذی نُسخہ ''حُجروں'' ظاہر کر رہا ہے۔

۳۰۴۔ رشید حسن خاں نے نیا پیرا گراف نہیں بنایا۔

۳۰۵۔ فاربس، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''سیر تماشا دیکھا کرو''۔

۳۰۶۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیرا بنایا ہے۔

۳۰۷۔ رشید حسن خاں کے ہاں: ''بغل میں لے آیا''۔ محاورے کے خلاف ہے۔ کسی طور درست نہیں۔

۳۰۸۔ رشید حسن خاں نے نیا پیراگراف نہیں بنایا۔

۳۰۹۔ ہمارے مآخذ اور نسخہ نامی کریمی (۱۹۱۸ء) کے علاوہ تمام نسخوں میں: ''وہی سوار بُرقعہ پوش''۔

سرگذشت آزاد بخت پادشاہ کی: مشمولہ سیرِ دُوسرے درویش کی:

۳۱۰۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''ایک ایک کو تکنے لگا''

۳۱۱۔ رشید حسن خاں کے ہاں: ''خوشی ہُوئے''۔

۳۱۲۔ مونیئر ولیمز اور رشید حسن خاں: ''ایک مدّت سے اسی طرح سیر و سفر کرتے پھرتے ہیں، خانہ بدوش ہیں''۔

۳۱۳۔ فاربس، ممتاز حسین، عبدالحق اور رشید حسن خاں: ''اپنا اپنا احوال''۔

۳۱۴۔ ہمارے مآخذی نسخے اور نسخہ مطبع مسیحائی ۱۲۷۲ھ کے علاوہ ''ہی'' کہیں نہیں ملتا۔

۳۱۵۔ رشید حسن خاں کے ہاں مصرعِ ثانی یُوں ہے: ''جو کچھ کہ میں نے دیکھا ہے اور ہے سُنا، سُنو''

۳۱۶۔ رشید حسن خاں نے نیا پیراگراف نہیں بنایا۔

۳۱۷۔ فاربس، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں ''دیکھاتا'' کی جدید املائی صورت ''دکھاتا'' ملتی ہے۔

۳۱۸۔ رشید حسن خاں نے نیا پیراگراف بنایا ہے۔

۳۱۹۔ ممتاز حسین کے ہاں: ''ایک ایلچی''۔ یہاں ''ایک'' اضافی ہے۔

۳۲۰۔ ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''ابھی بے گُناہ کا قتل کرنا درست نہیں''۔

۳۲۱۔ رشید حسن خاں نے نیا پیراگراف نہیں بنایا۔

۳۲۲۔ فاربس، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیراگراف بنایا ہے۔

۳۲۳۔ ممتاز حسین کے ہاں: ''بندی خانہ''۔

۳۲۴۔ رشید حسن خاں نے نیا پیراگراف نہیں بنایا۔

۳۲۵۔ دیگر نسخوں میں: ''تیرے باپ نے شاید یہ کہا کہ نیشاپور میں کوئی سوداگر ہے۔'' ''ہے'' صرف ہمارے مآخذی نسخے میں ہے۔

۳۲۶۔ رشید حسن خاں نے نیا پیراگراف بنایا ہے۔

۳۲۷۔ ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیراگراف بنایا ہے۔

۳۲۸۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''معلوم نہیں کیا ہوئی۔''

۳۲۹۔ دیگر نسخوں میں، بشمول رشید حسن خاں، بیٹی کے بعد ''کے'' کی جگہ ''کا'' ملتا ہے اور وزیر زادی سے پہلے ''وہاں'' دکھائی نہیں دیتا۔

۳۳۰۔ دیگر نُسخوں میں، بشمول رشید حسن خاں: ''آتے آتے جب چوک میں پہنچا''۔

۳۳۱۔ دیگر نسخوں میں، بشمول رشید حسن خاں: ''سوداگر بچہ کر مشہور کیا تھا''۔ ہمارے مآخذی نُسخے اور نُسخہ مطبع مسیحائی ۱۲۷۲ھ کی عبارت یکساں ہے۔

۳۳۲۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیراگراف بنایا ہے۔

۳۳۳۔ رشید حسن خاں کے ہاں: ''حُسن جمال''

۳۳۴۔ عبدالحق کے ہاں: ''سوداگر بچہ تو چاہتا ہی تھا۔''

۳۳۵۔ ہمارے مآخذی نُسخے، نُسخہء نامی کریمی اور ''باغ و بہار'' طبع اوّل ۱۸۰۴ء میں: ''میرے قبلہ گاہی سوداگر ہیں'' ملتا ہے جب کہ فاربس، عبدالحق، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں ''قبلہ گاہ'' درج ہے۔

۳۳۶۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیراگراف بنادیا ہے۔

۳۳۷۔ دیگر نُسخوں، بشمول رشید حسن خاں کے: ''غلاموں نے اُس پنجرے کو'' درج ہے۔ جب کہ یہاں ایک پنجرہ نہیں۔ میر امّن کچھ دیر پہلے واضح طور پر لکھ رہے ہیں کہ: ''اتفاقاً ایک طرف جو دیکھا تو ایک دوکان ہے، اُس میں دو پنجرے آہنی لٹکتے ہیں اور اُن دونوں میں دو آدمی قید ہیں۔''

۳۳۸۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیراگراف بنادیا ہے۔

۳۳۹۔ دیگر نُسخوں، بشمول رشید حسن خاں کے: ''پنجرے'' درج ہے۔ جب کہ پنجرے دو ہیں، دو افراد کے لیے الگ الگ۔ اس لیے ''پنجروں'' کا محل ہے۔ ہمارے مآخذی نُسخے اور ''منتخباتِ باغ و بہار'' مرتبہ: بینز (BANESS) مطبوعہ: ۱۸۸۷ء میں ''پنجروں'' ملتا ہے۔

۳۴۰۔ تمام مُروجہ نُسخوں، بشمول بینز (BANESS) اور رشید حسن خاں کے: ''قُفل قفس کا کھولے'' درج ہے۔ جو کسی طور درست نہیں۔ دیگر نُسخوں میں ''کُنجی'' ہے جب کہ ہمارے مآخذی نُسخے میں ''کنجیاں'' ہیں۔ اس لیے کہ تالے دو ہیں، پنجرے دو ہیں۔

۳۴۱۔ مُروجہ نُسخوں، بشمول رشید حسن خاں کے: ''پھر تالا بند کر کے تالی خواجہ کے حوالے کی۔'' ملتا ہے، جو کسی طور درست نہیں۔ دو الگ الگ پنجروں کے قُفل ایک ہی چابی سے کیسے کُھل سکتے تھے؟ ''منتخبات باغ و بہار'' مرتبہ بنیز (۱۸۸۷ء) اور ''باغ و بہار'' مطبوعہ کلکتہ (۱۲۶۸ھ مطابق ۵۲۔۱۸۵۱ء) میں ہمارے مآخذی نُسخے کی صورت ملتی ہے۔

۳۴۲۔ ہمارے مآخذی نسخے اور ''باغ و بہار'' مطبوعہ کلکتہ ۱۲۶۸ھ (مطابق ۵۲۔۱۸۵۱ء) کے علاوہ مُروجہ نسخوں، بشمول رشید حسن خاں کے: ''وے تمھاری قید میں ہیں؟ نہیں تو تم اور وے برابر ہیں۔'' درج ہے، جو کسی طور درست نہیں۔

۳۴۳۔ رشید حسن خاں کے ہاں: ''سبب گریے کا''۔

۳۴۴۔ یہاں سے رشید حسن خاں نے نیا پیرا گراف بنایا ہے۔

۳۴۵۔ دیگر نُسخوں میں: ''ناراضی''۔

۳۴۶۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''دُعائے بد نہ کریں''۔

۳۴۷۔ رشید حسن خاں نے نیا پیرا گراف نہیں بنایا۔

۳۴۸۔ دیگر نسخوں میں ''نے'' نہیں ملتا۔

۳۴۹۔ رشید حسن خاں نے نیا پیرا گراف نہیں بنایا۔

۳۵۰۔ یہاں سے رشید حسن خاں نے نیا پیرا گراف بنا دیا۔

۳۵۱۔ رشید حسن خاں کے ہاں: ''اچّھا خیر جلد مل جُل کر میرے پاس آؤ''۔

۳۵۲۔ فاربس کے تتبع میں عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی، ممتاز منگلوری اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''یہ مردکون گھُس آیا''۔ جب کہ ''مردوا'' کا محل ہے۔

۳۵۳۔ دیگر قدیم و جدید نُسخوں میں ''مگر'' نہیں ملتا۔ جب کہ اِس لفظ کے نہ ہونے سے ایک کمی کا احساس ہوتا ہے۔ ہمارے مآخذی نسخے میں: ''مگر تمھارے بموجب فرمانے......''

۳۵۴۔ رشید حسن خاں نے نیا پیرا گراف نہیں بنایا۔

۳۵۵۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''تُو جو مُناسب جانے سو کر''۔

۳۵۶۔ رشید حسن خاں کے ہاں: ''اُوپر'' کی بجائے ''پر''

۳۵۷۔ رشید حسن خاں نے نیا پیرا گراف نہیں بنایا، جس کا محل ہے۔

۳۵۸۔ رشید حسن خاں نے ''کہ'' درج نہ کرتے ہوئے یہاں سے نیا پیرا گراف بنا دیا ہے۔

۳۵۹۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''لوازم'' سے پہلے ''وہ'' کا اضافہ ملتا ہے۔

۳۶۰۔ رشید حسن خاں: ''نام ونشان''۔

۳۶۱۔ فاربس تا رشید حسن خاں، سب کے ہاں ''چھوٹ'' درج ہے۔ جس کے یہاں کوئی معنی نہیں بنتے۔ دُرست: ''جُوت'' ہے۔ یہی ہمارے مآخذی نُسخے میں موجود ہے۔

۳۶۲۔ رشید حسن خاں نے نیا پیرا گراف نہیں بنایا۔

۳۶۳۔ فاربس، عبدالحق، کشفی، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''کہ گویا''۔

۳۶۴۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیرا گراف بنایا ہے۔

۳۶۵۔ فاربس، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''اپنا پیشوا جانتا ہوں''

۳۶۶۔ فاربس، ہنیز، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''آ ئین میری''۔ یعنی آ ئین کو مؤنث لکھا گیا ہے۔ جب کہ ہے مُذکر اور ہمارے مآخذی نُسخے میں مُذکر ہی لکھا گیا ہے۔

۳۶۷۔ رشید حسن خاں: ''اور حج بھی کر آیا ہوں''۔

۳۶۸۔ رشید حسن خاں: ''اور مُسلمان کہاتا ہوں''۔

۳۶۹۔ دیگر نسخوں میں: ''تمام خلق اللہ''۔

۳۷۰۔ رشید حسن خاں: ''کنویں''۔

۳۷۱۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں: ''مرضی مبارک یہی ہے''۔

۳۷۲۔ کشفی اور رشید حسن کے ہاں ''وے'' کی جدید اِملائی صورت ''وہ'' درج ہے۔

۳۷۳۔ دیگر نُسخوں میں: ''پھول اُٹھ چکے''۔

۳۷۴۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیرا گراف بنایا ہے۔

۳۷۵۔ رشید حسن خاں نے نیا پیرا گراف نہیں بنایا۔

۳۷۶۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''یے'' کی بجائے ''یہ''۔

۳۷۷۔ ایضاً

۳۷۸۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیرا گراف بنایا ہے۔

۳۷۹۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''بیچ'' کا جدید املا: ''بیچ''۔

۳۸۰۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں بھیڑیے کو بیچنے کا حوالہ نہیں ملتا: ''آخر اُن کی بے مُروّتی دیکھ ایک حویلی خرید کی'' محض اِتنا کہنے سے معلوم نہیں ہوتا کہ حویلی خریدنے کو رقم کہاں سے آئی۔ ہمارے مآخذی نُسخے میں صورتِ احوال پوری طرح کُھل کر سامنے آ جاتی ہے۔

۳۸۱۔ کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''خُدا کے توکل پر بیٹھا''۔

۳۸۲۔ رشید حسن خاں: ''دُکان''

۳۸۳۔ رشید حسن خاں: ''رُوٹھے کیوں نہ مترشتر آٹھوں جام''

۳۸۴۔ رشید حسن خاں: ''ایک راو رے جُرن کے بیہہ نبھایئے''

۳۸۵۔ رشید حسن خاں نے نیا پیرا گراف نہیں بنایا۔

۳۸۶۔ ایضاً

۳۸۷۔ رشید حسن خاں: ''بے اعتبار ہو گئے ہو''۔

۳۸۸۔ فاربس، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''اب وہاں کی جاروب کشی کرتا ہے''۔ اِس میں ''کی'' زائد ہے۔

۳۸۹۔ کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں ''وے'' کی جدید املائی صُورت ''وہ'' دیکھنے کو ملتی ہے۔

۳۹۰۔ کشفی: ''بُوزہ فروش کی لڑکی پر عاشق ہُوا''۔ کشفی صاحب اور ممتاز منگلوری نے جنس ہی تبدیل کر دی۔

۳۹۱۔ فاربس اور عبدالحق: ''جاؤں''

۳۹۲۔ کشفی اور رشید حسن خاں: ''یہ''

۳۹۳۔ رشید حسن خاں نے نیا پیرا گراف نہیں بنایا۔

۳۹۴۔ کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں ''کوٹھری'' کا جدید اِملا ''کوٹھری'' درج ہے۔

۳۹۵۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''کہ'' نہیں ملتا۔ جس کی کمی شِدّت سے محسوس ہوتی ہے۔

۳۹۶۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''ڈھکیلا'' کی جدید اِملائی صُورت ''دھکیلا''

۳۹۷۔ ہماری مآخذی نُسخے میں کمپوزنگ کی غلطی سے ''تھک'' کی بجائے ''تک'' ملتا ہے۔

۳۹۸۔ فاربس، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''پکڑلی''۔

۳۹۹۔ کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''دُکانیں''۔

۴۰۰۔ کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''دُکان''۔

۴۰۱۔ فاربس، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''یہ'' درج ہے جب کہ ''یے'' کا محل ہے۔

۴۰۲۔ اِس پُورے پیرا گراف میں رشید حسن خاں نے ''اِن'' اور ''اُن'' کے فرق کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا۔ اس پیراگراف میں ''یے'' کا استعمال ہُوا ہے۔ اس حوالے سے ''اُن'' کا محل نہیں۔ ''اِن'' اور ''اِنھوں'' آئے گا۔

۴۰۳۔ رشید حسن خاں: ''اِس نے تیری''۔

۴۰۴۔ رشید حسن خاں: ''یے دونوں''۔

۴۰۵۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیرا گراف بنادیا ہے۔

۴۰۶۔ دیگر نُسخوں، بشمول رشید حسن خاں کے: ''ہاتھ زندگی سے دَھوئے''

۴۰۷۔ رشید حسن خاں کے ہاں: ''اور میں رُوبہ قبلہ کھڑا ہُوا'' درج ہے، جو اگلی عبارت سے لگا نہیں کھاتا۔

۴۰۸۔ رشید حسن خاں نے نیا پیرا گراف نہیں بنایا۔

۴۰۹۔ ایضاً

۴۱۰۔ ایضاً

۴۱۱۔ رشید حسن خاں کے ہاں: ''کوتوال کے ڈنڈے نے مجھے اُس پہاڑ پر لے گئے۔'' خاں صاحب کے ہاں ''نے'' زائد ہے۔

۴۱۲۔ رشید حسن خاں نے نیا پیرا گراف نہیں بنایا۔

۴۱۳۔ فاربس، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''چپڑ چپڑ مُنھ چلانے کی''۔

۴۱۴۔ فاربس اور رشید حسن خاں ہاں: ''کیا ہو جو مجھے بھی تھوڑا سا دو''۔

۴۱۵۔ رشید حسن خاں: ''وہ کھاپی کر''۔

۴۱۶۔ رشید حسن خاں: ''کنویں''۔

۴۱۷۔ مونیئر ولیمز اور رشید حسن خاں: ''مٹکا پھوٹا''۔ عجیب بات ہے، گرا گھڑے پر اور ٹوٹ گیا مٹکا۔

۴۱۸۔ مونیئر ولیمز اور رشید حسن خاں: ''پھر'' ندارد۔

۴۱۹۔ رشید حسن خاں: ''پہاڑی''۔ جب کہ بات ''پہاڑ'' کی ہو رہی ہے۔ پہلے بھی ''پہاڑ'' کا ذکر ہو چکا۔ ''پہاڑی'' کا محل نہیں۔

۴۲۰۔ فاربس، مونیئر ولیمز، عبدالحق، کشفی، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں کے ہاں ''وے'' کا جدید اِملا ''وہ'' درج ہے۔

۴۲۱۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز منگلوری اور رشید حسن خاں: ''ڈور''۔ نامی کریمی (۱۹۱۸ء) اور فاربس کے ہاں: ''ڈوری''۔

۴۲۲۔ رشید حسن خاں: اونچی

۴۲۳۔ فاربس، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں: ''جست کر کر مجھ پر پر چلائی''۔

۴۲۴۔ فارسی محاورے کا لفظ بہ لفظ اُردو ترجمہ۔

۴۲۵۔ فاربس، عبدالحق، کشفی اور رشید حسن کے ہاں ''جزیرہ'' کی بجائے ''جزیرے'' ملتا ہے۔ فاربس کے تتبع میں ممتاز حسین کے ہاں: ''ایک جزیرے میں جا پہنچا''۔ اس میں کوئی قرینہ نہیں۔ اس لیے کہ سوار ایک نہیں، دو ہیں۔ ''باغ و بہار'' مطبوعہ کلکتہ: ۱۲۶۸ھ اور ''منتخبات باغ و بہار'' مُرتبہ: بنیز مطبوعہ: ۱۸۸۷ء میں ''جا پہنچے'' درج ہے۔ یہی صورت ہمارے مآخذی نُسخے میں ہے۔

۴۲۶۔ فاربس اور رشید حسن خاں کے ہاں ''گبرُو جوان'' ملتا ہے۔ جب کہ گبرُو کے بھی وہی معنی ہیں جو ''جوان'' کے ہیں، لہٰذا گبرُو کے ساتھ جوان کا اضافہ بے معنی ہے۔

۴۲۷۔ کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''گُپت رکھی''۔

۴۲۸۔ رشید حسن خاں نے نیا پیرا نہیں بنایا۔

۴۲۹۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''ہے'' نہیں ملتا۔

۴۳۰۔ رشید حسن خاں نے نیا پیرا گراف نہیں بنایا۔

۴۳۱۔ کشفی اور رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیرا گراف بنایا ہے۔

۴۳۲۔ رشید حسن خاں: ''ازدحام''۔ میر امّن نے یہ لفظ دو بار استعمال کیا۔ خاں صاحب نے ایک جگہ ''ازدہام'' اور دوسری جگہ ''ازدحام'' درج کیا۔

۴۳۳۔ رشید حسن خاں نے نیا پیرا گراف نہیں بنایا۔

۴۳۴۔ رشید حسن خاں نے یہاں نیا پیرا گراف بنا دیا۔

۴۳۵۔ رشید حسن خاں نے نیا پیرا نہیں بنایا۔

۴۳۶۔ ایضاً

۴۳۷۔ رشید حسن خاں: ''روز مجھے شراب پلاتی''

۴۳۸۔ ہمارے مآخذی نُسخے میں ''نے'' درج نہیں۔

۴۳۹۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی، ممتاز منگلوری اور رشید حسن خاں کے ہاں ''ہنسی'' کی بجائے ''ہنسنے'' درج ہے۔

۴۴۰۔ رشید حسن خاں: ''کیا تقصیر ہے کچھ دشمن جان کر نہیں رکھا۔'' اِس عبارت میں ''کہ'' کی کمی کھٹکتی ہے۔

۴۴۱۔ رشید حسن خاں نے نیا پیرا گراف نہیں بنایا۔

۴۴۲۔ کشفی: ''تم بھی چلو نا''۔ رشید حسن خاں: ''تم بھی چلو نہ''۔

۴۴۳۔ رشید حسن خاں نے نیا پیرا گراف نہیں بنایا۔

۴۴۴۔ ممتاز حسین اور رشید حسن خاں: ''ٹھہرایا''۔

۴۴۵۔ رشید حسن خاں نے نیا پیرا گراف نہیں بنایا۔

۴۴۶۔ رشید حسن خاں: ''نہیں، بڑا بُت میرا انصاف کرے گا''۔ اِس میں ''تو'' کی کمی بُری طرح کھٹکتی ہے۔

۴۴۷۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''ماتا'' کی بجائے ''ما'' ملتا ہے۔

۴۴۸۔ رشید حسن خاں: ''بڑا درجہ ہے''۔

۴۴۹۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں ''اُڑھ'' کی جدید اِملائی صُورت ''اوڑھ'' دکھائی دیتی ہے۔

۴۵۰۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں: ''اوڑھے ہُوئے دِہرے میں گیا۔''

۴۵۱۔ ہمارے مآخذی نُسخے میں ''موتی اور مونگا'' درج ہے، یعنی ''اور'' اضافی ہے۔

۴۵۲۔ رشید حسن خاں: ''جو پاس ہے''۔ یعنی ''ہے'' اضافی ہے۔

۴۵۳۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں: ''چھوٹے بڑے''۔

۴۵۴۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیرا گراف بنا دیا ہے۔

۴۵۵۔ رشید حسن خاں نے نیا پیراگراف نہیں بنایا۔

۴۵۶۔ کشفی اور رشید حسن خاں: ''برہم ہو کر اُٹھے''۔

۴۵۷۔ کشفی اور رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیراگراف بنا دیا۔

۴۵۸۔ رشید حسن خاں: ''بندگی، عجز و نیاز۔''

۴۵۹۔ رشید حسن خاں: ''رسالے دار''۔

۴۶۰۔ رشید حسن خاں نے نیا پیراگراف نہیں بنایا۔

۴۶۱۔ رشید حسن خاں: ''اور بڑی محنت اور خدمت کر رہے ہیں۔''

۴۶۲۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''چوروں'' کی بجائے ''چوٹٹوں'' درج ہے۔ مونیئر ولیمز: ''چوٹوں''۔

۴۶۳۔ رشید حسن خاں: ''لیکن۔''

۴۶۴۔ ممتاز منگلوری اور رشید حسن خاں کے ہاں ''حرام زادگی'' کی بجائے ''حرمزدگی'' درج ہے۔

۴۶۵۔ مونیئر ولیمز، عبدالحق اور رشید حسن خاں: ''ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہے''۔ ممتاز حسین کے ہاں ''ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہے گی۔''

۴۶۶۔ رشید حسن خاں نے ''کہ بلند تھا'' کو قوسین میں ڈال دیا۔

۴۶۷۔ عبدالحق اور ہنیز کے ہاں ''دوڑایا'' ہی درج ہے۔ ممتاز حسین کے ہاں ''دوڑایا'' کی بجائے ''بھیجا'' مِلتا ہے۔

۴۶۸۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیراگراف بنا دیا۔

۴۶۹۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں: ''کئی تھیلیاں اور اُس کے قبیلے کے پاس لے آیا۔'' اِن چاروں کی ہاں ''اور'' زائد ہے۔

۴۷۰۔ رشید حسن خاں نے نیا پیراگراف نہیں بنایا۔

۴۷۱۔ کشفی اور رشید حسن خاں: ''خواہ مخواہ''۔

۴۷۲۔ ہنیز، عبدالحق اور رشید حسن خاں: ''نہ معلوم ہُوا کہ باپ اور نوکر چاکر اور اسباب کہاں گئے۔''

۴۷۳۔ عبدالحق کے ہاں ''پڑا'' کی بجائے ''بَڑا'' درج ہے۔

۴۷۴۔ ہمارے مآخذی نُسخے میں کمپوزر کی غلطی سے یہاں اضافی طور پر چند الفاظ درج ہو گئے ہیں، جو اگلی سطر کا

حصہ ہیں۔

۴۷۵۔ ہمارے مآخذی متن میں یہ ایک سطر کمپوزر کی غلطی سے کچھ کی کچھ ہوگئی۔ عبدالحق کے ہاں ''کئی دن ایک گھر بھی'' درج ہے۔ بہت ممکن ہے اُن کے مآخذی متن میں بھی اِسی جگہ کوئی گڑبڑ پائی جاتی ہو۔

۴۷۶۔ دیگر نُسخوں میں ''پیٹ بھر کر کھاؤ'' درج ہے۔

۴۷۷۔ بنیز، عبدالحق اور ممتاز حسین نے نئے پیراگراف کا آغاز ''تب'' سے کیا ہے۔

۴۷۸۔ رشید حسن خاں نے نیا پیراگراف نہیں بنایا۔

۴۷۹۔ ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''ڈُبوا دیتا ہے۔''

۴۸۰۔ ''مارے بوجھ کے وہ ہرگز چل نہیں سکتا۔'' عبارت کا یہ ٹکڑا ہمارے مآخذی نُسخے کے علاوہ ایڈیشن ۱۲۶۸ھ میں بھی موجود ہے۔ ڈنکن فاربس، عبدالحق اور ابوالخیر کشفی کے مرتب کردہ متون اِس ٹکڑے سے خالی ہیں۔

۴۸۱۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیراگراف بنا دیا ہے۔

۴۸۲۔ فاربس، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیراگراف بنا دیا ہے۔

۴۸۳۔ رشید حسن خاں نے نیا پیراگراف نہیں بنایا۔

۴۸۴۔ دیگر نُسخوں میں اس لائین کا آغاز ''وہ عزیز تبسّم کر کے بولا'' سے ہوتا ہے۔ ہمارے مآخذی نُسخے میں ''وہ عزیز'' درج نہیں ہے۔

۴۸۵۔ ہمارے مآخذی نُسخے اور ایڈیشن ۱۲۶۸ھ میں ''ایک صندوق'' جب کہ دیگر نُسخوں میں ''ایک دوسرے صندوق'' درج ہے۔ رشید حسن خاں کے ہاں بھی ''ایک دوسرے صندوق'' ملتا ہے۔ جب کہ اِس سے قبل صندوقچے کا حوالہ آیا ہے، صندوق کا نہیں۔ اس لیے ''ایک دوسرے صندوق'' کا محل نہیں۔

۴۸۶۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''اور تابوت اور صندوق کو اندر لے چلے'' ملتا ہے۔ ابتدائی ''اور'' زائد ہے۔

۴۸۷۔ ''اوگن'' کے معنی ہیں بے ڈھنگا پن، عیب، بُرائی۔ واضح رہے کہ یہ لفظ دُنیا سے متعلق پنڈت کے تبصرے میں آیا ہے۔ عبدالحق اور ممتاز حسین نے ''اوگن'' کو ''آراگون'' اور رشید حسن خاں نے ''آواگون'' کر دیا۔ ''آراگون'' کے کوئی معنی نہیں۔ ''آواگون'' کے معنی وہ ہیں، جس کا محل نہیں۔

۴۸۸۔ فاربس، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''کہوں''۔

۴۸۹۔ دیگر تمام نُسخوں، بہ شمول رشید حسن خاں کے، ''تو بیاہ کاہے کو کیا تھا'' کی بجائے ''بیاہ کاہے کو کیا تھا'' مِلتا

ہے۔ اِس جُملے کا آغاز "اگر" سے ہُوا ہے اِس لیے "تو" کا آنا ازبس ضروری ہے۔ ہمارا ماٰخذی نُسخہ اِس کمی کا شکار نہیں۔

۴۹۰۔ کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں "آپ" کی بجائے "اب"۔

۴۹۱۔ ممتاز منگلوری اور رشید حسن خاں: "مغز کا گودا"۔ نامی کریمی (۱۹۱۸ء) میں: "مغز نکل پڑا"۔

۴۹۲۔ رشید حسن خاں: "تتیں"۔

۴۹۳۔ فاربس، کشفی اور رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیراگراف بنایا ہے۔

۴۹۴۔ رشید حسن خاں نے نیا پیراگراف نہیں بنایا۔

۴۹۵۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں یہاں سے نیا پیراگراف بنادیا گیا۔

۴۹۶۔ رشید حسن خاں: "خُرد سالی"۔

۴۹۷۔ عبدالحق، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں کے ہاں "شاہ بندر" کی بجائے "شاہ بندری" درج ہے۔ جو کسی طور درست نہیں۔ نامی کریمی (۱۹۱۸ء) اور فاربس کے ہاں "شاہ بندر" ہی ملتا ہے۔

۴۹۸۔ فاربس، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں "ساتھ" نہیں ملتا۔

۴۹۹۔ عبدالحق، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں: "مارا جاوے گا"۔

۵۰۰۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیراگراف بنادیا۔

سَیر تیسرے درویش کی :

۵۰۱۔ رشید حسن خاں نے جُملہ ءِ مُعترضہ کی اِس عبارت کو قوسین میں ڈال دیا۔

۵۰۲۔ کشفی اور رشید حسن خاں: "مہتاب کی سی صُورت"۔

۵۰۳۔ "باغ و بہار" مطبوعہ ۱۲۶۸ھ میں "چھیڑا" کی جگہ "چُھوا" درج ہے۔

۵۰۴۔ فاربس: "جنگل پہاڑ کیوں بستا ہے۔" عبدالحق: "بسایا ہے۔"

۵۰۵۔ فاربس، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں: "پیچھا لیا۔"

۵۰۶۔ رشید حسن خاں: "چھوڑ چھاڑ کر نکل جاوے گا۔" اِس مقام پر رشید حسن خاں نے نیا پیراگراف نہیں بنایا۔

۵۰۷۔ باغ و بہار (۱۲۶۸ھ) میں "راہ و رسم" درج ہے۔

۵۰۸۔ کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں ''بیپاریوں'' کا جدید اِملا ''بیوپاریوں'' ملتا ہے۔

۵۰۹۔ رشید حسن خاں نے نیا پیرا گراف نہیں بنایا۔

۵۱۰۔ رشید حسن خاں: ''کُل جان و مال سے حاضر ہوں۔''

۵۱۱۔ فاربس، ممتاز حسین، کشفی، رشید حسن خاں کے ہاں ''خواجہ سرا'' کی بجائے ''خواجہ'' درج ہے۔

۵۱۲۔ ڈنکن فاربس: ''یاری دروان''۔ مونیئر ولیمز اور عبدالحق: ''بارے درون''۔ ممتاز حسین: ''دربان'' اور کشفی: ''بارے باری داروں''۔

۵۱۳۔ رشید حسن خاں: ''کھڑیں تھیں۔''

۵۱۴۔ ''باغ و بہار'' طباعتِ اوّل ۱۸۰۴ء: ''پارچہ پوشا کی اور تحفہ اپنے ساتھ لے گیا تھا، جب کئی کشتیاں حضور میں چُنیں گئیں۔'' رشید حسن خاں: ''پارچہ، پوشا کی اور تحفے اپنے ساتھ لے گیا تھا، سب کی کشتیاں حضور میں چُنیں گئیں۔''

۵۱۶۔ کشفی اور رشید حسن خاں: ''اُسی خواجہ کے ساتھ۔''

۵۱۷۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں ''وہی'' کی بجائے ''وہ'' ملتا ہے، جب کہ ''وہی'' کا محل ہے۔

۵۱۸۔ ہمارے مآخذی نُسخے میں کمپوزنگ کی غلطی سے ''قریب'' کی بجائے ''قربت'' درج ہو گیا ہے۔

۵۱۹۔ ''باغ و بہار'' طباعتِ اوّل ۱۸۰۴ء میں بھی ''شان شوکت'' واو عطف کے بغیر ہے۔ فاربس اور عبدالحق کے ہاں ''شان و شوکت'' درج ہے۔

۵۲۰۔ دیگر نُسخوں میں: ''ایک جوانِ حسین نظر آیا۔''

۵۲۱۔ ''باغ و بہار'' (۱۲۶۸ھ) میں ''نہتھے'' کی بجائے ''مُخنی'' درج ہے۔

۵۲۲۔ ''قفس'' کا قدیم اِملا ''قفص'' ہے۔ ہمارے مآخذی نُسخے میں ''ص'' کے ساتھ درج ہے۔ دیگر نُسخوں میں اُس کی جدید اِملائی صُورت یعنی ''قفس'' ملتی ہے۔

۵۲۳۔ رشید حسن خاں: ''شہزادہ۔''

۵۲۴۔ رشید حسن خاں: ''یہ تماشا بھی دیکھ لیں۔''

۶۲۵۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیرا گراف بنا دیا۔

۵۲۶۔ رشید حسن خاں کے ہاں نیا پیرا گراف نہیں ملتا۔

۵۲۷۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''دوکاندار'' کی جدید املائی صُورت ''دُکاندار'' اور ''دوکانیں'' کی جدید املائی صورت ''دکانیں'' درج ہے۔

۵۲۸۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیرا گراف بنادیا۔

۵۲۹۔ رشید حسن خاں: ''اپنے وہاں جانے کی''۔

۵۳۰۔ سوائے ہمارے مآخذی نسخے کے، ہر ایک کے ہاں ''پڑھیں'' درج ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ رشید حسن خاں نے ''فاتحہ پڑھی'' کی بجائے ''فاتحہ پڑھیں'' کو درست ثابت کرنے کے لیے یہ تک لکھ دیا کہ ''چونکہ فاتحہ میں کئی چیزیں پڑھی جاتی ہیں، فعل جمع لایا گیا۔''

۵۳۱۔ رشید حسن خاں نے نیا پیرا گراف نہیں بنایا۔

۵۳۲۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیرا گراف بنایا ہے۔

۵۳۳۔ ''باغ و بہار'' (۱۲۶۸ھ) میں ''شام ہو'' درج ہے۔

۵۳۴۔ رشید حسن خاں نے نیا پیرا گراف نہیں بنایا۔

۵۳۵۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیرا گراف بنادیا۔

۵۳۶۔ ''باغ و بہار'' طباعت اوّل ۱۸۰۴ء، فاربس، عبدالحق اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''ستھوارا'' درج ہے۔

۵۳۷۔ فاربس، مونیئر ولیمز، عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''دِلا''۔

۵۳۸۔ کشفی اور رشید حسن خاں: ''کلیجا''۔

۵۳۹۔ کشفی اور رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیرا گراف بنایا ہے۔

۵۴۰۔ دیگر نُسخوں، بہ شمول رشید حسن خاں کے: ''بادشاہوں کی لونڈی غلام ہیں۔''

۵۴۱۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں ''نباہ'' درج ہے، جس کا محل نہیں۔

۵۴۲۔ دیگر نُسخوں، بہ شمول رشید حسن خاں کے: ''زرخرید''۔

۵۴۳۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں ''اپنے فدوی'' درج ہے۔ جو سراسر غلط ہے۔

۵۴۴۔ ''باغ و بہار'' طباعت اوّل (۱۸۰۴ء)، فاربس اور عبدالحق کے ہاں: ''اب جب تلک مزاج شریف چاہیے'' درج ہے، جو کسی طور درست نہیں۔

۵۴۵۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیراگراف بنایا ہے۔

۵۴۶۔ رشید حسن خاں نے نیا پیراگراف نہیں بنایا۔

۵۴۷۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیراگراف بنایا ہے۔

۵۴۸۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں: ''خاطر جمع کر''۔

۵۴۹۔ رشید حسن خاں نے نیا پیراگراف نہیں بنایا۔

۵۵۰۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیراگراف بنایا ہے۔

۵۵۱۔ فاربس، عبدالحق، کشفی اور رشید حسن خاں: ''پیش آئی کہ''۔

۵۵۲۔ دیگر نُسخوں، بہ شمول رشید حسن خاں: ''تلاش''۔

۵۵۳۔ رشید حسن خاں: ''رُقعہ''۔

۵۵۴۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیراگراف بنایا ہے۔

چوتھے درویش کی سَیر :

۵۵۵۔ ڈنکن فاربس اور عبدالحق: ''سیر چوتھے درویش کی۔''

۵۵۶۔ اِس مصرع میں اگر ''یہاں'' درج کیا جائے تو مصرع بے وزن ہو جائے گا۔ ہمارے مآخذی نُسخے میں بھی ''یہاں'' درج ہے جسے ہم نے ''یاں'' سے بدل دیا۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''یہاں'' ملتا ہے۔ یُوں مصرع خارج از وزن ہو جاتا ہے۔

۵۵۷۔ عبدالحق اور ممتاز حسین کے ہاں ''کہ'' نہیں مِلتا۔ جب کہ اِس ایک ہی جُملے میں اگلا ٹکڑا والد کی وفات سے متعلق بیان پر مُشتمل ہے لہٰذا ''کہ'' کا آنا ضروری تھا۔

۵۵۸۔ اس عبارت کے جُملہ ءمُعترضہ: ''جو میرے چچا ہیں'' کو رشید حسن خاں نے قوسین میں ڈال دیا۔

۵۵۹۔ کشفی کے ہاں: ''اس بندوبست اور سلوک'' درج ہے۔

۵۶۰۔ یہاں سے رشید حسن خاں نے نیا پیراگراف بنا دیا ہے۔

۵۶۱۔ ''باغ و بہار'' طباعت اوّل: ۱۸۰۴ء، فاربس اور رشید حسن خاں: ''اَدنا سہیلی''۔

۵۶۲۔ رشید حسن خاں اور کشفی کے ہاں: ''پانچوں اُنگلیوں۔''

۵۶۳۔ رشید حسن خاں: ''مجھے ساتھ لیا محل میں پہنچا دیا۔''

۵۶۴۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں: ''سانپ پھر گیا''۔

۵۶۵۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیراگراف بنایا ہے۔

۵۶۶۔ رشید حسن خاں: ''میں اپنے دل میں''۔

۵۶۷۔ رشید حسن خاں: ''میموں۔''

۵۶۸۔ رشید حسن خاں نے ملک صادق کے بعد کی عبارت: ''جو بادشاہ جنوں کا ہے'' کو قوسین میں ڈال دیا۔ نیز نیا پیراگراف نہیں بنایا۔

۵۶۹۔ رشید حسن خاں: ''کئی طرح کی تحفہ۔''

۵۷۰۔ رشید حسن خاں: ''اِتنی محنت کچھ نیک نہ لگی''۔ کسی طور درست نہیں۔

۵۷۱۔ فاربس، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں نے ''سے'' کی بجائے ''ماچین کی'' درج کیا ہے۔

۵۷۲۔ رشید حسن خاں نے عبارت کا یہ حصہ: ''جو بجائے ابوجہل کے تھا'' کو قوسین میں ڈال دیا۔

۵۷۳۔ رشید حسن خاں: ''اے شہزادے! جنوں کا لشکر کیا نہیں دیکھتا؟'' یعنی ''تو'' ندارد۔

۵۷۴۔ رشید حسن خاں: ''سُر ے دانی''۔

۵۷۵۔ دیگر نسخوں، بہ شمول رشید حسن خاں میں: ''چیلے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔'' جملہ مرتبین نے ''چپکے'' کو ''چیلے'' پڑھا جب کہ ''چیلے'' کی یہاں کوئی جگہ نہیں بنتی۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری نے البتہ ''چپکے'' درج کیا ہے۔

۵۷۶۔ کشفی اور رشید حسن خاں: ''حق یاد کر کے۔''

۵۷۷۔ رشید حسن خاں: ''ملک صادق''۔

۵۷۸۔ فاربس، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں: ''بچارا''۔

۵۷۹۔ ''باغ و بہار'' (۱۲۶۸ھ): ''بخوبی و دیانت داری''۔

۵۸۰۔ ڈنکن فاربس، ممتاز حسین، کشفی، ممتاز منگلوری اور رشید حسن خاں: ''اپنی سعادت دونوں جہان کی سمجھے گا''، یعنی عبارت کچھ کی کچھ ہو گئی۔

۵۸۔ رشید حسن خاں: ''تلک'' کی بجائے ''تک''۔

۵۸۲۔ کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں ''تالاش'' کا جدید اِملا ''تلاش''۔

۵۸۳۔ کشفی اور رشید حسن خاں: ''سرانجام ہُوئی تو''۔

۵۸۴۔ فاربس، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں: ''میں اُس کے پیچھے لگ لیا''۔ اِس بیان کو مکمل پڑھنے سے اندازہ ہوگا کہ ہمارا مآخذی نُسخہ درست ہے۔ آگے چل کر اِسی انداز میں سکتہ ڈال کر بات کی گئی ہے: ''وہ اُس کے اندر گیا، میں بھی چلا۔''

۵۸۵۔ رشید حسن خاں نے نیا پیرا گراف نہیں بنایا۔

۵۸۶۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیرا گراف بنا دیا۔

۵۸۷۔ رشید حسن خاں: ''تھا'' ندارد۔

۵۸۸۔ دیگر نُسخوں، بہ شمول رشید حسن خاں: ''میں پُکارا''۔

۵۸۹۔ ہمارے مآخذی نُسخے میں واضح طور پر ''اٹھواٹی کھٹواتی'' درج ہے۔ ''جامع اللغات'' از خواجہ عبدالمجید میں ''اٹواٹی کھٹواٹی'' اور ''اٹواٹ کھٹواٹ'' ملتے ہیں۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں ''اٹھواٹی کھٹواٹی'' درج ہے۔

۵۹۰۔ رشید حسن خاں: ''بیاہا ہی چاہیے۔''

۵۹۱۔ رشید حسن خاں: ''دونوں''۔

۵۹۲۔ رشید حسن خاں: ''دُھوم دھام''۔

۵۹۳۔ فاربس، کشفی اور رشید حسن خاں کے ہاں ''بھونڈ پَیری'' درج ہے، جو سراسر غلط ہے۔ بھُنڈ (ہندی۔ صفت) بدشگون۔ منحوس۔ نحس۔ بھُنڈ پیری: جس کے آنے سے نحوست پھَیل جائے۔ سبز قدم۔ منحوس۔ کم بخت (جامع اللغات)

۵۹۴۔ کشفی اور رشید حسن خاں: ''معلوم نہیں ہوتا''۔ عبارت پر نظر ڈالیں تو اِس مقام پر ''ہوتا'' کا لفظ اضافی معلوم ہوتا ہے۔ درست عبارت یُوں ہے: ''کچھ اسرار معلوم نہیں اور مجھے بھی ہرگز اطلاع نہیں'' ہمارے مآخذی نُسخے میں ''ہوتا'' درج نہیں۔

۵۹۵۔ فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں: ''بھوٹے مکان''۔

۵۹۶۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''دوکان'' کا جدید اِملا ''دُکان'' مِلتا ہے۔

۵۹۷۔ فاربس، عبدالحق اور کشفی کے ہاں بھی ''سر چھپاوے'' درج ہے۔ ممتاز منگلوری اور رشید حسن خاں نے جانے کِس بنیاد پر اِسے ''سَر چُھپاوے'' کردیا۔ یہاں سَر چُھپانے کا محل نہیں۔

۵۹۸۔ کشفی اور رشید حسن خاں: ''کھانا بھی مزے دار۔''

۵۹۹۔ رشید حسن خاں: ''جو میری قسمت میں بدا ہوگا، سو ہوگا''۔ یہاں ''میں'' اضافی ہے۔ ہمارے مآخذی نُسخے میں ''بدا'' کی قدیم اِملائی صورت ''بدھا'' ملتی ہے۔

۶۰۰۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیرا گراف بنا دیا۔

۶۰۱۔ ہمارے مآخذی نُسخے میں ''گوٹا کناری اور'' درج نہیں، لیکن اِس کا محل ہے۔ اس لیے یہاں ہم نے ڈنکن فاربس کی پیروی کی ہے۔

۶۰۲۔ ہمارے مآخذی نُسخے میں: ''سر'' کمپوز ہونے سے رہ گیا، جس کا اضافہ کیا گیا ہے۔

۶۰۳۔ کشفی اور رشید حسن خاں: ''نوالہ''۔

۶۰۴۔ کشفی اور رشید حسن خاں: ''آج اپنی لڑکی سے تیرا نذکور کروں گا۔''

۶۰۵۔ رشید حسن خاں اور کشفی: ''اور کہا کہ''۔

۶۰۶۔ ''باغ و بہار'' طباعتِ اوّل (۱۸۰۴ء)، عبدالحق اور رشید حسن خاں: ''خُدا کی حفظ و امان میں سونپا''۔

۶۰۷۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیرا گراف بنا دیا۔

۶۰۸۔ رشید حسن خاں: ''ڈولی''۔ فاربس، عبدالحق اور کشفی کے ہاں: ''ڈولے''۔

۶۰۹۔ رشید حسن خاں: ''عیش کرلوں''۔ اِس مقام پر ''صبر کروں''، ''جیوں یا مروں'' کے ساتھ ''عیش کروں'' کی مناسبت ہے۔

۶۱۰۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیرا گراف بنا دیا۔

۶۱۱۔ کشفی اور رشید حسن خاں: ''بارے اُس کے ڈرانے اور سمجھانے سے میں حیران ہو کر چُپکا ہو رہا''۔

۶۱۲۔ دیگر نُسخوں، بہ شمول رشید حسن خاں کے: ''غُل شور''۔

۶۱۳۔ دیگر نُسخوں، بہ شمول رشید حسن خاں کے: ''شکر خُدا کا، ہماری محنت نیک لگی۔'' اِس سے قبل بھی ''نیگ'' کا لفظ ملتا ہے، جسے دیگر مُرتّبینِ ''باغ و بہار'' نے ''نیک'' درج کیا ہے۔

۶۱۴۔ ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں: ''دیکھو، کِس کِس محنتوں''۔

۶۱۵۔ فاربس، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں: ''جب نزدیک جا پہنچے''۔

۶۱۶۔ عبدالحق: ''سری پاؤ''۔ رشید حسن خاں: ''سرے پاؤ''۔ اِن دونوں لفظوں کے کوئی معنی نہیں۔ بے معنی لفظ ہیں۔ عبدالحق اور رشید حسن خاں نے فرہنگ میں اِس کے معنی درج نہیں کیے۔

۶۱۷۔ فاربس: ''چوڈول''۔

۶۱۸۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیراگراف بنا دیا۔

۶۱۹۔ فاربس، ممتاز حسین، کشفی اور رشید حسن خاں: ''کیوں تُو اپنی جان''۔

۶۲۰۔ دیگر نُسخوں، بہ شمول فاربس، عبدالحق، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں کے: ''کِس کے بُرجِ حمل سے نمودار ہُوا۔'' یہاں ''کے'' درج کرنے کا کوئی جواز نہیں۔

۶۲۱۔ ہمارے مآخذی نُسخے میں کمپوزنگ کی غلطی سے ''اپنے'' سے پہلے ''تو'' درج ہو گیا۔

۶۲۲۔ رشید حسن خاں کے ہاں ''جُھونے لگیں'' درج ہے۔ جو نوبت بجنے کے حوالے سے بے معنی ہے۔

۶۲۳۔ رشید حسن خاں نے یہاں سے نیا پیراگراف بنا دیا۔

۶۲۴۔ فاربس، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں: ''اپنا لہو پیتے تھے'' نیز یہاں سے اُنھوں نے نیا پیراگراف نہیں بنایا۔

۶۲۵۔ رشید حسن خاں کا نیا پیراگراف یہاں سے شروع ہوتا ہے۔

۶۲۶۔ ہمارے مآخذی نُسخے میں ''نَورَتن'' کی بجائے ''نور'' درج ہے۔ کمپوزنگ کی غلطی سے بقیہ حصہ رہ گیا۔

۶۲۷۔ فاربس اور ممتاز حسین کے ہاں ''تخت کے مانند''۔

۶۲۸۔ رشید حسن خاں نے نیا پیراگراف بنایا ہے۔

۶۲۹۔ رشید حسن خاں: ''اِس فرمان کو دیکھتے ہی''۔

۶۳۰۔ رشید حسن خاں: ''نام نشان''۔

۶۳۱۔ رشید حسن خاں: ''پاس لائے''۔

۶۳۲۔ فاربس، ممتاز حسین، رشید حسن خاں: ''دیکھیں گے تو''۔

۶۳۳۔ فاربس، ممتاز حسین، رشید حسن خاں: ''اب ہمارے تمھارے ملاقات ہوئی''۔

۶۳۴۔ فاربس، ممتاز حسین، رشید حسن خاں: ''مانندِ شکر شیر''۔

۶۳۵۔ فاربس، ممتاز حسین، رشید حسن خاں: ''غم غصہ''۔

۶۳۶۔ ''جس کے واسطے شہزادہ، مُلک نیمروز کا گاؤ سوار ہو کر سودائی بنا تھا'' کو رشید حسن خاں نے قوسین کے سپرد کر دیا ہے۔

۶۳۷۔ ''جو ملک صادق کے قبضے میں تھی'' کو رشید حسن خاں نے قوسین کے سپرد کر دیا ہے۔

۶۳۸۔ رشید حسن خاں و ممتاز حسین کے ہاں ''وہ سب'' نہیں، صرف ''سب'' مِلتا ہے۔

۶۳۹۔ فاربس، ممتاز حسین اور رشید حسن خاں کے ہاں ''چہاردہ معصوم علیہم الصّلوٰۃ وَالسّلام'' کے بعد ''کے'' بھی درج ہے۔ جب کہ اِبتداء میں ''بہ طُفیل'' یہی معنی دے رہا ہے۔

خاتمہء کتاب میں :

۶۴۰۔ ہمارے مآخذی نُسخے (نسخہ فیض اللہ، ایڈیشن ۱۸۴۳ء) میں اِس عُنوان کے تحت نثری حصہ: ''جب یہ کتاب ..... تا ..... ہمیشہ سر سبز رہے گا۔'' شامل نہیں، اشعار البتہ موجود ہیں۔ مونیئر ولیمز، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر ممتاز منگلوری اور رشید حسن خاں نے اسے شاملِ کتاب کیا ہے۔

O

فرہنگِ باغ و بہار

آ

آب دار : پانی پلانے والا ملازم۔ بادشاہوں یا اُمراء کے ہاں پانی سے متعلق سامان کی سنبھال اور پانی پلانے کی خدمت اسی کے سپرد ہُوا کرتی تھی۔

آب دار خانہ: بادشاہوں یا اُمراء کے ہاں مطبخ میں پانی کے انتظام سے متعلق ایک مُستقل شعبہ۔

آبِ رَواں: باریک اور سفید ململ کی ایک قِسم۔ اِس سے کُرتے بنائے جاتے تھے۔

آبشورہ: لیموں اور شکر کا شربت، جسے شورہ میں رکھ کر ٹھنڈا کیا جائے۔ ہاضمہ درست رکھنے کے لیے زِیرہ اور سُونٹھ مِلا کر عام طور پر کھانے کے بعد پیا جاتا ہے۔ بغیر زیرہ اور سُونٹھ کے ہو تو اسے ''آبشورہ'' یا ''افشرہ'' کہتے ہیں۔ سُونٹھ ملے آبشورہ کو ''جَل سُونٹھ'' بھی کہا جاتا ہے۔ بعض مقامات پر ''کھٹومر'' اور ''جل زیرا'' بھی کہلاتا ہے۔

آب و دانہ: دانہ پانی، رزق، روزی۔

آپ بھی قصد دمشق کا کرو : اِرادہ دمشق جانے کا کرو۔ آپ کے ساتھ کرو کا استعمال جائز نہیں۔ بے تکلفی کی فِضا قائم کرنے کے لیے آج کل یہ صُورت دوبارہ دیکھنے کو مل رہی ہے۔ خاص طور پر پاکستان کے دولت مند طبقہ میں۔

آتما کے درد سے : آتما دل، رُوح۔ مُراد دِلی محبت سے مجبور ہو کر۔

آٹھ پہر : ہردَم، ہر وقت۔ قدیم وقتوں میں چوبیس گھنٹوں کی جگہ دن اور رات کو آٹھ حصوں میں بانٹا گیا تھا۔

آخِرش : آخرکار۔

آخور: رڈی، بے مصرف۔ گھوڑے کی جُھوٹی گھاس، جسے بے کار کہا جائے۔

آدانت: اِبتدا سے اِنتہا تک۔ ہمیشہ ہمیشہ کے۔

آدمی کا شیطان آدمی ہے : آدمی، آدمی ہی کی صُحبت سے بگڑتا ہے۔

آدمی نہتھے کی : نہتے آدمی کی، خالی ہاتھ آدمی کی۔

آدینہ : روزِ جمعہ۔

آذربائیجان: ایران کا مشہور صُوبہ۔ جس کے ایک حصّے پر رُوس نے قبضہ کرلیا تھا۔ اس صُوبے کے مشہور شہروں میں تبریز، مراغہ اور آردبیل جیسے قدیمی شہر تھے۔

آرتی: ہندوؤں کی پُوجا پاٹ کی ایک رسم، جس میں دیوتاؤں کے سامنے پنج مُکھیا دیا پھرایا جاتا ہے۔

آرزُو کمال ہے : بہت آرزُو ہے۔ حد سے بڑھی ہوئی خواہش ہے۔

آڑے آوے : مدد کے لیے آئے، مددگار رہے۔

آزر : حضرت ابراہیمؑ کے والد (جامع اللغات) اپنے زمانے کے مشہُور بُت تراش۔

آزُقہ : تھوڑی سی خوراک۔ میر امّن نے کہیں ''آزُقہ'' اور کہیں ''آذوقہ'' لکھا ہے۔ (''آٹھ دن کا آزقہ دے جاتی ہوں''۔ ''آذوقہ پہنچے تو اُس کا دم بچے۔'')

آسَن: اَستھان، وہ جگہ جہاں فقیر یا جوگی رہتے ہیں۔

آشُفتہ : پریشان، بدحواس۔

آشنائی کی راہ سے : دوستی کے بھروسے، دوستی کے طریق پر۔

آغا : آقا، مالک، بڑا بھائی۔ مُغلوں کے نام سے پہلے استعمال ہوتا ہے۔

آفتاب دو نیزے پر بُلند ہُوا : دن چڑھ گیا، دُھوپ پھیل گئی۔

آفتابہ : اُونچی ٹونٹی کا ڈھکن دار لوٹا، جو نیم گرم پانی سے بھر کر مُونہہ ہاتھ دُھلانے کے کام آتا تھا۔ اس میں پکڑنے کو دستی لگی ہوتی تھی اور عام طور پر تانبے کا بنا ہوتا تھا۔

آگا پیچھا کرنا : تامُّل کرنا، ہچکچانا۔

آگ بگُولا : مُجسّم غضب۔

آگے : زمانۂ سابق میں، اب سے پہلے، پچھلے زمانے میں۔

آگے حدِّ ادب : ادب مانع آرہا ہے، کیا عرض کروں۔ یہاں وضاحت کی جگہ اِشارے نے لے لی ہے۔

آگے ہی : پہلے ہی۔

آگیا : حُکم، فرمان، ہدایت، اِرشاد (جامع اللغات)، اجازت۔

آلت : مرد کا عُضوِ تناسُل۔

آلتمغا : سندِ شاہی۔

آمد : آمدنی، آنے کی خبر (آمدن کا حاصل مصدر)۔

آمنا : بے شک، ہم تصدیق کرتے ہیں۔ آمنا وصدّقنا : ہم ایمان لائے، ہم نے تصدیق کی۔

آنا کانی دینا یا کرنا: جان بوجھ کر ان جان بننا، آنکھ بچانا، چشم پوشی کرنا، موقع دینا۔

آنچل پلو : مُقیش کی جھالر جو بھاری جوڑوں کے دوپٹے کے کناروں پر ٹانکتے ہیں۔

آنسوں : آنسو کا قدیم اِملا۔

آنکھیں پتھرا جانا : آنکھوں کا بے حس و حرکت ہو جانا۔

آنکھیں کُھل گئیں : دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا، حیران رہ گیا۔

آنند : خوشی، راحت، اطمینان۔

آنول نال : نومولود (بچّے) کی ناف جو انتڑی کی طرح بڑھی ہوئی ہوتی ہے، جسے دائی کاٹ دیتی ہے۔ ''وہ نکیا، جو بچّے کے پیدا ہونے کے وقت اُس کے ساتھ لگی ہوتی ہے، جسے کاٹ کر دفن کر دیتے ہیں۔'' (جامع اللغات) کٹا ہُوا نال عام طور پر گھر کے صحن میں گاڑا جاتا ہے دِلّی میں جس عورت کے بچّے زندہ نہ رہتے ہوں، وہ گھر کے باہر بھی دَبوا دیتی تھی۔ ''جب کہتے ہیں کہ فلاں شخص کا آنول نال وہاں گڑا ہے، تو اُس سے یہی مراد ہوتی ہے کہ وہ اُس کا مقامِ پیدائش ہے۔'' (آصفیہ)

آویزہ : عورتوں کے کان کا زیور، کان لٹکن۔ لیکن یہاں مُراد ہے ایسا جواہر، جو خنجر کے دستے کے ساتھ لٹک رہا ہو اور ہلکی سی جُنبش کے ساتھ جھلمِل کرتا ہو۔

آہستے سے : آہستہ سے۔

آئین : قاعدہ، طور طریقہ، دستُورالعمل۔

آئینہ بندی: اصل میں ''آئین بندی'' ہے۔ مُراد آراستگی، سجانا، چراغاں کرنا۔

ا

اِبراہیم ادہَم : بلخ (افغانستان) کے قدیمی شہر کے ایک باعمل صُوفی، زاہد ۷۷۶ عیسوی تا ۷۸۲ عیسوی کے بیچ

وفات پائی۔ افسانوی روایت یہ ہے کہ بادشاہ تھے اور ایک عبرتناک خواب دیکھ کر فقیر ہو گئے۔ میر امّن نے بھی اِسی حوالے سے اُن کا ذکر کیا ہے۔

اب کا: ابھی، اِسی وقت۔

اب مزید کرو : دستر خوان اُٹھا دو۔

اِبنا : بیٹے۔ اِبن کی جمع۔

اَبُوجہل : اَبُو (عربی) باپ۔ جہل (عربی) جہالت، جاہلانہ ضِد۔ مُراد : سخت حاسِد، دشمن، ہٹ دَھرم۔ شہر مکّہ کا ایک مشہور کافر، جس کا نام ابوالحکم عمر بن ہشام بن المغیرہ تھا۔ اُسے رسولِ اکرمؐ سے سخت عداوت تھی۔ آپ کی تکالیف کا باعث یہی شخص تھا۔ حضورؐ نے اسے ''اَبُوجہل'' قرار دیا تو اُس کی یہ کنیت، نام کی جگہ مشہور ہو گئی۔ جنگِ بدر میں قتل ہُوا۔

ابھرن : زیور، گہنے۔

ابھی دِلّی دُور ہے : ابھی مقصد پُورا ہوتا نظر نہیں آتا۔

اپچی ہتھیاروں سے لیس۔ اوپچی۔

اُپرالا کرنا : اُپرالا (ہندی) مدد۔ مدد، طرف داری کرنا۔ حفاظت کرنا۔

اپڑنا : اُکھڑنا، نشان پڑنا۔

اپنی جوگا : جوگا (پنجابی) قابل، لائق۔ اپنے لائق۔

اپنے تئیں : ''باغ و بہار'' میں یہ لفظ مجھے، ہمیں اور اپنے آپ کو، کے مفہوم میں برتا گیا ہے۔ جیسے: ''اپنے تئیں بھی ایک روز مرنا ہے''، ''اپنے تئیں سب سے بہتر سمجھتا ہے۔'' ''اپنے تئیں تھانبا''۔ اگر آج اپنے تئیں مقدور ہوتا۔''

اپنے شعور سے : اپنی سمجھ بُوجھ سے۔

اُتارا : ٹھکانہ، پڑاؤ۔ ع ہو گا لبِ جُو شام کے لشکر کا اُتارا (انیس)

اُتارن : پہنا ہُوا لباس، نیا ہو یا پُرانا۔

اَتالیق : گھر پر آ کر درس دینے والا۔ اُمراء کے بچّوں کو اُن کے گھر پر تعلیم و تربیت دینے والا اُستاد۔

اَتاول : جلدی۔ پنجابی میں ''اتول'' ہے۔ جو شخص جلدی میں ہو، اُسے ''اتولا'' کہتے ہیں۔

اِتنے گرم یا ایسے ٹھنڈے : کبھی تو ہم بستر ہونے کے لیے مچلتے تھے اور اب یکلخت ٹھنڈے پڑ گئے۔ یہاں میر امّن نے گفتگو کو عُریانیت کی حد میں نہیں جانے دیا۔

ماڑی : کوٹھا، بالا خانہ۔ چکلے میں طوائف کے بیٹھنے کا مقام۔

اٹکل : اندازہ۔

اٹکلنا : اندازہ لگانا۔

اُٹھائی گیرا : اُچکا، بازار میں سے آنکھ بچا کر چیزیں چُرا لے جانے والا۔

اَٹھواتی کھٹواتی لے کر پڑنا : غُصّے یا غم کے سبب الگ تھلگ ہو کر پڑ رہنا۔

اَٹھواڑے میں : کسی دن سے آٹھواں دن (جامع اللغات)۔

اَجر : نیک کام کا بدلہ، ثواب۔

اَجل گرِفتہ : جو مَرنے کے قریب ہو۔

اجھلنا : اُنڈیلنا۔

اَچھوانی : اجوائین اور سُونٹھ کا حریرہ، جو گرمائش پہنچانے اور طاقت میں اضافے کے لیے زچّہ کو دیا جاتا ہے۔ اِسی مناسبت سے اسے ''اَجوانی'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں ذائقے کے لیے شکر یا چینی مِلا دی جاتی ہے۔

اِحتیاج : غرض، حاجت، ضرورت۔

اَحدی ماہر تیرانداز۔ کہا جاتا ہے کہ یہ نام مغل بادشاہ جلال الدین اکبر نے مخصوص تیراندازوں کو دیا۔

احمد شاہ دُرّانی : احمد شاہ اَبدالی (افغان بادشاہ) جس کے ''دُرِ دُرّین'' لقب اختیار کرنے کی وجہ سے ''دُرّانی'' بھی کہا جاتا ہے۔

اِختلاط : میل جول، راز و نیاز، بے تکلفی، دوستانہ۔

اَخگر : چنگاری۔

اَدَچِّہ : بالا پوش۔ وہ کڑھائی کردہ یا رِیشم سے بُنی ہوئی چادر، جسے زیبائش کے لیے پلنگ کے اوپر بچھی ہوئی چادر پر بچھاتے ہیں۔

اَدھار : ''اِتنی غذا، جس سے بُھوک جاتی رہے لیکن سیری نہ ہو'' (جامع اللغات) مُراد تھوڑی سی غذا کا سہارا

اَدھ مُوا : نیم مُردہ، مرنے کے قریب۔

اَدھی : آدھی دمڑی، معمولی رقم، پُرانے پیسے کا آٹھواں حصّہ۔

اُدھیانا : اُڑ جانا، اُڑایا جانا، اُچھل جانا۔

ارجمند : پیار کے قابل، خوش باش۔

اُردابیگنی : ''مردانہ لباس پہنے ہوئے ہتھیار بند عورت، جو شاہی محلوں میں چوکی پہرا دیتی تھی۔'' (آصفیہ) ہندی میں اسے ''تُرکنی'' اس لیے کہا جاتا تھا کہ وہ تُرک ہوتی تھی اور حرم کی حفاظت اور انتظام پر مامور ہوتی تھی۔

اُردو کے لوگ : اُردو (تُرکی) بمعنی لشکر۔ فوج کے سپاہیوں کے علاوہ، وہ لشکری، جو قلعے کے اطراف میں رہتے تھے۔

اُردوے مُعلاّ کی زُبان : ''دِلّی کی فصیح اور مُستند اُردو'' (جامع اللغات) زبان دانی کے حوالے سے میر تقی میر کے بیٹے میر کلّو عرش کا ایک شعر ہے :

ہم ہیں اُردو ے مُعلاّ کے زباں داں اے عرش
مُستند ہے ، جو کچھ اِرشاد کیا کرتے ہیں

ارزق : نیلا۔

ارکان : رُکن (عربی) کارندہ، کسی جماعت کا ممبر حکومت کے عہدہ دار، امیر وزیر۔ ارکانِ دولت: حکومت کے سردار، امیر وزیر۔

اریب : آڑا ترچھا۔

اِڑیا : پہنا۔ (پیر میں جُوتا اُڑسا)۔

اَزبسکہ : چُونکہ۔ ''باغ و بہار'' میں یہ کلمہ ''بہت زیادہ'' کے معنوں میں بھی برتا گیا ہے۔

اَزدحام: بھیڑ، انبوہ، ہجوم، جمِ غفیر (جامع اللغات)۔

اَسباب گُزارے کا : وہ وسیلہ، جس کی مدد سے دریا کے پار اُترا جا سکے۔ جیسے کشتی یا پُل۔

اِستاد : ''اِستادن'' مَصدر کا ماضی۔ یعنی کھڑا کرنا۔

اِستادے: خیمے کے بانس، چُوبیں یا کھمبے، جن پر شامیانہ کھڑا کیا جاتا ہے۔

(جڑاؤ اِستادے : ایسے کھبے، جن میں جواہرات ٹکے ہوں)

اُستُخواں : ہڈّی

اِستدعا کر : استدعا (عربی) گزارش، اِلتجا۔ مُراد ہے : درخواست کر کہ وہ آئے۔

اِستَری : عورت، بیوی۔

اِستغفار : بخشش چاہنا، توبہ کرنا۔

اِستفسار : سوال کرنا، پُوچھنا۔

اِستقامت کا مکان : قیام گاہ۔

اِستقلال : مضبوطی، مُستقل مزاجی۔

اِستنبول : تُرکی کا مشہور زمانہ تاریخی شہر قسطنطنیہ۔ ''دراصل اسلامبول کا مُخفف ہے'' (جامع اللغات)۔

اَستھان : جائے قیام۔ سادھو، سنتوں کے رہنے کی جگہ۔ مَسکن، آستانہ (جامع اللغات)۔

اِسرار : پنہاں رکھنا، بھید چُھپانا، جن یا پَری کا سایہ، آسیب (جامع اللغات)۔

اِس کا عِوض بالفعل ہم سے نہیں ہوسکتا : فی الوقت ہم اِس کا عِوض (بدلہ) نہیں دے سکتے۔

اِسفندیار : قدیم ایران کا ایک بادشاہ۔

اِسمِ اَعظم: اللہ کا بزرگ تر نام۔ مسلمانوں کے نزدیک ''اللہ''، ہندوؤں کے نزدیک ''اَوم''، یہودیوں کے نزدیک ''جیہودا''۔

اِسم با مُسمّٰی : جیسا نام، ویسا کام۔

اِسہال : پیٹ چلنا۔ ڈنکن فاربس نے اس کے معنی Loosening بتائے ہیں۔

اِسے : ''اِس سے'' کا قدیم اِملا۔

اَسیر : وہ بچّہ، جس کی ماں مرچکی ہو۔ بہت ممکن ہے امّن نے ''اَسیرِ بَلا'' کے مخفف کے طور پر برتا ہو، جس کے معنی ''مُصیبت زدہ'' کے ہیں۔

اِشارَت : اشارہ۔ اِن ہی معنی میں یہ لفظ پنجابی میں بھی مُستعمل ہے۔

اَشرف الاشراف: شُرفاء میں سب سے نمایاں۔ شریفوں میں سب سے شریف۔

اَشرفُ البلاد : شہروں میں سب سے بہتر شہر۔

اُصاغر : چھوٹے لوگ۔ مُراد مُفلس، نادار لوگ۔

اِصفہان : ماضی قدیم میں ایران کا ایک صُوبہ۔ اب ایران کا ایک مشہور شہر۔ ''صفوی بادشاہ شاہ عباس کا دارالخلافہ۔ رُوسیوں نے ۱۹۱۶ء میں اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہاں کی تلوار اور سُرمہ مشہور ہے۔'' (جامع اللغات) میر امّن نے اسے ''اصفہانِ نصف جہاں'' لکھا ہے۔

اُصطرلاب: ایک آلہ جس سے ستاروں کی بُلندی، مقام اور رفتار دریافت کرتے ہیں۔

اُصیل : نسلاً باورچن، خادمہ۔

اِضطِرار : بے قراری، بے چینی، بے اختیاری۔ (ضَر: نقصان پہنچانا)

اطفال : بچّے۔

اِعلام : خبر دینا۔

اَعیان : شُرفاء۔

اَغلب: شک جو یقین کی حدوں کو چُھو رہا ہو، گمانِ غالب۔ غالب کی تفضیل بعض وکُل۔ (اَغلب ہے : قریب قریب یقین ہے)

اَفزُوں: زیادہ، بڑھتے چلے جانے والا۔

اَفسُوں : ٹونا ٹوٹکا، منتر، جادُو۔

اَفشانی کاغذ : وہ کاغذ، جس پر رنگ یا خوش بُو چھڑکی گئی ہو (جامع اللغات)

افلاطون : یُونان کا مشہور فلاسفر، جو سُقراط کا شاگرد اور ارسطو کا اُستاد تھا۔ ہمارے ہاں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ افلاطون، طبیب بھی تھا۔

اِقبال کا تارا : قِسمت کا ستارا۔

اقسام اقسام کے : طرح طرح کے۔ عام طور پر واحد کو دُہرایا جاتا ہے لیکن میر امّن نے جمع کو دُہرایا ہے۔ یہ اُن کا خاص اسلُوب ہے۔

اِقلیم : مُلک، ولایت، بَرِاعظم۔ پُرانے وقتوں میں کُرۂ ارض کو سات حِصّوں میں بانٹا گیا تھا۔ ہر حصّے کو اقلیم کہتے تھے۔

اَکابِر : اکبر (عربی) کی جمع۔ مُقتدر، سردار، بہ عُہدہ بڑے۔ (اکابرِ عالَم: دُنیا جہان کے بڑے۔)

اَکابر و اَصاغر : (اکابر : اکبر کی جمع۔ اصاغر : اصغر کی جمع) مُراد چھوٹے بڑے لوگ۔

اَکال (ہندی): قحط۔

اکبر : مُغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر (۱۵۴۲ء۔م:۱۶۰۵ء)۔ ہمایوں کا بیٹا اور جہانگیر کا باپ ۱۵۵۶ء میں چودہ برس کی عمر میں تخت نشین ہُوا۔ مدفن ضلع آگرہ کے گاؤں سِکندرہ میں ہے۔

اُپَت : طاقتِ ایجاد و اِختراع، اُپج، ذہنی رسائی۔

اُکھڑ آیا : نشان اُبھر آیا۔ "نشان اُکھڑنا" اب متروک ہے۔

اَگیا : دراصل "آگیا" ہے۔ یعنی اجازت۔

اُلاق : سجی ہوئی چھوٹی کشتی۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کے مطابق: ایک مُدوّر کشتی، جسے قالینوں کو گاؤ تکیوں سے سجا کر اُمراء کی سیر و تفریح کے کام میں لایا جاتا ہے۔

اَلامرُ فَوق الادب: حُکم، آدابِ مجلس پر فائق ہے۔ حُکم کی بجا آوری ہر صورت اور حالت میں ضرور ہے۔

البتہ : ضرور۔ میر امّن نے صرف اِن معنوں میں برتا ہے جبکہ اس لفظ کے دیگر معنی ہیں : بے شک، بلاشُبہ، مگر، اِلّا، لیکن۔

اِلتماس : گزارش، بنتی، عرض۔ یہ لفظ عربی میں مُذکر ہے۔ لکھنؤ میں مؤنث برتا جاتا ہے۔

اَلجُوع اَلجُوع : شدید بُھوک۔

اَلَروبَلَو: لایعنی، بے معنی باتیں۔

اَلشِ خاص : بادشاہوں یا اُمرا کے مطبخ کا پکا ہُوا کھانا، جو کسی کی عزت بڑھانے کے لیے اُس کے گھر بھیجا جائے۔

القِصّہ : حاصلِ کلام، مختصر یہ کہ، غرض کہ، یعنی۔

اَلماس : ہیرا۔ کہنے کو پتھر ہوتا ہے لیکن ہوتا خالص کاربن ہے۔

اَلَنگ : جانب، پہلو، سمت، طرف، قطار۔ یہاں مُراد ہے قلعہ کی وہ دیوار جو محافظت کے لیے کھڑی کی گئی۔

اُولوالعزم : صاحب حوصلہ، بہادر، عالی ہمت (جامع اللغات)۔

اَلول کَلول: کھیل کُود۔

اِلہٰ العالمین : سب جہانوں کا رَبّ۔

اِمام ضامن : حضرت ابوالحسن علی بن امام جعفر موسیٰ الکاظم (شیعہ عقیدے کے مطابق ساتویں امام) ''آپ آدمیوں کی ہی نہیں جانوروں کی بھی ضمانت دیا کرتے تھے۔اس لیے امام ضامن مشہور ہوئے'' (جامع اللغات) جب کوئی سفر پر نکلتا ہے تو عزیز و اقارب اُس کے بازو پر ساتویں امام کے نام پر کچھ رقم باندھ دیتے ہیں۔وہ خیریت سے منزل پر پہنچ کر اُس رقم کو خیرات کر دیتا ہے۔

امانت : سپُرد کی ہوئی چیز، کسی کمی بیشی کے بغیر۔(امانت دَھرا ہے: ویسے کا ویسا رکھا ہُوا ہے۔)

امانت لے چلو : احتیاط کے ساتھ اُسی طرح لے چلو۔

اُمرازادیاں : امیروں کی لڑکیاں۔

اُمراؤں سے کہی : اُمراء سے کہی۔دِلّی کی ٹکسالی بول چال میں اُمراؤں ہی کہتے تھے۔

اَمرَد : مُغ بچہ، نوعمر خُوب صورت لڑکا، جسے ساقی گری کے لیے رکھا جاتا تھا۔

اِملاک : (مِلک کی جمع) مُراد مال اسباب، جائیداد۔

اُمیر وزیر : انتظامیہ، مُنشی، دیوان۔

اَن : اناج۔

اَن بول : گُونگا۔

اَنت : ہمیشہ کے لیے۔

انتظار کھینچنا : انتظار کرنا۔فارسی محاورہ ''اِنتظار کشیدن'' کا اردو رُوپ۔میرزا غالب :

نفس کو انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں ، انتظارِ ساغر کھینچ

اَچپت : فوراً، دفعتاً، انجانے میں، اچانک۔

اِندَر : ہندوؤں کے دیوتاؤں کا راجا۔آکاس اور سُرگ کا مالِک۔

اِندَر کا اکھاڑا : راجا اِندَر کی سَبھا، جس میں پریاں ناچتی تھیں۔کنایتاً: خُوب صورت عورتوں کا مجمع۔

اِندراین : حنظل۔اِندراین یا حنظل کا پھل سخت کڑوا ہوتا ہے۔

اَندیشہ : خیال، فکر، خوف، دھڑکا۔

اِنصرام : اہتمام، انتظام، بندوبست، انجام کو پہنچنا۔ (اِنصرام کر : انجام کو پہنچا)

اُن کر : پلٹ کر۔

اُن کو وہاں رکھ کر : مُراد بیوی کو وہاں چھوڑ کر۔ یاد رہے کہ قدیم وقتوں میں بیوی بھی گھریلو سامان طرز کی شے تصوّر کی جاتی تھی۔

اَنگا : وہ لونڈی، جس نے بچپن میں خدمت کی ہو (نُور اللغات)۔

اَنگشتری : انگوٹھی۔

اَن رِکنا مہینا : حمل کا آٹھواں مہینا، جسے عام طور پر منحوس سمجھا جاتا ہے اس لیے شمار میں نہیں لاتے۔

اَنگوچھا: چھوٹی دھوتی۔

انگور کرلائے: زخم مُندمل ہو گئے۔

انوٹھا : نرالا، نیا، عجیب۔

انوٹھی : نرالی، نئی، عجیب۔

اُنھیں پاتو پھر آئی : فوری طور پر پلٹ آئی۔

اوپری : اجنبی۔

اَوسان : حواس۔

اوسر چُوکی ڈومنی، گاوے تال بے تال : ہندی مَثَل (اوسَر چُوکنا : بے سُرا ہونا) اوسر بہ معنی موقع۔
مُراد ڈومنی جب تال بُھول جاتی ہے تو بے سُری گائے چلی جاتی ہے۔ اِسی طرح جب غلطی سے کسی مصیبت میں پڑ جائیں تو ہوش جاتی رہتی ہے اور آدمی غلطی پر غلطی کرتا چلا جاتا ہے۔

اُونٹ چڑھے، کُتّا کاٹے : کہاوت ہے کہ جب شامت آتی ہے تو لاکھ احتیاط کیجیے، نقصان پہنچ ہی جاتا ہے۔

اُونٹ کے گلے میں بلّی : (مَثَل) ناموزوں بات، بیہودہ دلیل۔

ایراد : لانا، پیش کرنا۔

ایسا تیسا : گالی دینے سے بچ کر بات کرنا۔ نسوانی لحن ہے۔

دلق پوشو : اے گدڑی پہننے والے درویشو۔

اے فُلانے : اے، جسے میں نہیں جانتی۔ نسوانی محاورہ، قُرب میں دُوری کی بہترین مثال۔ فُلان (عربی) غیر معلوم شخص۔ وہ شخص جو ذہن میں تو ہو لیکن زبان سے نہ کہیں کہ اُسے جانتے ہیں۔

ایک بات مُنھ پر نہ رکھی : کچھ بھی نہ کہا۔

ایک چلّے میں : چالیس روز میں۔

ایک، دُوسرے کا واقف کار ہوتا ہے : میاں بیوی کا ایک دُوسرے سے کچھ ڈھکا چُھپا نہیں ہوتا۔

ایک ساعت : لحہ بھر بعد۔

ایک گھوڑی جلد : ایک تیز رفتار گھوڑی۔

ایلچی : سفیر۔

اَینچنا : کھینچنا۔

ب

بات بول کر : کہہ کر۔ بات کا یہ استعمال اَب متروک ہے۔

باٹ : راہ، راستہ۔

بادامی : ایسا قورمہ، جس میں بادام کُتر کر ڈالے گئے ہوں۔

بادکش : پنکھا۔

بادلا : ایسا ریشمی کپڑا جو سونے یا چاندی کے تاروں سے بُنا جاتا تھا۔ ملکہ نُور جہاں نے تیار کروایا تھا۔

بادیہ : قدح، تانبے کا بڑا کٹورا۔

باربَردار: قُلی۔

باربَرداری: اَسباب ڈھونے کے جانور اور چھکڑے۔

بارِخُدایا : اے باری تعالیٰ۔

بار کرنا : سامان چڑھانا، کشتیوں میں بھرنا۔

بارہ اَبھرن: سَولہ سنگھار، بارہ زیور اور سَولہ سجاوٹیں۔

بارہ پُلا : بارہ محرابوں یا دَروں والا پُل۔

بارہ دَری : بارہ دروں والی ہَوا دار عمارت۔ ایسی عمارت عام طور پر محل کی چھت پر، باغوں میں یا

دریا کے کنارے بناتے ہیں۔

بارہوں : دس اور دو، بارہ۔

باری دار : پہرے چوکی والے نگران سپاہی۔ "جو اپنی باری یا نوبت پر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو۔" (دریائے لطافت)

بارے : آخرکار، الغرض، آخرالامر، مگر، لیکن، خیر (جامع اللغات)۔

بازدار : وہ ملازم جس کے ذمہ بازوں کو سدھانے اور اُن کی غور و پرداخت اور حفاظت کا کام ہو۔

باسن : برتن۔

باشہ یا باشا : باز کی ایک قسم۔ "باشہ کی مادہ کو باشین کہتے ہیں۔" (جامع اللغات)۔

باعِث : وجہ، سبب، مقصد۔

باعِث ہُوا : اصرار کیا، زور دے کر کہا، مجھ سے بھی کہا۔

باقرخانی : خستہ مَیدے کی روغنی روٹی، جسے شکر اور دودھ ملا کر تنور میں پکایا جاتا تھا۔ شاہجہان کے دورِ حکومت میں اِلہ آباد کے حاکم باقر خاں (م: ۱۶۳۷ء) نے اپنے مطبخ میں ایجاد کی تھی۔

باگھ : شیر، چیتا۔

بالاپوش : پلنگ پوش۔

بالائی مزے : دیدار، بوس و کنار، اورل سیکس۔

بال بال گج موتی پرونا : حد درجہ بناؤ سنگھار کے ساتھ۔

بال باندھی کوڑی مارنا : (محاورہ) بے خطا نشانہ لگانا۔ اب "بال باندھی کوڑی اُڑانا" بولا جاتا ہے۔ اسی مفہوم کا دُوسرا محاورہ : "بال باندھا نشانہ اُڑانا۔"

بال بیکا نہیں کر سکتا : ذرہ برابر نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

بالعکس : بَرعکس، بَرخلاف، اُلٹا۔

بالفعل : فی الوقت، اِس وقت۔

باؤ : ہَوا، آسیب، سایہ۔

باؤبتاس: بھوت پریت، آسیب۔

باور : بھروسہ، یقین، اعتماد۔

باؤلا : پگلا، جنونی۔

باؤلی : وہ کُنواں، جس کے پانی تک پہنچنے کے لیے سیڑھیاں ہوں۔ جرنیلی سڑک (شیر شاہ سُوری روڈ) پر اکا دُکا باؤلیاں اب بھی موجود ہیں۔

باہمن: برہمن۔

پِتا : مُصیبت۔

بتاشا : بُلبلہ، حباب۔

بَت کہاؤ : مُفصّل گفتگو، بات چیت کا ڈھنگ۔

بَتیاتے ہیں : باتیں کرتے ہیں۔(بَتیاتے تھے: باتیں کرتے تھے)۔

بَجِد ہونا : بضد ہونا۔ ''بَجِد ہونا'' دہلی کا غلط العوام ہے۔

بَجرا : ایسی ہلکی پُھلکی تفریحی کشتی، جسے ایک آدمی آسانی سے کھے لے۔ "BUDGEROW"۔

بُجھرا : گھڑے یا مٹکے پر رکھا جانے والا مٹی کا ڈھکنا۔

بَچَن : قول، کلام، بات۔ اصل میں ''وَچَن'' ہے۔ غلط العوام بننے میں واو، ب میں تبدیل ہوگیا۔ ہندی اور سنسکرت کے اکثر الفاظ جو اُردو میں مُستعمل ہیں، اِس نوع کی تبدیلیوں سے دوچار ہُوئے۔

بُخارا : رُوسی تُرکستان کے علاقہ ماوراء النہر کا ایک قدیمی شہر، جو اِسلامی علوم کا مرکز رہا۔ مسلمان سائنس دانوں نے اس شہر میں سیارگان کے مشاہدے اور مطالعے کے لیے کئی رصدگاہیں قائم کیں۔ یہ علاقہ اب ازبکستان کا حصہ ہے۔ ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء میں بُخارا ایک صُوبہ تھا، جس کا رقبہ ۹۰ ہزار کلومیٹر تھا۔

بختیار : خُوش نصیب۔

بخُور : صندل، عُود، لوبان۔ جنھیں آگ پر ڈالیں تو خُوش بُو پیدا ہو۔

بَدا ہے: طے شُدہ ہے، مُقدر میں لکھا ہے۔

بدخشاں : افغانستان کے شُمال اور دریائے جیحوں کے جنوب میں ایک قدیمی شہر، جس کا پُرانا نام ''بدخش'' تھا۔ ایک زمانے میں صوبہ بھی رہا۔ بڑی مدت تک اس پر رُوسیوں کا قبضہ رہا۔

۱۸۵۹ء سے دوبارہ افغانستان کا حصّہ ہے۔ اِس علاقے سے یاقُوت نکلتا ہے۔

بَد دماغ ہونا : ناراض ہونا، ایسی ناراضی جس میں جارحانہ پہلو ہو۔

بَدر رَو : گندے پانی کی نکاسی کا راستہ، موری۔

بدرَہ : چمڑے کی تھیلی، جس میں اَشرفیاں یا رُوپے ہوں۔ ہمیانی، توڑا۔

بَد طالع : بَد قسمت، بُرے نصیب والا۔

بدَوؤں : جمع ہے بدَوی کی۔ عرب کے ریگستان کا باشندہ۔ لُٹیرا، اُجڈ، گنوار۔ یہاں ڈاکو یا لُٹیرا کے معنوں میں برتا گیا ہے۔

بَد ہیئت : بے ڈھبا، بَد شکل، بَد صُورت، ایسی بدوضع صُورت، جس میں ڈراونا پن موجود ہو۔

بَدھا تھا : بَدا تھا، یعنی طے تھا۔ ''بَدھا''، ''بَدا'' کا قدیم اِملا اور تلفظ ہے۔

برائے خود : اپنے طور پر، اپنی جگہ۔

بَر باد کردی : برباد کی۔

بَر پاہیں : قائم ہیں۔

بُرجِ حَمل : راس میکھ۔ شکل مینڈھا، نُوروز کے دن آفتاب اِس بُرج میں داخل ہوتا ہے۔ نُوروز سے موسمِ بہار کا آغاز ہوتا ہے اور ایرانی سال کا آغاز بھی۔

برداری : مُراد بار برداری۔

بَرداشتہ ہُوا ہو : بَد دِل ہُوا ہو، جی نہ لگتا ہو۔

بَرس دِن : پُورا سال۔

بُرقع پوش : نقاب پوش۔ بُرقع : نقاب (نُورُاللّغات۔ جامع اللغات)۔

برقَنداز : توڑے دار بندوق رکھنے والا بندُوقچی۔

برگ وبار : پتّے اور پھَل۔

بڑی فجر : علی الصّباح، صُبح سویرے۔ فجر کے معنی آخر شب کی سفیدی اور نُور کا تڑکا ہیں۔ فجر سے مُراد وہ وقت جب صُبح کی نماز ادا کی جاتی ہے۔

بِس : زہر، سم، ہلاہل۔

بَستر : لباس۔

بسیکھ: مقرر، شُمار، خاصیت۔ ع شوخی، شرارت، مکروفن، سب کا بسیکھا ہے یہاں (نظیر اکبر آبادی)

بَشارت : مژدہ، وہ خوش خبری، ''جس کی جانب خواب میں اشارہ ہو'' (جامع اللغات)۔

بُشرَہ : چہرہ مُہرہ۔

بَصرَہ: عراق کا ایک قدیمی شہر اور بندرگاہ۔ اصل نام ''بَسراہ'' تھا۔ چونکہ یہاں سے بہت سے راستے نکلتے تھے۔ عربوں نے فتح کر لینے کے بعد ''بصرَہ'' سے بدل دیا۔

بَعید ہے : خِلاف ہے، دُور ہے۔

بَغدادی اُونٹ : دو کوہان والا اُونٹ (جامع اللغات)۔

بُقچہ : کپڑے یا سامان رکھنے کی پوٹلی، گٹھری۔ ''بُقچی'' پُٹلیا کو کہتے ہیں۔

بَکاوَل : باورچی خانے کا داروغہ، ہیڈ خانساماں، رَسوئیا، باورچی (جامع اللغات)۔

بَکاوَل : بَکاوَل کے مُتعلق، کھانے پکانے کا سامان، طشتری (جامع اللغات)۔

بکتر پوش : زِرہ پہننے والا، زِرہ پہنے ہُوئے۔

بِگانی تِریا : دُوسرے کی اِستری (بیوی)، بے گانی عورت، غیر عورت۔

بِگانے ستر پر نگاہ مَت کر : غیر عورت پر نگاہ مَت ڈال۔

بُلبلِ ہزار داستان خُوش آواز، خُوش گُفتار، شیریں دہن۔ (دستان : نغمگی) بُلبل کی خُوش بیانی (چہکار) کے سبب اُسے ''ہزار دستان'' کہا گیا۔ یہی مُرکب بعد ازآں ''ہزار داستان'' کہلایا۔

بَل بے: کلمہ ندا۔ حیران کُن صُورتِ حالات کو دیکھ کر یہ کلمہ ادا کیا جاتا ہے۔ ''بَل بے تیری جرأت، تیری بہادری کو شاباش'' (جامع اللغات)۔

بلخ : افغانستان کا ایک قدیمی شہر، جو غالباً شاہ کیمورث نے آباد کیا تھا۔ اُس شہر کے کھنڈرات مزار شریف کے قریب کئی مُربع میل میں ہیں۔ بُدھ مذہب کا مرکز رہا۔ ماضی قریب کی طالبان حکومت نے بُدھ آثار تقریباً مٹا کر رکھ دیے۔ گوتم کے بڑے بڑے سنگی مجسمے توڑ پھوڑ دیے۔

بَلدَہ : شہر۔ (پیش کے ساتھ ''بُلدَہ'' لکھنا درست نہیں۔)

بِلِلّی : سادہ لوح، ناسمجھ۔ دہلی کا روزمرہ۔

بَلیالُوں : صدقے جاؤں، واری جاؤں، قُربان جاؤں۔ نسوانی طرزِ اظہار ہے۔ اصل میں ''بلائیں لینا'' ہے۔ بعض ایڈیشنوں میں ''بَلیاں لُوں'' بھی درج ہے۔

بُن : جڑ، نیچے۔

بِنا : بُنیاد، نیو۔

بَنات : بانات، اُونی کپڑا یا پشمینہ، جو اُون کے ریشوں کو جما اور دبا کر کاغذ بنانے کے طریق پر تیار کیا جاتا ہے۔

بَناس پتّیاں: گھاس پات، جنگلی بُوٹیاں اور پتّیاں۔ اِسی سے ''بناسپتی'' لفظ وجود میں آیا۔ سنسکرت میں ''ونسپتی'' جنگلی درخت کو کہتے ہیں۔

بَندَر : بندرگاہ، ساحلی مَنڈی، وہ آبادی جو ساحلِ سمندر پر ہو۔

بَندِش : سازِش، مشورہ، تدبیر۔

بُندوڑ : بدقماش۔ دُخترِ رز لگی ہے مُنہہ ورنہ

ہے یہ مُردار سو بُندوڑ کی ایک

(بہادر شاہ ظفر)

بُندھلانا : پُھسلانا۔

بُندی : ایک آرائشی زیور جو صافے کے اُوپر باندھا جاتا تھا، کمر میں باندھنے کے لیے زردوزی کی سنگھار پٹّی۔

بَندی خانہ : قید خانہ، مَحبس، حوالات۔

بَندی وان : اسیر، قیدی۔

بنگالا کو ہندوستان کرنا : بنگال کی غیر فصیح اردو کو فصیح بنا دینا۔ دیکھیے: میر امّن کی عرضی۔

بِوائی پَھٹنا : سرد موسم میں ایڑیوں کا پَھٹ جانا۔

بُوٹ : کچّا ہرا چنا، چھولا۔ زَبر کے ساتھ ''بَوٹ'' لکھنا غلط ہے۔ (بوٹ : برتن) بُوٹ، دِلّی کے بازاروں میں پھیری والے بھی بیچتے تھے۔

بُود و باش مُقرّر کی : رہائش اختیار کی۔

بُورانی : ایک کھانا، جس میں بریاں بیگن کے قتلے تل کر ڈالے جاتے ہیں۔ ممتاز حسین نے "رائتے کی ایک قسم" بتائی ہے۔ روایت ہے کہ بریاں بیگن سے تیار کردہ اِس کھانے کو بُوران بنتِ خسرو پرویز (ایرانی بادشاہ) نے ایجاد کیا تھا۔ خسرو پرویز کی وفات کے بعد بُوران ۶۳۰ھ مطابق ۱۲۳۲ء میں کچھ مُدّت تخت نشین رہی۔ مہیشور دیال نے دِلّی میں بنائی جانے والی بُورانی کی چھے اقسام بتائی ہیں۔ سادہ، ککڑی، مُونگ، بیسن، کھیرا، بیگن (عالم میں انتخاب : دِلّی)

بُوڑھا آڑھا ہو : لمبی عمر پائے۔ دُعائیہ کلمہ ہے۔ (بُوڑھا آڑھا : بڑا بُوڑھا)

بُوزنہ : بندر۔

بُوزہ خانہ : جہاں جَو اور چاول سے بنی ہوئی دیسی شراب بکتی ہو۔ (بُوزہ : جَو)

بُوزہ فروش : دیسی شراب بیچنے والا، مے فروش۔

بُوعلی سینا : ابُوعلی الحسین بن عبداللہ (م: ماہ رمضان ۲۱ جون ۱۰۳۷ء) مشہور ریاضی دان، ماہرِ فلکیات، فلاسفر اور طبیب۔ اُنھیں "ابنِ سینا" اور "شیخ الرئیس" کے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ مدفن ہمدان (ایران) میں ہے۔

بُوقلمُوں : رنگا رنگ، تعجب انگیز (جامع اللغات)۔

بَول : پیشاب۔ بَول خطا ہونا (لازم) پیشاب نکل جانا (نُور اللغات)۔

بُوند کی بُوند : دو آتشہ شراب، نہایت تیز شراب (جامع اللغات)۔

بَہا : قیمت، مَول، ایک محصول جو خلعتوں کے لیے لیا جاتا تھا۔

بھاٹ : ایک قوم جو نسبت نامے یاد رکھتی ہے اور ممدوح کی بے جا تعریف اور خوشامد کر کے انعام پاتی ہے۔ کچھ عطا نہ ہو تو ہجو گوئی کر کے روپے بٹورتی۔ انھیں "بَھٹ" بھی کہا جاتا ہے اور پنجابی میں "بَھنڈ"۔ عوامی شاعر کو بھی بھاٹ کہتے تھے۔

بہادر علی جی : میر بہادر علی حسینی نارنولی۔

بھاڑے لے کر : بھاڑا (ہندی) : کرایہ (مراد : کرایہ طے کر کے)۔

بھاکھا : زبان۔ ہندی۔ ہندی میں "بھاکا" بھی کہتے ہیں جب کہ سنسکرت میں "بھاشا" ہے۔

بھانگڑوے : لفنگے، لُچے، بدمُعاش، وہ آدمی، جو دُوسروں کی کمائی پر گزارہ کرے۔" (جامع اللغات)۔

بھاوے :	اچّھی لگے یا اچّھا لگے۔
بھبھوت :	وہ راکھ جو سادھو، سنیاسی اپنے بدن پر ملتے ہیں (جامع اللغات)
بُھٹّا سا اُڑ گیا :	ایک ہی وار میں سر، گردن پر سے اُڑ گیا۔
بھٹھیار خانہ:	(ہندی۔ مذکر) درست ''بھٹیار خانہ'' ہے۔ مُراد ادنیٰ درجے کی سرائے، بھٹیارے یا بھٹیاری کی سرائے، جس میں ادنیٰ لوگ ٹھہرتے ہوں۔
بہ جنس :	بہ حفاظت، اُسی طرح جیسا کہ تھا۔ (بہ جنس پایا: اُسی طرح پایا)
بھچپا:	آتش بازی کی ایک قسم، جس میں سے شرارے نکل کر جھاڑی سی بنا دیں۔
بہ خاطرِ جمع :	اطمینان کے ساتھ۔
بَہری :	مادہ باز، جو کبوتروں کا شکار کرتی ہے۔ بعض تُرکی لغات میں اسے حائے حُطّی سے لکھا گیا ہے۔ (فرہنگِ آصفیہ)۔
بہری :	چندہ۔ سیّد احمد دہلوی کے مطابق یہ لفظ اِن معنوں میں دِلّی میں نہیں بولا جاتا تھا۔ یہ پُوربی ہے۔ میر امّن کے عظیم آباد (پٹنہ) میں طویل قیام کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔
بہ سرو چشم :	سر آنکھوں پر، بہ خوشی۔
بھجایا :	بھیجا، بھجوایا۔
بَھر پایا :	سب کچھ پا لیا، اب کُچھ خواہش نہیں۔ اب اِن معنوں میں نہیں بلکہ الٹ معنوں میں ''بھر پایا'' کہا جاتا ہے۔ تنفر اور بے زاری کے اظہار کے لیے طنزاً۔
بَھسَم :	خاکستر، راکھ۔
بَھکتیے :	بھکتیا کی جمع۔ مُراد عورتوں کے سے لباس پہن کر سوانگ رچانے والے۔
بَھکنا :	بھائی، ماں جایا۔
بُھلاوا :	دھوکہ۔
بَہَلیے :	بَہَلیا کی جمع۔ مُراد : تیر کمان سے لیس مُلازم، جو شکار میں ساتھ رہتے تھے۔
بَہم پہنچائی :	حاصل کی۔
بَہم پہنچتے :	حاصل ہوتے۔

بہ مجرّد : جیسے ہی۔

بہ مجرّد سُننے اِس قصّے کے : جیسے ہی اس قصّے کو سُنا۔

بہ مُوجب : مُطابق۔

بہنا : ہَوا کا چلنا۔

بُھنڈ پَیری : منحوس، سبز قدم۔

بَھنْورکلی : وہ لوہے، پیتل یا چاندی کا تَر پھلا (گلوبند یا حلقہ) جو پالتو جانوروں کے گلے میں اُنھیں نظرِ بد سے بچانے کے لیے پہناتے ہیں۔ (بَھنْورکلی مُرصّع کی : گلوبند، جس میں جواہرات جڑے ہوئے ہوں)

بُھوبل یا بُھوبھل: سُلگتی ہوئی راکھ۔

بُھوکھ : بُھوک کا قدیم املا اور تلفظ۔

بَھونْرے میں : تہہ خانے میں۔ بَھونْرا (ہندی) : تہہ خانہ۔

بُھوئی پالکی یا ڈولی اٹھا کر چلنے والا مزدور، حمال۔

بھیانک ہوکر : پریشان ہوکر، خوف زدہ یا وحشت زدہ ہوکر۔ مغربی پنجاب میں انھی معنوں میں برتا جاتا ہے۔

بھچک : دنگ، بھونچکا، حیران۔

بھیدُو : رَازدار، بَھیدی۔

بھینٹ مُلاقات : مُڈ بھیڑ، آمنا سامنا۔

بیاکُل : بےکل، بےقرار۔

بے بَہا : انمول، جس کی قیمت کا اندازہ ہی نہ لگایا جا سکے۔

بیپاری : بیوپاری، تاجر، سوداگر۔

بےتقصیری : بےگُناہی۔

بَیجُو باورا : بھارت کا مشہور گلوکار اور ماہرِ موسیقی۔ مُغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر سے ۳۰۰ سال قبل کا زمانہ پایا۔

مہاراجہ جموں کے دربار میں گائکی کا مظاہرہ کیا۔

بے چوبا : چھوٹا خیمہ، جس میں بانس نہیں لگائے جاتے۔ مجازاً آسمان۔

بیدِ مُشک : ایک پہاڑی درخت، بَید کی ایک قسم جس کی شاخیں حد درجہ نازک، لچک دار اور پھول نہایت خوش بُو دار ہوتے ہیں۔ شاخوں سے کُرسیاں بُنی جاتی ہیں اور پُھولوں سے عرق کشید کیا جاتا ہے، جو مُفرّح القلب ہوتا ہے۔

بیرن : بھائی، پیارے۔ خالصتاً نسوانی لحن۔

بیڑھنا : بھیڑنا، دروازہ بند کر دینا۔

بے سروپائی : بے سروسامانی۔ بے بسی۔

بے سر ہو گیا : (شہر کا) حاکم نہ رہا۔

بیسن دان : وہ برتن، جس میں چنے کا آٹا (سفُوف) رکھا جاتا تھا۔ وہ سُفُوف ہاتھوں کی چکنائی دُور کرنے اور چہرے کی رنگت نکھارنے کے لیے بطور صابن استعمال کیا جاتا تھا۔

بے کلی : بے چینی۔

بے کم و کاست : کمی بیشی کے بغیر، پُورا پُورا۔

بیل پُھوٹی، رائی رائی ہو گئی : مثل : نا اتفاقی میں نقصان ہوتا ہے (جامع اللّغات) بیل کے پودے میں نارنگی کے برابر پَھل آتا ہے۔ بیل کا پکا ہُوا پَھل پَھٹ جائے تو بیج بکھر جاتے ہیں۔

بَیل نہ کُودا، کُودی گون، یہ تماشا دیکھے کون : مثل : ''جب کوئی اُمید کے خلاف کام کرے یا دخل در معقولات دے یا بے موقع بول پڑے یا شکایت کسی اور نے کرنی ہو اور کرے کوئی اور تو کہتے ہیں۔ (جامع اللّغات) (گون : بوری)۔

بیمارداری : تیمارداری، بیمار کی خبر گیری۔

بے مُحابا : بے دھڑک، بے خوف و خطر۔

بے نوا : بے سروسامان، جس کے پاس کچھ نہ ہو، بے کس۔ مُراد: درویش، فقیر۔

بے نیاز : وہ جو کسی کا محتاج نہ ہو، بے پروا۔ مُراد : اللہ۔

بیوَرا : مژدہ، خبر، بھید۔

بے وسواس ہو کر : بے خوف ہو کر۔

پ

پاپی : گنہ گار۔

پاچھنا : پچھنا، لوہے کو گرم کر کے چھوانا یا نشتر لگانا۔

پادشاہ زادۂ عالمیاں : ساری دنیا کے شہزادے۔

پادشاہِ ظلِ اللہ : بادشاہ، جو اللہ کا سایہ ہے۔

پادشاہ علی الاطلاق : مالکِ کُل، ربِّ عظیم، اللہ۔

پارچہ : گوشت کا ٹکڑا۔ بوٹی۔

پارۂ اَبر : بادل کا ٹکڑا، بدلی۔

پاسنگ : وہ وزن جو ترازو کے پلڑوں کو برابر کردے، جُزوی، تھوڑا سا۔

پاکھر : ''برگستواں کی ہم شکل گھوڑے کی زِرہ'' (آئینِ اکبری) ''گھوڑے یا ہاتھی کی زِرہ'' (فرہنگِ آصفیہ) ''آہنی پوشاک، جو گھوڑے کو میدانِ کارزار میں پہناتے ہیں۔'' (نور اللغات)۔

پال : چھولداری، چھوٹا خیمہ۔

پانچوں ہتھیار : نیزہ، تلوار، برچھی، تیر اور کمان (جامع اللغات) پلیٹس کے ہاں ڈھال بھی درج ہے لیکن انھوں نے نیزہ اور برچھی کو ایک ہی طرح کے ہتھیار شمار کیا ہے۔ جب کہ اُن دونوں میں فرق ہے۔ نیزہ نشانہ باندھ کر پھینکا جاتا ہے، برچھی، ہاتھ میں رہتی ہے۔

پان سے : پانچ سو۔

پانی دیوا : پانی دینے والا۔ مُراد بیٹا، اولادِ نرینہ۔

پاد بھاری : لباسِ فاخرہ، خلعت۔

پاؤ روٹی : ''انگریزی طرز کی ڈبل روٹی کی طرح کی روٹی جو وزن میں پاؤ سیر ہوتی ہے۔'' (جامع اللغات)

پاؤں اُکھڑے : شہر چھوڑ کر نکلنا پڑا۔ ''باغ و بہار'' میں پاؤں یا پانو کو کئی طرح لکھا گیا ہے: پانو، پاٹوں، پانوں، پاؤں۔

پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہوں : اطمینان سے گزر ہو رہی ہے۔

پاؤں گور میں لٹکا چکا ہوں : مرنے کے قریب ہوں، مرنے پر آمادہ ہوں۔

پائیں باغ : وہ باغیچہ جو محل کی چہار دیواری کے اندر محل کی سطح سے قدرے نیچے ہو۔

پائے تخت : دارالخلافہ، راج دھانی۔

پائے پر : اپنے اپنے مقام اور مرتبے سے مخصوص جگہ پر۔

پَت : آبرُو، عزت، لاج۔

پٹری یا پٹڑی : ''چاندی یا تانبے کی تختی جس پر تعویذ کُھدا ہو۔ ایک قسم کا ہاتھ کا زیور۔'' (جامع اللغات)۔ زمرد ہرے رنگ کا ہوتا ہے اور یہی رنگ پتے کا بھی ہوتا ہے۔ پٹری عام طور پر پتے کی شکل کی بنائی جاتی تھی۔ اِس مُناسبت سے بات کی گئی۔

پٹیلی : چوڑے پیندے کی کشتی، جس پر تختے بچھا کر پالکی یا بہلی (بیل گاڑی) کو پار لگاتے ہیں۔

پَچھل پائی : چُڑیل۔ (کہا جاتا ہے کہ چُڑیلوں کے پَیر پیچھے کو مُڑے ہوئے ہوتے ہیں۔)

پَدَمنی : پدم کے معنی ہیں کنول۔ یعنی کنول کے پُھول جیسی نازک اندام عورت۔ شاستروں میں عورت کی چار اقسام بتائی گئی ہیں: پدمنی، چترنی، سنکنی اور ہستنی۔ اِن چاروں میں سے پدمنی کو اعلیٰ قرار دیا گیا ہے۔

پذیرا ہُوا : تسلیم کر لیا گیا، قبول کر لیا گیا۔

پذیرا نہ کیا : قبول نہ کیا۔

پراگندہ ہُوا : پریشان ہو گیا، گھبرا گیا، مُتفکر ہُوا۔

پراگندہ ہُوئے : بکھر گئے، پھیل گئے۔

پرپَیچ : تدبیر، جوڑ توڑ، چال بازی۔

پَرتَل : گھڑسوار کا تھیلا بھر سامان، جو ایک گھوڑے پر لادا جا سکے۔

پَر جی میں سوچ آتا ہے : دِل میں خیال کرتی ہوں (یہاں میر امّن نے ''سوچ'' کو مذکر برتا ہے)۔

پَر چانا : راضی کرنا، بہلانا، اپنے طریق پر لے آنا۔

پَر چھا ہُوا : مجمع چَھٹ گیا، ہجوم کم ہُوا۔ پَرچھا (ہندی) مجمع، ہجوم، بھیڑ۔

پَرچھا ہونے لگا : (رات کی) تاریکی چھٹنے لگی۔

پَرداز : آئینے کا آرائشی حاشیہ، چوکھٹا۔

پُرسش : اِستفسار، پُوچھ گچھ۔ (گناہوں سے متعلق پُوچھ)۔

پَرند : تیز رفتار، جیسے پروں سے اُڑتا ہو۔

پَر نہیں کٹے تھے : گھوڑی کی ہمت جوان تھی۔ پَر کٹنا (لازم) ہمت نہ ہارنا۔ سدھائی نہیں گئی تھی۔

پَروانگی : حُکم، فرمان، اجازت، منظوری (جامع اللغات) ''باغ و بہار'' میں یہ لفظ اِن چاروں معنوں میں برتا گیا ہے۔

پَری پیکر : پری کی صُورت، حسین، خُوب صُورت۔ (پری ایک خیالی جنس کی عورت جس کے بازوؤں پر پَر ہوتے ہیں اور نہایت خوبصورت خیال کی جاتی ہے۔ شاعرانہ تخیل کی ایجاد ہے کوہ قاف اُس کا وطن بیان ہوتا ہے۔ (جامع اللغات)۔

پَری زاد : یوں تو یہ لفظ خُوب صُورت کے مفہوم میں برتا جاتا ہے لیکن یہاں تیز رفتار گھوڑوں کی بات کی گئی ہے۔ یہاں مُراد برق رفتاری ہے۔

پَری کا سایہ : بُھوت پریت کا اثر۔

پَریوں کا اُتارا : پریوں کا مجمع، جمگھٹ، اکھاڑا۔

پڑے پھرے : گھومتا پھرے۔

پژمُردہ نہ ہوگا : مُرجھائے گا نہیں۔

پس ماندہ : پیچھے رہا ہُوا، بچا ہُوا۔ یہاں ''پس ماندوں'' سے مُراد ہے شیر شاہ سوری کی وفات کے بعد وہ پٹھان، جو ہندوستان پر حکمران تھے۔

پُشت بہ پُشت : نسل در نسل، باپ دادا کے وقتوں سے۔

پَشمینہ : بھیڑ بکریوں کی پشم سے بُنا ہُوا کپڑا، جو کشمیر میں تیار کیا جاتا تھا۔ (پشم: وہ باریک رُواں جو بھیڑ بکریوں کی کھال پر اُون کے کے درمیان اُگا ہُوا ہوتا ہے۔ حد درجہ ملائم ہوتا ہے۔)

پشواز : عورتوں کی ایک پوشاک، جو پاؤں تک لمبی اور گھیر دار ہوتی ہے۔ قدیم وقتوں میں بیگمات پہنتی تھیں، بعد میں دہلی اور لکھنؤ کی رقاصائیں ناچ کے وقت پہننے لگیں۔

پکھاوَج : مَردنگ، طبلے کی طرح کی لمبوتری ڈھولک۔

پکھروٹا : چاندی یا سونے کا ورق، جو پان یا حلوے پر لپیٹ دیا جاتا تھا۔ یونانی ادویہ میں بھی اس کا

استعمال عام ہے۔

پگڑی بندھوائی : جانشین بنایا (ایک رسم)۔

پلاس : ٹاٹ۔موٹا کپڑا (جامع اللغات)۔

پلشت : فاحشہ، پلید، ناپاک، نجس، بھرشٹ، زشت۔

پلوار : بھاری سامان ڈھونے کی کشتی۔ یہ سامنے سے چوڑی اور رُوپچی سے تکونی ہوتی تھی۔

پلیت : پلید، نجس۔

پَن بھتا: اُبلے ہوئے چاول جنھیں شربت میں ڈال کر فالودے کی طرح پیتے اور کھاتے ہیں (پَن : پانی۔ بھتا یا بھات : چاول)۔

پنجتن پاک: شیعہ مسلمانوں کے مطابق پانچ پاک وجود۔ مُراد حضرت محمدؐ، حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ۔

پنجشنبہ : جمعرات کا دن۔

پِنڈ نہ چھوڑا : لفظی معنی : جسم۔ یہاں ''پیچھا نہ چھوڑا'' مُراد ہے۔

پنڈا : برہمنوں کی ایک قوم، برہمن جو کسی بُت کے مندر کا پُجاری ہو۔

پنڈت خانہ : بندی خانہ، قید خانہ، مَحبس، جیل۔

پنڈ ھلانا : پُھسلانا۔

پَنڈ ایاین : پَنڈے یا پنڈت کی بیوی (جامع اللغات)۔

پَن سوئی : ڈونگا، ڈونگی، چھوٹی کشتی (جو جہازوں کے ساتھ بندھی رہتی تھی)۔

پنگھولا : پنگوڑا، ننھے بچّے کا جھولا۔

پَو پھٹے : صُبح کا وقت۔

پوست : کھال، چمڑا۔

پوشاکی : پوشاک بنانے کے لائق، پہننے کے لائق۔

پوکھر : جوہڑ، تالاب۔

پھانکڑے مُفت خورے۔ (''پھانک'' ہندی اور پنجابی میں خالی جیب شخص کو کہا جاتا ہے۔)

پھبتی ہے : مناسب ہے، زیب دیتی ہے۔(میرامّن نے انھی معنوں میں 'پَھبے ہے' بھی لکھا ہے۔)

پَھبے ہے : مناسب ہے، زیب دیتی ہے۔

پھِر آئی : پلٹ آئی۔

پھِرتی بار : پلٹتے ہوئے، لَوٹتے ہوئے۔

پَھڑ : جُوا خانہ۔

پُھساہنڈا : دھیمی آواز میں عشقیہ گفتگو۔

پُھسلا پنڈھلا کر : جھانسا اور دَم دلاسا دے کر۔

پُھسلایا : بہکایا۔

پھک رہی ہوں : پُھنک رہی ہوں۔

پُھول اُٹھ چکے : سوئم ہوگیا۔ مسلمانوں میں وفات کے تیسرے دن قبر پر ارگجا اور پھول چڑھانے کی رسم ہوتی ہے۔ ہندو بھی تیسرے روز پُھول چُنتے ہیں۔

پھونہار : پُھوار۔

پُھونہیاں : بُوندیں، بُوندا باندی، پُھوار۔

پھیپھڑی : پپڑی (پیاس یا گرمی کے سبب ہونٹوں کا خشک ہونا)۔

پھینچنا : نچوڑ مروڑ کر پانی نکالنا۔

پھنٹا : سر پر صافہ باندھے، سجے ہُوئے۔

پیادہ : چپراسی، اَردلی۔ حاکم یا قاضی کی عدالت کا پیادہ محاصِل، ہرکارہ۔

پیت کی پیت رہے اور میت کا میت ہاتھ لگے : دوستی بھی قائم رہے اور من کی مُراد بھی پالیں۔

پیٹھا : (دریا کے) پانی میں اُترا۔

پیٹھنا : گھسنا، داخل ہونا۔

پٹی : صندوقچہ۔

پَیدا کر کے : ڈھونڈ کر۔

پَیدا کریں : ڈھونڈ لائیں۔

پَیدا ہُوا : ظاہر ہُوا۔ آشکارا۔ پیدا (فارسی صفت) آشکارا۔

پَے دَر پَے : مُسلسل، لگاتار، ایک کے بعد ایک۔

پیر یا پِیڑ: درد، دُکھن۔

پیر زال : بہت بُوڑھی عورت (''زال'' سندھی میں عورت کو کہتے ہیں)۔

پیر زن : بُڑھیا، بُوڑھی عورت۔

پیر غُلام : بُوڑھا زرخرید نوکر۔

پیریں لگیں : دَردیں شروع ہُوئیں (مراد: دردِ زہ)۔

پیڑھی بہ پیڑھی پُشت در پُشت، نسلاً بعد نسلاً۔

پَیزاریں : جُوتیاں۔ پَیزار کی جمع۔

پیشانی : ماتھا۔ مُراد مُقدر۔

پیش کش : بادشاہ کے حضور حاضری کا نذرانہ۔

پَیکان : تیر کا پھل، جو نوکدار اور تِکونا ہوتا ہے۔

پیکھنے کا کھیل : کٹھ پُتلیوں کا تماشا (پیکھنا (ہندی): پُتلی تماشا) قدیم وقتوں میں گُلابو اور شتابو، دو کٹھ پُتلیاں بہت مشہور ہوئیں۔ پیکھیا : ایکٹر، اداکار۔

پیہم چلا گیا : مُسلسل سفر کرتا گیا۔

ت

تا بہ مقدُور : سکت کے مطابق۔

تابُوت : مُردے کا صندوق۔

تاراج کیا: برباد کیا۔

تار کشی کا رُومال: سونے چاندی کی تاروں سے کڑھائی کیا گیا رُومال۔

تازی : برق رفتار گھوڑا۔ (جیسے ''تازی کُتّا'' جو برق رفتار ہوتا ہے اور شکار کے کام آتا ہے۔)

تاش : اطلس۔ سونے کی تاروں سے بُنا ہُوا کپڑا۔

تالیف : ترتیب و تہذیب، کسی دُوسرے کے خیالات کو اپنے اسلوب میں لکھنا۔

تالیقہ :	تعلیقہ یعنی مال واسباب کی ضبطی، مکان کی قُرقی سے متعلق اسباب کی فہرست۔
تالیوں :	چابیوں۔(چابی کی جمع)
تان سَین :	گوالیار (بھارت) کا ایک مشہور گویا (پ:۱۵۳۱ء۔م:۱۵۸۸ء) جو شہنشاہ اکبر کے دربار سے مُنسلک رہا۔اس کا شمار اکبر کے نورتنوں میں ہوتا تھا۔موسیقی کا کامل اُستاد۔راگ دُھرپد، درباری کانٹرا اور میاں کی ملہار کا خالق۔بعد از وفات گوالیار میں تدفین ہوئی۔اصل نام: ترلوچن داس۔ذات: گوڑ برہمن۔
تَبر :	کُلھاڑی طرز کا ایک آلہ، جس سے لکڑیاں چیرتے تھے۔وزن میں ہلکا تَبر بطور ہتھیار بھی استعمال ہوتا تھا۔(تَبر زن: لکڑہارا۔تَبر بردار : تَبر سے مُسلح سپاہی)
تَپ :	بُخار۔
تَتّا :	گرم (سندھی میں "تتو" ہے) "کَس بر تے پر تَتّا پانی" مراد : کَس (مردانہ) قُوت کو محسوس کر کے (نہانے کو) پانی گرم کروایا؟
تَتری :	نازونخرے کرنے والی عورت، اُٹھکھیلن (جامع اللغات)۔
تُجّار :	تجارت کرنے والے، تاجر کی جمع۔
تجویز کرے :	تصفیہ کرے، فیصلہ کرے بعد از تامل، سوچ بچار۔تجویز (عربی۔مؤنث): تصفیہ، فیصلہ، غور، تامل، سوچ بچار۔
تُجھ سارکے:	تُجھ جیسے، تیری طرح کے۔
تحاشی :	تحاشا، خوف، خوف زدہ۔
تُحفہ :	نفیس، عجیب، چیدہ، اعلیٰ۔
تُحفہء عِلّت :	انوکھی بیماری، عجیب وغریب مُصیبت۔اُس کالی کلوٹی، بُھتنی سی عورت کے لیے کلمہء حقارت۔
تختِ طاؤس :	شاہجہان کا بنوایا ہُوا تخت جس پر سونے کا مُرصّع مَور پر پھیلائے کھڑا تھا۔نادر شاہ ۱۷۳۹ء میں ہندوستان کو لوٹ کر یہ تخت بھی اپنے ساتھ ایران لے گیا۔
تختہء نَرد :	نردین کا کھیل، چَوسر طرز کا کھیل جو چوبی تختے پر چار پانسوں سے کھیلا جاتا ہے۔ایران میں شطرنج کے مقابلے پر ایجاد کیا گیا۔اس کے چوبیس خانے ہوتے ہیں۔

ترازُو ہونا : آر پار ہونا۔ تیر کا پَھل گزر جائے اور آخری حصّہ نہ گُزرے۔

ترپولیا : سہ درہ، تین دَروں یا تین محرابوں والی عمارت۔ درمیانی دَر بڑا رکھا جاتا ہے۔

تُرت : جلد، جَھٹ پَٹ، فوراً۔

تَرقیم کیا : تحریر کیا۔

تُرک : تاتار یا تُرکستان کا باشندہ، جو یقیناً مسلمان ہوگا۔

تَرکِ حیوانات : اُن اشیا کا استعمال چھوڑ دینا جو حیوانات سے پیدا ہوتی ہیں، جیسے گوشت، دُودھ، انڈا، مچھلی، گھی، بالائی۔

تُرکستان : تاتار کا علاقہ، منگولوں کی سرزمین۔

تُرکنی : وہ تُرک سپاہی خواتین جو مردانہ لباس (وردی) پہن کر پہرا چوکی کا کام کرتی تھیں۔

تسخیر: حاضرات کا وہ وظیفہ یا عمل، جس میں جِنوں، بُھوتوں یا پَریوں کو قابو کر کے کسی کے دل میں اپنی محبت پیدا کی جا سکے۔

تشخیص : مرض پکڑنا۔

تَصدیع : تکلیف۔

تَعجّب دیکھ کر : عجیب واقعہ دیکھ کر۔

تعفُّن سَڑاند، بَدبُو۔

تغافُل ہُوا : بے پروائی برتی گئی، غفلت سے کام لیا گیا۔ تغافُل (عربی): غفلت، بے پروائی۔

تغیر کر کر : مُلازمت سے برطرف کر کے۔

تغیر ہو گیا : مُتغیر ہو گیا۔ مُراد: رنگ فق ہو گیا، ہوش جاتے رہے۔

تفاوُت: دُوری، فاصلہ، فرق، غلط۔ ''باغ و بہار'' میں یہ لفظ دُوری یا فرق اور غلط کے معنوں میں برتا گیا ہے۔ ''سیر پہلے درویش کی'' اور ''سیر تیسرے درویش کی'' میں فرق کے معنوں میں اور ''سیر دوسرے درویش کی'' میں غلط کے معنوں میں۔

تفنُّن : خُوش طبعی، دل کے بہلاوے کی خاطر۔

تقصیر: قصور، غَلَطی، گُناہ، کمی کوتاہی، بُھول چُوک۔

تقید : تاکید کی گنوار صورت، اصرار، تنبیہ۔

تکش : ترکش۔تیر رکھنے کا خانہ، تیر دان۔

تکینی : چھوٹا تکیہ، جسے ''گل تکیہ'' بھی کہتے ہیں۔

تکیہ : فقیر، درویش کی قیام گاہ۔

تگ ودَو: دوڑ دھوپ، کوشش، سعی، جستجو (جامع اللغات)۔

تَل : سطح۔

تَلَپھتی : تڑپتی۔

تَلَپھتے : تڑپتے۔مراد بےبسی سے تڑپتے ہوئے۔

تلپھے ہے : تڑپ رہا ہے۔

تلک : تک

تلوار دودستی : بھاری تلوار، جو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر چلائی جائے۔

تماش بین : ناچ کا رسیا، عیاش۔

تمامی : سونے چاندی کے تاروں اور ریشم سے بنا ہوا کپڑا۔ ''جس کی بناوٹ میں سنہری یا رُپہلی بادلے کا چارخانہ بنا ہوتا ہے۔'' (فرہنگِ آصفیہ)۔

تُم سار کا : تم جیسا۔

تمسک : وہ تحریر جو قرض حاصل کرنے کی سند کے طور پر لکھی جائے۔عربی میں اس کے معنی مضبوطی سے پکڑنا اور چنگل مارنا ہے۔

تَملُّق : خوشامد، چاپلوسی، للوپتو (جامع اللغات)۔

تناول کرنا یا تناول فرمانا : کھانا کھانا، کھانا نوش فرمانا۔

تنکی شیر مال : خوب کھلی ہوئی خستہ روٹی، جو پلاؤ یا زردہ کی قابوں کو ڈھکنے کے لیے پکائی جاتی تھی تاکہ چاول گرم رہیں۔

تو : تاکہ، اِس لیے کہ۔(سوالیہ انداز ہو تو اِس کے معنی ''پھر؟'' ہوں گے)۔

تواضع کرنا : خاطر مدارت، آؤ بھگت، مہمانداری۔''ایک پیالہ تواضع کیا۔'': شراب کا پیالہ پیش کیا ازراہ

خاطرداری۔

توبڑا : تھیلا۔

تورا / تورہ : سینی یا کشتی، جس میں سامان رکھ کر کسی امیر کی نذر گزاری جائے (پیش کے ساتھ لِکھنا غلط ہے۔

تورہ پوش : بانس کی پھپچیوں سے بنا، کڑھائی دار کپڑے سے ڈھکا ہُوا ڈھکنا، جس سے سینی یا کشتی کو ڈھانپا جائے۔

تورے کا تورا چُن دیا : انواع واقسام کا کھانا سامنے لا رکھا، خوان میں رکھے قِسم قِسم کے کھانے سامنے لا رکھے۔

؎ مُرصع جام و زرّیں آب خورے
بڑے تھے سلطنت کے اُن کے تورے (نظیر)

تُوڑ : جھالر، جالی (موتیوں کی تُوڑ : موتیوں سے بنی جھالر یا جالی)

توڑا : ایک ہزار روپے یا اشرفیوں کی بھری ہوئی تھیلی (فرہنگ آصفیہ)۔

تَوَقُّف کا مکان نہیں : ٹھہرنے یا قیام کرنے کی جگہ نہیں۔ رُکنے کی جگہ نہیں۔

تَوَقُّف کرو : رُکو، ٹھہرو (عربی میں تَوَقُّف کے معنی رُکنے، ڈھیل دینے اور دیر کے ہیں۔) مُراد : رُکو، ابھی سزا نہ دو۔

تَوَقُّف کیجیے : ٹھہریے، انتظار فرمائیے۔

تَوَقُّف ہوگا : اگر دیر ہوگی۔

تول : وزن (جواہرات کے معاملے میں وزن خاص اہمیت رکھتا ہے)۔

تَوَلُّد : بچّے کا پیدا ہونا، جنم لینا۔

تَوَنگر : دولت مند، مال دار۔

تھالی : دھات کا گول اور چپٹا برتن، جس میں روٹی بھی رکھی جا سکے اور سالن بھی ڈالا جا سکے۔ مٹی کی رکابی کی ترقی یافتہ صورت۔

تھانبنا : تھامنا۔ (اپنے تئیں تھانبا : اپنے آپ کو سنبھالا)۔

تہ پوشی : لڑکیوں، عورتوں کا زیر جامہ (انڈرویئر)۔ دُلھن کے لیے عام طور پر نرم اور بھڑکیلے کپڑے کا بنایا جاتا تھا، بالخصوص زربفت کا۔

تَھل بیڑا : بندرگاہ، کنارہ۔ ناؤ یا بحری جہاز کے ٹھہرنے کا مقام۔

تَھلَکنا : ہلنا، دھڑکنا۔

تئیں : کو، لیے، واسطے۔

تیجا : سوئم۔ مرے ہوئے کا تیسرا دن۔

تیرے کارنے : تیرے کارن یعنی تیری خاطر، تیرے لیے۔

تیز آب : ایسڈ۔ مجازاً : بہت تیز شراب۔

تیغا : بڑی اور خم دار تلوار۔ ''تیغا زبردست، لنگر دار، اصیل اور فولادی دونوں طرح کا خُوش خم اور پُر خم ہوتا ہے۔ تین طرح کا سُنا اور دیکھا ہے۔ گُجراتی گھاٹ کا، راہواری گھاٹ کا، جھان کا مشہور ہے۔'' کیپٹن اعجاز علی شہرت، پندرہ روزہ ''حُسن کار'' حیدر آباد (دکن) جلد: ایک، شمارہ: پانچ۔

ے تیغا ، سپر ، قرابیں ، جمدھر ہُوا تو پھر کیا (نظیر)

تیل ماش اور کالے تِلے صدقے کرنا : نظرِ بد سے بچانے کے لیے عورتوں کا ایک ٹوٹکا۔

تیمُور : اَمیر تیمُور (پ: ۱۳۳۶ء۔ م: ۱۴۰۵ء) اُس کا باپ قوم برلا کا سردار تھا۔ امیر تیمُور مختلف جنگیں لڑ کر ۱۳۶۹ء میں سمر قند پر قابض ہُوا۔ مغرب میں دریائے والگا کے کنارے تک اور جنوب و جنوب مغرب میں افغانستان، ایران، بغداد، کربلا اور کُردستان فتح کیے ۱۳۹۸ء میں ہندوستان پر حملہ کیا۔ دِلّی کو لوٹنے کے بعد دمشق اور حلب پر قبضہ کیا۔ چین پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا کہ ۱۴۰۵ء میں وفات پائی۔ لنگڑا تھا اس لیے تیمور لنگ کے نام سے مشہور ہُوا۔ سمر قند کے نواح میں مدفن ہے۔

تیورانا : غشی کی حالت۔

تیوری : ماتھے پر بَل۔

تیہے میں آکر : سخت غصّے میں آکر۔

ٹ

ٹک : ذرا۔

ٹکر : روٹی کا ٹکڑا۔

ٹکرا : نوالہ، لقمہ، روٹی۔

ٹنڈیاں کسنا : دونوں بازو جکڑنا، مُشکیں کسنا، ہاتھوں کے پُہنچے کسنا۔

ٹنکیانا : گھوڑے کو ایڑ لگانا۔

ٹھاکر : آقا، سوامی، زمین دار (راجپوتوں میں)

ٹھاٹھ پھیلانا : (محاورہ) کسی چیز کی درستی کا سامان جمع کرنا۔

ٹھٹھولی : تمسخر سے۔

ٹھڈیاں : ٹھڈی : بھنے ہوئے اناج کا وہ دانہ جو ابھی پُوری طرح نہ کھلا ہو۔ بعض مقامات پر بھنا ہُوا چنا مُراد لی جاتی ہے۔

ٹھنڈھک : ٹھنڈک کی قدیم اِملا۔

ٹھنڈھے : ٹھنڈے کی قدیم اِملا۔

ٹوپ جھلم کا : زِرہ کی طرح کی آہنی نقاب، جو جنگ جُو لڑتے وقت چہرے کی حفاظت کے لیے پہنتے ہیں۔

ٹھلیاں : مٹی کے چھوٹے گھڑے۔ ہندو ان سے پتروں کو پانی دیتے ہیں۔

ٹھہرا، اور سادھ کر : اچھی طرح سوچ بچار کر کے۔

ٹہل : خدمت گزاری، چاکری۔

ٹھور : ٹھکانہ، جگہ۔

ٹھیپ : وہ ٹھیکرا (برتن) جس میں فقیر اپنے استعمال میں آنے والی آگ رکھتے ہیں۔

ٹیپ ٹاپ سے : اہتمام سے۔

ٹینٹی : کانٹے دار جھاڑی ''کریل'' کا پھل (جس کا اچار بھی بنایا جاتا ہے)

ث

ثابت خانی: خاص ہتھیار بند سپاہی۔ ''ثابت خانی'' اِس لیے کہلائے کہ پہلے پہل ثابت خان نے انھیں بھرتی کیا تھا۔

ثانی : اُس جیسا، مانند۔

ثانی الحال: بارِ دگر، بعد میں۔

ثَمرَہ : حاصل۔

ج

جاجم: ٹھپّے کے ساتھ تیار کردہ چادر، جو دری پر بچھائی جاتی ہے۔

جارُوب کشی: جھاڑو دینا، جھاڑو دینے کا پیشہ۔

جاگیر : وہ زمین، علاقہ یا گاؤں جو بادشاہ کی طرف سے بطور انعام دیا جائے اور اُس کی آمدن انعام پانے والا اپنے خرچ میں لائے۔ ''جاگیر دوام'' وہ جاگیر ہُوا کرتی تھی جو نسلاً بعد نسل خاندان میں رہے۔ ''جاگیرِ احتشام'' لشکر کی پرورش کے لیے دی جاتی تھی۔

جامدانی : ایک باریک کپڑا جس میں پُھول از خود اُبھرے ہوئے ہوں یعنی کپڑے کی بُنائی میں ہوں، کڑھائی کردہ نہیں۔

جامع مسجد : مُراد : جامع مسجد دہلی۔

جاں باز : جان لڑا دینے والے۔ مُراد: ایسے گھوڑے جو جفاکش ہوں، بہت دیر تک دوڑ سکتے ہوں۔

جاں بہ حق تسلیم ہونا : مر جانا، فوت ہو جانا۔

جانفِشانی : بہت کوشش، سخت محنت، سرگرمی۔ ''جانفشانی بجالاتے رہے'' : سخت محنت کرتے رہے۔

جانکندنی: جانکنی، دم توڑنے کی حالت، نزع کا عالم۔

جاہی جُوہی : ایسی آتشبازی جس میں سے چنبیلی کی طرح کے پُھول جُھڑتے ہوں۔

جائی : (پیدا کردہ) بیٹی۔ اسی طرح، جایا: بیٹا۔

جب ایسی چیزوں پر رَوا رکھی : شادی کرنا گوارا کیا اور اک زُوجے کے بدن کے محرم بنے۔

جب بیل پھوٹی، رائی رائی ہوگئی : جب نااتفاقی سے پُھوٹ پڑ جائے تو نقصان ہوتا ہے۔ مُراد، فوج کی ثابت قدمی سردار کے سر سے ہے۔ بادشاہ نہ رہا تو فوج بکھر گئی۔

جب تلک نتھنوں میں دَم ہے : جب تک دَم میں دَم ہے، زندگی باقی ہے۔

جب تئیں : جب تک۔

جٹا : گُندھے یا جمے ہُوئے بال، جُوڑا۔

جٹا دھاری : شِو جی کی طرح کے گُندھے ہوئے بالوں والا۔ ''جٹا دھر'' بھی کہتے ہیں۔ یہ شِو جی کا لقب ہے۔ شِو جی کے پُجاری جٹا دھاری ہُوا کرتے ہیں۔

جچّا : زچہ ۔ ع کچھ ڈھول مجیرے لاتی تھیں کچھ گیت جچّا کے گاتی تھیں (نظیر)

جدّ و کد : کوشش، سخت محنت، مشقت۔

جُدی : جُدا۔

جُدی جُدی : جُدا جُدا، الگ الگ۔

جُرّہ : نر باز کو جُرّہ کہتے ہیں (جامع اللغات) ایک شکاری پرندہ، جو چیل سے چھوٹا لیکن حد درجہ خطرناک۔ اُس کا رنگ مٹمیلا، پیٹھ کالی اور آنکھیں لال ہوتی ہیں (ہندی شبد ساگر)

ع باز و لگڑ و جُرّہ و شاہین ہوئے عاشق (نظیر)

جڑاؤ : مُرصّع کار، جواہرات ٹکے ہُوئے۔

جڑاؤ کے : مُرصّع (برتن)

جز بز ہونا : تنگ ہونا، کبیدہ خاطر ہونا۔

جَس : شہرت، نام۔

جَست کر کر : چھلانگ بھروا کر (گھوڑے کو)

جِس تِس طرح : جیسے تیسے۔

جِس کی نہ پھٹی ہو بوائی، کیا جانے پیر پرائی : مثل: جسے کبھی دُکھ نہ پہنچا ہو، وہ کسی کی تکلیف کو کیسے سمجھے گا۔ سردی سے ہاتھ پیر پھٹنے کو ''بوائی پھٹنا'' کہتے ہیں۔ یوں بھی کہا جاتا ہے: ''جس کے پاؤں نہ جائے بوائی، وہ کیا جانے پیر پرائی۔

جَس ہوگا : نیک نامی ہوگی۔

جُفت : مثل، طرح کا (طاقِ کسریٰ کا جُفت ہو : نوشیرواں (بادشاہ) کے محل جیسا ہو)

جگر سوز : دِل جلا۔

جلا وطن ہُوا : شہر کو چھوڑنا پڑا۔ جلاوطن (فارسی۔ صفت) جو وطن سے نکلا یا نکالا گیا ہو۔

جَل بَل کر : جَل بُھن کر۔ جلنا (ہندی) بَھڑکنا، بَلنا (ہندی) سُلگنا، جلنا۔

جَلد : برق رفتار، تیز۔

جَلد دَست : ماہر، ہاتھوں کے تیز کاری گر۔

جَلد کیا : تیز بھگایا۔

جِلَو کر کر : ساتھ چل کر۔

جِلَو میں لے کر : ساتھ لے کر۔

جِلَو میں ہو لیے : ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

جُمنا : ہندوستان کا مشہور دریا، جو دریائے گنگا کا معاون ہے اور اُس سے پریاگ کے پاس جا کر ملتا ہے۔ جمنوتری سے نکلتا ہے۔ لمبائی ۸۶۰ میل۔ دہلی اور آگرہ اُس کے کنارے آباد ہیں۔

جُمیرات : جمعرات کا قدیم اِملا۔ قدیم وقتوں میں ''جمع رات'' بھی لکھتے رہے ہیں۔

جِن نے : جِس نے، جِنھوں نے۔

جنابِ باری میں : اللہ کے حضور میں۔

جَنتر مَنتر : جھاڑ پونچھ کا ٹوٹکا، بُری رُوح کے سایے کا اُتار۔

جَنَم بُھم : جائے پیدائش، جَنَم بُھومی۔

جَنَم پتری : زائچہ، سِتاروں کی نسبت سے مستقبل کا احوال۔

جِنّیات : جِن کی جمع۔ (عالَمِ جِنّیات کو : جِنّوں کے جہان کو)

جواب دے کر : (مصاحبوں کو دربار میں) حاضری سے منع کر کے۔

جَواں مَردی : بہادری، فیّاضی۔

جواہر میں جَڑی : جواہرات سے بجی۔ میر امّن نے اکثر جمع کا صیغہ برتا ہے مثال : ''ایسا جواہر کبھو نہ دیکھا تھا۔'' یعنی روزمرہ کو صحتِ لفظی پر ترجیح دی ہے۔

جوشِش : جوش۔

جوگا : مناسب، لائق (اپنے جوگا : اپنے لائق)۔

جوگنی کو پیٹھ دے کر : بُری ساعت سے بچ بچا کر۔ (جوگنی : علمِ نجوم کے مطابق وہ دیوی یا رُوح، جس کے اختیار

میں اُچھارا وقت ہوتا ہے۔ ہندوؤں کی چونسٹھ جوگنیاں مشہور ہیں۔ یہاں مُراد ہے دُرگا دیوی (کالی دیوی) کی خادمہ، ایک جادوگرنی۔ یعنی سعد ساعت دیکھ کر روانہ ہُوا۔ ج۔ ایف۔ بینز نے لکھا ہے: "Having Jurned the R.Backs on the evil deity".

جَون پُور کا پُل : جلال الدین محمد اکبر کے عہدِ حکومت ۹۸۰ھ مطابق ۷۳-۱۵۷۲ء میں پتھر کے ساتھ تعمیر کیا گیا۔ اُسی حالت میں آج بھی قائم ہے۔ اس پر دورویہ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر سیر تماشا کے لیے بُرجیاں بنی ہیں۔ (بہ حوالہ مولانا فضل اللہ فاروقی ندوی۔ "باغ و بہار" مرتبہ: ابوالخیر کشفی) سرسید احمد خاں نے "آثارالصنادید" میں لکھا ہے کہ: "اِس پُل کو جہانگیر بادشاہ کے عہد میں ۱۰۲۱ھ مطابق ۱۶۱۲عیسوی کے مہربان آغا عرف آغامان المخاطب بہ "آغائے آغایان" خواجہ سرا نے بنایا ہے۔" بارہ دروں والا یہ پُل لمبائی میں ۳۶۱ فٹ اور چوڑائی میں ۴۶ فٹ ہے۔ دریائے جمنا سے پھوٹنے والی ایک ندی پر، خانِ خاناں کے مقبرے کے پچھواڑے متھرا روڈ پر واقع ہے۔

جُونْرا بھونْرا : الگ تھلگ جگہ، تہ خانہ۔

جُوہی : آتش بازی کی ایک قِسم جس میں آتش بازی کے ذریعے ایک گھنا سا جھاڑی دار پیڑ بن جاتا ہے، جس کی پتّیاں چھوٹی اور نوک دار ہوتی ہیں، عین جُوہی کے پتوں کی طرح۔

جھاڑ : پنج شاخہ مشعل جو اُمراء کے محلات میں روشنی اور آرائش و زیبائش کے لیے لٹکایا جاتا تھا۔

جھاڑا جھٹکا، پھر : پیشاب کرنے کے بعد وضو میں رہنے کے لیے ڈھیلے کا استعمال کر کے۔ مونیرِ ولیمر لکھتے ہیں: " TO PERFORM NECESSARY CALLS OF NATURE "

جہاں تہاں کا : اِدھر اُدھر کا۔ مُراد مختلف شہروں یا مُلکوں کا۔

جہاں دِیدہ : تجربہ کار۔

جھروکھا : جھروکا کا قدیم اِملا۔ قلعہ یا محل کی وہ اُبھرواں کھڑکی، جو پائیں باغ یا دریا کے رُخ پر کُھلتی ہو، جھروکہ دَرشن کے لیے مخصوص تھی۔

جَھڑبیری : جنگلی بیر کی جھاڑی۔ ع تو ہم بھی سُوکھ کے جَھڑبیری کے ہوئے ہیں جھاڑ (نظیر)

جَھڑنے لگیں : بجنے لگیں۔

جھلابُور : جَگ مَگ کرتی، جگمگاتی۔

جھلَم : باریک زنجیروں کی جھالر، جو نقاب کی طرح سر پر پہنے ہوئے لوہے کے خود سے چہرے کے رُخ پر لٹکتی رہتی تھی اور جنگ میں تلوار کے وار سے چہرے کو بچاتی تھی۔

جھلَم کا ٹوپ: وہ خود جس میں جھلَم لگی ہو۔

جُھمَک : چمک، تجلّی۔(جُھمَک ہی سے جُھمکڑا بنا) ع کیا جانے کیا جھمکڑا جادو پناہ دیکھا (نظیر)

جُھوٹھ مُوٹھ : جُھوٹ مُوٹ کی قدیم اِملا و تلفظ۔

جھول : وہ کپڑا جسے پالتو گھوڑے، ہاتھی، کُتّے یا ہَرن کی پیٹھ پر سردی سے بچاؤ اور آرائش کے لیے ڈال دیتے تھے۔

جھونٹے: سر کے بال، چوٹی، بالوں کا جُٹا۔(جھونٹا کی جمع)

ع سرکاٹ راچھسوں سے جھونٹے پکڑ ہلادے (نظیر)

جُھونما : جُھوما کا قدیم اِملا۔(مراد : لڑکھڑایا، ڈولا)۔

جی : فرد، شخص (دونوں جی : ہم دونوں)

جیبھ : زبان، بہ معنی عضوِ جسم۔

جَیٹھر : پانی سے بھرے ہُوئے گھڑوں کا اک دوجے پر رکھے ہُوئے ہونا۔

جِیدھر : جدھر کا قدیم اِملا و تلفظ۔

جِیدھر تِدھر : جہاں تہاں (جیدھر : جدھر۔ تِدھر :وہاں)

جی میں ٹھہرایا : طے کرلیا، پکّا ارادہ کرلیا۔

چ

چار آئینہ : ''ایک قسم کی زِرہ، جس میں چار لوہے کے تختے، بانات اور مخمل میں منڈھ کر سینے اور پیٹھ کی طرف لگائے جاتے ہیں۔'' (نُور اللغات)

چار چند : چَوگُنا خوبصورتی (چار چاند لگنا :خوبصورتی بڑھنا)

چار دانگ : چاروں سمت، چاروں طرف (دانگ : سمت، طرف) '' چار دانگ ملک''

چاروں اطراف میں جو ممالک ہیں۔ مُراد پوری دنیا۔ ''چار دانگ دُنیا'': پُوری دنیا۔

چارزانو : آلتی پالتی مار کر۔

چارقُب : صدری یا واسکوٹ۔ ''چارقُب موتیوں کی'': موتیوں سے مزین چارقُب (صدری)

چارگردے کے : دَم خَم والے۔ ''چارگردے کے گھوڑے'': وہ گھوڑے، جو جلد نہ تھکیں۔

چالاک : چُست، پُھرتیلا، برق رفتار۔

چاندنی : وہ سفید چادر، جو فرشی دری کے اُوپر بچھائی جاتی ہے۔

چاوَچوز : نازنخرہ، لاڈ پیار۔

چاہیتا : درکار ہوتا۔

چِبَلا : چھچھورا، طفلانہ حرکتیں کرنے والا۔ دہلی کا روزمرہ۔

چَپکن : انگرکھا، قبا۔

چت : دھیان۔ پنجابی میں ''چِیتا'' کہا جاتا ہے۔

چُٹلا : مُوباف، چوٹی باندھنے کا فیتہ۔

چِٹّے بِٹّے : ننھے بچّوں کا ایک کِھلونا، جس میں چُسنیاں اور لٹّو لٹکتے رہتے ہیں۔

چراغاں : بہت سے چراغوں کا اکٹھے جلنا یا رَوشن ہونا۔

چَرتَر : عورتوں کا مکر فریب، چَھل، چالاکی۔

چَرخی : ایسی آتش بازی، جس میں آتش بازی چھوڑنے کو ایک چکری سی لگی ہوتی ہے، جو گھومتی ہے اور چاروں اطراف میں آتش بازی کے پُھول برستے ہیں۔

چَرم : چمڑا، کھال، پوست۔

چَرن بَرداری : چاکری، کفش برداری۔ یہاں عاجزی کے ساتھ خدمت گزاری کے معنوں میں آیا ہے۔ (چَرن (سنسکرت) : پاؤں، مجازاً جُوتا)

چڑھواں جُوتا : اُٹھی ہوئی ایڑی والا جُوتا، جس میں پاؤں کا تلوا جما رہتا ہے، لانگ بُوٹ۔

چشم نُمائی کرنا : آنکھ کی اِشارت سے دَھمکی دینا یا جھڑکنا۔ ع بے جُرم و خطا یار نہ کر چشم نمائی (نظیر)

چقاچاق : چاقو چلنے کی آواز۔

چکار : چَور۔

چکمک : چقماق۔ وہ پتھر، جس کو رگڑنے سے چنگاریاں نکلتی ہیں۔

چلّا : چالیس دن کی مُدّت، چالیس دن کے وظیفے کا عمل۔ ''چلّے بیٹھنا'': چالیس دن کو گوشہء تنہائی میں بیٹھنا۔

چلمچی : ہاتھ مُونہہ دھونے کا برتن، جس کی بالائی سطح پر سُوراخ دار ڈھکّن ہوتا ہے تاکہ استعمال شدہ پانی پَیندے میں جا بیٹھے، اُوپر سے دکھائی نہ دے۔ عام طور پر تانبے کا بنایا جاتا تھا۔

چلّہ : کمان میں کھنچا ہُوا تانت کا درمیانی حصّہ، جس کے اُوپر تیر کو رکھ کر نشانہ لیا جاتا ہے۔

چلّے میں غُسل کیا : چالیس روز میں صحت یاب ہُوا۔

چُماق : لوہے یا لکڑی کا شش پہلو گُرز، جو عُہدے کا نشان ہوتا تھا۔ اُسے ''چُماغ'' بھی کہتے تھے۔

چمچا بھر خُون اپنا، ہر بات میں زبان سے نِثار کرتے تھے : جانثاری کا دعویٰ کرتے تھے۔

چُملا : چھوٹا کاسہ، جس میں فقیر کھانے پینے کی اشیاء رکھتے ہیں۔

چَند در چَند : مُتعدد، بہت سے، کئی ایک۔

چَندے : کچھ مدت بعد۔

چَنگا : صحت مند، تن درست۔ سندھی میں ''چنگو'' بولا جاتا ہے (چنگے ہونے کی دُعا مانگنا : صحت یاب ہونے کی دُعا مانگنا)

چنگیریں : چنگیریں، پھیلے ہوئے مُونہہ کی ٹوکری، جس میں پُھول یا پھل رکھے جائیں، مُراد پُھول دان۔

چُوائیو : ٹپکائیو۔ مُراد آہستہ آہستہ ٹپکانا۔

چوب دار : دَربان۔

چوبک : ڈھول بجانے کی لکڑی۔ چَوب کا اسم تصغیر۔

چَوبے : چَوبا کی جمع۔ مُراد متھرا کے ایسے برہمن، جو چار ویدوں کے عالم ہوں۔ اب اُن کی اولاد بے شک انپڑھ ہی کیوں نہ ہو، ''چَوبا'' کہلاتی ہے۔

چَوپَڑ : چوسر، نبرد بازی۔ ایک ایسا کھیل جو بساط پر چار رنگوں کی چار چار گوٹوں اور تین پانسو سے دو افراد کے بیچ کھیلا جاتا ہے۔ دونوں کھلاڑی، دو دو رنگوں کی آٹھ آٹھ گوٹیں لے لیتے ہیں اور

باری باری پانسے پھینکتے ہیں ۔ پانسوں کے مطابق گوٹیں حرکت کرتی ہیں ۔ یہ کھیل جب پانسوں کے بدلے سات کوڑیاں پھینک کر کھیلا جائے تو اُسے ''پچیسی'' کہتے ہیں۔ اس کھیل کی بساط عموماً کپڑے پر بنائی جاتی ہے۔ بیچ کا حصّہ تھیلی کی شکل کا ہوتا ہے، جس میں کھیل کے بعد گوٹیں بھر کر رکھ دی جاتی ہیں۔ تھیلی کے چاروں کناروں پر چار لمبے چوکور ٹکڑے ہوتے ہیں، جن میں سے ہر ایک کی لمبائی میں آٹھ آٹھ چوکور خانوں کی تین تین قطاریں ہوتی ہیں۔

ع کسی کے نرد نے چوپڑ کے کردیا زارا (نظیر)

چَوجُگی : نہایت قدیم، چار زمانوں کا۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق دنیا کی عمر چار جگوں کی ہے اور ہر جُگ کئی لاکھ سال کا ہوتا ہے۔ مُراد بہت قدیم آبادی۔

چَوچلا : چونچلا، ناز نخرہ ۔ ع سمجھا ہوں میں تمھارے انداز چوچلوں کے (نظیر)

چونڈول : کشادہ اور ہوادار ڈولا، جسے کہار کندھوں پر اُٹھا کر چلتے تھے۔

چَوکی : پہرا (''گاڑھی چوکی'': سخت پہرا۔ ''چوکی آ بیٹھی'': پہرا لگ گیا۔ ''چوکی میں تھے'' پہرے پر تھے۔)

چَوگان : چوگان یا چوغان، اُس گیند کے بلّے کو کہتے تھے جس کا نچلا سِرا ہاکی کی طرح مُڑا ہُوا ہوتا تھا۔ ایک ایرانی کھیل۔ گھوڑوں پر بیٹھ کر یہ کھیل پولو کی طرح اُسی بلّے سے کھیلا جاتا تھا۔ سلطان قُطب الدین ایبک، لاہور میں یہی کھیل کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر ہلاک ہُوا۔ جہاں دم دیا، وہیں مدفین ہوئی۔ ایبک روڈ، نئی انار کلی، لاہور میں مزار ہے۔

پھر اس میں آ کے سر نے لیا پاؤں پر قرار
چوگان سے کمر کے بنا سر کی گیند مار (نظیر)

چَوگوشہ : مُستطیل سینی یا کشتی جس میں اشیاء رکھ کر دوسرے گھروں میں بھجوائی جاتی تھیں۔

چَوگھرا : چار خانوں پر مشتمل خاص دان، جو عام طور پر تانبے یا چاندی کا بنا ہُوا ہوتا تھا۔ جس میں لونگ، الائچی، چھالیہ اور کھلوریاں رکھتے تھے۔

چَھاپ : خاتم۔ ایسی انگوٹھی جو بطور مُہر استعمال میں لائی جاتی تھی۔

چھاتی پر سانپ پھِر گیا : از حد ملال ہُوا، شدید صدمہ پہنچا۔

چھار : راکھ۔

چہاردہ معصوم : اثنا عشری شیعہ حضرات کے عقیدے کے مطابق حضرت محمدؐ رسول اللہ، حضرت فاطمہؓ اور بارہ امام (دیکھیے: دوازدہ امام)

چھاگل : مشکیزہ۔

چھب تختی : بالغ مرد کے سینے اور جسم کی موزونی اور خوبصورتی (آصفیہ)
(''چھب تختی درست ہوئی'' : جسم سڈول ہو گیا) ممتاز حسین نے گات اور جسم کا متناسب ہونا لکھا ہے۔ ع کیا سجیں، کیا کیا دھجیں، کیا ناز، کیا چھب تختیاں (نظیر)

چھپر کھٹ : بھاری پلنگ جسے ''چھپر کھاٹ'' یا ''چھپر کھٹ'' اِس لیے کہتے تھے کہ اس کے چاروں پایوں پر چار بانسوں کے ذریعے (آرائش کے لیے) باریک پردے ڈال دیے جاتے تھے، مچھر دانی کی طرح کے۔

چھتر: مُرصّع، رنگ دار چھتری، جو بادشاہوں کے سر پر تانی جاتی تھی۔
ع نے ہاتھی گھوڑے سنگ گئے، نے تخت چھتر ہم راہ چلے (نظیر)

چھتر باندھے ہوئے : چھتری کا سایہ کیے ہُوئے۔

چھتیس فرقہ رعیت : ہر فرقے اور طبقے کے لوگ، ساری رعیت، چھوٹے بڑے، عورت مرد سب۔

چُھچھی : شوخ سُرخ رنگ کی (چُھچھا : شوخ سُرخ رنگ کا)

چہ خوش : واہ کیا کہنے۔ کلمہ طنز۔
ع جھنجھلا کر دُور پھینک دی اور یُوں کہا : چہ خُوش (نظیر)

چہرہ ملین : افسردہ، اُداس چہرہ۔

چھڑیاں : جھنڈیاں۔

چھڑیوں کا میلہ : وہ میلہ جو کسی بزرگ کی چھڑیوں کے نام سے ہو۔ جیسے میراں جی کی چھڑیاں، میاں مدار کی چھڑیاں۔ ع سیکڑوں رنگ رنگ کی چھڑیاں (نظیر)

چھکو : تھپڑ، دَھول۔

چھلاوا ہو گیا : چُل یا چھل دے گیا (چھلاوا :شوخی، چُلبلاہٹ اور تیز رفتاری) ممتاز حسین اور رشید حسن خاں

نے اس کے معنی "غائب ہوگیا" لکھے ہیں جو گمراہ کن ہیں۔

چُھوٹ : عکس۔

چُھوٹی ہوئیں : چُھوٹی ہوئی۔

چُھوچُھو : دایہ، کھلائی۔ بچّے کے پوتڑے دھونے اور اُس کی مالش کرنے والی عورت۔

چُھول : سر چُھول، سر مُونڈنا، مُونڈن۔

چیلا : شاہی غلام۔

چیں بہ جبیں ہوکر : پیشانی پر شکنیں ڈال کر، ناراضی کا اظہار کرکے۔

چیُونٹی : چیونٹی کا قدیم اِملا۔

چین : براعظم ایشیا کا ایک بڑا مُلک (رقبہ ۴۲۷۷۲۶۰) ماؤزے تنگ کے سُرخ انقلاب کے بعد ایٹمی طاقت بنا۔ قدیم وقتوں میں چین کے لوگ افیونی مشہور تھے۔ سُرخ انقلاب سے پہلے وہاں مچھلیوں تک کی پُوجا کی گئی۔

ح

حاتم : حاتم طائی، زمانہ : قبل از اسلام۔ اصل نام حاتم بن عبداللہ بن سعد۔ عربی شاعر اور شجاع تھا۔ قبیلہ طے کا سردار تھا۔ صاحبِ دیوان ہے۔ (جامع اللغات) سخاوت کے سلسلے میں اُس کا نام ضرب المثل بن گیا۔ "المنجد" میں درج ہے کہ اُس کا دیوان پہلی بار لندن سے ۱۸۷۲ء میں شائع ہُوا۔ اُس کے دیوان کا ایک ترجمہ جرمن زبان میں ہو چُکا ہے۔

حاجب : دربان۔

حاذِق : ماہرِ فن طبیب۔ کامل طبیب کی صفت کے طور پر "حکیمِ حاذق" کہا جاتا ہے۔

حاضرات جن وپَری : وہ عمل، جس کی مدد سے جنوں اور پریوں کو بُلایا جاسکے۔ کہا جاتا ہے کہ چراغ کی لَو میں جن اور پریاں دکھائی دیتے ہیں۔

حاضری : ماحضر۔ وہ تھوڑا سا کھانا، جو بوقتِ ضرورت موجود ہو۔

حَباب : شراب رکھنے کا نازک شیشہ بصورتِ صُراحی۔

حَتَّی المقدور : جس قدر ممکن ہو، جہاں تک ہو سکے۔

حجاب : پردہ، نقاب۔

حچّہ : زچّہ۔ حچّہ نسوانی تلفظ ہے۔ گنوار لوگ بچّہ بھی کہتے ہیں۔

حَرامی : چور، لُٹیرا۔

حرف زندگی پر ہے : زندگی داؤ پر ہے۔

حِصار : شہر پناہ، چار دیواری۔

حَظ : مزا، لذّت، لُطف۔

حُکم میں حاضر رہنا : حُکم کی تعمیل کے لیے مُستعد اور ہمہ وقت حاضر رہنا۔

حَلَبی آئینے : شام کے شہر حَلَب کے بنے ہُوئے اعلیٰ درجے کے آئینے، جو پُرانے وقتوں میں مشہور تھے۔

حلقہ بگوش : جس کے کان میں غُلامی کا چھلا پڑا ہُوا ہو۔ مُراد: مُطیع، تابع فرمان۔

حَلیم : کھچڑا۔ اصل لفظ لحیم تھا، کیوں کہ گیہوں اور چنے کی دال میں گوشت کا جزو غالب ہے۔

حیران ہوکر : مصیبت اُٹھا کر۔ مُراد شکست کھا کر۔

حیرت نے لیا : حیرت ہوئی۔

حیض بیص : اُلجھن، کش مکش، بحث مُباحثہ۔ یہاں مُراد ہے خیالات کا اُلجھاوا۔

حَیف ہے : قابلِ افسوس۔ مُراد بے مصرف ہے۔

خ

خاتَم : چھاپ، انگوٹھی، جو بطور مُہر بھی کام آتی تھی۔

خاص بردار : مُسلح ملازم، جو سواری کے ساتھ بطور گارڈ رہتا۔

خاصدان : ٹِفن، جس میں کھانا رکھا جا سکے۔

خاصہ : شاہی مطبخ کا کھانا، جو بطور عزت افزائی کے اُمراء کو بھجوایا جاتا تھا۔

خاص پوشاک : عُمدہ لباس۔

خاصے : عُمدہ، بطور معیارِ اعلیٰ۔

خاطر جمع : اطمینان (خاطر جمع کرنا : اطمینان کر لینا۔ خاطر جمع ہونا : مُطمئن ہونا)

خاطر جمعی : ہر پہلو سے اطمینان۔

خاک نشیں: خاکسار (کلمۂ عاجزی)

خاگینہ : تلے ہوئے انڈے اور کتری ہوئی پیاز ملا کر قیمے کی طرح تیار کردہ سالن۔

خام ہُوا : غلط ثابت ہُوا۔

خان خواص : ممتاز لوگ۔ یہاں مُراد: ممتاز کنیزیں۔

خانساماں : داروغہ، مُہتمم۔

خانہ زاد : لونڈیوں یا غلاموں کی وہ اولاد جو آقا ہی کے گھر پر پلی بڑھی ہو۔ مُراد جدی پُشتی ملازم۔

خانہ زادِ مَورُوثی : جدی پُشتی ملازم۔

خاوِند : آقا۔ خُداوند کا مُخفف۔ میر امّن نے یہ لفظ شوہر کے معنوں میں بھی برتا ہے (خاوِند کرنے سے عیب نہیں: شادی کرنے سے انکار نہیں)

خبرداروں : شاہی مُخبروں۔ (خبردار کے لفظی معنی چوکنا، مُستعد)

خبر شرط : احتیاط لازم (کلمۂ تنبیہہ کے طور پر راز کی حفاظت کے لیے آیا ہے)

خجالت : خِفت، ندامت، شرمندگی۔

خجِل : نادِم، شرمندہ۔

خُداوند : آقا، مالک۔

خِدمت : ذمہ داری۔

خَراج : وہ مقررہ رقم یا جنس جو ماتحت حاکم کی جانب سے سال بہ سال شاہی خزانہ میں جمع کروائی جاتی تھی۔ ''خراج'' کو بالکسر لکھنا غلط ہے۔

خُرد خام کیا : خُوب مارا پیٹا، ہڈی پسلی ایک کر دی۔

خُردسالی : کم عُمری۔

خَردماغی : تکبر، گھمنڈ۔

خَریطہ : وہ تھیلی جس میں بادشاہ کی جانب سے رُقعہ، حکم نامہ بھیجا جائے۔

خزانہ : لگان۔ چوتھے درویش کے بیان میں اُنھی معنوں میں استعمال ہُوا ہے۔

خزانۂ عامرہ : شاہی خزانہ۔

خُسرو : امیر خُسرو، ہندوستان کا عظیم شاعر۔ ہندی اور فارسی میں شعر کہے، بطور سپہ سالار جنگوں میں حصّہ لیا۔ آخری عمر میں نظام الدین اولیاءؒ کے مُرید ہوئے۔ ہشت بہشت، سکندر نامہ اور مِنج گنج اُن کے نام سے منسوب ہیں۔ ڈاکٹر صفدر آہ نے اُن پر عمدہ تحقیق کا کام کیا ہے۔

خِشت : اینٹ۔

خصوص : خصوصاً۔

خَط : مکتوب، تحریر، دستاویز۔

خَطا : قدیم دور کے شمالی چین کے علاقے مشرقی تُرکستان کا ایک صُوبہ۔ جسے آج کل ''سنکیانگ'' کہا جاتا ہے۔ خُتن اُس کے قریب کا شہر تھا۔

خَلِش کر رہا : رڑک رہا ہے، چُبھ رہا ہے، کھٹک رہا ہے۔

خِلط : آمیزش، مِلاوٹ، بدن کی چار رطوبتوں میں سے کوئی ایک۔ جیسے صَفرا، سودا، بلغم، خون۔ خَلَط : ملنا (جامع اللغات)

خِلعت : لباسِ فاخرہ، وہ پوشاک جو بادشاہ بطور عزت افزائی، لوگوں کو عطا کرتے تھے۔

خَلقت : لوگ۔

خِلوَت : تنہائی۔

خِلوَت خانہ : تنہائی میں بیٹھنے یا رہنے کی جگہ۔

خُمار شِکَنی : دہی کا پیالہ۔ رات کو پی جانے والی شراب، صُبح کے وقت بدمزہ کرتی ہے۔ جسمانی ٹُوٹن اور بدمزگی کو دُور کرنے کے لیے عام طور پر دہی کا پیالہ پی لیا جاتا ہے۔

خُمس : بہ معنی پانچ۔ فقہ جعفریہ کے مطابق مال کا پانچواں حصّہ مُفلس اور ضرورت مندوں کا ہوتا ہے۔

خُمیں : خُم (فارسی) کی جمع (خُم : مٹکا، گھڑا۔)

خوابِ خرگوش : غفلت کی نیند، تغافل۔

خواجہ زادہ : اعلیٰ درجے کے تاجر کا بیٹا۔

خواجہ سرا : وہ نامرد غلام جو محلات کے اندر آتے جاتے اور پہرہ داری کا کام کرتے تھے۔ ''ہیجڑے کا اعزازی نام'' (آصفیہ) ''باغ و بہار'' سے معلوم ہوتا ہے کہ نامرد غلاموں کو ''خواجہ سرا''،

''خوجہ'' اور ''محلی'' بھی پکارا جاتا تھا۔ خواجہ سراؤں کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ بادامی، دستیؔ اور صندلی، عضوِ تناسل کے حوالے سے۔

خواص : امیر زادی کی خدمت گار۔ میر امّن نے ''خواص'' کو واحد لکھا ہے۔

خواص پُرا : محل کا وہ حصّہ جو خواصوں کے لیے مخصوص ہو۔

خواصیں : خواص کی جمع۔ امیر زادیوں کی خدمت گار مُلازمائیں۔

خواہ نخواہ : خواہ مخواہ کا قدیم اِملا و تلفظ۔

خوجہ : نامرد غلام، ہیجڑہ، خواجہ سرا۔ میر امّن نے اسے ''مَحلی'' بھی لکھا ہے۔

خُودرَو : خُود بخود اُگنے والا۔

خورجی : گدّھے کا تھروا (بوری نما بڑا تھیلا) جو گدّھے کی پیٹھ پر اسباب لادنے کو باندھ دیتے ہیں۔

خوردخام کرنا : بہت زیادہ مار پیٹ، ہڈی پسلی ایک کرنا۔

خورِش : خوراک (خواب وخورش: نیند اور خوراک)

خُوزادہ : قدرتی خوبصورت مرد (جامع اللغات)

خُوزادی : قدرتی خوبصورت لڑکی یا عورت، جسے بناؤ سنگھار کی ضرورت نہ ہو۔ ''خُوزادہ'' کی تانیث۔ (جامع اللغات) یاد رہے کہ ''خُوزادی''، ''خواجہ زادی'' کا مخفف ہرگز نہیں۔

خوش : عُمدہ، نفیس۔

خوش خوری کے سبب سے : عُمدہ خوراک کی وجہ سے۔

خوش نقشے خلوت خانے میں : تنہائی کے نفیس کمرے میں۔

خُوگیر : وہ گدّی جو گھوڑے کی زین یا کاٹھی کے نیچے پسینہ جذب کرنے اور پیٹھ کو چھلنے سے بچانے کے لیے رکھی جاتی ہے۔

د

دابنے : بغیر تجہیز و تکفین کے گاڑنے۔

دادا : کھلائی مرد۔ ایسا بزرگ ملازم جس نے گود میں کھلایا ہو۔ ''دادا'' عزت و تکریم کے لیے کہا جائے گا۔

دادِ الٰہی : اللہ کی عطا، اللہ کی دین۔

داد و دِہش : بخشش، سخاوت کی عطا۔

دارُ الخلافت : دارالخلافہ، راج دھانی۔

دارُ الشرح : قاضی کی عدالت، جس میں احکامِ شرعیہ کے تحت فیصلے کیے جائیں۔

دارُ الشفا : ہسپتال، مطب، شِفا خانہ۔

دارُو دَرمن : علاج مُعالجہ (درمن، درماں کی بگڑی ہوئی شکل ہے)

دامن ہاتھ لگا ہے : سہارا مُیسّر آیا ہے۔

دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے : انتہائی قریبی تعلقات تھے۔

داوَدی : ایسی آتش بازی، جس میں سے گُلِ داوَدی کے پیڑ سے مُشابہ سفید سفید پُھول اور کٹاوَدار پتیاں جھڑتی ہیں۔

دائی : اَنّا۔ وہ عورت جو دُلھن کے ساتھ میکے سے خدمت گزاری کے لیے ساتھ آتی ہے۔

دبائے ہُوئے : (گھوڑا) دوڑاتے ہوئے، (گھوڑا) بڑھاتے ہوئے۔

دُبدھے میں ہونا : اندیشے میں پڑنا، پس و پیش کی کیفیت۔

دبیر : مُنشی دیوان۔ اِنتظام کرنے والا۔

دَدا : وہ لونڈی جس نے بچپن میں خدمت کی ہو (نُور اللغات)

دَرپے ہونا : کسی چیز کے حصول کا پُختہ ارادہ کر لینا۔

دَردامن : آنچل، حاشیہ، مغزی۔

دَرگذر کرنے کو : نظر انداز یا معاف کر دینے کو۔

دَرگذر نہ کروں گا : کوئی کسر نہ اُٹھا رکھوں گا۔

دَرگذر نہ کی : جان بھی تجھ پر نثار کرنے سے دریغ نہ کیا۔

دِرم : چوَنّی کے برابر چاندی کا سِکہ۔

دَرماہا : ماہانہ تنخواہ، مُشاہرہ۔

دروغ : کِذب، جُھوٹ۔

دریافت کیا : معلوم کیا، اندازہ لگایا۔

دریغ نہ کروں : پہلوتہی یا انکار نہ کروں۔

دریغ نہیں کرتا : بِلا خوف و خطر کام کرنے کو تیار رہتا ہوں۔

دِسا کریں : کِسی طرف نِکلیں۔ (دِسا : طرف، سمت)

دَست بَستہ کھڑا کیا : اِس طور پیش کیا کہ دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔

دَست بہ سر ہُوا : ہاتھ پیشانی تک لاکر سلام کیا۔

دَست پناہ : چمٹا۔

دستخطِ خاص سے : اپنے قلم سے، لِکھ کر۔

دَستَگی: تھیلا۔ جس میں کاغذ رکھتے ہیں (جامع اللغات) ''نُوراللغات'' میں بھی ''دَستَگی'' ہی ملتا ہے ''دستکی'' نہیں۔ اصطلاح دفتر ہندوستان۔ وہ تھیلی یا تھیلا، جس میں ضروری کاغذات رکھتے ہیں (نُور) عبدالحق کے تتبع میں رشید حسن خاں نے دَستکی بمعنی پاکٹ بک لکھا ہے، جو درست نہیں۔

دَست گیر ہاتھ باندھ کر۔ ~~ نے مُجھ کو قتل کرتا ہے ظالم نہ دست گیر

کیا بے طرح کے غم میں پھنسا ہوں میں اے نظیر (نظیر)

دَست گیری : مُعاونت، مدد۔

دَشتِ قبچاق علاقہ تا تار کا ایک بڑا صحرا (جامع اللغات)

دُشمنی کمال ہُوئی : دُشمنی حد سے بڑھ گئی۔

دَغدَغہ : خطرہ، خوف، دھڑکا۔

دُکھ دَھندھے سے چُھوٹ جاتے : میر امّن نے تکلیف کے ساتھ ان کا تکلیف دہ پیشہ بھی ظاہر کر دیا۔

دَکھن : جنوبی ہندوستان کا علاقہ دکن۔

دَل بادَل : بہت بڑا خیمہ جو دو منزلہ ہُوا کرتا تھا۔ مغل شہنشاہوں نے اس طرح کے خیموں کو رواج دیا۔ شاہجہان کے دور تک خیمہ سازی کی صنعت درجۂ کمال کو پہنچ گئی۔

ع بانات، قناطیں، شمیانے، دَل بادل تنبو تنوائے (نظیر)

دلِ پُر اِضطرار : بے قرار دل۔

دِل جمعی کر کے : اچھی طرح اطمینان کر کے۔

دِل چَلا کر کہا : ہمت کر کے کہا، جرأت کے ساتھ کہا۔

دَلداپیش گیر : چوڑا پردہ، جو مسہری یا پلنگ کے اُوپر اَوس کی نمی سے بچاؤ کے لیے باندھ دیا جاتا تھا۔

دِلداری سے : ہمدردانہ تسلی دے کر۔ دوستانہ انداز اختیار کر کے۔

دِل رِیش : دِل فگار، دُکھی دل والا۔ ع اور چِلّہ کشی کر کے ہمیشہ رہے دِل ریش (نظیر)

دَلق : گلیم، گدڑی۔ کپڑے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے تیار کردہ درویشانہ لباس۔

دَلق پوش : گدڑی پہنے ہوئے درویش۔

دِلگیر : غمگین، اُداس۔

دُلمیان : سر بہ مُہر تھیلی، جس میں حُکم نامہ یا خط رکھ کر بھجوایا جاتا تھا۔

دَم پُخت : وہ کھانا (چاول یا سالن) جسے دَم دے کر گلایا گیا ہو۔ دیگی یا دیگ پر ڈھکنا رکھ کر بھاپ روکنے کے لیے عام طور پر گُندھے ہُوئے آٹے کا استعمال کیا جاتا ہے۔

دَمڑی : پُرانے پیسے کا چوتھا حصّہ، چھدام (آصفیہ)

ع آدم ایک دمڑی کی ھیا کو رہے عاجز سدا (نظیر)

دِمشق : مُلک شام کا دارالسلطنت۔ دنیا کا سب سے پُرانا آباد شہر۔

دَم لیا : قیام کیا، قدرے اطمینان کا سانس لیا۔ (اشارہ عظیم آباد میں قیام کی طرف)

دَم نہ ماریو : اعتراض نہ کرنا، حُکم عدولی نہ کرنا۔

دُند مچایا : شورو غُل کیا، آفت کھڑی کی۔ ''دُن مچانا'' بھی کہتے ہیں۔

ع دن رات دُن مچی ہے یہاں اور پڑے ہے جنگ (نظیر)

دِنی : بہت دِنوں کا۔

دوازدہ اِمام : اثنا عشری شیعہ بارہ اِماموں کو مانتے ہیں۔ اُن کے نزدیک اِمامت بھی مِن جانب اللہ ہوتی ہے اور اِمام بھی نبی کی طرح معصوم ہوتا ہے۔ بارہ اماموں کی تفصیل : حضرت اِمام علی، حضرت اِمام حسن، حضرت اِمام حُسین، حضرت اِمام زین العابدین، حضرت اِمام باقر، حضرت اِمام جعفر صادق، حضرت اِمام موسیٰ کاظم، حضرت اِمام علی موسیٰ رضا، حضرت اِمام محمد

نقی، حضرت اِمام علی تقی، حضرت اِمام حسن عسکری اور حضرت اِمام مہدی جنھوں نے ابھی ظاہر ہونا ہے۔ یعنی اِمام غائب۔

دوپارہ : دو ٹکڑے۔

دوپیازہ : ایسا قورمہ جس میں گھی کی بُھنی ہُوئی پیاز کے ساتھ ترکاری کے طور پر کچی پیاز بھی کُتر کر ڈالی جاتی ہے۔ سالن میں شوربا نہیں ہوتا۔

دوجی سے : حاملہ (مراد: دو جاندار ہیں۔ ایک ماں اور ایک اُس کے پیٹ کا بچّہ)

دوچند : دُگنی، بڑھوتری۔

دوِدلا : اُلجھن میں پڑا ہُوا، تذبذب میں پڑا ہُوا۔

دُودھ بڑھایا : (شیرخوار کا) دُودھ چُھڑایا۔

دُور پار : اللہ نہ کرے۔ (نسوانی محاورہ)

دُور دراز : طویل، لمبا (قصّے کی طوالت کی طرف اشارہ)

دورستہ : دو طرفہ، رستے کے دونوں اطراف۔

دورویہ : دونوں اطراف میں۔

دوسار ہوگیا آر پار ہوگیا۔

دوستی جانی : پکّی دوستی (یہ میرامّن کی اختراع ہے)

دومنزل کی ایک منزل کرتا ہُوا : تیزی سے سفر طے کرتا ہُوا۔

دونا : پیالہ۔

دونوں جی : ہم دونوں (مراد: باپ اور بیٹی)

دھاپ : اِتنا فاصلہ، کہ انسان دم لیے بغیر دوڑ سکے۔

دھاوا مارے آتا ہوں : دُور کی منزلیں طے کرتا ہُوا چلا آتا ہوں۔

دَھر ماروں : پیشاب کی دَھار ماروں (''دَھر نہ ماروں'' کلمۂ نفرت ہے۔ یعنی اُس پر پیشاب بھی نہ کروں)

دہرا : بُت خانہ، مندر (لیکن یہاں مُراد رہنے کی جگہ ہے۔)

دِھرا ہَر : خلوتِ خاص، پوشیدہ کمرہ، جہاں کسی کو چھپایا جا سکے۔

دَھن ہے : شاباش، صد رحمت۔ دھن (سنسکرت): شاباش۔

دھوبی کا کُتّا، نہ گھر کا نہ گھاٹ کا : نِکمّا، بے کار آدمی۔ ''جس کا کوئی ٹھکانہ نہ ہو'' (جامع اللغات) بے کار مارا مارا پھرے۔ (مثل ہے)

دھول جَھکّڑ : مار پیٹ۔ تھپڑ، گھونسا، لات مارنا۔

دَھونس دھڑکا : رُعب، دھمکی، دباؤ۔

دہی کا ٹیکا : سفر کی مُصیبتوں سے بچانے کا ایک نِسوانی ٹوٹکا۔

دَہیز : جہیز۔

دَہ یکے : دسواں حِصّہ۔

دِیدارُو : دیکھنے کے قابل، خُوب صُورت۔

دِیدہ دانستہ : جان بُوجھ کر، دیکھتے بھالتے ہُوئے۔

دیرینہ : پُرانا۔

دینے لینے کا سَودا : جُوا، قمار بازی۔

دیوار گیری ::: رنگدار آرائشی کپڑا، جو دیواروں پر سجاوٹ کے لیے ٹانک دیا جائے۔ آج کل کپڑے کی جگہ کاغذ کی اَبری کا استعمال عام ہے۔

دَیّا : دایہ (''دَیّا رے دَیّا''، اظہارِ حیرت کے لیے نِسوانی اظہار)

دِیوان : افسرِ اعلیٰ محکمہ مال۔

ڈ

ڈاڑھ مار کر رویا : زار و قطار رویا۔

ڈاکا آیا : ڈاکو، ڈاکا ڈالنے آئے۔

ڈَریا کر لے آئیں : لگام پکڑ کر جانور کو ٹہلانے کو ''ڈَریانا'' (ہندی) کہتے ہیں۔ یہاں مراد ہے : گھوڑے کی لگام تھا کر لے آئیں۔

ڈگنا ڈگمگانا، گرنے کے قریب ہونا۔

ڈنڈے لٹھ بردار۔ لاؤ لشکر۔ ڈنڈا کی جمع (کوتوال کے ڈنڈے : کوتوال کے لٹھ بردار سپاہی)

ع ہر منزل میں اب ساتھ ترے یہ جتنا ڈیرا ڈنڈا ہے (نظیر)

ڈول میں اور تول میں اور آب داری میں : وزن، جسامت اور رنگ۔ جواہرات میں یہ تین صفات قابلِ لحاظ ہوتی ہیں۔

ڈونگے : ڈونگا کی جمع۔ کسی برتن میں سے پانی یا مائع نکالنے کا ڈنڈی دار چمچا، ڈوئی۔

ڈھارس ڈھارس، اطمینان۔

ڈھب سلیقہ، طریق۔

ڈھکنا سامنے آنا۔

ڈھیٹھ ڈھیٹ کا قدیم اِملا و تلفظ۔

ڈیل بدن، جسم۔

ذ

ذوالفقار حضرت علیؓ کی تلوار کا نام۔ یہ تلوار العاص بن مُنبہ کی ملکیت تھی جو جنگ بدر میں قتل ہُوا۔ حضورؐ نے مالِ غنیمت میں سے یہ تلوار علیؓ کو عطا کی۔ سیدھی، دَو دھاری تلوار تھی۔ (ذو: مالک۔ فَقار : پیٹھ کی ہڈی)

ر

راتب خوراک، وظیفہ۔

راس سَر گروہ، فرد۔ (راس گھوڑا : سَر گروہ گھوڑا۔ سیاہ رنگ اور کنڈھے سینگوں والی پنج کلیان بھینس کو بھی ''راس بھینس'' کہا جاتا ہے۔)

راست آئی : تدبیر کے مطابق کام ہُوا، بات بن گئی۔

راست ہُوا : سچ ثابت ہُوا۔

رام ہوتی چلی : لاتعلقی ختم ہوتی گئی، اجنبیت جاتی رہی۔

راندے ہُوئے : دُھتکارے ہوئے، مَردُود۔ (اِسی سے ''راندۂ درگاہ'' بنا) مُراد بستی کے لوگ اللہ کی پکڑ میں آ گئے۔

رانڈ تحقیراً عورت۔ گالی کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کے ایک معنی بیوہ کے بھی ہیں لیکن

یہاں اِن معنوں میں نہیں برتا گیا۔ ('' رانڈ بیواؤں'': میر امّن نے رانڈ اور بیواؤں کا استعمال ایک ساتھ کیا ہے، جو روزمرہ کے مطابق ہے۔)

راہ داری : تجارتی محصُول، چُنگی۔ معافیٔ محصول کی تحریر مُراد ہے۔

راہداری کی سَنَد : تجارتی محصُول، چُنگی سے بری ہونے کا حُکم نامہ۔

راہ دِکھانا : انتظار کروانا۔

رَجا : اُمید، آس۔

رِحلَت : فوتیدگی، موت، روانگی، کُوچ۔

رَحَم : چاولوں کا حلوہ، جسے نیاز کے لیے عورتیں پکاتی ہیں۔ لڑکیاں ہنڈکلیا میں بھی یہی حلوہ پکاتی ہیں۔

رُخصتی : وہ اشیاء یا روپیہ جو وداع کرتے وقت دیا جائے، وداع کی سلامی۔

ردّوبدَل : حُجت اور تکرار۔

رُستم : قدیم ایران کا مشہور پہلوان جرنیل۔ زال بن سام بن نریمان کا بیٹا۔ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے لگ بھگ نو سو برس قبل اِس دنیا میں نامور ہُوا۔ فردوسی کا '' شاہنامہ'' رُستم کی بہادری کے کارناموں سے بھرا پڑا ہے۔ اُس کی بیوی تہمینہ کے بطن سے پیدا ہونے والا رستم کا بیٹا سُہراب، افراسیاب کی چال کے سبب رستم کے ہاتھوں قتل ہُوا۔ رُستم کا سوتیلا بھائی شغار، اُس کی شہرت سے جلتا تھا۔ ایک رات اُس نے رُستم کو دعوت پر بُلایا اور رستے میں گہرے گڑھے کُھدوا کر اُن کی تہہ میں تیز بھالے اور برچھیاں لگوا دیں۔ گڑھوں کو گھاس سے ڈھک دیا گیا تھا۔ رات کی تاریکی میں رستم مع گھوڑے (رخش) کے گڑھے میں گِرا، گھوڑے '' رخش'' نے وہاں سے جست بھری تو دوسری گڑھے میں گر گیا۔ یوں یکے بعد دیگرے متعدد گڑھوں میں گر کر رُستم شدید زخموں کے سبب ہلاک ہُوا۔

رسُولِ کبار : سب سے برتر رسول۔ مُراد حضرت محمدؐ۔ (کبار: کبیر کی جمع)

رَطل : بارہ اونس کے برابر وزن۔

رَطوبات : ترکاری، سبزیاں۔

رَعشہ ہو گیا : (ڈر کر) تھر تھر کانپنے لگا۔

رَقَم — جَواہر (''کچھ رقم جواہر کے بیش قیمت''، ''رقمِ بے بہا'' دونوں مقامات پر عدد یا قیمت کے معنوں میں نہیں، جواہر کے معنوں میں برتا گیا ہے۔)

رکاب — لوہے کے دو حلقے، جو گھوڑے کی زین کے ساتھ دونوں طرف لٹکتے رہتے ہیں۔ اُن میں پاؤں رکھ کر گھوڑے پر چڑھتے اور ایڑ لگاتے ہیں۔ یہاں بادشاہ کے خاص ملازمین مُراد ہیں۔

رکاب میں آدیں : (بادشاہ کی) سواری کے ساتھ آئیں۔

رَمَق — آخر دَم، تھوڑی سی جان، دمِ واپسیں۔

رَمّال — جوتشی، نجومی، علمِ رَمَل کا ماہر (علمِ رَمَل کے ذریعے ہندسوں اور اشکال سے غیب کا علم اور مستقبل کا حال معلوم کیا جاتا ہے)

رمز کی باتیں : پوشیدہ باتیں۔ رمز (عربی) ایما، اشارہ۔

رَنڈی — عورت۔ یہ لفظ پیشہ ور عورت (طوائف) کے لیے بھی برتا جاتا ہے۔ یہاں یہی دوسرے معنی مُراد ہیں۔ ع رنڈی بھی آدمی ہی نچاتے ہیں گت لگا (نظیر)

رنڈیا — بیوہ، رانڈ۔

رَنگترا — سنگترا، نارنگی۔

رنگ محل — عیش منزل۔ (جہاں بادشاہ یا اُمراء عیش و نشاط کی محفل سجائیں۔)

رُوبکار ہُوا : پیش آیا۔ رُوبکار (فارسی) سامنا، آ گا۔

رُوپا — چاندی۔

رُوپے کی/رُوپے کے : چاندی کی، چاندی کے۔

رُوٹھے کیوں نہ راجا ...... تُو نہ رُوٹھا چاہیے : راجہ مُجھ سے کیوں نہ رُوٹھے، اُس سے مجھے کچھ لینا دینا نہیں۔

اے راجاؤں کے راجہ، تیرے سوا میں کسی کی تعریف کیوں کروں اور کسی نوع کا تعلق کیوں رکھوں۔ میرا بھائی مجھ سے کیوں نہ رُوٹھے، وہ میرے اچھے بُرے میں نہیں۔ صرف تُو ہی تو ہے جو میرا سہارا ہے میں اور کس کے دَر پر جاؤں۔ چاہے دوست رُوٹھے یا دُشمن، مجھے کسی کی پَروا نہیں۔ میرے لیے تو تیرے قدموں ہی میں پناہ ہے۔ دنیا بے شک مجھ سے

رُوٹھتی ہے تو رُوٹھ جائے، مجھے تو بس تیرا کرم درکار ہے۔ بے شک تُو اگر
مُجھ سے نہ رُوٹھا تو یہ دنیا والے میرے سامنے جُھک جائیں گے، میرے
پاؤں چُومیں گے اور میری تکریم کریں گے۔

روزراتب — روزینہ، روزانہ کی مقررہ خوراک۔

روزِشُمار — روزِحشر، روزِقیامت۔ جس دن اَعمال کا حساب ہوگا۔

روزگار نے مُوافقت نہ کی : حالات نے ساتھ نہ دیا، حالات سازگار نہ رہے۔

روزنامہ — بہی کھاتہ، دن بھر کا حساب کتاب درج کرنے کا رجسٹر۔

رَوِش — باغ کی پٹڑی، جس پر گھاس اُگا دیتے ہیں۔

ع — جس جس رَوِش کے اُوپر جا کر ہُوا نمایاں (نظیر)

رُوشِناس — واقفیت، مُونہہ ملاحظہ، جان پہچان۔

روغن جوش — گوشت کا سالن۔

روکڑ — نقد رقم، نقد روپیہ۔

رُوکھا پھیکا ہونا : خفگی کا اظہار کرنا۔

رُوم — مشرقی قیصروں کی سلطنت، جس کا دارالخلافہ قسطنطنیہ تھا۔ (جامع اللغات)

رُومالی — اوڑھنی۔ ''رومال جو عورتیں سر سے باندھ لیتی ہیں''۔ (آصفیہ)

رُو واس — رونے کا میلان۔

رَوَنا — زنان خانے کا ملازم، جو ڈیوڑھی میں بیٹھا رہتا ہے۔ ''رَوَنے'': زنان خانے کے مُلازم۔

ے کہے گا رَوَنا تو تھیلی کو بھروں گا میں
جو چیز منگاؤ گے لا آگے دَھروں گا میں (نظیر)

روند مارا : ہر جگہ دیکھ لیا، چھان مارا (مگر ناکامی ہوئی)

رُوہت — چہرے کی رونق یا تر و تازگی، نرمی، خوبصورتی، حُسن۔ ''رُوہت بِکھر جانا'' (لازم):
چہرے پر رونق آ جانا (جامع اللغات)

رِہتا سِہتا :	رہا سہا، جو کچھ باقی بچا تھا۔
رِیاضت	نفس کُشی، خواہشات پر قابو پانا۔
رِیش	داڑھی۔
ریکھا	مُقدر کی لکیر۔
رَین	رات۔
رِینْدھنا	پکانا۔
رَیوڑی کا پھیر	کسی لالچ یا طمع میں آ کر مصیبت میں پھنسنا۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے ایک دوست سے کہا کہ پہلی دفعہ ایک، دوسری دفعہ دو، تیسری دفعہ چار غرضیکہ دوگنا کرتے ہوئے کے بار ریوڑیاں کھاجاؤ گے، اُس نے کہا : ''دس دفعہ''۔ یہ کہہ کر پھنس گیا کیونکہ اسے ۱۰۲۳ ریوڑیاں کھانی پڑیں۔ اس لیے یہ محاورہ ہُوا۔ (جامع اللغات)

ز

زادبُوم	جنم بھومی، جائے پیدائش۔ (''زادبُوُ'' بھی کہتے ہیں)
زادِراہ	سفر خرچ، راستے کا خرچہ۔
زار بہ زار رونا :	بہت رونا۔
زَربفت	کمخواب۔ ایک کپڑا، جو سونے اور ریشم کے تاروں سے بُنتے ہیں۔ (جامع اللغات) اِس سے پائجامے بھی تیار کیے جاتے تھے۔
زَردوزی	زری کا کام، طلائی کام، سلمے ستارے اور کلابتوں کا کام۔ ''زردوزی'' بطور صفت : وہ جس پر زری کا کام کیا ہُوا ہو۔ (جامع اللغات) بقول صباح الدین عبدالرحمٰن : وہ کپڑا، جو سونے کے تاروں سے بُنا جائے۔ کلابتوں کا بُنا ہُوا کپڑا ہے، زردوزی، کام دانی کی عمدہ قسم کا نام ہے۔ جو سونے کے تاروں سے مخمل، کمخواب اور دوسرے ریشمی کپڑوں پر بنائی جاتی ہے۔ اس کام کے لیے فرموں کی ضرورت پڑتی ہے، جن کو کارچوب کہتے ہیں۔'' (''معارف'' بابت : جولائی ۱۹۶۰ء)
زرق برق	چمک دار، چمک دمک، طمطراق، بھڑک دار۔

زَرگری سُنار کا پیشہ (ہتھیار زرگری کے : سُنار کے اوزار یعنی پیانہ، جمور، ہتھوڑی، آری، باکنال، کات، چمکنی، چمٹی اور جندری)

زِرۂ بکتر فولاد کی کڑیوں (زنجیروں) سے بناہُوا اگرتا، جو قدیم وقتوں کی جنگوں میں تلوار کے وار سے بچنے کے لیے پہنا جاتا تھا۔

زِرہ داوٗدی : حضرت داوٗدؑ کی نسبت سے۔ داوٗدؑ رزقِ حلال کے حصول کے لیے زِرہ بنایا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ لوہا اُن کے ہاتھوں میں خود بخود مَوم جایا کرتا تھا۔

زری زر بخش نظام الدین اولیاء کا لقب۔

زَغند چھلانگ، جَست۔

زمانہ سازی : ظاہرداری، بناوٹ، مکارانہ خوشامد۔

زمین پھاٹے : زمین پھٹے۔

زمین چُومی : زمیں بوس آداب، کورنش۔

زنُبور : زمبور، چمٹا، پلاس۔

زَنجیر ہاتھیوں کی تعداد ظاہر کرنے کو کہا جاتا ہے جیسے دو زنجیر فِیل : دو عدد ہاتھی۔

زِندان قید خانہ، مَحبس۔

زِندہ دَر گور سخت مُصیبت میں گرفتار۔

زَنگ زنگ بار، زنجبار، حَبش۔ مشرقی افریقہ کا ایک جزیرہ (اب تنزانیہ کا حصّہ) جو غلاموں کی تجارت کے لیے مشہور تھا۔ ع بُت روم میں اور ہند میں اور زنگ میں پہچان (نظیر)

زنگی : زنگ بار، زنجبار یا حَبش کا باشندہ۔ یہ لوگ صحت منداور جفاکش تھے، لیکن تھے مُفلس اور تہی دست۔ اُنھیں غلام بنا کر انسانی منڈیوں میں فروخت کیا جاتا تھا۔

زِہ کمان کی تانت۔

زہر مار کیا : بے دِلی سے کھایا پیا۔

زہرِ ہلاہل مُہلک زہر، زہرِ قاتل۔

زَہے واہ وا، مرحبا، شاباش (کلمۂ تحسین) زہے نصیب : کیا اچھا مُقدر ہے۔

زیرانداز — وہ جاذب غالیچہ، جسے بچھانے کے بعد اُس پر آفتابہ، سلفچی اور بیسن دان رکھ دیتے تھے تا کہ کمرے میں پانی نہ پھیلے۔

زیرباد : — مُلک بَرما کا پُرانا نام۔ (ڈنکن فاربس۔ حافظ محمود شیرانی)

زیروزَبر — تہ وبالا، تباہ و برباد۔ (زیروزَبر کر کے : شِکستِ فاش دے کر)

زِین پوش — گھوڑے کی زین کے اُوپر ڈالنے کا کپڑا۔

س

سادھ کر : — درست اندازہ کر کے۔

سار — مانند، مِثل (تُجھ سار : تیری مانند)

سارے ڈیل میں زبان حلال ہے : (مِثل) اِنسان کو قول کی پاسداری کرنی چاہیے (جامع اللغات)

ساعتِ سعید — نیک گھڑی، مُبارک گھڑی، شُبھ گھڑی۔

ساقِ عروس — ایک قِسم کی میٹھی روٹی (جامع اللغات) رُوسی تُرکستان میں پکائی اور کھائی جاتی تھی، ہندوستان میں بھی عام ہوگئی۔ اسی طرح ''نافِ عروس'' بھی میٹھی روٹی کی ایک قِسم تھی۔ یہ دونوں نام روٹیوں کی صورت اور شباہت کو ظاہر کرتے ہیں۔

سالِک — پابندِ شریعت صُوفی۔ مجذوب کی ضِد۔ وہ زاہد، جو دُنیا سے بھی تعلق قائم رکھے۔

سامھنے — سامنے کا قدیم تلفظ اور اِملا۔

سامیُ النسل : — اعلیٰ نسل کا۔

سانجھ — شام (سانجھ سے : شام کے وقت)

سانڈنی — لمبی مُسافت طے کرنے والی اُونٹنی، جو نر کی نسبت زیادہ دَم خَم رکھتی ہو۔

ساوَن بھادَوں کے اُچھلنے کا تماشہ : مُغلیہ عہد میں بن بادل برسات کا نظارہ کرنے کو ''ساون بھادوں'' کے نام سے باریک باریک جالیوں کے ساتھ ایسی جگہ بنائی جاتی تھی، جس میں بیٹھنے والوں کی نظر دھوکہ کھاتی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بارش ہو رہی ہے۔

سائبان: — سایہ بان کا مُخفف۔ ایسا شامیانہ، جو دُھوپ یا بارش کی بُوچھار سے بچنے کے لیے خیمے یا مکان کے آگے لگایا جاتا ہے۔

سائیں اللہ : درویشوں کا کلمۂ خطاب، اِس کے معنی ہیں، آقا و مالک اللہ ہے، اے اللہ والے۔

سُبحانَ اللہ پاک ہے اللہ کی ذات۔ ایک ایسا کلمہ، جس میں تحسین اور تعجب دونوں شامل ہیں۔ یوں کبھی تو کلمۂ تعریف ہوگا اور کبھی کلمۂ طنز۔

سُبھ لگن مُبارک گھڑی، ساعتِ سعید، جب دو مُبارک ستارے یکجا ہوں۔

ع سُبھ ساعت سے یُوں دنیا میں اُوتار گربھ میں آتے ہیں (نظیر)

سِپاہ گری سپاہی کا کسب یا فن۔ مثل مشہور ہے کہ: "سپاہ گری کے تیس فن ہیں۔" مُراد: سپاہ گری بہت مشکل ہے۔ (جامع اللغات)

سُپیاریاں (سُپاری کی جمع) چھالیہ۔

ستّار عیب چُھپانے والا۔ اللہ کے اسمائے حسنہ میں سے ایک نام۔ "اللہ ستار العیوب" ہے۔ شرارتاً شیروانی کو بھی "ستار العیوب" کہہ دیتے ہیں۔

سِتارے آتش بازی کی ایک ایسی قِسم جس میں سے ستاروں کی طرح کے ہشت پہلو پُھول جَھڑتے ہیں۔

سَتوانسا وہ بچّہ، جو حمل کے سات ماہ بعد پیدا ہو۔ مہیشور دیال نے اسے ایک رسم کہا ہے جس میں ساتویں مہینے میکے والے سدھوڑے لے کر آتے ہیں۔

سٹھورا پنجیری۔ سُونٹھ اور شکر کو گیہوں کے آٹے میں مِلا کر اور خالص گھی میں بُھون کر پنجیری بنائی جاتی ہے۔ زچّہ کو گرمائش اور طاقت کے لیے کھلائی جاتی ہے۔ "اس میں سُونٹھ ہوتی ہے۔ اِس وجہ سے یہ نام ہُوا" (نُوراللغات)

ع کچھ تھال پنجیری کے رکھتیں کچھ سُونٹھ سٹھورا کرتی تھیں (نظیر)

سخت بے حد، بے حساب (سخت اُداس ہُوا : بے حد اُداس ہُوا)

سخن گویوں شُعراء (سخن گو کی جمع)

سُدھ بُدھ ہوش و حواس۔ ے یہ بات کہی راجہ سے تب وہ بھی اپنی سُدھ بُدھ کھو
حیران ہُوئے اور چُپ رہ گئے، من بیچ بہت شرمندہ ہو (نظیر)

سَرا سرائے، عارضی رہائش گاہ جیسے ہوٹل یا موٹل۔

سَراپردہ — خیمے کے چوگرد لگائی جانے والی قنات۔

سراچوں — شاہی خیموں۔ سراچہ (شاہی خیمہ) کی جمع۔ ''عہدِ تغلق میں بڑے خیمہ کو سراچہ اور عیوان کہتے تھے۔'' (صباح الدین عبدالرحمٰن)

سَرانجام — ضروری سامان۔

سَرانجام نہیں ہوسکتے : (اتنے رُپوں کا) انتظام نہیں ہوسکتا۔

سَراندیپ — سری لنکا کا پُرانا نام۔ کبھی اسے سیلون بھی کہا جاتا تھا۔

سَربراہ — مُنتظم، افسر۔

سَربسر — پُوراپُورا، پُورم پُور، ابتدا تا انتہا۔

سَرپیچ — زنانہ پگڑی میں سامنے کے رُخ پر ٹکا ہُوا ہیرے یا موتی کا زیور۔

ے تری دستار پر عاشق کُشی کو
ستم ہے گوشوارہ قہر سر پیچ (آتش)

سَرپٹ پھینک کر : گھوڑے کی چال تیز کر کے۔

سُرت — ہوش (سُرت جاتی رہی : ہوش جاتے رہے)

ع جُز عیش وطرب کچھ اور نہیں، جس دن سے سُرت سنبھالی ہے (نظیر)

سَرتاپا — سَر سے پَیر تلک، مکمل طور پر۔

سرچھول — سر مُنڈا۔ چھولنا کے معنی چھلکا اتارنے کے ہیں۔

سُرخاب — ایک آبی پرندہ۔ نر اور مادہ کی محبت مشہور ہے۔ اس سُرخی مائل پرندے کے جوڑے میں سے کوئی ایک مر جائے تو دوسرا زندہ نہیں رہتا۔ بعض اوقات جان بُوجھ کر نر اپنی مادہ سے رات بھر دور رہتا ہے لیکن ساری رات اُسے پکارتا رہتا ہے۔

ع اختیاری ہجر ہے سُرخاب سے سُرخاب کا (ناسخ)

ع ہنس، ہُما، سُرخاب، تدرُویں بولیں ''یارحمان'' میاں (نظیر)

سرخوش ہُوئے : شراب کا نشہ چڑھ گیا۔

سرِدربار : بیچ دربار کے، سب کے سامنے۔

سَرِ دَوال چمڑے کی پٹی جسے گھوڑے کے مُونہہ پر چڑھاتے ہیں۔لگام اُسی سے اٹکی رہتی ہے۔

سرزَنِش کرنا : لعنت ملامت کرنا۔

سر سے سِر واہ (ہندی مثل) سردار کے ساتھ فوج ہے۔(نُورُاللغات)مُراد یہ کہ سردار ہے تو فوج بھی ہے۔
(سِر واہ : پگڑی، دستار)

سرِ غِلاف کھینچ کر : ملفوف خنجر یا قرولی نکال کر۔

سرفرازی دیجیے : عزّت بڑھایئے۔ (نکاح کی طرف اشارہ)

سَرگذشت جو بیت گیا اُس کا حال، واقعہ۔

سَرگردان پریشان، حیران۔

سرِ مُو ذراسا، بال کے سِرے جتنا۔

سِر واہ پگڑی، دستار۔

سروِ چراغاں لکڑی کے ٹکڑوں سے سَرو کے درخت کی شبیہہ بنا کر، اُس کی شاخوں پر چراغاں کرنا۔

سروقدّ سرو کے درخت کی طرح سیدھا، سُتواں۔(سروقد اُٹھنا : سیدھا کھڑا ہونا)

سِرے پاؤ سراپا، مکمل، سَروپا۔

سَعد جدوجُہد، کوشش۔

سِکندر : سکندر بن فیلقوس، شاہِ مقدونیہ کا بیٹا ۲۹۴ قبل مسیح میں پیدا ہُوا۔ ۳۳۱ قبل مسیح میں ایران اور افغانستان فتح کرنے کے بعد ہندوستان آیا۔ بابل میں وفات پائی۔

سُکھپال بڑی پالکی یا ڈولا، جس میں اُمراء کی خواتین مختصر سفر کرتی تھیں۔

سِلاح اسلحہ، ہتھیار۔

سلاطینوں : سُلطان کی جمع سلاطین۔ میر امّن نے جمع الجمع برتا ہے۔

سِلپچی سلفچی۔ وہ برتن جس میں ہاتھ دُھوے جاتے ہیں۔ شاہی دسترخوان پر پہلے بادشاہ، اُس کے بعد بیگمات کے ہاتھ شاہی سلپچی سے دُھلتے۔ شہزادوں اور شہزادیوں کے لیے الگ الگ سلپچیاں ہُوا کرتی تھیں۔

سَلخ قمری مہینے کا آخری دن۔

سَلسَبیل	جنت کی ایک نہر۔
سلَونے	نمکین۔
سُلیمانؑ :	سلیمان بن داوٗدؑ (پ:۹۷۵۔م:۱۰۳۳ قبل مسیح) یہودیوں کے تیسرے بادشاہ۔ مسلمانوں کے اعتقاد میں ایک پیغمبر۔ ۱۰۱۵ قبل مسیح میں بادشاہ بنے۔ بیت المقدس کی بنیاد رکھی۔ توریت میں شامل ضرب الامثال اُن کی تخلیق شمار کی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اِن کی ایک ہزار بیویاں تھیں، جن میں سے ایک ملکہ سبا بھی تھی۔ کہتے ہیں کہ جنّات بھی اُن کے تابع تھے۔ کنعان کے حاکم۔
سَما	آسمان، فلک۔
سماوے	پُورا اندر چلا جائے۔
سموچا	مکمل، کُل، پُورا، سارا، سالم، کامل (تف) مکمل طور پر، کُلہم (جامع اللغات)
سموسہ	گوشت کے قیمے میں بادام، جائفل، پستہ، پیاز اور گرم مصالحہ ڈال کر پتلی چپاتیوں میں لپیٹ کر گھی میں تل لیا جاتا ہے۔
سنجاف	گوٹا، جو کپڑوں کے کناروں پر زیبائش کے لیے لگایا جاتا ہے۔ ع تھی زور ادا سے سر اُوپر سنجاف ڈوپٹے کی اُلٹی (نظیر)
سَندیسا	پیغام۔
سنڈاس	بدرَو، گندے پانی کا نالہ۔
سنسانا :	سنسنی پیدا کرنا۔
سَنگ	وزن، پتّھر۔ میر امّن نے اِن دونوں معنوں میں یہ لفظ برتا ہے۔
سنگت	گُردوارہ، دھرم شالہ، وہ جگہ جہاں سکھ مذہبی رسومات ادا کریں۔
سنگسار	شادی شدہ زِنا کار کی شرعی سزا۔ جُرم ثابت ہونے پر، مرد ہو یا عورت، اُسے زمین میں گڑھا کھود کر کمر تک گاڑ دیا جاتا ہے۔ آبادی کے لوگ پتّھر مارتے ہیں، یہاں تک کہ ہلاک ہو جائے۔
سِن و سال	عُمر۔

سِنگھاسَن — تختِ شاہی، وہ تخت جسے سونے کے بنے ہوئے شیروں نے اُٹھا رکھا ہو۔ ''باغ و بہار'' میں سِنگھاسن پر ''بڑا بُت'' دھرا تھا۔

سُن — ساکت، بے حس و حرکت۔ (حیرت کی انتہا کا نتیجہ)۔

سَنہ — سال عیسوی یا ہجری۔ عیسوی کے لیے ''سنہ ء''، ہجری کے لیے ''سنہ ھ''۔

سَواد — آبادی کے آثار، شہر کا قُرب و جوار۔

سَوانگ — بہرُوپ بھَرنا، اداکاری کرنا۔

سوچا کیا کہ : سوچا۔

سَودا — خبط، جنون۔

سَودائیوں : سَودائی کی جمع۔ سودائی : جنونی، مخبوط الحواس، دیوانہ، پاگل۔ میرامّن نے ایک مقام پر ''سودائی سا'' کہہ کر بیمار کے معنوں میں برتا ہے۔

سُورج مَل جاٹ : مغل حکومت کا باغی (م: ۲۵ دسمبر ۱۷۶۳ء) اس نے ۱۷۵۳ء میں دہلی پر پہلا حملہ کیا اور ۱۷۶۱ء میں دوسرا کامیاب حملہ۔ بقول میر تقی میر : ''۱۲ جون ۱۷۶۰ء میں اکبرآباد پر قبضہ کیا لیکن اس سے کچھ دن پہلے اس کا اکبرآباد کے اکثر محلات پر قبضہ مکمل ہو چُکا تھا۔'' (ذکرِ میر)

سوزنی — دُہرا، رُوئی بھرا گدّا، جس پر سوئی دھاگے سے باریک کام کیا گیا ہو۔

سُوفار — تیر کا پھَل، پیکان۔

سوگند — قَسم، عہد۔

سولہ سِنگھار — بھارتی عورتوں کا بناؤ سِنگھار (۱)۔ انجن (یعنی سُرمہ) (۲) مَنجن (۳) اُبٹن (۴) داتن (۵) سَیندور (۶) کیسر (۷) نیل (۸۔) التا (۹) پان (۱۰) پھُول (۱۱) خُوشبو (۱۲) مسی (۱۳) مہندی (۱۴) کنگھی (۱۵) تیل (۱۶) بندی (جامع اللغات)

سَوں — قسم، سَوگند، عہد۔

سونا اُچھالتے چلے جاتے : امن و امان ایسا کہ بغیر فکرمندی کے قیمتی اشیاء لیے پھرتے۔

سویرے — جلدی، وقت سے پہلے۔

سہائی — مددگار۔ ''سہائے'' بھی کہتے ہیں۔

سبج آہستہ، دھیما۔

سہ شبانہ روز : تین راتیں اور دن۔

سہو وخطا بھول چوک۔

سبی سانجھ ہوتی : پوری طرح سے شام ہو جاتی۔

سی سال : تیس سال۔ سی (فارسی): تیس۔

سے اِس لیے، سو۔ "سے" بہ معنی: سو

سیاست انتظامِ مُلک کے علاوہ ایک معنی دھمکی یا تنبیہہ کے بھی ہیں۔ یہاں یہی دوسرے معنی مُراد ہیں۔ ع دل ہی تو ہے، سیاستِ درباں سے ڈر گیا (غالب)

سیاست کروں : ظالمانہ سزا دُوں۔

سیانے عامل، تعویز گنڈا کرنے والے، جھاڑ پُھونک کرنے والے۔ (سیانا کی جمع)

جب دَیو کا اَجل کے سایہ ہُوا مُقابل

مُلا رہا نہ سیانہ، عالم رہا نہ فاضل (نظیر)

سیتل پاٹی آسام کی بنی ہُوئی چٹائی جو از حد چکنی ہوتی ہے۔

سیج بند وہ رنگین ڈوری، جس سے پلنگ کی چادر کو چاروں پایوں سے کس کر باندھتے ہیں۔

سَیر پہلے درویش کی : پہلے درویش کی رُوداد، مُہم سے متعلق۔

سَیر کرنے کے باعث : لُطف اندوز ہونے کے سبب۔

سَیر ہُوئے : متنفر ہوئے، بیزار ہُوئے۔ سیر (فارسی۔ صِفت: تنفر، بے زاری)

سیس سر، کھوپڑی۔ ع سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دَم بولو واہ گرُو (نظیر)

سَیف تلوار، تیغ، شمشیر (فرہنگِ آصفیہ)

ع نہ تیرے پاس طمنچہ، نہ تیر، سَیف، نہ ڈھال (نظیر)

سیلی سیاہ ریشم یا تاگے کی ڈوری، جسے جوگی اور فقیر گلے میں پہنتے ہیں۔ کمر میں باندھنے کے کام بھی آتی ہے۔ میر امّن نے ان دونوں معنوں میں برتا ہے۔

سینا بیٹھے ہی رہنا، جیسے پَرندے انڈوں پر بیٹھتے ہیں۔ میر امّن نے "گھر گُھسنا" کے معنی میں

برتا ہے۔(گھر سیتا ہے : گھر میں پڑا رہتا ہے۔جنگل پہاڑ کیوں سیتا ہے : جنگل پہاڑ میں کیوں پڑا ہے۔)

ہینگ سمانا (ہندی۔مذکر۔لازم) پناہ کی جگہ مِلنا۔مُراد جس شہر میں رزق میسر آیا اور محفوظ جگہ ملی، دہلی سے نکل کر وہاں پڑ رہا۔

سیوڑا جَین مَت کا بھکشو۔جس کا کام اُپدیش دینا اور کتھا سُنانا ہوتا ہے۔وہ اپنے مُنہہ پر ڈھاٹا باندھ کر رہتا ہے تا کہ کوئی کیڑا یا بھُنگا مُنہہ میں جا کر مر نہ جائے۔سیوڑا، اَہِنسا کے معاملے میں شدّت پسند ہوتا ہے۔

ش

شادیانے خوشی کے باجے (شادیانہ کی جمع)

شادی مَرگ ہو جانا : وہ مَوت، جو بہت زیادہ خوشی میسر آنے پر ہو۔

شاطِر مکّار، چالاک،۔مجازی معنی : جاسُوس، اس لیے کہ "باغ و بہار" میں قاصد کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔

شاگرد پیشہ ادنیٰ درجے کے نوکر چاکر، خدمت گار، عملہ۔

شال بافی : شال باف ایک طرح کا سُرخ ریشمی کپڑا (جامع اللغات) لفظی معنی شال بُننے کے ہیں۔ عہدِ مُغلیہ کی ایک مُستقل اور ترقی یافتہ صنعت۔ (شال باف : شال بُننے والا جُلاہا)

شاہجہاں آباد : شہاب الدین مرزا خُرّم بن جہانگیر (پ:۱۵۹۳ءم:۱۶۶۶ء) شہنشاہ ہندوستان کا آباد کردہ شہر یعنی دہلی۔

شاہ نامہ : ایران کے مشہور شاعر ابوالقاسم حسن طوسی المعروف فردوسی (۹۳۲ء۔۱۰۲۰ء) کی مشہور تصنیف۔جس میں شاہانِ ایران نیز ایران کی قومی تاریخ رقم کی گئی ہے۔لگ بھگ ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل کتاب ہے۔

شایان ہے : لائق ہے، زیبا ہے۔

شاید کہ باشد شاید ایسا ہی ہو۔

شبانہ روز رات دن۔

شَب دیگ — ثابت شلجم (درمیانے سائز کے) اور گوشت کا سالن جسے رات بھر دَم دے کر ہلکی آنچ پر پکایا جائے۔ کشمیری ڈِش ہے۔

شَبنَم — مَلمَل، باریک ملائم سفید کپڑا (آصفیہ) اِس کی بناوٹ جھر جھری ہوتی ہے۔ اس کے کئی نام ہیں جیسے آبِ رواں، اَرنی اور جہازی مَلمَل۔

ع شبنم کے پیرہن کے تھے بَل پہ بَل نمایاں (نظیر)

شِتاب — جلد۔

شِتابی — فوراً، جلدی۔

شِتا — نکیائی، بیسوا۔

شُتر — دُشمن۔ (مِتر شُتر : دوست دشمن)

شحنہ — کوتوال، پولیس آفیسر، سٹیشن ہاؤس آفیسر S.H.O

شِدّت — سختی (جو کچھ کہ پیش آئی ہے شدت مرے تئیں : مجھ پر جو سختی گزری ہے)

شرابِ پُرتگالی — ملک پُرتگال کی بنی ہوئی عمدہ شراب، اَوپورٹو شہر (پُرتگال) میں تیار کردہ شراب۔ ''اس کو ''پورٹ وائن'' بھی کہتے ہیں۔'' (نُور)

شرابِ دوآتشہ — دومرتبہ کشید کی ہوئی شراب، جو بہت تیز ہوتی ہے۔

شراب کا شیشہ : مِینا، شیشے کی بوتل۔

شربتِ ورق الخیال — بھنگ۔

شرط خدمت کی تھی : جس قدر خدمت کرنا چاہی تھی۔

شطرنجی — کئی رنگوں کے سُوت سے تیار کردہ دَری، جس میں خانے بنے ہُوئے ہوتے ہیں۔ حیدرآباد (دکن) میں یہ لفظ اب بھی اسی نوع کی دَری کے لیے مُستعمل ہے۔

شُقّہ — بادشاہ یا اُمراء کی جانب سے اپنے سے کم درجہ امیر کے لیے لکھا گیا رُقعہ، حُکم نامہ، ہدایت نامہ۔

شِکار بند — وہ تسمہ یا ڈور جو گھوڑی کی کاٹھی کے پچھلے حصّے میں سامان یا شکار باندھنے کے کام آتی ہے۔

شَلاق — سَونٹے یا چھڑی سے مارنا۔ دیکھیے : ''ضرب شَلاق''۔ شلک یا شلق (فارسی۔ مؤنث) توپ یا بندوق کا دغنا۔ خبردار کرنے کی ایک رسم۔

شلوکا مختصر کُرتا، جو کمر تک ہوتا ہے اور اُس کی آستینیں کُہنی تک ہوتی ہیں۔

شلیتہ ٹاٹ کا بڑا تھیلا، بورا۔

شمعِ مجلس، حیران اور فانوسیں روشن تھیں: ''شمعِ مجلس'' کے بعد سکتہ (،) لگا کر پڑھیے۔ شمعِ مجلس کے معنی ہیں وہ موم بتی، جو محفل میں جلے۔ میر امّن کہہ رہے ہیں کہ فانوسوں کی روشنی کا جھمکڑا ایسا تھا کہ شمعِ مجلس خود کو کمتر سمجھ کر پریشان تھی۔ ناصر کاظمی نے اِس صورتِ حالات کو محبوب کے حوالے سے یُوں بیان کیا ہے:

تیرے سامنے شمع دھری تھی
شمع کے آگے اک سایہ تھا
تیرے سائے کی لہروں کو
میرا سایہ کاٹ رہا تھا

محبوب کے رُخِ روشن کے سامنے شمعِ محفل کو ماند دکھانے کے لیے ضروری تھا کہ محبوب کے سایے کو اپنے سایے کے ساتھ ڈھانپ دیا جائے۔

شوربُور شرابُور۔ دِلچسپ بات یہ ہے کہ دِلّی میں ''شرابُور'' اور لکھنؤ میں ''شوربُور'' کہا جاتا ہے۔ بہت ممکن ہے یہ صورت قیامِ عظیم آباد کا نتیجہ ہو۔ پُورب میں شرابُور کو شوربُور لکھا اور بولا جاتا ہے۔

شورے کی صُراحیاں: شورے سے ٹھنڈی کی گئی پانی کی صُراحیاں۔ برف کی عدم دستیابی کی صورت میں پانی کو ٹھنڈا کرنے کے لیے پانی کی صُراحیاں بھر کر شورے سے بَھری کیاریوں میں رکھ دی جاتی تھیں۔

شُولا: شُلّہ چاولوں کو گوشت کے شوربے میں بطور ہریسہ گلا کر پکاتے ہیں۔ شُلّہ کو دِلّی میں ''شُولا'' کہتے ہیں۔

شہر پناہ فصیل، وہ مضبوط اور اونچی دیوار جو اطرافِ شہر میں حفاظت کے لیے بنائی جاتی تھی۔

شہریاری حکومت (شہریار: بادشاہ)

شہ نشین بادشاہوں کے بیٹھنے کی جگہ۔ محل یا قلعہ کی کسی کھڑکی کو آگے بڑھا کر بنائی گئی جگہ، جہاں بیٹھ کر بادشاہ دیدار (درشن) دیا کرتے تھے۔

شیر برنج کھیر (شیر: دُودھ۔ برنج: چاول) دودھ اور پسے ہوئے چاولوں کے آمیزے سے تیار کی

جاتی ہے۔

شیرمال مَیدے میں گھی مِلا کر تندور میں پکائی گئی روغنی روٹی، جس پر پکاتے وقت دُودھ کا چھینٹا دیا جاتا ہے۔حسبِ ذائقہ نمک یا دہی بھی مِلا دیا جاتا ہے۔

شَیطان کے کان بہرے : خُدا نہ کرے، خُدا نہ خواستہ، ہر مُصیبت دُور رہے۔خالصتاً نسوانی محاورہ ہے۔اِسی مفہوم کا ایک محاورہ ہے :''سات قرآن درمیان'' بعض اوقات دونوں کو اکٹھا بھی بولا جاتا ہے۔

شیطان لگا ہے ؟ : کیا فتنہ و فساد کھڑا کرنا چاہتے ہو؟ شرارت سُوجھی ہے؟

شِیو رات شِوراتری۔ ہندوؤں کا ایک تیوہار۔ شِو کی یاد میں برت (روزہ) رکھا جاتا ہے اور روزہ کھول کر خوشی منائی جاتی ہے۔ ہندوؤں کے تین بڑے فرقوں وِشنو، شاکت اور شِیو میں سے ایک بڑا فرقہ پھاگن میں یہ تیوہار مناتا ہے۔

ص

صاحبانِ والاشان : فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے اربابِ اختیار۔ نیز ٹریننگ پانے والے نوجوان انگریز اَفسران۔

صاحبِ ذُوالفقار : حضرت علیؓ۔

صاحبِ قِران : مغل بادشاہ امیر تیمور کا لقب، مُراد وہ شخص جس کی پیدائش کے وقت زحل اور مُشتری ایک بُرج میں ہوں۔ (یاد رہے کہ یہ دونوں ستارے بہت مدّت بعد یکجا ہوتے ہیں۔ ایسے شخص کو خوش نصیب تصوّر کیا جاتا ہے) نیز ایسے بادشاہ کا خطاب، جو چالیس برس سے زیادہ حکومت کرے۔ (زحل اور مُشتری کے قِران کے وقت حضورِ اکرمؐ اور حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے۔ جلال الدین محمد اکبر اور اورنگ زیب عالمگیر دونوں نے انچاس انچاس برس حکومت کی۔ جدید دور میں جاپان کے شہنشاہ ہیرو ہیٹو (م:۱۹۸۹ء) نے ترسٹھ برس حکومت کی۔ کیوبا کے فیدرل کاسترو ۱۹۵۹ء میں حکمران بنے یوں ۲۰۰۸ء تک انچاس برس تو اُن کو حکمران بنے ہوگئے۔ یُوں یہ تمام شخصیات ''صاحبِ قِران'' کہلائیں گی۔)

صاحبوں : فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں زیرِ تربیت نوجوان انگریز افسران۔

صادِق سچّا، وفادار۔

صافی نامہ خلاصی نامہ، فارغ خطی، ایسی تحریری دستاویز جس سے معلوم ہو کہ مدّعی کو اب کوئی شکایت

باقی نہیں رہی، کوئی دعویٰ نہیں۔

صانع پیدا کرنے والا، بنانے والا، خالق۔ مُراد اللہ تعالیٰ۔

صُبح خیزے وہ چور، جو صُبح مسافروں کے جاگنے سے پہلے سرائے سے سامان چُرا لے جاتے تھے۔ (صُبح خیزا کی جمع)

صُحبت گرم ہُوئی : بے تکلفانہ گفتگو ہونے لگی۔ صُحبت (عربی): ہم نشینی، دوستانہ۔

صد و بیست سال : ایک سو بیس سال۔ یہاں مُراد برسوں کا تعین کرنا نہیں، صرف زیادہ عمر کی طرف اشارہ ہے۔

صلاحِ دولت : حکومتی پالیسی۔ صَلاح (عربی) : مشاورت۔

صَلوٰۃ درود، اللہ کی رحمت (صَلو : دعا مانگنا)

صندلی چوکی، کُرسی، اُونچی تپائی جو مخروطی شکل کی ہو۔

صنعتیں : کاریگریاں، ہُنرمندیاں۔ صَنعت (عربی) : کاریگری کی جمع۔

صُورت نہ شکل، چُولھے میں سے نِکل : (مثل) بدصُورت، بدوضع مرد، عورت کے لیے کہتے ہیں۔ اِس مثل کی ایک صورت اور بھی ہے: ''صُورت نہ شکل، بھاڑ میں سے نِکل۔''

ض

ضربِ شلاق چھڑی سے مارنا پیٹنا۔

ط

طاقِ کِسریٰ قدیم ایران کے مشہور بادشاہ نوشیراں عادل کا بنوایا ہُوا محل (''کِسریٰ'' عجم کے بادشاہوں کا عمومی لقب تھا)

طالع مُقدر، قسمت، نصیب۔

طالع مَند : بختاور، خُوش نصیب۔

طباشیر بتاشیر (فارسی) کا مُعرب۔ مُراد بنسلوچن۔ ایک سفید رنگ کی دَوا جو بانس کے درختوں کے تنوں سے حاصل کی جاتی ہے۔

طرحیں : انداز، طریقے۔ طرح (عربی) انداز کی جمع۔

طرفین فریقِ اوّل یا دوم۔ (طرف کی جمع)

طعام بخش (اگر لکڑی کا ہو تو) ڈوئی، سالن نکالنے کا بڑا چمچہ۔

طعنہ مہنا باتوں کے ذریعے کسی کو اُس کی شخصیت یا سماجی حیثیت میں کمی کا احساس دِلانا، طعن و تشنیع۔ (''مہنا'' تابع مہمل ہے)

طِلا بافی ایسا کپڑا، جس کی بُنائی میں سونے کے تار شامل ہوں۔

طلب مُشاہرہ، تنخواہ۔

طناب خیمے کی رسّی۔

طوَیلہ اَصطبل۔

طہارت (عربی۔مؤنث) استنجا، وُضو اور غُسل (مکمل طہارت)۔

طے (عربی۔مذکر) یمن کا ایک قبیلہ، جو عرب میں آباد ہو گیا۔ مشہور عربی شاعر، شجاع اور سخی حاتم بن عبداللہ بن سعد (حاتم طائی) کا تعلق اِسی قبیلے سے تھا۔

ظ

ظِلّ اللہ اللہ کا سایہ۔ قدیم وقتوں میں یہ تصور عام تھا کہ بادشاہ، منجانب اللہ ہوتے ہیں۔ اِس لیے بادشاہوں کو ''ظِلّ اللہ'' یا ''ظِلِ الٰہی'' کہا جاتا تھا۔ ظِلِ سُبحانی، ظِلّ اللہ کا مُترادف ہے۔

ظِلِ سُبحانی اللہ کا سایہ تفصیلات کے لیے دیکھیے : ظِلّ اللہ۔

ع

عادَت پر : عادَت کے مطابق۔ عادَت (عربی مؤنث) خصلت۔

عاصی گنہ گار۔

عاقِلاں خود می دانند : (مثل) عقل مند کو بتانا نہیں پڑتا۔

عالَمیاں دُنیا کے سب لوگ۔

عامِل جِنّات یا بھوت پریت کا سایہ اُتارنے والا۔

عجم ایران۔ (اہلِ عرب اپنی زبان دانی کے زُعم میں ایران کو ''عجم''، یعنی گُونگوں کا ملک کہتے تھے۔)

عَجمی اِیران کا باشندہ (اہل عرب اپنی زبان دانی کے زُعم میں اہلِ ایران کو ''عجمی'' گونگا کہتے تھے۔)

عُجوبہ انوکھا، عجیب (یہاں اشارہ عجیب و غریب واقعہ کی طرف ہے۔)

عدالت　　انصاف۔

عرش پر جھنڈا گاڑا ہے : کمال رُعب ڈالا ہے، بڑا کام کیا ہے۔

عروس　　دُلھن۔

عِشق مُشک　　محبت کی ملاقاتیں۔

عصے بردار : چوب دار، وہ خاص ملازم جو سونے، چاندی مڑھے ہُوئے عصا ہاتھوں میں اٹھائے بادشاہوں یا ججوں کے آگے آگے چلتے ہیں۔

عِطر پان　　خاطر داری۔

عظیم آباد : ہندوستان میں پُورب کا ایک شہر جو اِس وقت پٹنہ کہلاتا ہے۔

عَفو　　مُعافی۔

عَقد باندھنا : نکاح پڑھوانا۔عقد (عربی۔مذکر): نِکاح۔

علامت　　علامتِ مَردمی مُراد ہے، یعنی عضوِ تناسُل۔

علیہم الصّلواۃ وَالسَّلام اُن سب پر درُود و سلام۔

عِمامہ　　دستار، پگڑی (اردو میں بفتحِ اوّل مُستعمل ہے)۔

عُمان : عرب کے جنوب مشرقی حصّے کا ایک چھوٹا سا مُلک۔

عُمدہ　　امیرِ دربار، رئیس، سردار۔

عَمل میں : حکومت میں۔

عَمل ہُوا : حکومت قائم ہوئی۔

عَمو　　چچا۔

عمیق　　گہرا۔

عُود سُوز　　اگردان، وہ برتن جس میں لوبان سُلگایا جائے۔
(عُود : اگر، ایک سیاہ رنگ کی خوشبودار لکڑی، جو پانی میں ڈوب جاتی ہے)

عِوَض لُوں　　بدلہ لُوں، انتقام لُوں۔

عُہدے　　اُمراء کے مَنصب اور مرتبے کے نِشانات، جو سونے، چاندی مڑھے ہوئے عصا کی صُورت

ہوتے تھے، انھیں لونڈی، غلام اُٹھائے رکھتے تھے۔ (عہدے لیے ہوئے کھڑی ہیں: اپنے منصب اور مرتبے کے نشانات لیے کھڑی ہیں)

عیال واطفال: بیوی بچّے، کنبہ، خاندان۔ حدیث ہے: ''الخلق عیال اللہ'' یہاں کنبے کے معنی ہوئے۔ حضرت اِمام ابوحنیفہ کا قول ہے: ''الفقہ عیال ابوحنیفہ۔'' یہاں خاندان کے معنی ہیں۔

عیاں راچہ بیاں: (مثل) جو چیز ظاہری ہے، اُسے بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

عین مین: بالکل۔

غ

غالِب ہے: گمان غالب ہے۔ غالِب (عربی صفت)

غٹ: گروہ، جتھا، ٹولی، غول، ہجوم۔

ع جا دیکھا ابھی اُدھر کوئی پَریوں کا غٹ گیا (نظیر)

غُراب: چھوٹی کشتی، جس میں بیٹھ کر بحری جہاز تک پہنچا جا سکے۔

غُرّہ: قمری مہینے کی پہلی تاریخ۔

غریب: مُسافر۔

غُسلِ صحت: بیماری کے بعد پہلی بار نہانا۔ غُسل (عربی) نہانا۔

غَضَبی: قہر، غُصّہ۔ (دہلی کا محاورہ ہے: غَضَبی میں پڑیں: قہر کا نشانہ بنیں)

غُلامِ کافری: ''سیاہ فام حَبَشی غلام''۔ (''باغ و بہار'' مرتبہ: بنیز BANESS)

غِلمان: خوبصورت نوجوان لڑکے، جو بہشت میں مومنین کی خدمت پر مامور ہوں گے۔

غَنی: دولت مند، مال دار، بے پروا، سخی۔

غنیموں: دشمنوں۔ غنیم (عربی): دشمن کی جمع۔

غور پرداخت: پرورش، نگہ داشت، دیکھ بھال۔

غور میں گیا: سوچ میں پڑا۔ میرامّن نے غور کا لفظ مؤنث برتا ہے۔ مثال: ''غور کی'' (سیر پہلے درویش کی)

غوری اور لودی: ان دو خاندانوں میں بالائی ہندوستان میں امیر تیمور سے پہلے حکومت تھی۔ ظہیر الدین بابر، ابراہیم لودی کو شکست دے کر ہندوستان کا بادشاہ بنا۔

غوطے میں گئی : غور و فکر میں ڈوب گئی، سوچ میں پڑ گئی۔

غُول بیابانی : (عَربی میں غُول بہ معنی دیو، شیطان، جادوگر) اگیا بیتال، چھلاوا۔ شمشان گھاٹ میں جلائے جانے والے مُردوں کی ہڈیوں کا فاسفورس بعض اوقات (جب ہوا رُکی ہوئی ہو) انسانی ڈھانچوں کی شکل دھار لیتا ہے اور اندھیری راتوں میں بے ڈھب انسانی ڈھانچے فضا میں حرکت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ انھیں ''اگیا بیتال'' یا ''غُول بیابانی'' کہتے ہیں۔ صاحبِ نُور کا یہ کہنا کہ ''فارسیوں نے واو مجہول سے استعمال کیا'' غلط ہے۔

میری وحشت نے چراغِ راہ جو سمجھا اُسے ۔ آنکھ دِکھلا کر مجھے غُولِ بیاباں رہ گیا (آتش)

غیبانی بدچلن، زانیہ، حرام کی جَنی (یہ کلمہ نسوانی محاورے میں بطور گالی کے رائج ہے)

ف

فاتحہ خیر : خیر کی دُعا۔

فاخرہ عُمدہ، بیش قیمت۔

فارس مُراد : ایران۔ لیکن درحقیقت ایران کا ایک مشرقی صُوبہ، جس کا دارالخلافہ ''شیراز'' تھا۔ (جامع اللغات) ''باغ و بہار'' میں کہیں تو مُلک ایران مُراد ہے اور کہیں وہ مشرقی صوبہ، جس کی طرف اُوپر اشارہ کیا گیا۔

فارغ خطی لادعویٰ، بے باقی کی رسید، میاں بیوی کی علاحدگی (طلاق) یا مال کی بے باقی کی تحریر۔

فاسق گُنہ گار، بدکار۔

فالُودہ پکا ہُوا نشاستہ، جسے چھلنی میں چھان کر چھوٹے چھوٹے قتلوں کی صورت چاولوں یا سویّوں کی طرح کتر لیا جاتا ہے۔ شکر (چینی) مِلا کر دودھ میں برف ڈال کر کھاتے ہیں۔

فانُوسِ خیال کاغذ کا بنا ہُوا چراغ دان، جس میں ہاتھی اور گھوڑوں کی شبیہیں کاغذ سے کاٹ کر ایک سریع الحرکت چکّر پر رکھ دیتے ہیں تا کہ وہ ہوا یا دُھوئیں سے خود بخود گردش کریں اور دیواروں پر عکس کی صورت ہاتھی گھوڑوں کو چلتے پھرتے دیکھ کر بچّے شاہی سواری کا لُطف لیں۔

فانُوسیں : قِندیلیں۔ فانوس (فارسی) قندیل کی جمع۔

فَبِہا بہتر ہے، دُرست ہے۔

فجر	علی الصباح، بہت سویرے۔
فحوائے کلام	اندازِ گفتگو۔
فرّاش	بستر بچھانے اور لیمپ جلانے والا۔
فرّاشی سلام	ایسا جھک کر سلام کے عالمِ رکوع میں چلا جائے۔
فَرد	وہ کاغذ، جس پر محرر سامان کا حساب کتاب درج کرتے ہیں۔
فِردوسی :	ایران کا مشہور شاعر، ''شاہنامہ'' اور ''یوسف زلیخا'' کا مصنف ابوالقاسم حسن طوسی (پ : ۹۳۲ء۔م : ۱۰۲۰ء) المعروف ''فِردوسی''۔
فَرسَخ	فرسنگ کا معرّب۔ آصفیہ اور نور کے مطابق اہلِ فارس کا میل چار ہزار گز کا ہوتا تھا، بعد میں ایک ہزار سات سو ساٹھ گز کا ہوا۔ یوں فرسَخ سے مُراد چھ میل، چھے فرلانگ اور ایک سو بیس گز کی مسافت۔
فرنگ	یورپ ۔ ''باغ و بہار'' میں یہ لفظ کئی مقامات پر برتا گیا۔ کہیں، یورپ، کہیں اِنگلستان اور کہیں نصاریٰ کے مُلک کے لیے برتا گیا۔
فَقر	درویشی۔
فِکر	سوچ بچار، دھیان، اُلجھاوے میں پڑنا۔ میر امّن نے فِکر کو مؤنث باندھا ہے حال آنکہ دِلّی میں اسے مذکر بولتے اور لکھتے تھے : ع عدم میں رہتے تو شاد رہتے اُسے بھی فِکر ستم نہ ہوتا (مومن)
فُلانے :	شخص غیر معلوم، وہ شخص جو ذہن میں تو ہو مگر زبان سے اُسے پہچاننے کا ثبوت نہ دیں۔ فُلان (عربی۔صِفت) : شخص غیر معلوم۔ قُرب میں دُوری کا اشارہ۔ درویش نے اپنے لیے متکلم کی جگہ غائب کا صیغہ برتا ہے۔
فِندَق	سُرخ رنگ کا ایک چھوٹا سا پھل، جس کی چھال سخت ہوتی ہے۔
فہمیدہ	سمجھ دار، باشعور۔
فی الجُملہ	کسی قدر، بہر حال، الغرض۔
فی الواقع :	دراصل، بے شک، حقیقتاً۔

ق

قارورہ — مُٹکنی طرز کی کانچ کی شیشی، مجازاً پیشاب۔ اصطلاحی معنوں میں وہ کانچ کا برتن (یا بوتل) جس میں ڈال کر مریض کا پیشاب، برائے ملاحظہ (رنگ، کیفیت) یُونانی اطباء کے سامنے رکھا جاتا ہے۔

ع جب مَوت مرض نے آن لیا ہو ، لے نبض اور قارورہ (نظیر)

قاری — پڑھنے والا۔

قاصر نہیں : (کام میں) کوتاہی کرنے والا نہیں۔

قاصر ہُوں : بے بس ہوں، مجبور ہُوں۔

قافلہ باشی — میرِ قافلہ۔

قالیچہ — چھوٹا قالین، غالیچہ۔

قباحت — خرابی، نقص، عَیب۔

قبالہ — مکان/جاگیر کی سندِ مِلکیت۔ ع محضر قبالہ لکھے، قضیے چُکائے شرعی (نظیر)

قبچاق : علاقہ تاتار کا ایک صحرا (جامع اللغات)

قِبلہ گاہ — والدِ مُحترم۔

قبُولی — چنے کی دال اور چاول کی کھچڑی۔ فاتحہ اور نیاز کے لیے پکائی جاتی ہے۔ پنجاب کے اُمراء کے ہاں یہ دستور بھی رہا ہے کہ قبولی کھانے والوں کی پلیٹوں میں کھچڑی کے اُوپر گرم گرم دیسی گھی بھی فراوانی سے انڈیل دیا جاتا تھا۔

قبیلہ — بیوی، جورُو (قبیلے کو بہ سبب محبت ساتھ لیا : بیوی سے محبت تھی، اس لیے اُسے ساتھ لیا)

قحبہ — بدچلن عورت، فاحشہ۔

قدم بَوس کیا : جُھک کر آداب بجالایا۔

قدم پر، گرنے لگیں : (میرے) پاؤں پڑنے لگیں، عاجزی اختیار کر کے خوشامد کرنے لگیں۔

قدم دیکھنا : قدم بوسی کرنا۔

قدم رنجہ فرمانا : کسی کے گھر تک آنے کی تکلیف گوارا کرنا۔ (''قدم رنجہ فرماوے'': میرے گھر تک آنے

کی تکلیف گوارا کرے۔ ''قدم رنجہ فرماؤ'': تشریف لائیے)

قراولِ پادشاہی : بندوقچی ، وہ مُسلح سپاہی جو حالات معلوم کرنے کے لیے گشت میں رہتے ہیں ۔ قراول (عربی) شِکار کھلانے والے، بہلیے۔

قُربان و کمان رکھنے کا خانہ۔

قِصاص : اِنتقام، خُون کا عِوَض۔

قصد کچھ اور کیا : مُجامِعت کا ارادہ کیا۔

قَصرِ نُعمان : حیرہ (عرب) کے بادشاہ نُعمان بن مُنذر کا بنوایا ہُوا محل ''خَورنق''، جِسے اُس نے ایرانی شہزادے بہرام گور کے لیے تعمیر کروایا تھا۔

قِسمت بدَھا ہوگا، سو ہوگا : جو قسمت میں لکھا ہوگا، سامنے آرہے گا۔ (بدھا: بدا)

قصُور : کمی۔ (بے حیائی اور حرمزدگی میں ہرگز قصور نہیں: بے حیا ہونے اور حرام زدگی میں کوئی شک نہیں)

قضا کار : قضارا، اتفاقیہ۔

قضائے اِلٰہی : رضائے الٰہی، اللہ کے حُکم کے مطابق اپنے وقت پر مَرنا۔

قطع کرنا : تراشنا (سخاوت کا جامہ خدا نے اُس عورت پر قطع کیا ہے : بلاشبہ سخاوت کا لباس اُسی عورت پر بجتا ہے۔ مراد صحیح معنوں میں اللہ نے اُسی عورت کو سخی بنایا ہے۔ قطع (عربی): کانٹ چھانٹ، تراش خراش۔

قِطعَہ : ٹکڑا (قِطعَہ بہار کا نظر آیا : زمین کا ایسا ٹکڑا، جو مُجسّم بہار تھا، دکھائی دیا)

قلب مکان ہے : ایسا ناقابلِ تسخیر قلعہ (یا جگہ) جہاں رسائی بہت مُشکل ہو (ڈنکن فاربس) (قلب : دشوار گزار پہاڑی راستہ) ''قلب'' نام کا ہرات کے قلعہ کا ایک بُرج بھی ہے۔ (جامع اللغات)

قُلزمَ : دریائے قُلزم یا بحرِ احمر (RED SEA)

قِلماقنیاں : ایسی تُرک عورتیں، جو پانچوں ہتھیاروں سے مُسلّح، شمشیرِ برہنہ ہاتھ میں لیے بطور پہرہ دار محلات میں موجود رہتی تھیں۔ اُن عورتوں کا تعلق ترک قبیلے قِلمان سے تھا۔

قلمرَو : سلطنت (تمام قلمرَو میں : پُوری سلطنت میں)

قُلنج : قولنج، وہ نا قابلِ برداشت دَرد جو پَسلیوں کے پیچھے ہوتا ہے۔

قلیان : گُڑگُڑی، ایرانی حُقّہ (ایس۔ڈبلیو فیلن اور پلیٹس نے بہ فتح اوّل لکھا ہے)

قلیہ : قورمہ، سادہ گوشت، جو گھی میں بُھون کر شوربہ دار پکایا جائے۔

ع پکایا قرض منگا کر پلاؤ اور قلیہ (نظیر)

قَمچی : کوڑا، چابک (اُر) پتلی لچکدار چھڑی۔

قُمقُمہ : چھوٹی قندیل۔

قَنْد : سفید شکر۔ ع کیا شکر، مصری، قند، گری، کیا سانبھر میٹھا کھاری ہے (نظیر)

قُوت : خوراک، غِذا۔

قُور بیگی : اسلحہ خانے کا داروغہ۔ بنیز (BANESS) نے اس کے معنی ''قاصد'' لکھے ہیں، جو سراسر غلط ہیں۔

قُورچی : ہتھیار بند سپاہی (قُور: ہتھیار۔ چی : اِسم فاعل کی علامت)

قورما پلاؤ : ایسا پلاؤ، جس میں مسالہ دار قورمے کا بُھنا ہُوا گوشت ملا دیا جاتا ہے۔

قَول کیا تھا : عہد کیا تھا۔

قہرِ درویش بہ جانِ درویش : (مثل) مُفلس و بے نوا کا غُصّہ اُس کی اپنی جان پر ہی نکلتا ہے۔

قَہوہ دان : سماوار کی طرح کی چھوٹی کیتلی برائے قَہوہ۔

ک

کاٹھ : لکڑی۔

کاٹھ ہو گیا : بے حِس و حرکت ہو گیا، مبہُوت ہو گیا۔

کاجا د کام کاج، کاروبار۔

کارآزمودہ : تجربہ کار۔

کارخانہ جات : تعمیر کے شُعبہ جات۔

کارکردہ : طویل تجربے کا حامل۔

کارواں سرا : قافلوں کے اُترنے، ٹھہرنے کی جگہ، وسیع و عریض سرائے۔

کاشانی مخمل : کاشان (ایران) میں تیار کردہ اعلیٰ درجے کی مخمل، جو اُس دَور میں سب سے اچھی تصوّر کی جاتی تھی (مخمل : ریشمی روئیں دار کپڑا)

کاش کہ: کیا اچھا ہوتا۔ (دیگر مُروجہ متون میں ''کاشکے'' درج ہے) ایسا کلمہ، جس میں کسی کام کے ہونے یا کرنے کی تمنا پائی جائے۔

کافُوری شمع : ''کافُور کی بنی ہوئی شمع، جس کی روشنی نہایت صاف ہوتی ہے۔'' (جامع اللغات) یہ شمع دُھواں مُطلق نہیں دیتی۔

کافُور ہو گئے : غائب ہو گئے۔

کاکا : بُڈّھا خانہ زاد مُلازم، وہ مُلازم جس کی گود میں بڑوں نے پرورش پائی ہو۔

کال : وقت، قِسمت، مَوت۔

کالے ٹکے: تانبے کے سِکّے۔

کامنی: نازک اور خُوب صورت (جامع اللغات)

کان پڑنا : کسی کے کانوں تک بات پہنچانا۔

کان دَھر کر سُنو : غور سے سُنو، توجہ دے کر سُنو۔

کانوں پر ہاتھ رکھنا : حیرت کا اظہار کرنا، صاف صاف انکار کرنا، لاعلمی ظاہر کرنا۔

کاوا دینا : گھڑ سواری کرتے ہوئے گھوڑے کو ایک دائرے میں یوں چکّر دینا کہ گھوڑے کے سُموں سے نرم زمین پر دائرہ سا بن جائے۔

کاہلا ہُوا : سُست، تھکا ہُوا (نُور۔ جامع اللغات) مُراد : بیمار۔

کائنات : مال اسباب، سرمایہ۔

کَب : کبت کہنے والا شاعر۔

کِبار : برتر، بڑے (رسولِ کِبار : نبیوں میں سب سے برتر۔ رسول اللہؐ۔)

کبِت : نظم۔ ع باہم کبت کا پڑھنا بہ اندوہ بے شُمار (نظیر)

کبیرا : ایک ہندی شاعر اور فرقہ ''کبیر پنتھی'' کا بانی۔ ذات کا جولاہا تھا۔ مسلمان اسے ''کبیر احمد''

سمجھ کر مسلمان مانتے ہیں اور ہندو ''بھگت کبیر'' یا ''کبیر داس'' مان کر ہندو سمجھتے ہیں۔ ''کبیرا'' سے مُراد ''بڑا شاعر'' ہے۔

کتخدا کرنا : شادی کرنا۔

کتخدائی : شادی۔

کِتنے دِن پیچھے : کُچھ دن بعد۔

کَٹّر : سخت دل، بے رحم۔

کثرت : مجمع، انبوہ، اِفراط، بُہتات۔

کجاوہ : اُونٹ کی کاٹھی، جس پر دو اشخاص ایک دوسرے کے مقابل بیٹھتے ہیں۔

کچکول : کشکول، کاسہ۔

کچّی ہوس پکانا: (محاورہ) قوتِ مردمی نہ ہونے کے باوجود مُباشرت کا ارادہ کرنا۔

کدُھو : کُھو کی ابتدائی شکل، کبھی۔

کرچھال : چھلانگ، زقند، چوکڑی۔ فارسی میں ہَرن کے کلانچیں بھر کر دوڑنے کو کرچھال (یا چوکڑی) کہتے ہیں۔

کِردگار : خالق، بنانے والا۔ (مُراد اللہ تعالیٰ)

کُرسی نشیں : دُرست، قابلِ تسلیم، مُوافق۔

کرکر : کام کر کے۔

کرم : اختیار، کام، حُکم، قِسمت۔ ''باغ و بہار'' میں صرف دو معنوں میں برتا گیا۔ اختیار اور قسمت کے معنوں میں۔

کرم کی ریکھا : مُقدر کا لکھا قسمت کی لکیر۔

کرّوبیاں وہ فرشتے، جو عرش پر اللہ کی کُرسی کے قریب ہیں اور ہر دَم حمد و ثنا میں مشغُول ہیں۔

کروٹیں کھا کر : پہلُو بدل کر۔

کُریال میں غُلیلا لگنا : ناگہانی آفت، عیش میں خلل پڑنا۔ فُرصت کے لمحات میں پرندے اپنی چونچ سے ساتھی پرندے کے پَروں کو سنوارتے یا سہلاتے ہیں، اُسے کُریال (ہندی۔ مؤنث) کہتے۔

ایسے میں غلّہ یا ڈھیلا مار دیا جائے تو اُن کے مزے میں کھنڈت پڑے گی۔ یہاں یہی معنی مُراد ہیں۔

کُس : عورت کی شرم گاہ۔

کَسب : پیشہ، ہُنر، فَن (سپاہ گری کا کسب: سپاہیانہ ہُنر، جراحی کا کسب : سَرجری کا فن، کسب کر رہا تھا : اظہارِ فن کر رہا تھا)

کِس برتے پر تتّا پانی : کِس بھروسے پر گرم پانی کی فرمائش کی جا رہی ہے؟ جب کہ کِیا کرایا کُچھ نہیں۔

کستُورا : سِیپ، ایک پَرِندہ۔

کِسریٰ : خُسرو کا مُعرب، شاہانِ ایران خصوصاً نوشیرواں عادِل کا لقب۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے : نُوشیروان۔

کِسو : کِسی۔

کِشتیاں : کِشتی کی جمع۔ ایک مُستطیل لکڑی کا ٹکڑا، جس کے چاروں طرف لکڑیاں لگی ہوتی ہیں۔ اُس میں کھانے کی چیزیں یا پاپوش رکھتے ہیں۔ (جامع اللغات) آج کے دَور کی ٹرے اُس کا مُتبادل ہے۔

کفِ دست میدان : چٹیل میدان (کفِ دست : ہتھیلی) جس طرح ہتھیلی پر کچھ نہیں ہوتا، اُس طرح کا بے آب و گیاہ میدان۔

کفنی : درویشوں کا بغیر آستین گیروے رنگ کا ڈھیلا ڈھالا اَن سِلا لباس۔ یعنی چادر لے کر اُس کے بیچوں بیچ ایک سُوراخ کر لیا جائے اور اُس میں سے سر گزار کر پہن لیں۔ کفن سے مُشابہت اَن سِلا ہونے کے حوالے سے ہے۔

کُلال : کُمہار۔

کَلاوَنت : خاندانی گویّا، ڈوم۔ بعض اصحاب نے ''کانونت'' لکھا ہے جو سراسر غلط ہے۔

ع جب مُفلسی سے ہَووے کلاوَنت کا دِل اُداس (نظیر)

کُلبُلاتی ہے : درد سے تڑپتی ہے (زخمی بے ہوش عورت کی بے کلی کی کیفیت)

کلجھواں : سَنوَلایا ہُوا، سیاہی مائل گندمی رنگ۔

کُلچہ : چھوٹی سی خمیر کے باعث موٹی روٹی، جسے تنور میں پکایا جائے۔

کلکتہ : بنگال (ہند) کا دارالخلافہ۔1911ء تک ہندوستان کا صدر مقام رہا۔

کلمہ کلام ہونے لگا : بات چیت، بول چال ہونے لگی۔

کلنک کا ٹیکا : بدنامی کا داغ، اِتہام، رُسوائی کا دھبہ۔

کِلول : خُوشی سے اُچھل کُود۔ ع شاجھو نپڑا بھی اس میں ہی کرتے کِلول ہیں (نظیر)

کَلّہ جَبڑا : چہرے مُہرے کی دھاک، دَبدبہ۔

کماحقہٗ : بخوبی، ٹھیک ٹھاک۔ لفظی معنی : جیسا کہ اُس کا حق ہے۔

کمال شوق ہُوا : جی مچلا۔

کماؤ کی پگڑی قائم رہے : شوہر کی عزّت برقرار رہے (دُعائیہ نسوانی محاورہ)

کُمک : فوجی مدد، اضافی فوج بھجوانے کی صورت میں۔

کمل : کمبل کا قدیم تلفظ و اِملا۔

کمند : رسّی کا پھندا، گرہ دار رسّی، جسے بطور سیڑھی کے چور چھتوں پر چڑھنے کے لیے کام میں لاتے ہیں۔

کِناری : باریک گوٹا، جسے عورتیں لہنگوں اور دوپٹوں کے کناروں پر لگاتی ہیں۔

ع کیا ساز جڑاؤ زیور، کیا گوٹے تھان کِناری کے (نظیر)

کنچنیاں : رقص میں خصوصی مہارت کی حامل طوائفیں۔

کُنڈلا : راوٹی، ایک طرح کا خیمہ (جامع اللغات)

کُندَن : خالص سونا۔ (جامع اللغات)

کُنور : راجا کا بیٹا۔

کنول : ایک ظرف، جس میں موم بتّی جلاتے ہیں (جامع اللغات)

(سَرو کنول کے : سَرو کی طرح سُتواں درخت، جن میں جا بجا موم بتیاں روشن کی گئی ہوں۔)

کنولا : نارنگی کی ایک قسم۔

کنیا : دس برس سے کم عمر کی لڑکی، بیٹی۔ کنیا (ہندی)

ع مُکھ دیکھ دُلاری کنّیا کا، یُوں بولے راجہ رانی سے (نظیر)

کواکِب : کوکب (ستارہ) کی جمع (ساتوں کواکِب : ساتوں ستارے، مُراد : سُورج، چاند، زُہرہ، مریخ، مُشتری، زُحل، عطارد)

کُواں : کُنواں کا قدیم اِملا۔ میر امّن نے بعض مقامات پر ''کُوا'' بھی لکھا ہے اور جمع کے طور پر ''کُوئے''۔

کُوچہ گردی : آوارہ گردی، گلی گلی گھومنا پھرنا۔

کوتوال کے ڈنڈے : کوتوال کے سپاہی۔ مجازاً ''ڈنڈے'' کہا گیا، ظلم وستم کا مفہوم ادا کرنے کے لیے۔

کوٹ : حِصار، قلعہ۔

کوٹ باندھ کر بیٹھنا : آلتی پالتی مار کر بیٹھنا۔ (طویل بیان کرنے سے قبل اِطمینان سے بیٹھنا) ہلکا سا اشارہ اِس طرف بھی ہے کہ جیسے جادُوگر منتر پڑھنے سے قبل زمین پر گول دائرہ کھینچ کر بیٹھتے ہیں، اُس طرح۔

کوٹھیاں : کوٹھی کی جمع۔ تجارتی اِدارے کی شاخیں، بڑی دُکانیں۔

کور : اندھا، نابینا۔

کورنِشات : کورنِش کی جمع۔ کورنِش : جُھک کر بار بار آداب بجالانا، شاہی دربار میں سلام کرنا۔

کُوڑ : کُوڑھ مغز، احمق (کُوڑ : کُوڑھ پَن)

کوڑی : سمندری کیڑوں کے خول، جو بطور سِکہ کے استعمال ہوتے تھے۔

کوکا : دُودھ شریک بھائی۔

کوکو پُلاؤ : لکھنوی پُلاؤ، جس میں کباب یا اُبلے ہوئے سالم انڈے ڈالتے ہیں۔ دِلّی میں اسے ''بیضہ پُلاؤ'' کہا جاتا ہے۔ (جامع اللغات)

کولا : گود، بغل (کولے میں پکڑ کر : بغل میں لے، بازوؤں میں بھر کر)

کوندھ : کوند کا قدیم اِملا اور تلفظ۔

کُون : مقعد۔

کونَین : دونوں جہان (دنیا اور آخرت)

کوہستان : پہاڑی سلسلہ، پہاڑی علاقہ۔

کوہِ قاف : بُحیرہ کسپین اور بُحیرہ اَسود کے درمیان کا پہاڑی سلسلہ، جس کی سب سے بُلند چوٹی کوہِ البرز، سطحِ سمندر سے اٹھارہ ہزار چار سو پینسٹھ فٹ بلند ہے۔ ایشیائے کوچک میں رُوسی تُرکستان اور ایران کا درمیانی علاقہ۔ داغستان، آرمینیا، آذر بائیجان اور جارجیا کے بہت سے علاقے اِس پہاڑی سلسلے کا حصّہ ہیں۔ کوہِ قاف سے بہت سی اساطیری روایات وابستہ ہیں۔ یہاں کی عورتیں حسین ہیں، شاید اِسی لیے اِسے پریوں کا مَسکن بھی کہا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایرانی بادشاہ خُسرو پرویز کی بیوی، شیریں کا تعلق اِسی علاقے سے تھا۔ چینی شہزادہ فرہاد اُس پر عاشق ہُوا۔

کوئی نوالہ : محض دو ایک نوالے۔

کُہاسا : کُہرا۔

کھال کھینچ کر بُھس بَھرو : بے جان مُورا بنا دو یعنی چہرہ تو بطور پہچان کے وہی رہے البتہ کھال میں بُھوسا بھر دیا جائے۔ قدیم دور کی انتہائی ظالمانہ سزا۔

کُھب گئی تھی : دِل میں جاگزیں ہوگئی تھی، دل میں اُتر گئی تھی۔

کھپرا : چوڑے پَھل کا تیر۔ یہ تیر دُور سے گردن اُڑانے کے لیے چلایا جاتا تھا۔

کُھترا : کونا، گوشہ۔

کھڑوے : نُقری زیور، جو ہندو بچّوں کے لیے بطورِ خاص بنائے جاتے تھے۔

کِھلوریاں : کِھلوری کی جمع۔ کِھلوری : گِلوری۔ دِن دھنیا بیج وغیرہ بُھنی ہوئی چیزیں، جو مُنہ صاف کرنے کے واسطے کھاتے ہیں۔ (جامع اللغات)

کھنڈی : بَن کھنڈی، ایک جنگل کا نام۔

کھیسا : جیب، کیسہ، تھیلی، خریطہ۔ یہاں مُراد کیسۂ جراحی ہے۔

کِھیل : بُھنے ہوئے چاول یا اناج جو پُھول گیا ہو۔ (جامع اللغات)

(کِھیل اُڑ کر مُنھ میں نہیں گئی : اناج کا ایک ذرّہ بھی مُنہ میں نہیں گیا، کچھ نہیں کھایا)

کِھیلنے : کِھیلنا : (ایک چھوٹی کشتی) کی جمع۔

کیا اِمکان ہے : ناممکن (مُراد اللہ کی کیا کیا صفات گنوائی جائیں)

کیا قسمت میں لکھا ہے : جانے مُقدر میں اور کیا کیا خرابی لکھی ہے۔

کِیا میں نے بنگالا، ہندوستاں : میں نے بنگال کی بگری پڑی زبان کو شائستگی دے کر ہندوستانی بنا دیا، یعنی اعلیٰ مقام دے دیا۔

کیتکی : کیوڑے طرز کا خُوشبودار، زردی مائل پیلے رنگ کا پُھول اور اُس کے پَودے کا نام۔ اِس پودے کا پھل اَنڈے کی شکل کا ہوتا ہے۔ پھل کِسی کام کا نہیں البتہ پُھولوں سے عِطر کشید کیا جاتا ہے۔ کیتکی کے پُھول کو ہندی شعراء بھونرے کا معشوق قرار دیتے ہیں۔

ع اور کیتکی کہتی ہے، صندل کا تراشا ہے (نظیر)

کے خُسرو : کے خُسرو بن سیاوش (پ: ۵۲۸ قبل مسیح) ایران کے کیانی خاندان کا بڑا بادشاہ جس نے بابل اور ایشیائے کوچک کو فتح کیا۔

کیفی : مَدہوش، مخمور، نشے میں ڈُوبا (کیفی ہوکر : مدہوش ہوکر)

کِیکَر : کیکر، ببُول۔ ایک جنگلی درخت جس کے پتے باریک اور کانٹے لمبے ہوتے ہیں۔ پُھول زرد رنگ کے خوشبودار ہوتے ہیں۔ اِس درخت کی چھال دیسی شراب بنانے اور چمڑا رنگنے کے کام آتی ہے۔ اُس کی داتُن مفید ہوتی ہے۔ کیکر سے حاصل ہونے والی گوند بہت لیسدار ہوتی ہے۔

کینچلی سی ڈال دی : صُورت بدل گئی، نئی وضع سے سامنے آیا۔

گ

گاڑنے دابنے کی فِکر : گڑھا کھود کر دبا دینے کی فکر، اس لیے کہ منشا اِخفا ہے۔ میر امّن نے دِلّی کے محاورے کے خلاف ''فِکر'' کو مؤنث باندھا ہے۔ ع عدَم میں رہتے تو شاد رہتے، اُسے بھی فِکرِ ستم نہ ہوتا (مومن)

گاڑھی چَوکی : سخت پہرا، مکمل نگہبانی۔

گاؤدِیدہ : تنور میں پکائی گئی مَیدے کی خمیری روٹی، جو دیکھنے میں گائے کی آنکھ سے مُشابہ ہونے کے سبب ''گاؤدِیدہ'' کہلائی۔

گاؤزبان : گائے کی زبان کی طرح لمبُوتری خمیری روٹی۔ ماوراءالنہر کے علاوہ فارسی بولنے والے افغانی، تنور میں پکاتے اور قہوہ کے ساتھ کھاتے ہیں۔

گاؤسوار : بَیل پر سواری کرنے والا (گاوَ : گائے اور بَیل دونوں کے معنی دیتا ہے)
''بُرجِ ثور'' میں بَیل کی شبیہہ نمایاں ہے۔ ثور (عربی) بَیل۔

گائن : ڈومنی، مُغنیہ۔ ع مٹکتی ہولیاں گاتی ہیں گائنیں کھڑیاں (نظیر)

گبرُو : جوان مرد، سجیلا مرد۔

گُپت : پوشیدہ۔

گج موتی : بہت بڑا موتی۔ حُجم کے لحاظ سے ہاتھی جیسے جسیم جانور سے مُشابہت دی گئی ہے۔ (گج : ہاتھی)

گدھے کا ہَل پھروا دو : (تباہ و برباد کردینے کے بعد) وہاں کی زمین بھی تہ و بالا کردو۔ ''کسی جگہ کو ایسا ویران کردینا کہ وہاں گدھے چرتے پھریں''۔ (جامع اللغات)

گذربان : شہر سے باہر جانے والے راستوں کے محافظ / نگران، جو ضروری کاغذات دیکھ کر شہر سے باہر جانے کی اجازت دیں۔

گذری : پُرانی اشیاء کا بازار، جو شام کے وقت شہری گزرگاہوں کے دونوں اطراف میں لگتا تھا۔
جیسے لکھنؤ کا ''نخاس بازار''۔ ع گذریاں ہیں، چوک ہیں، بستے کئی بازار ہیں (نظیر)

گِردا : چھوٹی گول تندوری روٹی ع یُوں چمکتا ہے پڑا ہر آن گِردا نان کا (نظیر)

گِردباد ہوگیا : بگُولا، چکّر کھاتی ہوئی ہَوا، جس میں گَرد و غُبار مِلا ہُوا ہو۔

گُرزبَردار : کندھوں پر گُرز اُٹھائے ہوئے سپاہی۔ گُرز : وزنی ہتھیار۔ اُس کے تین حصّے ہوتے ہیں (۱) قبضہ، یعنی گرفت کی جگہ (۲) کلّہ یا سر، وہ گول اور موٹا وزنی مقام جو ضرب لگانے پر حریف کے سر پر پڑے (۳) عمود، یعنی سلاخِ آہنی، جو قبضہ اور کلّہ کے درمیان ہوتی ہے۔ گُرزوں کے کلّے مختلف وضع کے ہوتے ہیں جیسے گُرزِ گاوَسر، گُرزِ شیرسر وغیرہ۔ ہندوستانی پہلوانوں کو کُشتی جیتنے پر گُرز انعام میں دیا جاتا تھا۔ خاندانِ پیش دادیاں کا مشہور ایرانی بادشاہ فریدُون، جو ۷۳۰ قبل مسیح میں تختِ ایران پر بیٹھا، اپنے کندھے پر ہمیشہ گُرزِ گاوَسر اُٹھائے رکھتا تھا۔

گُرسنگی : بُھوک، کھانا کھانے کی طلب۔ (جب گُرسنگی ہوتی ہے، گھاس پات کھاتا ہوں : جب بُھوک لگتی ہے تو گھاس اور پتّے کھاتا ہوں)

گُرگا : خدمت گار شاگرد، گرو کی ٹہل کرنے والا'' (جامع اللغات) دِلّی والے یہ لفظ شاگرد اور چیلے کے معنوں میں برتتے ہیں۔ یہی صورت پنجاب میں ہے۔

گرمابہ : گرم پانی کا حمام، جہاں نہانے کو گرم پانی مُیسّر ہو۔

گرم مت ہو : خفا نہ ہو، غُصّے کا اظہار نہ کرو۔

گرہست: خانہ داری کے حوالے سے سُگھڑ، سلیقہ شعار۔

گریباں گیر : دعویدار، مزاحم۔ (اِس شعر میں مُراد یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کوئی شخص تیرا گریبان پکڑے اور میرے خُون کا دعویٰ کرے۔)

گڑھ : حِصار، قلعہ۔ ع گڑھ، کوٹ، رہکلہ، توپ، قلعہ کیا شیشہ دار و اور گولا (نظیر)

گڑھ کر : گھڑ کر، ڈھال کر۔

گُزارے کا اسباب : دریا پار کرنے کا وسیلہ۔

گُزرانیاں : گزرانیں، نذریں۔

گُزربان : فصیل کے دروازے پر کھڑے نگہبان، جو شہر کے اندر آنے جانے والوں پر نظر رکھتے ہیں۔

گزک : شراب کے ساتھ تبدیلیِ ذائقہ کے لیے کھائی جانے والی اشیاء (تلی ہوئی نمکین دال، پستہ، بادام، کباب وغیرہ) ع شیشہ، گُلابی، ساقی اور جام اور گزک ہے (نظیر)

گسائیں : ''گوسائیں'' کا مُخفف۔ جوگی، سادھو، سنت۔

گُفت وشُنُود : بات چیت (گُفت : بولنا۔ شُنُود : سُننا) گُفت وشُنید۔

گُلاب پاش : وہ صُراحی نُما ظرف، جس میں عرقِ گلاب بھر کر چھڑکتے ہیں۔ اسے ''گُلاب افشاں'' بھی کہتے ہیں۔

گُلابی شیشۂ مے سے چھوٹا جام، مینا، بوتل نُما ظرف، جس میں شراب اور گُلاب رکھتے تھے۔

گُل اَندام پھول جیسا نازک بدن، گُل بَدن۔ (کلمۂ صفت)

گُل بَدن ایک قسم کا باریک ریشمی کپڑا، جس سے تنگ موہری کا پائجامہ اور زانو پوش بنایا جاتا تھا۔

گُل تکیہ چھوٹا سا نرم و نازک تکیہ جسے کروٹ لیتے وقت گالوں کے نیچے رکھا جاتا تھا۔

گُلستانِ اِرم : وہ باغ جو شداد ابنِ عاد نے بنوایا تھا۔ اُس کا تعلق قومِ عاد سے تھا۔ میر امّن نے ایک مُلک قرار دیا ہے۔

گُل عِذار : گُلابی گالوں والا، جس کے رُخسار گُلاب کے پھول جیسے ہوں۔ (کلمۂ صِفت)

گِلکرسٹ : جان بارتھوِک گلکرسٹ (۱۷۵۹ء۔۱۸۴۱ء) اسسٹنٹ سرجن حیوانات، پروفیسر شعبہ ہندوستانی فورٹ ولیم کالج کلکتہ۔

گُل گُلاب : ایک قسم کی خوشبودار شراب۔

گُلگُلے : چینی (یا شکر) ملے پتلے آٹے کو گھی میں تل کر تیار کیے جاتے ہیں۔ بعد از عصر چائے کے ساتھ کھائے جاتے ہیں۔

گلیارا : گلی، کوچہ، گھروں کے بیچ کا درمیانی راستہ جس میں سے عام و خاص گزریں۔

گُماشتہ : معاملاتِ لین دین سے متعلق کارندہ، ایجنٹ، کار پرداز، مُنیم۔

ع آگے گُماشتوں کے کُھلی ہر طرف بہی (نظیر)

گُمت : یکجا، سنگ (ایک گُمت رہیں : یکجا رہیں)

گُنبذ : بُرج، گول چَھت جس میں آواز گونجتی ہے۔ عام طور پر مساجد یا مقابر کی چھت ایسی ہوتی ہے۔

گنجِ قارون : بہت بڑا خزانہ (لفظی معنی: قارون کا خزانہ) قارون، حضرت مُوسیٰؑ کا چچازاد بھائی تھا۔ بہت دولت مند۔ قصّوں میں اس قدر مبالغہ کیا گیا ہے کہ اُس کے خزانوں کی چابیاں چالیس اونٹوں پر لے کر چلتے تھے۔ روایت ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی بد دُعا سے مع خزانوں کے زمین میں دھنس گیا۔

گنجیا : گاڑی بان یا گھسیارے کے اوزاروں کا تھیلا (جامع اللغات)

گُنی : ہُنر مند، چتُر۔ ع کیا نر سے ملے کے ناریاں کیا گوڑھ کیا گُنی (نظیر)

گنگا : ایک دریا جو گنگوتری میں سے نکلتا اور خلیج بنگالہ میں گرتا ہے۔ ہندو اسے مُقدس دریا سمجھتے ہیں۔ لمبائی ۱۶۸۰ میل ہے۔

گوٹا کِناری : گوٹا : چاندی، سونے ریشم کے تاروں سے بنا ہُوا کم عرض فیتا۔ کِناری بھی وہی چیز، البتہ گوٹے سے ذرا چوڑی ہوتی ہے۔ اکثر زری کے گوٹے اور کناری کو ''گوٹا کِناری'' کہا جاتا ہے۔ گوٹے کِناری کے ملبوسات ملکہ نُور جہاں سے منسوب ہیں۔

ع کُچیں تصویر سی، جن پر لگا گوٹا کِناری ہے (نظیر)

گور : قبر، لحد، وہ گڑھا، جس میں مُردے کو دفن کرتے ہیں۔

گورستان : قبرستان۔

گوش پیچ : ایک آرائشی زیور جو زنانہ پگڑیوں میں سجایا جاتا تھا۔ ''باغ و بہار'' میں گوش پیچ لگی پگڑی خواجہ سرا نے پہن رکھی ہے۔

گوشمالی : تنبیہہ، تادیب (دینا، ہونا کے ساتھ)

گوکھرُو : مقیش وغیرہ کا تکھونٹا موڑا ہُوا گوٹا، جو دوپٹہ وغیرہ پر لگتا ہے۔ (جامع اللغات) یہاں وغیرہ کی وضاحت نہیں کی گئی۔ واضح رہے کہ دوپٹے کے علاوہ انگیا کے کناروں پر لگتا ہے۔

ع نہ توئی ہے نہ کناری نہ گوکھرُو تِس پر (نظیر)

گولی : لمبوترا امٹکا، ''پان رکھنے کی بڑی ٹھلیا۔'' (آصفیہ)

گون : بوری۔

گویائی : بول چال، بات چیت۔

گھاٹ : پایاب رستہ، ندی یا دریا میں اُترنے کا وہ مقام جہاں پانی کم ہو۔

گھاٹ باٹ: گھاٹ : پایاب مقام۔ باٹ : رستہ۔

گھالنا : تباہ و برباد کرنا۔ (گھر گھالنا کی ترکیب سے لکھا جاتا ہے۔)

گھاو : گہرا زخم۔ مُرّوج نُسخوں میں گھاوں (گھاو کی جمع) درج ہے۔

گھر سیتا ہے : گھر میں پڑا رہتا ہے، گھر گُھسنا۔ (مُرغی کے انڈے سینے کی نسبت سے)۔

گھر کا دِیا نہ دِیا : گھر میں روشنی کے لیے مٹی کا چراغ تک نہ دیا۔ مُراد : بیٹا (اولادِ نرینہ)

گھر گھالا : گھر تباہ کیا۔

گھر میں رہے نہ تیرتھ گئے، مُونڈ مُنڈا فضیحت بھئے : (مثل) حاصل وصول کچھ نہیں، مُفت کی رُسوائی ہاتھ لگی۔

گھُڑک کر : بگڑ کر، طیش میں آ کر۔ گھُڑ (ہندی) آواز سے ڈرانا۔

گھُڑ چڑھی : گھوڑے کی سواری کا ماہر / کی ماہر۔

گھما گھم : گہما گہمی، چہل پہل، لوگوں کی کثرت۔

گُھمنڈنا : بادلوں کا چھا جانا، بادلوں کا جمگھٹا۔ برسے ہے مینہ جھڑا جھڑ، بادل گُھمنڈ رہے ہیں (نظیر)

گھوری : سخت گیری۔

گہوارہ : پالنا، جُھولا، پنگوڑا۔

گیدی : لالچی، بے حیا (''گید'': چیل کی نسبت سے)

گیر وابَستَر : گیروے رنگ کا دَرویشانہ لباس، جسے سادھو، سَنت، سنیاسی پہنتے ہیں (بَستَر (ہندی) لباس۔ گیروا : اُونٹ کی رنگت کا)

ل

لاحق : لگی (فکر لاحق ہوئی : فکر لگی)

لادعوےٰ : دَست برداری کی تحریر۔

لاڈ : بچّے کے انداز میں پیار۔

لاشریک : جس کا کوئی شریک نہیں (نہ اُس سے کوئی، نہ وُہ کسی سے) یعنی اللہ۔

لال کردیے : خُون میں نہلادیے۔

لبالَب : کناروں تک بھری۔

لَبِ فرش : فرش کا کنارہ۔

لَپ : وہ مِقدار، جو ایک ہتھیلی پر آجائے۔ (لَپ بھر: مُٹھی بھر)

لتّا : چیتھڑا، پُرانے کپڑے کا ٹکڑا۔

لَترا : چُغل خور، دفع دُور کیا ہُوا، چاپلُوس۔

لٹک : نازو ادا۔ چلنے، بولنے یا گانے کا انداز (جامع اللغات)

لچکا : ہلکی پُھلکی کشتی، بجرا۔

لحاظ میں رکھا ہوگا : (اِس بات کا) خیال رکھا ہوگا (کہ زبان پر غلط اثرات مرتب نہ ہوں)

لَخلَخہ : عنبر، مُشک، عُود اور کافُور کو ملا کر تیار کردہ لُگدی، جسے اطبّاء دماغ کی تقویت کے لیے سنگھاتے تھے۔ (یہاں لخلخے کی لُگدی کو جلا کر خوشبو پیدا کی جارہی ہے) یاد رہے کہ ''لخلخہ'' اُس ظرف کو بھی کہتے ہیں، جس میں یہ لُگدی جلائی جائے۔

لُڑھ گئے : لُڑھک گئے۔

لُقمان : ایک مشہور دانشور۔ بعض روایات کے مطابق لُقمان عاد ثانیہ کی نسل سے خالص عرب نژاد بادشاہ تھا۔ بعض مُصنفین لُقمان کو حضرت داوٴدؑ کا وزیر، بعض باعور کا بیٹا اور بعض حبشی غلام بتاتے ہیں۔ کچھ مُفسرین نے لُقمان کو نبی بھی قرار دیا ہے۔ یہ طے ہے کہ زانی کو سنگسار کرنے اور چور کا ہاتھ کاٹنے کی سزا لقمان نے تجویز کی تھی۔ لُقمان کا ذکر قرآنِ پاک میں بھی آیا ہے۔ لُقمان نے اپنے بیٹے کو جو نصیحتیں کی تھیں، وہ سورۃ لقمان میں درج ہیں۔

لگا : لاگ، پریم، پیار، اُلفت، آشنائی، ربط، راہ و رسم۔ (کِسو سے کوئی لگا تو نہیں لگایا : کسی سے آشنائی تو نہیں پیدا کر لی۔

کیونکہ خیرات لگائیں ہم لگا
کہ فرشتے کا واں لگاوٴ نہیں

لنبا : لمبا کا قدیم اِملا۔

لنگوت : لمبی کشتی۔ LONG BOAT کا موٴرّد رُوپ۔

لن ترانی والا : خودستائی کرنے والا، بڑے بول بولنے والا۔ لغوی معنی ہیں : ''تُم ہمیں نہ دیکھ پاوٴ گے''۔ یہ جواب اللہ نے موسیٰؑ کو اُس وقت دیا جب اُنھوں نے دیدار کی خواہش کا اظہار کیا۔ لیکن اردو محاورہ میں اس کے معنی بدل گئے۔

لنگ : طرف، جانب، ضلع۔

لنگوی : لگن، تغاری، پرات۔ ایسا کُھلا بڑی تھالی نما ظرف، جس میں لنگر کا کھانا بانٹا جاتا ہے۔

لوازمہ : ضروری سامان، اسباب۔ لازِم کی جمع لوازم ہے اور جمع الجمع لوازمات، جب کہ میر امّن نے لوازمات کی جگہ ''سب لوازمہ'' لکھا ہے۔

لوازمِ شاہانہ سے تیار ہے : شاہی محلات سے مخصوص ساز و سامان موجود ہے۔

لِوا لائے : لے آئے، منگوا لائے۔

لوبھ : لالچ، حرص، طمع، بے صبری۔

ع بے صبر و قناعت ساتھ میاں، سب چھوڑ یہ باتیں لوبھ بھری (نظیر)

لوتھ : لاش، تنِ مُردہ۔

لوٹ پوٹ رہنا : فقیرانہ بے نیازی سے سو رہنا۔

لوزیات لوز (بادام) کی جمع۔ بادام سے تیار کردہ مُثلثی وضع کی مٹھائی۔

لونڈئی : لونڈی کا قدیم املا اور تلفظ۔

لُون : نمک۔

لہر : گوٹے یا لچکہ وغیرہ کی لہردار ٹنکائی، جو رضائی یا دوپٹوں پر کی جاتی ہے۔(آصفیہ۔ جامع اللغات)
کشیدے کی دھاری (جامع اللغات)

لہو نے جوش کیا دل میں محبت جاگی۔

لے اُبھرا : لے بھاگا۔

لَیل و نہار شب و روز (لَیل: رات، شب۔ نہار: دن، روز) مُراد تمام عُمر۔

لیلیٰ : مجنوں کی معشوقہ، جو عامر کی بیٹی تھی۔ پہلی صدی ہجری بہ مطابق ۶۲۲ء میں ہوئی ہے۔

م

ماتم سرا : وہ جگہ (یا گھر) جہاں کسی کے غم میں سینہ کوبی کی جائے، ماتم کدہ۔ (ماتم (عربی) : سوگ، غم، رنج)

ماجائی : بہن، ہمشیرہ۔

ماچین : چینی تاتار، سلطنتِ چین۔ سنسکرت میں ''مہا چین'' بولا جاتا ہے۔

ماخوذ نہ ہوئیں گے : پکڑ میں نہ آئیں گے۔

مادیان : گھوڑی، گدھی۔ مادین (فارسی) : مادہ۔

ماس کا سالن: گوشت کا سالن۔ ہندوانہ زبان۔

ماما : عمر میں بڑوں کو عزت سے بُلانے کے حوالے سے میر امّن نے یہ لفظ مختلف معنوں میں برتا ہے۔

مامی پنا : حمایت کرنا۔

مانجھ دھار میں : منجھدھار میں، بیچ دریا میں۔ مَنجھ (ہندی۔ صفت) درمیان۔ دلّی والے ''مانجھ دھار'' تادیر لکھتے رہے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے بھی ''منجھدھار'' کو ہمیشہ ''مانجھ دھار'' لکھا۔

ماندگی : تھکن۔

ماٹدی : (طبیعت) خراب ہوئی۔

مانُس : آدمی، آدم زاد۔

مان مَہت : تکریم، عزّت، احترام۔

ماہیت : وجہ، سبب، حقیقت۔

مبادا : اللہ نہ کرے، خُدا نہ خواستہ (کلمۂ دعائیہ)

مُباف : رنگ دار کپڑے کی دَھجی، جسے لڑکیاں سر کے بالوں کو گوندھ کر چوٹی میں باندھ لیتی ہیں۔

ے زریں مُباف کا بھی دکھانا کمر کو موڑ
لمبی کو اسپ شوق کے اک تازیانہ تھا (نظیر)

مُبلغ : روپیہ کی رقم، عدد (اردو میں بضم میم وبکسر لام مُستعمل ہے جب کہ عَربی میں "مَبلَغ" ہے میم اور لام پر زبر کے ساتھ۔)

مَت : عقل، نصیحت، فہم۔ پنجابی میں کہا جاتا ہے: "مَت ماری گئی" یعنی عقل فہم جاتی رہی۔ ع مَت کی سُنی سے من لگا، سُکھ چین ہے جی کے تئیں (نظیر)

مُتبنّیٰ کر کر : گود لے کر، کسی دوسرے کے بچّے کو اپنی اولاد سمجھ کر پال لینا۔

مُتعدّد : ایک سے زائد، کئی ایک۔

مُتعرض : دخل اندازی کرنے والا، روکنے والا، مانع، مزاحم۔ ("مُتعرض نہ ہو": مت اُلجھ۔ "کسی بات کے معترض نہ ہو": کسی بات میں دخل نہ دو۔)

مُتعہ شیعہ مذہب میں کچھ مدّت کے لیے عورت سے نکاح کر لینا۔ اُن کے ہاں ایسے عارضی نکاح کو قانونی وشرعی اعتبار حاصل ہے، گو ہندوستان، پاکستان میں یہ عارضی نکاح کی صورت اب ختم ہوگئی۔

مُتعیّن : مُقررہ۔

مُتعیّنہ : مُقرر کیا گیا۔

مُتکلّم ہوا : بولا۔ مُتکلّم (عربی): بولنے والا، بات کرنے والا۔

مُتنجن پلاؤ : میٹھا پلاؤ، جس میں لیموں کی تُرشی بھی شامل کر دی جاتی ہے۔

مُتَنَفِّس : سانس لینے والا، جاندار۔

مُتَوَطِّن : باشِندہ۔

مَٹھ : کھوہ، ہندو جوگیوں کے رہنے کی جگہ۔

مِٹّی ڈالنا : پردہ پوشی کرنا، چھپانا۔

مِٹّی کی مُورتیں: اِنسان۔

مِٹیا : حمال، بوجھ اُٹھانے والا مزدور۔

مِثقال : ایک مثقال : ساڑھے چار ماشے کا وزن۔

مجذوب : اللہ کی محبت میں غرق، بظاہر دیوانہ مست (عالمِ جذب میں درویش)

مُجرا شاہانہ : شاہی آداب کے ساتھ کورنش، تسلیمات۔ مُجرا (عربی) ادب سے سلام کرنا۔

مُجرائی دربار ی، مصاحب، سلام کرنے والا۔

مُجرے گاہ : بادشاہوں کے دربار میں وہ جگہ جہاں لوگ کھڑے ہو کر مُجرا عرض کرتے تھے۔ (جامع اللغات)

مجنوں : قیس عامری کا لقب، لیلیٰ بنتِ عامر کا دیوانہ۔

مُجھ کچھ کام نہیں : مُجھے کچھ کام نہیں۔

مُحاورے سے : (اہلِ دِلّی کی) بول چال کے مُطابق۔

محبُوس : مُلزم، جسے حوالات میں رکھا گیا ہو، حوالاتی۔

محبُوس خانہ : حوالات (مُلزم، جب تک مُجرم ثابت نہ ہو، حوالاتی کہلاتا ہے اور اُسے جہاں رکھا جاتا ہے اُسے حوالات کہتے ہیں، قید خانہ یا جیل نہیں)

محرَم : واقِف، ہمراز (محرَم نہ ہوگا : نہ جان پائے گا)

مُحصّل : چنگی یا تحصیل کا کارندہ۔

محظُوظ ہونا : لُطف اندوز ہونا۔ حظ (عربی) لُطف، خوشی۔

مُخلی : خواجہ سرا (تفصیلات کے لیے دیکھیے: ''خواجہ سرا'')

محمد شاہ : بن فریدالدین، شہنشاہِ دہلی، خاندان سادات سے تھا۔ ۱۴۳۴ء میں تخت نشیں ہُوا۔

محمُودی : ایک قسم کی باریک مَلمل۔

محنت : دُکھ، تکلیف۔(محنت اٹھانا : تکلیف اُٹھانا۔محنت نیگ لگی : محنت ٹھکانے لگی)

مُختارکار : سربراہِ کار، مُہتمم، انتظامی امُور میں بااختیار اَفسر۔

مخطوب : منگیتر، منسُوب۔

مُخفی : چُھپی ہوئی، چُھپاہُوا، پوشیدہ۔

مُخل : حارج، خلل ڈالنے والا/والی۔

مُخلصی : نجات، چُھٹکارا۔(مُخلصی کی صورت نظر نہیں آتی : نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی)

مَخملِ کاشانی : کاشان (ایران) کی بنی ہوئی نفیس مَخمل۔مخمل (عربی) ایسا کپڑا، جس کی ایک طرف نہایت نرم اور رُوئیں دار ہوتی ہے۔اِس سے پائجامے بھی تیار کیے جاتے تھے۔

مَدارُالمُہام : مُختارُالمُلک، وہ شخص، جو امورِ سلطنت میں مرکزی حیثیت کا حامل ہو۔

ع خُدا جہاں کا اگر اِس صنم کو کبھی مدارالمُہام کرتا (نظیر)

مددِ مُعاش : پرورش کا وسیلہ، وہ جاگیر، جو حکومتِ وقت کی جانب سے بطورِ علم پروری علماء کے لیے وقف کردی جائے۔

مدرَسہ : فورٹ ولیم کالج، کلکتہ۔

مُدعی : حریف، مُخالف۔

مذکور : ذکر کیا گیا، بیان کیا گیا۔

مُرچھانا : غش آنا، بے ہوش ہونا۔

مردآدمی : جواں مرد۔

مردآدمیّت : بہادری، ملی انسانیت (انسانیت کے وصف میں زور پیدا کرنے کے لیے)

مردَک : حقیر آدمی، ادنیٰ آدمی۔مَرد کی تصغیر(جامع اللغات)

مردُمی : دلیری، انسانیت، مُروّت۔

مردُود : ردّ کیا گیا، ملعون، نابکار۔

مُرشدُاللہ : فقیروں کا کلمۂ خطاب: اللہ راہ نمائی کرنے والا ہے۔

مُرصّع کاتخت : ایسا تخت، جس میں جواہرات جڑے ہوں۔

مُرفہ : آسُودہ۔ (مُرفہ الحال : آسودہ حال، خوش حال)

مَرکب : کوئی جانور، جس پر سواری کی جاسکے۔ (مُراد : گھوڑا)

مُرکبِ زِسہو وخطا : آدمی غلطی کا پُتلا ہے، بھُول چوک انسان کی فِطرت میں ہے۔

مَرکب کوڈَپٹ کر : سَواری (گھوڑے) کو تیز دوڑا کر۔

ہرگ چھالا : ہرن کی کھال، جس پر جوگی، عابد، درویش عبادت کرتے ہیں۔ (ہرگ : ہرن۔ چھالا۔ کھال)

ع اُٹھا تُونبی کو اور کاندھے کے اُوپر رکھ ہرگ چھالا (نظیر)

مَروارید : ایسی آتش بازی، جس میں سے موتیوں کی طرح کے ننھے ننھے شرارے پھُوٹتے ہیں۔

مُزاحم : رُکاوٹ ڈالنے والا۔

مُزاحم نہ ہو : اِسے نہ روکو۔

مُزاحم محصول کا نہ ہو : محصول کے لیے نہ روکا جائے۔

مزید کرو : دَسترخوان اُٹھادو۔

مُسَبِّبُ الاَسباب: کئی طرح کے سبب (ذریعے) پیدا کرنے والا۔ (یعنی اللہ تعالیٰ)

مسکہ : تازہ مکھن (جامع اللغات)

مسلسل جادو: مسلسل نام کا جادوگر۔ فارسی میں ناصر خسرو اور فردوسی نے ''جادو'' کا لفظ 'جادوگر' کے معنی میں برتا ہے دیکھئے ''فرہنگِ فارسی عمید''، ص:482

مسہری : ایسا پلنگ، جس کے پایوں کے ساتھ لوہے کے حلقے لگے ہوتے ہیں تا کہ مچھر دانی کے بانس پھنسائے جاسکیں۔ مسہری، مچھر دانی کے لیے بھی آیا ہے۔

مَسیں : جوانی کے آغاز میں مرد کے بالائی ہونٹ اور ناک کے درمیان پیدا ہونے والا رُواں۔

مَشائخ : بزرگ لوگ (شیخ کی جمع)

مُشرَّف : عزّت عطا کردہ، مُعزز۔

مُشرِف : میر مُنشی، افسرِ مال (آئینِ اکبری)

مُشقاب : بڑی قاب، بڑا طباق، چاول ڈالنے کا بڑا برتن (جامع اللغات)

مُشکل کٹھن : پیچیدہ مسئلہ، اُلجھاؤ والی بات (ایسے مُترادفات کا استعمال ''باغ و بہار'' میں کئی ایک مقامات

پر دیکھنے کو ملتا ہے۔)

مُشکیں باندھیں ہیں : دونوں بازوؤں کو پُشت کی جانب لے جا کر باندھ دیا ہے۔

مَشورت : مَشورہ، مُشاورت۔ مشورۃ (عربی) کی اردو صُورت۔

مُصاحِب : سَنگی ساتھی، ہم نشیں۔ جیسے چاند کے ساتھ ستارے۔

مُصاحبت : ساتھ رہنا۔

مُصَمَّم : پُختہ، پکّا، مُحکم، اُستوار۔

مصنُوع : بنایا گیا، خلق کیا گیا، مخلوق۔

مُضاعَف : دوچند، دُگنا۔

مُضایقہ : حرج، قباحت۔

مُطالعہ کی : پڑھی۔ مُطالعۃ (عربی) کتب بینی، غور، دھیان۔

مَطلع صاف ہُوا : سُتھرائی ہوگئی، ساری فوج نکل بھاگی۔ مَطلع (عربی) طلوع ہونے کی جگہ۔

مَعبُود اللہ : وہ (اللہ) جس کی عبادت کی جائے۔ (فقیروں کا کلمۂ خطاب۔)

مُعتَمَد : اعتبار یا بھروسے کے قابل۔

مُعلِّم : (۱) اُستاد (۲) جہاز کا کپتان، ملّاح (یہ لفظ میر امّن نے ان دو معنوں میں برتا ہے۔)

معمُور : لبریز، بھرا ہوا۔

مُعرّق : جگ مگ کرتی، سونے چاندی سے مُرصّع، جگمگاتی۔

مغزی : ایک قِسم کا حلوہ، جسے مغزیات (پستہ، بادام) ڈال کر بنایا جاتا ہے۔ ''نہایت سفید حلوہ'' (نُوراللغات)

مغفُور : بخشا گیا۔ مرحوم کے ساتھ بطور کلمۂ احترام آتا ہے۔

مُقابِل : رُوبرو ڈٹ کر کھڑا ہو جانے والا، مخالف۔

مقام کریں : ٹھہر جائیں، قیام کریں۔

مقام ہے : قافلے کی جائے قیام ہے۔ یہاں قافلہ تھم جائے گا، قیام کر کے آگے چلے گا۔

مُقتضا : تقاضا (مُقتضا عقل کا یہ ہے : دانشمندی کا تقاضا ہے کہ)

مَقدُور : حیثیت، قُدرت، بساط (بہ مقدور اپنے : بساط بھر) "باغ و بہار" میں یہ لفظ حیثیت کے معنوں میں بھی برتا گیا ہے (اِس مقدُور کو پہنچا : اِس حیثیت کو پہنچا)

مُقرّب : قریب کیا گیا شخص، مصاحب۔

مُقرّر : بلا شک وشُبہ، یقیناً۔

مُقطّع : سجاہُوا، آراستہ کیا گیا۔

مُقلِّب القلوب: دِلوں کو بدلنے والا (یعنی اللہ تعالیٰ)

مُقیش : سونے یا چاندی کا چپٹا باریک تار (جسے "بادلہ" بھی کہا جاتا ہے۔) سے بُنا گیا کپڑا۔

مُقیشی : ایک قسم کا باریک گوکھرُو، جو صرف تاروں کو موڑ کر بنایا جاتا ہے۔ (جامع اللغات) مُقیش کا بناہُوا گوٹا۔

مکان : مقام، موقع محل۔ ع نہ آہ کا مکاں ہے نہ رونے کی اَب ہے جا (نظیر)

مکر چکر : حیلہ بہانہ، دھوکا دھڑی۔ مکر (عربی) حیلہ، فریب۔

مُکلّف : آراستہ، پُر تکلف۔

مگن : مُطمئن، پُر باش۔

مُل : انگوری شراب (جامع اللغات)

ملازمت حاصل کرنا : خِدمت میں حاضری کا حصول۔

ملازمت حاصل ہوئی : خدمت میں حاضری کا موقع مِلا۔

ملازمت کے اشتیاق نے : خدمت میں حاضری کے شوق نے۔

مَلاگیر کا ٹیکا : مَلاگیر پہاڑی سلسلے سے حاصل کردہ اعلیٰ درجے کا صندل، جس کا ماتھے پر ٹیکا لگایا جاتا تھا۔ مَلاگیری : صندلی رنگ سے مِلتا جُلتا رنگ۔

مَلغُوبہ : کھانے کی ایک قسم، جس میں ماش کی دال کو دَہی مِلا کر پکایا جاتا ہے۔

مَلک التُّجار : بڑا تاجر۔ مَلِک (عربی) بادشاہ۔ تُجار : تاجر کی جمع۔

مَلک المَوت : مَوت کا فرشتہ، عزرائیل۔

مُلک گیری : مُلک فتح کرنا اور انتظام سنبھالنا۔

مَلِین : غمگین، مَلُول، اُداس۔

مَملکت : سلطنت، حکومت۔

مَملُوک : زرخرید غلام۔

مَنتری : وزیر۔

مِنّت دار : احسان مند، ممنونِ احسان۔ مِنّت (عربی) : احسان۔ (مِنّت دار ہوئے : ممنونِ احسان ہوئے)

مَندا : ماند پڑ جانا، ختم ہو جانا، کاروبار میں نقصان ہو جانا۔

مِندِیل : سر کا رُومال، لُنگی (جامع اللغات)

مَنڈا تخت : بے پردہ، چپاتی کی طرح کی پالکی۔

منڈل : مَندِر، دیوی یا دیوتاؤں کا اُستھان (یہاں وہی مَندِر مُراد ہے، جس میں وہ پَنڈِ یاین موجود تھی۔)

ع اس منڈل اُونچے گُمت میں جو دیبی آپ براجت ہیں (نظیر)

منڈپ : منڈھوا۔ وہ چھوٹا مندر یا ''منڈھوا'' جہاں مذہبی تقریب کا اہتمام کیا جائے۔

منسُوب : منگنی، نِسبت۔

مَنشا : سبب

منصِب : مرتبہ، عُہدہ۔

منصِب دار قدیمی بادشاہ کی جانب سے نسل در نسل وظیفہ خوار۔

مُنکِر پاک ہُوئے : اپنی بے گناہی کا اظہار کرنے لگے، صاف مُکر نے لگے۔

منگل کوٹی : مَنگل کوٹ شہر (بھارت) کا بُنا ہُوا قالین۔

مُنہہ کی نرم : وہ گھوڑی جو لگام کے جھٹکے نہ سہہ سکے۔

مُنہہ میں کے دانت ہیں : تُم کون ہو؟ کیا طاقت ہے؟ کیا کر سکتے ہو؟

مُوا جاتا ہے : مَرا جاتا ہے۔ مُوا (ہندی) مر گیا۔

مور پنکھی : مور کی شکل کی کشتی۔

مولا مُشکِل کُشا : حضرت علیؓ کا لقب۔ وہ مالِک جو مُشکلات دُور کر دیتا ہے۔

مُونگے کے درخت مُونگا : ایک سمندری کیڑا۔ یہ کیڑا سمندر کے اندر رہتے ہوئے اپنے پیٹ سے خارج کردہ لُعاب دار مادے سے ''مرجان'' کے تہہ در تہہ گھر بناتا چلا جاتا ہے۔ بحر اوقیانوس میں بہت سے جزائر مونگے کے تہہ در تہہ گھروں پر مشتمل ہیں۔ مُونگے کے درخت کو نباتات و سنگ کے درمیان خیال کیا جاتا ہے لیکن اُس سے حاصل کردہ سُرخ رنگ کا مُونگا یعنی ''مرجان'' از حد قیمتی جواہر میں شمار کیا جاتا ہے۔ اُس کے دانے زیورات میں نگ کے طور پر جڑے جاتے ہیں۔ ع مُکھ پان، گلے موتی مالا اور مُونگا، سونا بھی اکثر (نظیر)

مُونہا مُونہہ : لبالب۔

مَونی : وہ ہندو فقیر جو چُپ کا روزہ رکھے ہُوئے ہو۔

موئی مٹّی کی نِشانی : مرحوم یا مرحومہ کی نِشانی۔

مہادیو : ہندوؤں کے دیوتا ''شِو جی'' کا ایک نام (مہا : بڑا)

مہت : دُلار، لاڈ (مان مہت : عزت احترام)

مہتابی : آتش بازی کی ایک قسم، وہ چبوترا جہاں چاندنی کے نظارہ کرنے کو بیٹھا جائے۔

مِہتر : سب سے بڑا سردار (مہ: بڑا۔ تر: کلمہ تفضیل) یہاں حضرت سلیمانؑ مُراد ہیں۔ حضرت یوسفؑ کے نام کے ساتھ تعظیماً آتا ہے۔ مہتر (اردو) بھنگی۔

بھٹیاریاں کہاویں نہ اب کیوں کہ رانیاں
مہتر خصم ہیں اُن کے، وہ ہیں مہترانیاں (نظیر)

مَہدِ زرّیں : سُنہرا پالنا، سُنہری جُھولا۔ (مَہد: جُھولا)

مِہر : محبت۔

مُہر : اشرفی، سونے کا سِکّہ۔ ع مُہریں بڑی گھڑائیں، سکّہ بڑا بنایا (نظیر)

مہربانگی : مہربانی، عنایت۔ (میر امّن نے اکثر لُغت پر روزمرہ کو ترجیح دی ہے)

مہر کر : جُھک کر، ادب سے خمیدہ ہو کر۔

مہمانیاں : دعوتیں، مہمان داریاں۔

مہمان کی شرط تین دن تلک ہے : یہ کہاوت مشہور ہے کہ تین دن تک مہمان، اُس کے بعد وبالِ جان۔

مَہنت : جوگیوں کا سردار، مندر کا نگران۔

مہُورت : سعد گھڑی، علمِ نجوم کے مطابق کسی کام کے کرنے کا مُبارک اور مسعود وقت (ہندی شبد ساگر)

ع جاسے کارج سِدھ ہوں ۔ سدا مہورت لائے (نظیر)

مُہیب : خوف ناک، ہَیبت ناک۔

میاں اللہ : لفظی معنی : اللہ مالک ہے (فقیروں کا کلمۂ خطاب)

میانجی : دلاّل، بیچ کا آدمی۔

میانے : میانہ (پالکی، ڈولی) کی جمع۔ مثلِ مُحافہ، پالکی طرز کی سواریاں۔

ع میانہ، محافہ اور وہ چنڈول بگھیاں (نظیر)

میتا : کاسۂ گدائی۔

میر بحر : ایڈمرل، بحری فوج کا سپہ سالار۔

میر بخشی : اکاؤنٹنٹ جنرل، حکومت کا ایک اعلیٰ عہدہ دار، جو اکاؤنٹس کا ناظمِ اعلیٰ ہوتا تھا۔

میر شِکار : شکار کھیلنے کے لیے مخصوص جنگلات میں موجود چرند پرند کی دیکھ بھال کے محکمے کا ناظمِ اعلیٰ۔

میر عمارت : چیف انجینئر، جس کے ذمہ شاہی عمارات کی تعمیر اور دیکھ بھال کا کام ہوتا تھا۔

میرے تئیں : مُجھے۔

مَیمُوں: بَندر، بُوزنہ۔

مَینڈکی کو بھی زُکام ہُوا : (مثل) اپنی حد سے بڑھ کر شیخی بگھارنا (طنزاً کہا جاتا ہے)

میوڑا : میوات کے علاقے کا رہائشی ملازم، میواتی۔ یہ لوگ اپنی بہادری اور جانفشانی کے لیے مشہور ہیں۔ لیکن یہاں اسمِ تصغیر کے طور پر تذلیل کرنے کو کم تر جان کر کہا گیا ہے۔

ن

ناتھ: نکیل۔ جس سے ناک کا زخم کھلا رہے۔ نتھ (پنجابی) بَیل کی ناک چھید کر اُسے بس میں کرنے کے لیے ڈالتے ہیں۔

ناچایا : ''نچایا'' کا قدیم اِملا۔

ناحق شِناسی : بلا وجہ ظلم زیادتی، ناانصافی۔

ناخدا : ملاّح، کشتی چلانے والا۔

ناخن لیے : ناخن تراشے۔

ناس : فنا، خاتمہ۔

ناشُدنی : کم نصیب، بدقسمت۔

نافرمان : نیلے رنگ کا ایک پھول۔ گلِ لالہ کی ایک قسم (ہندی شبد ساگر)

ع نیلوفر و نافرمان ہے رُوپ کنہیا کا (نظیر)

نافرمانی : گُل نافرمان کے رنگ کا۔

نافِ شہر: شہر کا مرکزی حصّہ، شہر کا وسط۔

ناکتخدا : بن بیاہا، بن بیاہی، غیر شادی شُدہ۔

نائند : گھوڑے کا سوا برس سے اڑھائی برس تک کی عمر کا بچھیرا، جس کے دُودھ کے دانت ابھی نہ ٹوٹے ہوں۔ ع نائند بچھیرے کو، دچکے اب اور دولتی مت چھاٹو (نظیر)

ناگاہ : یکا یک، اچانک۔

نام آوری : شُہرت۔

نام نہاد : میر امّن نے 'نہاد' کا لفظ نام ور فیملی کے، معنوں میں برتا ہے۔

نامچہ : روزنامچہ، چھوٹی ڈائری۔

نانِ نعمت : لذیذ روغنی روٹی۔ ''بڑی لذیذ نعمت'' (نُوراللغات) ''بڑی نعمت۔ لذیذ نعمت'' (جامع اللغات)

ناوَک : تیر، خدنگ، بان۔ (''ناوہ'' کی تصغیر)۔

نپٹ : بہت، بالکل، مکمل، محض۔ ع تندرستی کو نپٹ فضلِ الٰہی بُوجھے (نظیر)

نتھ چُوڑی سہاگ کی سلامت رہے : دُعائیہ، خاوند جیتا رہے، سہاگن رہے۔

نَٹ کھٹ : شوخ، ہَٹ دھرم ۔ ع نَٹ کھٹ، اُچکا، چور، دغاباز، گٹھ کٹا (نظیر)

نجس العَین: وہ، جس کو چھُونا، کھانا، پینا ناجائز ہو۔ (''باغ و بہار'' میں کُتّے کے لیے آیا ہے)

نجھا کر : غور سے (دیکھ کر)، غور سے ملاحظہ کرکر (جامع اللغات)

نجیبوں : نجیب (عربی): شریف کی جمع ۔ مُراد: شُرفاء۔

نخرے : ناز، غمزہ، عشوہ کی جمع۔

نِدان : بعد میں، پیچھے۔ ع نِدان آ کے وہ میرے گلے کا ہار ہُوا (نظیر)

نِدھڑک : بے خوفی سے، بے دھڑک، بلا خوف و خطر۔

نَرسِنگا : بیل کے سینگ کو اندر سے کھوکھلا کر کے اُس کا بگل بنانا۔ تانبے یا کسی دوسری دھات کا بھی بنایا جاتا ہے۔ ع آنند بدھاوے، باج رہے نرسنگے، سرنا اور تُرئی (نظیر)

نَرگاوٗ : بَیل۔

نَرگس دان : گُلدان، جس میں نرگس کے پُھول رکھے جائیں۔

نَرگسی: نرگسی قورمہ مُراد ہے۔ یعنی گوشت پکا کر اُس میں اُبلے ہوئے انڈوں کو کاٹ کر ڈال دیا جائے۔ کٹا ہُوا انڈا آنکھ (نرگس) سے مُشابہ ہوتا ہے، اس لیے یہ سالن ''نرگسی قورمہ'' یا ''نرگسی'' کہلاتا ہے۔

نِرے : پُورے، خالص ۔ ع وہ کان نِرے طوفان بھرے، کن پُھولوں بالے جان بَھرے (نظیر)

نَسَقچی : جلّاد۔

نِظام الدین اَولیاء : سُلطان المشائخ لقب، دہلی کے مشہور وَلی۔ امیر خُسرو دہلوی کے مُرشد۔ ان کا مرقد دہلی میں ہے اور ان کی پائنتی کی طرف امیر خسرو دفن ہیں۔

نعرہ بھرتا ہُوا چلا : نعرہ لگاتے ہُوئے چل پڑا۔

نعل بَندی: خِراج، وہ مقررہ رقم یا جنس، جسے بادشاہ کی خدمت میں سال بہ سال بطور نذرانے کے پیش کیا جائے۔

نُطفے میں خَلَل ہوگا : نسب میں خرابی ہوگی، ولد الزِنا، جس کے متعلق یہ نہ پتا ہو کہ کِس کے نُطفے سے ہے۔

نَفَروں : نَفَر (عربی) : سائیس کی جمع۔ مُراد : سائیسوں۔

نَقب : سُرنگ، وہ سُوراخ جو ایک مکان سے دُوسرے مکان میں لگایا جائے (جامع اللغات)

نُقرئی : چاندی کے، چاندی کی (نُقرہ : چاندی)

نقشِ کالحجر : اُس نقش کے مانند جو پتھر پر کندہ ہو۔ (دُرست محاورہ : ''کالنقشِ فی الحجر : پتھر کی لکیر کی طرح پائیدار؛ ہے۔'')

نکتہ رَس : دانا، بات کی تہہ تک پہنچ جانے والا۔

نِکٹ : نزدیک۔

نک گھِسنی : ناک رگڑنا، سجدۂ شکر۔ (عاجزی کا پہلو نمایاں ہے)

نک گھِسنی کی : ناک رگڑی، سجدۂ شکر کیا۔ (عاجزی اختیار کی)

نکھ : ناخن۔

نِکھٹُو : ناکارہ، نِکما، نہ کمانے والا۔

نکھ سِکھ سے دُرست : لفظی معنی پاؤں کے ناخن سے سَر کی چوٹی تک بے عیب، ناک نقشہ اچھا ہونا، حُسن کا نمونہ۔ (نکھ: ناخن۔ سِکھ: سر) اردو میں ''نک سِک سے درست'' بولتے ہیں۔

ع تصویر کا عالَم، نکھ سِکھ سے جَھب، تختی صاف پَری جیسی (نظیر)

نکیر منکَر : منکر نکیر۔ دو فرشتے، جو قبر میں مُردے سے سوال کریں گے کہ تیرا دِین کیا ہے۔ ''منکر نکیر'' کو ''نکیرین'' بھی کہا جاتا ہے۔ غالباً میر امّن کے زمانے میں ''نکیر منکر'' ہی کہا جاتا تھا، بعد میں یہ ترتیب تبدیل ہوگئی۔

نمازِ دوگانہ: دو رکعت نماز (نفل) یعنی نمازِ شکر (وہ نماز (دو نفل) جو کسی عنایتِ خداوندی کے شکریے میں ادا کی جائے (جامع اللغات)

نمدا : اُونی کپڑا، جو اُون کے ریشوں کو دَبا کر تیار کیا جاتا ہے، عام طور پر گھوڑوں کی پیٹھ پر زِین کے نیچے جاذِب کے طور پر ڈالا جاتا ہے۔

نمش : نمشک، دُودھ کو تھوڑی سی مِصری یا شکر کے ساتھ خُوب گاڑھا پکا کر موسمِ سرما میں رات کو اُوس میں رکھ دیتے ہیں اور صُبح اُسے اُچھال اُچھال کر جھاگ کی صُورت تیار کر لیتے ہیں۔ اُس جھاگ کے گولے اور قُلفیاں بنائی جاتی ہیں جو بچّے اور بڑے بطور آئس کریم کھاتے ہیں۔ دِلّی والے اسے ''دولت کی چاٹ'' کا نام دیتے ہیں۔ فارسی میں اس کا مکمل نام ''نمشک'' ہے۔ اُس کے نیچے کی کُھرچن کو نہایت لذیذ بتایا جاتا ہے۔

نم گیرا : وہ شامیانہ، جو اُوس کی نمی سے محفوظ رہنے کے لیے چارپائی پر تان دیتے ہیں۔

ع نمگیرے جھالر موتی کے، کمخواب مشجر جھلکائے (نظیر)

نمود ہُوا : ظاہر ہُوا۔ نمود (فارسی) ظاہر۔ آشکارہ۔

نمود ہُوئی : مشہور ہوئی، شہرت ملی۔

نمود ہوئے : ظاہر ہُوئے۔

ننگ وناموس: عزت وحُرمت، عصمت وعِفت (ننگ وناموس کو خیرباد کہنا : عزت کھودینا) ننگ ونام کے بھی یہی معنی ہیں۔

ننگیا لینا : چھین جھپٹ لینا، لُوٹ کھسُوٹ کر زبردستی ننگا کردینا، بہ زور سب کچھ رکھوالینا۔

ننگے مادرزاد : ننگ (ہندی) ننگا ہونا۔ مادرزاد (فارسی) پیدائشی۔ مُراد ایسے ننگے، جیسے پیدا ہی اِسی طرح ہوئے ہوں۔

نواڑا : چھوٹی تفریحی کشتی۔ ع بجرے وناؤ چپو، ڈونگے بنے نواڑے (نظیر)

نوبت : حالت۔

نوبت ہوچکی : باری ہوچکی، نقارہ بج چُکا۔

نوبت خانہ : نقار خانہ، شاہی محل سے مُلحق وہ جگہ، جہاں ڈھول دمامہ رکھے جاتے تھے۔ تقریبات کے موقع پر اعلان کرنے کو بجائے جاتے تھے۔

نوچندی جُمعرات: ہر چاند کی پہلی جُمعرات۔ لکھنؤ میں اس روز لوگ کربلا یا شاہ مینا کے دربار پر حاضری دیتے تھے۔ قمری مہینے کی پہلی جمعرات کو ''نوچندی'' کہتے ہیں۔

نوخرید : نیا نیا خرید کردہ۔

نُوربافی : کھڈی پر تیار کردہ اعلیٰ درجے کا سُوتی کپڑا۔

نورتن : نو طرح کے جواہرات۔ جواہرات کی نشاندہی میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ''جامع اللغات'' میں موتی، ہیرا، زمُرد، لعل، نیلم، پکھراج، مونگا، لاجورد اور گومید کے نام درج ہیں جب کہ ''ہندی شبد شاگر'' میں : موتی، فیروزہ، یاقوت، ہیرا، مونگا، لہسنیا، لعل، نیلم اور گومید کے نام ملتے ہیں۔ ع جھلک کسی کے ڈوپٹے میں نورتن کی سی (نظیر)

نُور کے وقت : صُبح صادق (''نور کے تڑکے'' بھی کہا جاتا ہے)

نُوروز : ایرانی سال کا پہلا دن، جب موسمِ بہار کے آغاز کے ساتھ قومی جشن کا آغاز ہوتا ہے اور کئی

روز تک جاری رہتا ہے۔ عموماً ۲۱ یا ۲۲ مارچ، جب آفتاب، بُرج حمل میں آتا ہے۔

نِوشت خواند : دستاویز کی تیاری، لکھا پڑھی۔

نِوشت خواند میں درست : پڑھنے لکھنے میں لائق۔

نوشِ جاں فرمادیں : پییں۔

نوشیرواں : خسرو اوّل بن قباد اوّل۔ ایران کے خاندانِ ساسانیہ کا بادشاہ، جو اپنے باپ کے بعد ۵۳۱ء میں تخت نشیں ہُوا۔ بغداد کا شہر اس نے آباد کیا جو شروع میں ''باغ داد'' اس لیے کہلایا وہاں نوشیرواں نے عدل و انصاف کیا۔ آرمینیا، یمن اور رُوم کا فاتح۔

نَول عطیہ، بَخشش (مُنجد) لیکن یہاں ''کرایہ'' مُراد ہے۔

نہار : صُبح، بغیر کچھ کھائے۔

نہایت کو : انجامِ کار۔

نہتھا : نہتا، خالی ہاتھ۔

نہُڑا : خَم کھایا، جُھکا۔

نہ کھانے کی سُدھ، نہ بَھلے بُرے کی بُدھ : نہ کھانے کا ہوش، نہ اپنے اچھے بُرے کی خبر، یعنی بے ہوش و حواس۔

نہوڑایا و جُھکایا، خمیدہ کیا۔

نہُڑ کر و جُھک کر، خم کھا کر۔

نیّرِ اعظم : سُورج، آفتاب۔ (''نیّرِ اَصغر'' چاند کو کہا جاتا ہے)۔ میر امّن یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ درجے میں سب سے برتر تھا، جیسے روشن ستاروں میں سُورج سب سے زیادہ رَوشن ہے۔

نیڑے : قریب، نزدیک۔

نیشاپُور : ایران کا ایک قدیم شہر۔ شیخ فریدالدین عطار اور عمر خیام کے مقابر اسی شہر میں ہیں۔

نیک اَندیش : نیک نِیّت۔

نیگ لگی : بار آور ہُوئی، کام بہ حُسن و خوبی اپنے انجام کو پہنچا۔

نیگ نہ لگی : ٹھکانے نہ لگی، کام نہ آئی۔

نیمروز : سیستان (ایران) کا علاقہ۔ ایک صُوبہ، جو مُلک فارستان (فارس) کے مشرق میں تھا اور

رُستم کو جاگیر میں مِلا تھا، کا ایک شہر۔ کابل بھی اُسی صُوبے کا ایک شہر ہے۔

نیمہ آستین: آدھی آستین کی باریک صدری، جو کُرتے کے اُوپر پہنتے تھے۔

ع اور تن میں نیمہ شبنم کا، ہو جس میں خس کا عطر (نظیر)

نیو : بُنیاد، جڑ، اَصل۔

نیہہ: (پنجابی۔ ہندی) محبت، پیار، چاہ (ہندی شبد ساگر)

ع جس گیان میں ہر سے نیہہ بڑھے، وہ گیان اُنھیں خوش آتا ہے (نظیر)

و

واتین : اُس کے ساتھ۔

وَاِلّا نہ : ورنہ، بہ صورتِ دیگر۔

واللہ اعلم: اللہ جانے (جامع اللغات)

وام : قرض، اُدھار۔

ورخرچی : فضول خرچی، اِسراف۔

ورغلانا : اُکسانا، بہکانا۔

ورغلانا ہے : بہکائے گا، اُکسائے گا۔

وَرق الخیال : بھنگ، حشیش (وَرق الخیال کا شربَت : چہار مغز کے ساتھ گُھٹی ہوئی بھنگ، جسے سندھی میں ''تھادل'' کہتے ہیں۔ یہاں ''تھادل'' ہی مُراد ہے۔)

وَسواس : اندیشہ، وسوَسہ، وہم۔

وُقوف : تمیز، شعور، آگہی، واقفیت۔

وکیلِ مُطلق : وہ اَمیر یا قاصِد جسے کوئی کام کرنے کا پُورا اختیار حاصل ہو۔

وِلایت : دُور دیس۔ (یہاں ایران مُراد ہے۔)

ولی نعمت : پرورش کرنے والا، مُربّی۔

وو : وہ (''وہ'' کی قدیم اِملائی صورت)

ووہی : وہی۔

دونہیں : وہیں۔(اب متروک ہے) اُسی لمحے۔

ع اورشیرنی نے لی نجف اشرف کی دونہیں راہ (نظیر)

دہیں : اُسی لمحے۔ ع آوے جورات کوتو نکالے دہیں اُسے (نظیر)

دے : دہ کا قدیم اِملاوتلفظ۔

دنچھنا : کھال اُدھیڑنا۔

ہ

ہاتھ جھاڑنا : غصّے سے ہاتھ کو جھٹکا دے کراُٹھانا، ہاتھ اُٹھانا (مارنے کو)۔

ہاتھ چھوڑنا : ضرب لگانا، حملہ کرنا، وار کرنا، تلوار لگانا (جامع اللغات)

ہادی : رہبر، راہنما، پیشوا، مُرشد۔''یاہادی اللہ'' درویشوں کا ایک نعرہ کہ اے اللہ ہمارا راہنما بن۔

ہانکے پُکارے : علی الاعلان، ببانگِ دُہل، سب کے سامنے۔

ہاں ناںھ فیصلہ نہ کر پانا، اقرار یا انکار، کچھ واضح نہ ہو۔

ہِبَہ نامہ : وہ دستاویز، جس میں کسی شخص یا جماعت کو زمین یا جائیداد بخش دینے کی شرائط لکھی جائیں۔

ہتھ پُھول : آتش بازی کی ایک قسم یعنی پُھل جھڑی۔ اُسے لکڑی کے سہارے پکڑ کر آگ دکھائی جاتی ہے اور اُسے ہوا میں جس قدر لہرایا جائے اُسی قدر بہتر چُھٹتی ہے۔

ع اور چاہو تم ہمارا یہ ہتھ پُھول چھوڑلو (نظیر)

ہدایا : ہدِیَہ کی جمع : نذرانے کا سامان۔

ہَرج مرج اُٹھانا : شورش مچانا، دنگا کرنا۔

ہَرج مرج کھینچتا ہُوا : تکالیف برداشت کرتا ہُوا۔

ہرچہ باداباد : جو ہونا ہے سو ہو، پروا نہیں، چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

ہرگز : ذرا بھی، قطعاً (ہرگز اِطلاع نہیں : قطعاً معلوم نہیں)

ہرنا : زین یا کاٹھی کا اگلا اُبھرا ہُوا حصّہ، جس میں گھڑسوار کوئی چیز لٹکا سکتا ہے۔

ہریسا : دال کا کھچڑا، جو گیہوں کے آٹے کو گوشت کی یخنی اور دُودھ میں مِلا کر پکاتے ہیں۔

ہزاری بزاری : اعلیٰ وادنیٰ لوگ، مال دار اور مُفلس لوگ۔

ہڑبڑانا : گھبرانا، بوکھلانا، مُضطرب ہونا (جامع اللغات)

ع پڑ جائے جس سے دِل میں فرشتوں کے ہڑبڑی (نظیر)

ہفت اِقلیم : اِقلیم بہ معنی مُلک۔ ہفت اِقلیم سے مُراد ہے پُوری دنیا۔ قدیم وقتوں میں دُنیا، کُل سات ممالک پر مُشتمل تھی : عرب، ایران، تُوران، ہند، چین، مصر اور یونان۔ یہاں ''پادشاہِ ہفت اِقلیم'' اِن ساتوں ممالک (یعنی پُوری دنیا) کے بادشاہ کے لیے آیا ہے۔

ہفت قلم : خطاطی کی سات اِقسام : خطِ ثلث، خطِ عقق، خطِ توقیع، خطِ رقاع، خطِ ریحان، خطِ نسخ اور خطِ تعلیق (جامع اللغات) بعض خطاط اِس سے قدرے مختلف خط بتاتے ہیں، مثلاً: خط نستعلیق، خطِ نسخ، خطِ ریحان، خطِ شکستہ، خطِ گلزار، خطِ کُوفی اور خطِ غُبار۔

ہلبلا کر : ہڑبڑا کر، گھبراہٹ کا شکار ہو کر۔

ہم : بھی، نیز (ہم نام و ہم تاریخ اِس سے نکلتی ہے: یہ نام بھی ہے اور تاریخِ تحریر بھی اس سے برآمد ہوتی ہے، مُراد :''باغ و بہار'': ۱۲۱۷ھ)

ہمجولی : ہم عُمر سہیلی، وہ جو بچپن میں ساتھ کھیلے۔

ہمیانی : کیسۂ زر، وہ تھیلی جس میں رقم ڈال کر کمر سے باندھ لیتے ہیں۔

ہنکارنا : آواز سے بھگانا۔

ہنُوز : اِس وقت تک، ابھی تک، تا حال۔

ہَوا بہنا : آہستہ آہستہ ہَوا کا چلنا۔

ہواو : حوصلہ (ہواو نہ پڑا : حوصلہ نہیں ہُوا)

ہَوائی : ایک قسم کی آتش بازی، جس کے فُتیلے میں آگ لگائیں تو راکٹ کی طرح آسمان کی جانب نکل کر فضا میں جل بُجھتی ہے۔ اسے آسمانی، اگنی بان، اگن بان، خدنگا اور ختنگا بھی کہتے ہیں۔

ع مہتاب، انار اور پُھل جھڑیاں، ہتھ پُھول، ہوائی خُوب کڑی (نظیر)

ہوتیاں تھیں : ہوتی تھیں۔ ہوتیاں (ہندی) ہوتی۔

ہولے : آگ میں بُھونے گئے ہرے چنے۔

ہونٹھ : ہونٹ کا قدیم اِملا اور تلفظ۔

ہونٹھ چاٹنے لگا : بے بسی سے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا، اظہارِ لاچاری۔ آج کل ''ہونٹ چاٹنے'' سے مُراد چٹخارہ لینا ہے۔

ہیژدہ ہزار : اٹھارہ ہزار۔

ہَیکل : گول، چوکور یا پان کی پتیوں سے مماثل ہار، جسے عورتیں پہنتی تھیں۔ اس ہار میں گول، چوکور یا پان جیسی پتیاں، پھیلاؤ ظاہر کرنے کے لیے کُوٹ کر بنائی جاتی تھیں، جو اندر سے تعویز کی طرح کھوکھلی ہوتی تھیں۔ اُس ہار کو ''حَمیل'' بھی کہا جاتا تھا۔

ع پڑا دُر، کان میں جَھلکے اور سج رہی ہَیکل (نظیر)

ہَیکل نورتن کی : ایک ہار (حمیل) جس میں موتی، ہیرا، زمُرد، لعل، نیلم، پکھراج، مونگا، لاجورد اور گومید جیسے جَواہرات جڑے ہوں۔

ہیلہ مار کر : ''ہیلہ'' یا ''ہیلا'' (ہندی۔ مذکر) پانی میں سے بہ زور گزرنا (جامع اللغات) مُراد : پانی میں سے (گھوڑے سمیت) زور لگا کر۔

ی

یاجُوج ماجُوج : یہ دونام انجیل اور قرآن میں اس حوالے سے آئے ہیں کہ حضرت نوحؑ کے پوتے (یاجُوج اور ماجوج) دونوں بھائی، دامنِ کوہ الطائی میں جا کر آباد ہوئے تھے اور روزِ قیامت وہاں سے خروج کریں گے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں منگول آباد تھے، جنھوں نے تیرھویں صدی میں چنگیز خان کی سرکردگی میں وہاں وہاں سے خروج کر کے دُنیا پر مظالم ڈھائے۔ کنایتاً مُفسد اور مُتفنی (شرارتی) لوگوں کو ''یاجُوج ماجُوج'' کے ناموں سے پُکارتے ہیں۔ یہاں ''سیر تیسرے درویش کی'' کے دو پیادے سپاہی مُراد ہیں، جو تیسرے درویش کو مُردہ جان کر اُسے چارپائی پر لیے جاتے تھے۔

یا سائیں اللہ : صُوفیاء کا کلمۂ خطاب۔ اے اللہ کے دوست۔

یافُقرا اللہ : صُوفیاء کا کلمۂ خطاب۔ اے اللہ کے مِسکین عاشقو۔

یامُرشد اللہ : صُوفیاء کا کلمۂ خطاب۔ اے اللہ کی ہدایت (سیدھے راستے) پر چلنے والے۔

یاہادی : صُوفیاء کا کلمۂ خطاب۔ اے پیر و مُرشد۔ راہنما۔

یتیم : غُلام، نوکر۔

یخنی پُلاؤ : گوشت کی یخنی کے ساتھ تیار کردہ چاول۔

یَساوَل : گھڑسوار مُحافِظ۔

یکتا : بے مِثال، جس کی طرح کا کوئی نہ ہو، نرالا۔

یگا : بے نظیر، یکتا۔ ایک معنی اکیلا اور تنہا کے بھی ہیں۔ میر امّن نے یہ لفظ دو جگہوں پر دو مختلف معنوں میں برتا ہے۔

یمن : عرب کے جنوب مغرب کا ایک علاقہ۔ یہ اسیر اور عدن کے درمیان ساحل بحرِ قلزم پر واقع ہے۔ قدیم یمن کا رقبہ تقریباً پچاس ہزار میل تھا۔ اب یمن دو مملکتوں میں بٹ چکا ہے شمالی یمن اور جنوبی یمن۔

یوسفؑ : ۱۷، ۱۸ اقبل مسیح کا زمانہ۔ یوسفؑ بن یعقوبؑ بن اسحاقؑ بن ابراہیمؑ۔ آپ حضرت یعقوبؑ کے گیارہویں بیٹے تھے اور نہایت حَسین تھے۔ بھائیوں نے حسد کے باعث انھیں سوداگروں کے ہاتھ بیچ دیا۔ بطور غلام زلیخا کے قریب رہے۔ فرعون کے خواب کی تعبیر بتانے پر رہا ہوئے۔ مصر میں وفات پائی۔

یُونہیں اُٹھ کھڑا ہوتا : بغیر کچھ کیے کرائے اُٹھ کھڑا ہوتا۔ از حد نازک اِشارہ ہے۔

ع پہنچا یُونہیں میں اُس چَمنِ زرفشاں میں (نظیر)

یہ حالت پہنچی : فارسی محاورہ : ''نوبت اینجا رسید'' کا اُردو ترجمہ۔ مُراد : یہ حالت ہُوئی۔

یہ دل میں کہہ کر چاہتا ہوں : دِلّی کا روزمَرہ۔ فعل حال، بہ مفہوم ماضی۔

یہہ : یہ کا متبادل۔ جب اشارۂ قریب کے لیے انگلی کے اشارے سے کسی ایک چیز یا فرد کی نشاندہی مقصود ہو۔

یے : یہ کا مُتبادل۔ خواجہ سگ پرست جب اِشارۂ قریب کے لیے اُنگلی کے اشارے سے اپنے دونوں بھائیوں کی طرف متوجہ کرتا ہے تو میر امن ''یہہ'' کی بجائے ''یے'' لکھتے ہیں۔ اِس فرق کی نشان دہی میرے عزیز دوست پروفیسر بشیر احمد قادری نے کی۔ ''یے'' اِشارۂ قریب کے لیے ہے۔ پہلی ''ی'' مکسور اور دوسری مجہُول۔

***
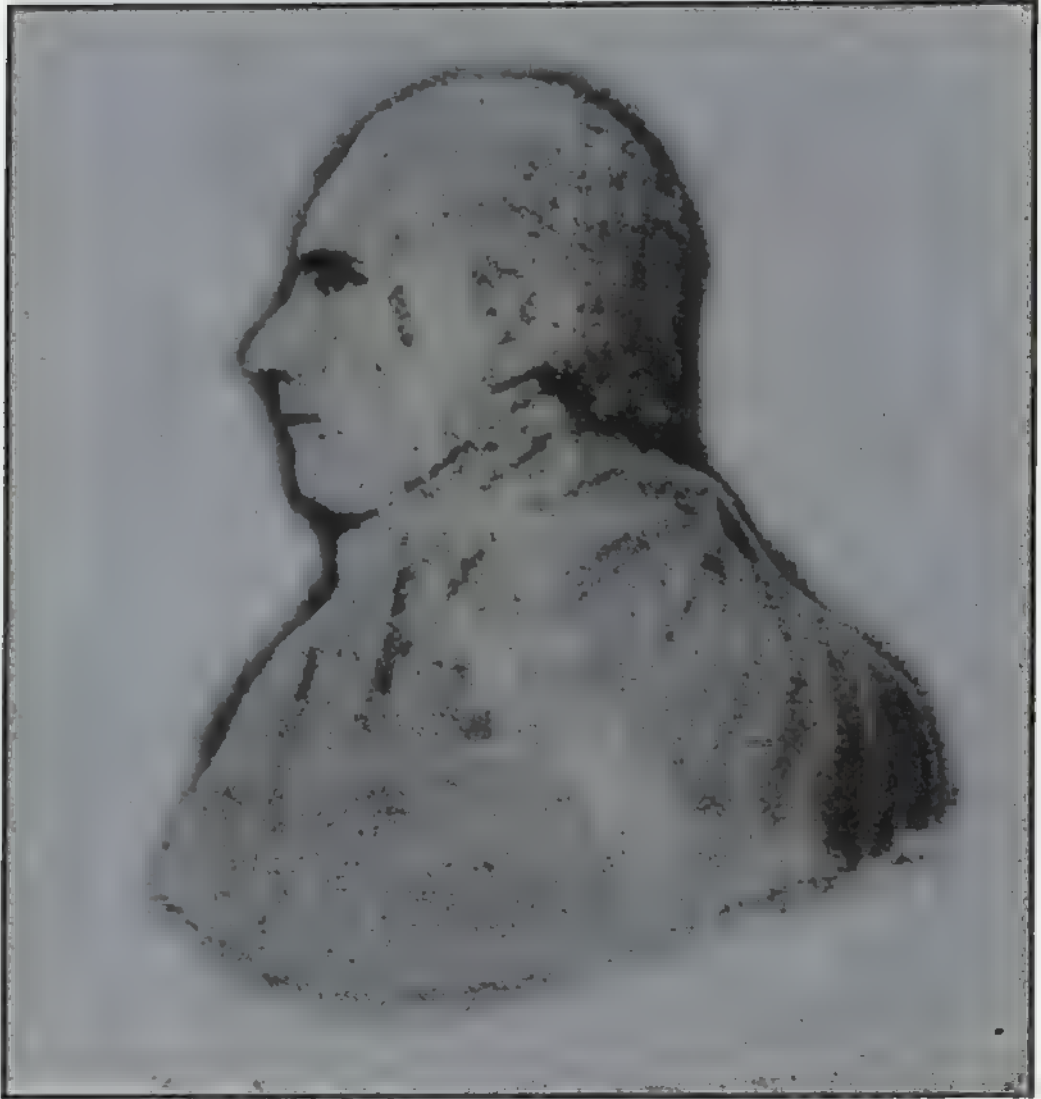
ریورنڈ ڈیوڈ براؤن، پرووسٹ فورٹ ولیم کالج، کلکتہ

۱۷۔ اگست ۱۸۰۰ء......جنوری ۱۸۰۷ء

ڈاکٹر جان بارتھوِک گلکرسٹ صدر شعبۂ ہندوستانی

۱۷۔اگست ۱۸۰۰ء......۲۴ فروری ۱۸۰۴ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باغ و بہار

واسطے زبدۂ نوئینان عالیشان مشیر خاص شاہ کیوان بارگاہ انگلستان مارکوئس
ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ کے جو حامی و حافظ مدرسے کے ہیں

ماخذ اسکا نو طرز مرصع وہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین خاں کا ہی
فارسی قصۂ چار درویش سے

جان گلکرسٹ صاحب دام دولتہ کی فرمایش سے

تالیف کیا ہوا میر امن دلی والے کا

شستہ و رفتہ وہ جن الفاظ کو حسن بیانی ہے
ورد ہی اب کہہ سامنے اسکے ورد زباں
رخامہ کہتا ہی میرا ہی جو فصاحت ایک پیر
سوز مانگی ہی میری خاوندے زر و مال
ختم اب کرتا ہی سودا بدعا ای خامہ
دوست ہوں شاد تیرے اور ہوں دشمن پامال

ہندوستانی چھاپاخانہ
سنہ ۱۸۰۳ عیسوی مطابق سنہ ۱۲۱۸ ہجری کے

سرورق: باغ و بہار (بہ زبان اردو) اشاعت اول: ۱۸۰۴ء جس میں سنہ اشاعت غلطی سے ۱۸۰۳ء درج ہو گیا۔

BAGH O BUHAR.

A TRANSLATION

INTO THE HINDOOSTANEE TONGUE,

OF THE CELEBRATED PERSIAN TALE,

ENTITLED

QISSUI CHUHAR DURWESH.

BY

MEER UMMUN

UNDER THE SUPERINTENDENCE OF

JOHN GILCHRIST.

FOR THE USE OF THE STUDENTS

IN THE

COLLEGE OF FORT WILLIAM.

Calcutta,

PRINTED AT THE HINDOOSTANEE PRESS.

1804.

سرورق: باغ و بہار (بہ زبانِ انگریزی) اشاعتِ اوّل: ۱۸۰۴ء

BAGH O BUHAR.

A TRANSLATION

INTO THE HINDOOSTANEE TONGUE,

OF THE CELEBRATED PERSIAN TALE,

ENTITLED

QISSUI CHUHAR DURWESH.

BY

MEER UMMUN

UNDER THE SUPERINTENDENCE OF

JOHN GILCHRIST.

FOR THE USE OF THE STUDENTS

IN THE

COLLEGE OF FORT WILLIAM.

Calcutta,

PRINTED AT THE HINDOOSTANEE PRESS.

1804.

سرورق: باغ و بہار (بہ زبان انگریزی) اشاعتِ اوّل: ۱۸۰۴ء

ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے "باغ و بہار" کپتان جیمز موئنٹ کے نام کی اور اُسی کپتان کی سازشوں اور نامناسب رویہ کے سبب ۲۳ فروری ۱۸۰۴ء میں گلکرسٹ نے استعفیٰ دیا۔ ۴ جون ۱۸۰۶ء میر میر امّن مستعفی ہوئے اور ۱۸۰۶ء ہی میں میر بہادر علی حسینی بھی کالج چھوڑ گئے۔

BAGH O BUHAR.

A TRANSLATION

INTO THE HINDOOSTANEE TONGUE,

OF THE CELEBRATED PERSIAN TALE,

ENTITLED

QISSUE CHUHAR DURVESH,

BY

MEER UMMUN.

UNDER THE SUPERINTENDENCE OF THE LEARNED MOULUVEES.

LAST EDITION,

MUCH IMPROVED.

Calcutta:

PRINTED BY L. MENDES, AT THE COMMERCIAL ADVERTISER PRESS, NO. 60, COSSITOLL

1839.

سرورق نسخہ فیض اللہ مخزونہ: ذخیرۂ حافظ محمود شیرانی، پنجاب یونی ورسٹی لائبریری، نیو کیمپس، لاہور کے خاتمہ کتاب کے مطابق یہ ایڈیشن ۱۸۴۳ء کی اشاعت ہے جس پر ۱۸۳۹ء درج ہے یعنی ۱۸۴۳ کے ایڈیشن کے لیے نیا سرورق کمپوز نہیں کروایا گیا۔

سبحان اللہ کیا صانع ہی کہ جسنے ایک مٹھی خاک سے کیا کیا صورتین اور
مٹی کی مورتین پیدا کین باوجود دو رنگ کے ایک گورا ایک کالا اور یہی
ناک کان ہاتھ پانون سب کو دیئے ہیں * تس پر رنگ برنگ کی شکلین جدی جدی
بنائین کہ ایک کی سج دھج سے دوسرے کا ڈیل ڈول ملتا نہین * کروڑون
خلقت مین جس کو چاہیئے پہچان لیجئے * آسمان اُس کے دریائے وحدت کا
ایک بلبلا ہی اور زمین پانی کا بتاشا لیکن یہ تماشا ہی کہ سمندر ہزارون لہرین
مارتا ہی پر اُسکا بال بیکا نہین کر سکتا * جس کی یہ قدرت اور صنعت ہو
اُس کی حمد و ثنا مین زبان انسان کی گویا گونگی ہی * کہے تو کیا کہے بہتر یون ہی
جس بات مین دم نہ مار سکے چپکا ہو رہے *

عرش سے لے فرش تک جسکا کہ یہ سامان ہی * حمد اُسکی کہا چاہون تو کیا امکان ہی
جب پیغمبر نے کہا ہو مین نے پہچانا نہین * پھر جو کوئی دعوے کرے اُسکا بڑا نادان ہی
رات دن پھرتے رہو پھر نہین صنعت دیکھئے * ہر طرف واحد کی صورت دیدۂ حیران ہی
اُسکا ثانی [illegible] ہی نہ ہوگا کبھو * ایسے یکتا کو خدائی سب طرح شایان ہی
لیکن اتنا جانتا [illegible] رزاق ہی وہ * ہر طرح سے مجھ پر اُسکا لطف اور احسان ہی
اور درود اُس اپنے دوست پر جسکے خاطر زمین اور آسمان کو پیدا کیا اور درجہ رسالت کا دیا

آغاز نسخہ فیض اللہ ایڈیشن ۱۸۴۳ء مع مُہر، فورٹ ولیم کالج، کلکتہ

Returned by Moulovee Aleem instead of the College Copy of Bagho Buhar, 9th May 1843.

College of Fort William

نسخہ فیض اللہ، اندراج کتب خانہ فورٹ ولیم کالج، کلکتہ

فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کے ملازم مولوی علیم نے کالج کی لائبریری سے حاصل کردہ ''باغ و بہار'' کی اشاعتِ اوّل ۱۸۰۴ء کے بدلے ''باغ و بہار'' (نسخہ فیض اللہ ۱۸۴۳ء) جمع کروایا۔ مولوی علیم نے 'اخلاق ہندی' از میر بہادر علی حسینی پر نظرِ ثانی کی تھی، اُن کا نظرِ ثانی شدہ نسخہ مطبع نجم السعادت، کلکتہ سے تیسری بار غرہ جمادی الثانی ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۵ء میں طبع ہوا تھا۔ یہ ایڈیشن صولت پبلک لائبریری رام پور میں موجود ہے۔

"آپ نے 'باغ و بہار' کو توجہ اور پوری احتیاط سے مرتب کیا۔ سلیقے سے، بمعہ حواشی اور تعلیقات۔"

پروفیسر ڈاکٹر محمد حسن

D-7، ماڈل ٹاؤن، دہلی
11 اپریل 2004ء

"آپ نے 'باغ و بہار' کے متن کی تحقیق و تصحیح میں جو محنت کی ہے، وہ غیر معمولی ہے۔ اہلِ نظر کو یہ فیصلہ کرنے میں دشواری نہیں ہوگی کہ آپ نے تدوین متن کا حق ادا کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔"

پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

جامعہ نگر، نئی دہلی
21 مئی 2004ء

پروفیسر ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی مرتب کردہ 'باغ و بہار' کا ماخذی نسخہ: "نسخہ فیض اللہ کلکتہ: 1843ء" اپنے متن، املا، پیرابندی اور اوقاف نگاری کے اعتبار سے بے مثل ہے۔ اس نسخے کی اشاعت اول: 1839ء کے بعد مئی 1843ء تک تین ایڈیشن نکلے۔ اس نسخے کے نقش ثانی مطبوعہ: اواخر 1843ء سے معلوم ہوا کہ 1839ء تا مئی 1843ء کے دورانیہ میں مولوی فیض اللہ، فورٹ ولیم کالج کے دیگر مولویان کے ساتھ مل کر اس پر نظر ثانی کا کام کرتے رہے۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا مرتب کردہ یہ وہی نظر ثانی شدہ ایڈیشن: 1843ء ہے، جو فورٹ ولیم کالج کی بیضوی مُہر اور لائبریرین کے ہاتھ کی ایک مختصر تحریر کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، نیو کیمپس، لاہور کے اورینٹل سیکشن کے گوشہ حافظ محمود شیرانی میں محفوظ ہے۔ تصحیح متن کے حوالے سے جُملہ مرتبین 'باغ و بہار' نے مقابلہ متون کے ذریعے جو کچھ نتائج برآمد کیے اور اس پر بھی کسی حتمی نتیجہ تک نہیں پہنچے، وہ سارا کچھ "نسخہ فیض اللہ: 1843ء" میں دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ وہ یوں کہ ایل ایف سمتھ کے نسخہ کلکتہ: 1813ء، 1851ء، پی ایس روزاریو کے نسخہ کلکتہ: 1836ء، ڈنکن فاربس کے نسخہ لندن: 1846ء، 1849ء، 1851ء، 1860ء، 1873ء، 1857ء، 1859ء، قاضی محمد اسماعیل مدرس فورٹ ولیم کالج کے نسخہ کلکتہ: 1854ء، مولوی سید محمد حسن لکھنوی کے نسخہ کانپور: 1855ء، ایڈورڈ بی۔ ایسٹ وک کے بہ زبان انگریزی ترجمہ: 1859ء، مونیئر ولیمز کے رومن نسخہ لندن: 1859ء، میجر ڈی۔ سی فلٹ کے نسخہ کلکتہ: 1905ء، مولوی عبدالحق کے انتخابی نسخہ: 1931ء، ممتاز حسین کے نسخہ کلکتہ: 1958ء، ابوالخیر کشفی کے نسخہ کلکتہ 1964ء، ڈاکٹر ممتاز منگلوری کے انتخابی نسخہ: 1966ء اور ڈنکن فاربس کے پیش کردہ متون: 1846ء، اور 1873ء پر مبنی رشید حسن خان کے انتخابی نسخہ: 1992ء سے بعد از موازنہ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے ثابت کر دیا کہ "نسخہ فیض اللہ کلکتہ: 1843ء" کے مرتبین نے اس متن کی تدوین میں میر امن کے خطی نسخے یا تصدیق شدہ نقل کو بنیاد بنایا۔ یہی سبب ہے کہ 'باغ و بہار' کا اس سے بہتر متن، قدیم و جدید مطبوعہ نسخوں میں دیکھنے کو نہیں ملتا۔

"ادارہ"

ISBN: 978-969-496-517-8